تفہیم احکام القرآن

www.KitaboSunnat.com

جلد سوئم

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.kitabosunnat.com

تفہیم احکام القرآن (جلد سوم)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے

لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ

جو بالکل سیدھی ہے۔ جو لوگ اسے مان کر بھلے کام

الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ

کرنے لگیں انھیں یہ بشارت دیتا ہے کہ

أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾

ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

(بنی اسرائیل ۱۷:۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفہیم احکام القرآن

تفہیم القرآن اور مولانا مودودیؒ کی دیگر تحریروں
میں مذکور احکام القرآن کا مجموعہ

جلد سوم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: مولانا عبدالوکیل علوی

ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب : تفہیمِ احکام القرآن (جلد سوم)

(معاشرت)

لوازمہ تصنیفات : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب وتدوین : مولانا عبدالوکیل علوی

باہتمام : ادارہ معارف اسلامی

مطبع : رانا پرنٹرز، دی مال، لاہور

اشاعتِ اول : نومبر (۲۰۰۹ء) (۱۱۰۰)

قیمت : -/[illegible] روپے

تقسیم کنندہ:

مکتبہ معارفِ اسلامی

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ پوسٹ کوڈ نمبر: ۵۴۷۹۰

فون: ۳۵۴۳۲۴۱۹ : ۰۴۲-۳۵۴۱۹۵۲۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
عرض ناشر	۱۹	عورتوں کی تعلیم	۴۹
باب اوّل		عورت کا اصلی اٹھان	۴۹
اسلامی نظامِ معاشرت		فصل چہارم: تحفظات	۵۵
فصل اول: اجمالی خاکہ	۲۳	اصلاحِ باطن	۵۶
اسلام کی معاشرتی اصلاحات	۲۷	حیا	۵۶
فصل دوم: اساسی نظریات	۳۱	حیا کا دائرۂ کار	۵۷
زوجیت کا اساسی مفہوم	۳۱	دل کے چور	۵۸
انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے مقتضیات	۳۳	فتنۂ نظر	۵۸
فطرت انسانی اور اس کے مقتضیات	۳۵	جذبۂ نمائشِ حسن	۵۹
فصل سوم: اُصول وارکان	۳۹	فتنۂ زبان	۵۹
محرمات	۳۹	دیگر حرکات	۶۰
حرمت زنا	۳۹	فتنۂ خوشبو	۶۰
نکاح	۳۹	فتنۂ عریانی	۶۱
خاندان کی تنظیم	۴۱	فصل پنجم: تعزیری قوانین	۶۳
مرد کی قوامیت	۴۱	حدّ زنا	۶۳
عورت کا دائرۂ عمل	۴۳	حدّ قذف	۶۵
ضروری پابندیاں	۴۵	فصل ششم: انسدادی تدابیر	۶۷
عورت کے حقوق	۴۷	مرد و زن کے باہمی اختلاط کی ممانعت	۶۷
معاشی حقوق	۴۷	لباس اور ستر کے احکام	۶۹
تمدنی حقوق	۴۸	مردوں کے لیے ستر کے حدود	۷۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
عورتوں کے لیے ستر کے حدود	۷۱
عورت کے لیے عورت کی حدودِ ستر	۷۳
استیذان	۷۳
استیذان کے احکام	۷۴
لفظ استیناس کی حکمت	۷۵
دورِ جاہلیت کا طریقہ	۷۶
تخلیہ کا حق	۷۶
ناواقف کار لوگوں کا طرزِ عمل	۷۸
استیذان کا درست طریقہ	۷۸
عوامی مقامات میں داخلہ	۷۹
حکم کا آغاز، نبیؐ کے گھر سے	۷۹
غلاموں اور نابالغوں سے مراد	۸۰
اوقاتِ تخلیہ	۸۰
مخصوص اوقات کے علاوہ اجازت کی وجہ	۸۱
تخلیہ اور لمس کی ممانعت	۸۱
محرموں اور غیر محرموں کے درمیان فرق	۸۳
غضِ بصر کے احکام	۸۳
مردوں کو غضِ بصر کا حکم	۸۳
غضِ بصر کے معنی	۸۴
غضِ بصر کا حکم احادیث میں	۸۴
غضِ بصر کے حکم سے مستثنیٰ صورتیں	۸۵
عورتوں کے لیے غضِ بصر کے بارے میں روایات	۸۶
عبداللہ بن اُمِ مکتوم کا واقعہ	۸۶
حضرت عائشہ کا حبشیوں کے کرتب دیکھنے کا واقعہ	۸۷
فاطمہ بنت قیس کی طلاق کے بعد رہائش کا مسئلہ	۸۷
فرقِ مراتب کا خیال	۸۷
ان مراتب کی حکمت	۸۸
ایک غلط استدلال اور اس کا جواب	۸۹
اظہارِ زینت کی ممانعت	۸۹
اعتدال کے حدود میں بناؤ سنگھار	۸۹
اظہارِ زینت کے حدود	۹۰
از خود ظاہر ہونے والی زینت	۹۳
مفسرین کے نزدیک آیت کا مفہوم	۹۴
سینوں پر دوپٹے ڈالنے کا حکم	۹۵
دوپٹے کی نوعیت	۹۶
گھر سے باہر نکلنے کے احکام	۹۶
اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھنے کا حکم	۹۶
بن ٹھن کر باہر نکلنے کی ممانعت	۹۷
حاجات کے لیے نکلنے کی اجازت	۹۸
مسجد میں آنے کی اجازت اور اس کے حدود	۹۹
مسجد میں آنے کی شرائط	۱۰۱
حج میں عورتوں کا طریقہ	۱۰۲
جمعہ و عیدین میں عورتوں کی شرکت	۱۰۳
زیارتِ قبور و شرکتِ جنازات	۱۰۳
جنگ میں عورتوں کی شرکت	۱۰۴
محرم کے بغیر سفر کی ممانعت	۱۰۶
ان احکام کی روشنی میں ایک مسلمان کا طرزِ عمل	۱۰۶
فصل ہفتم: پردہ	۱۰۹
دو اہم اور پیچیدہ مسائل: مرد و عورت اور فرد و جماعت کا تعلق	۱۰۹
پردہ: عورتوں کے لیے حفاظت کا اہم ذریعہ	۱۱۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
پردہ کے احکام	۱۱۲
اسلام میں پردے کے احکام کا آغاز	۱۱۳
ان احکام کا اطلاق	۱۱۳
آیت حجاب	۱۱۴
'پردہ' سے مستثنیٰ عورتیں	۱۱۵
وہ رشتہ دار جن سے پردہ نہ کرنے کی اجازت ہے	۱۱۵
اس مقام پر شہادت الٰہی کے ذکر کی حکمت	۱۱۷
عورت کا عورت سے پردہ	۱۱۷
تین نہایت اہم مسائل	۱۱۸
۱- تمام محرمات کے سامنے چہرہ کھولنا جائز ہے	۱۱۸
۲- غیر محرم رشتہ داروں کا معاملہ	۱۱۹
۳- اگر رشتے میں شبہ پڑ جائے، اس کا حکم	۱۲۰
ناسمجھ بچوں سے پردہ کی نوعیت	۱۲۰
غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ سے پردے کا حکم	۱۲۱
حد عقل کو پہنچ جانے والوں کے لیے احکام	۱۲۲
اختلاف فقہا	۱۲۲
۱۵ برس والی حدیث	۱۲۲
اپنے غلاموں سے پردہ	۱۲۳
چہرے کا پردہ	۱۲۴
واقعہ افک سے استدلال	۱۲۷
إِلَّا مَا ظَهَرَ کا مفہوم	۱۲۷
نقاب	۱۲۹
کیا برقع پردے کی غایت پوری کرتا ہے	۱۳۲
کیا پردہ محض ایک رواجی چیز ہے؟	۱۳۳
'پردہ' کے متعلق چند عملی سوالات	۱۳۴

عنوان	صفحہ
کیا پردہ مناسب رشتے کی تلاش میں رکاوٹ ہے؟	۱۳۷
پردہ اور پسند کی شادی	۱۳۹
پردے کا مسئلہ سمجھنے میں حائل رکاوٹیں	۱۴۱
اسلامی قوانینِ معاشرت میں تخفیف	۱۴۳
اسلامی نظامِ معاشرت کی حفاظت کا آخری چارۂ کار	۱۴۴
باب دوم	
قانونِ ازدواج	
فصل اوّل: قانونِ ازدواج کے مقاصد	۱۴۹
اخلاق وعفت کی حفاظت	۱۴۹
مودّت ورحمت	۱۵۱
غیر مسلموں سے مناکحت کی قباحت،	
(مودت ورحمت کا فقدان)	۱۵۲
کفاءت، مودت ورحمت کے لیے ایک بنیاد	۱۵۳
فصل دوم: قانونِ ازدواج کے اصول	۱۵۵
اصل اول: مرد کی قوامیت	۱۵۵
مرد کے فرائض	۱۵۶
مہر	۱۵۶
نفقہ	۱۵۷
ظلم سے اجتناب	۱۵۷
ایلاء	۱۵۷
ضرار اور تعدی	۱۵۸
ازواج میں عدل نہ کرنا	۱۵۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
مرد کے حقوق	۱۵۹
حفظ للغیب	۱۶۰
شوہر کی اطاعت	۱۶۰
مرد کے اختیارات	۱۶۱
نصیحت، تادیب اور تعزیر	۱۶۱
طلاق	۱۶۲
فصل دوم: رشتہ ازدواج کا استحکام	۱۶۳
طلاق کی شرائط	۱۶۴
خلع	۱۶۴
قضائے شرعی	۱۶۴
فصل سوم: ازدواجی معاملات کے بارے میں اصولی ہدایات	۱۶۵
مشرکوں سے نکاح کی ممانعت	۱۶۵
مہر کی ادائیگی	۱۶۶
مرد کی بالادستی	۱۶۶
مناسب نفقہ	۱۶۶
بدسلوکی پر تادیب	۱۶۷
حکمین کا تقرر	۱۶۷
خلع کا راستہ	۱۶۷
تعدی سے اجتناب	۱۶۸
بیویوں میں عدل	۱۶۸
ایلا کا حکم	۱۶۸
لعان	۱۶۹
طلاق کا اختیار	۱۶۹
طلاق کا نصاب	۱۷۰

عنوان	صفحہ
باب سوم	
نکاح کے احکام	
فصل اول: نکاح کا مفہوم اور اہمیت	۱۷۳
لفظ نکاح کا اصل معنی و مفہوم	۱۷۳
ایک سوال کا جواب	۱۷۴
نکاح کی ضرورت	۱۷۵
قوانین فطرت اور ازدواجی زندگی	۱۷۵
مدنیت صالحہ کا قیام	۱۷۶
تعلق زوجین کی صحیح صورت	۱۷۹
نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر	۱۷۹
نکاح کی اہمیت	۱۸۱
نکاح کرنے والے کے لیے اللہ کی مدد	۱۸۲
اعلانِ نکاح کا مقصد	۱۸۲
انسان پر اس کے نفس کا حق	۱۸۲
غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے حکم	۱۸۳
لونڈی اور غلام کی صالحیت	۱۸۳
کیا مالک پر اپنے غلام کا نکاح کرنا واجب ہے؟	۱۸۴
'غنی' کرنے کا مطلب	۱۸۴
نکاح کے متفرق مسائل	۱۸۴
نکاح کا موقع نہ پانے والوں کے لیے حکم	۱۸۴
نکاح سے پہلے عورت کو دیکھنا	۱۸۵
مروجہ رسوم اور ان کی اصلاح	۱۸۶
مفلس اور مقروض کے لیے شادی کی رسوم	۱۸۷
رشتے میں لڑکے کی طرف سے پہل کا انتظار	۱۸۸
منگنی اور جہیز وغیرہ کی شرعی حیثیت	۱۸۸
جہیز کی موجودہ صورت	۱۸۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
منگنی کا شرعی حکم	۱۸۹
ٹیلی فون پر نکاح	۱۸۹
خطبہ کے بغیر نکاح	۱۹۰
ادلے بدلے کا نکاح	۱۹۰
کم سنی میں نکاح	۱۹۱
شادی بیاہ اور موسیقی	۱۹۱
سول میرج	۱۹۳
فصل دوم: مہر	۱۹۵
قرآن وحدیث میں مہر کا ذکر	۱۹۵
اسلامی قانون میں مہر کی حیثیت	۱۹۶
مہر کی ادائیگی، مؤجل یا معجّل	۱۹۷
فقہائے احناف کے اقوال	۱۹۸
قول راجح	۱۹۹
عرف ورواج کی قانونی حیثیت	۱۹۹
موجودہ معاشرے کی حالت	۱۹۹
لونڈی کے ساتھ نکاح کی صورت میں مہر	۲۰۰
مہر کی مقدار	۲۰۰
مہاجر مؤمن عورتوں کے مہر کا مسئلہ	۲۰۲
فصل سوم: مسئلہ کفاءت	۲۰۵
نکاح میں کفاءت کا اعتبار، عقل ونقل کے لحاظ سے	۲۰۵
کفاءت میں اصل اعتبار	۲۰۶
ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۲۰۷
دوسری غلط فہمی	۲۰۷
فصل چہارم: مسئلۂ ولایت	۲۰۹
بالغ عورت اور نکاح کا اختیار	۲۰۹
ولایت اجبار اور خیار بلوغ	۲۱۲
ولایت اجبار	۲۱۳
خیار بلوغ کی شرائط	۲۱۶

عنوان	صفحہ
فصل پنجم: محرمات	۲۱۷
قرآن میں مذکور فہرست	۲۱۷
سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کی حرمت	۲۱۷
جس عورت سے باپ یا بیٹے کا ناجائز تعلق رہا ہو اُس کا حکم	۲۱۸
مختلف بہنوں کا حکم	۲۱۹
خوش دامن اور سوتیلی بیٹی کے احکام	۲۱۹
بیٹے کی بیوی (بہو) کا حکم	۲۱۹
خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کا ایک نکاح میں اجتماع	۲۲۰
دو بہنوں کا ایک مرد کے نکاح میں ہونا	۲۲۰
رضاعی ماں بہنوں کا حکم	۲۲۰
رضاعت کس عمر میں معتبر ہے؟	۲۲۰
مدت رضاعت میں فقہا کا اختلاف	۲۲۱
محرمات کی حرمت میں پوشیدہ حکمت	۲۲۲
توأم (متحد الجسم) بہنوں کا حکم	۲۲۳
سوتیلے بیٹے کی بیوی کا حکم: حضرت زیدؓ اور زینبؓ	۲۲۵
کے واقعے کی روشنی میں	۲۲۵
حاجت پوری کرنے کا مفہوم	۲۲۵
حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح اللہ کے حکم سے ہوا	۲۲۵
اس نکاح کی مصلحت وضرورت	۲۲۵
آپؐ کے لیے یہ نکاح فرض تھا	۲۲۵
کیا یہ ضابطہ تمام انبیا کے لیے ہے؟	۲۲۶
حضرت زیدؓ اور زینبؓ کے نکاح وطلاق میں احکامی اشارات	۲۲۶
مخالفین کے پروپیگنڈے کے دوران میں اہل ایمان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟	۲۲۶
حضرت زیدؓ کو اپنی بیوی روکے رکھنے کا مشورہ	۲۲۶
اس ضمن میں حضورؐ کو اللہ سے ڈرنے کا حکم	۲۲۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
باب چہارم	
متفرق مباحث	
فصل اوّل: تعددِ ازواج	۲۳۱
بنیادی حکم	۲۳۱
تعددِ ازواج کا حکم عورتوں کے مفاد میں ہے	۲۳۳
تعددازواج کی صورت میں پیش آنے والے مسائل	۲۳۴
بیویوں کے درمیان عدل کا مطلب	۲۳۴
حضورؐ کے لیے حلال بیویوں کی تعداد	۲۳۵
اس رخصت کا مقصد	۲۳۶
آپؐ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے نکاح کی اجازت	۲۳۶
عام مسلمان کے لیے حکم	۲۳۷
آپؐ کے لیے چند مخصوص احکام	۲۳۷
آپؐ کو اس عام قاعدے سے مستثنیٰ فرمانے کی مصلحت	۲۳۸
تنگی نہ رہنے کا مطلب	۲۳۸
حضورؐ کے ذمے سپرد کام کی نوعیت	۲۳۸
تعددِ ازواج سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ	۲۳۹
بیویوں کی باری سے متعلق آپؐ کا طرزِ عمل	۲۴۰
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۲۴۱
ایک تنبیہ	۲۴۱
حضورؐ کو حلال کی گئی عورتوں میں سے کسی کو طلاق دینے کا حق نہیں	۲۴۲
فصل دوم: گھریلو اختلافات	۲۴۳
ازدواجی تعلقات کے بگاڑ پر ابلیس کا اظہارِ مسرت	۲۴۳

عنوان	صفحہ
نشوز (سرکشی) کی حالت میں کارروائی کی حدود	۲۴۳
حَکَم (ثالث) کا تقرر	۲۴۵
ثالثوں کے اختیارات	۲۴۶
فصل سوم: ایلاء	۲۴۹
بنیادی حکم	۲۴۹
حکم کا اطلاق	۲۴۹
ایلا کی انتہائی مدّت	۲۵۰
ایلاء میں حلف ضروری نہیں ہے	۲۵۰
اس دعوے کے دلائل	۲۵۱
فصل چہارم: ظہار	۲۵۳
ظہار کے لغوی معانی	۲۵۳
ظہار کے متعلق اللہ کا پہلا فیصلہ	۲۵۳
بیوی کو ماں سے تشبیہ دینا نہایت بے ہودہ بات اور جھوٹ ہے	۲۵۴
جرم کی ہلکی سی سزا	۲۵۴
عہدِ رسالتؐ میں ظہار کے چند واقعات	۲۵۵
پہلا واقعہ	۲۵۶
دوسرا واقعہ	۲۵۶
تیسرا واقعہ	۲۵۶
چوتھا واقعہ	۲۵۶
یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا کا مفہوم	۲۵۶
پہلا مفہوم	۲۵۷
دوسرا مفہوم	۲۵۷
تیسرا مفہوم	۲۵۷
چوتھا مفہوم	۲۵۷
قانونِ ظہار	۲۵۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
قانون کی تفصیلات	۲۵۸
جاہلی رسومات کی تنسیخ	۲۵۸
ظہار کرنے کی اہلیت	۲۵۸
فقہا کے اختلافات	۲۵۸
کیا عورت ظہار کرسکتی ہے؟	۲۵۹
صریح اور غیر صریح الفاظ کا فرق	۲۶۰
غیر عورت سے ظہار کا مسئلہ	۲۶۰
ظہار کے لیے وقت کی تحدید	۲۶۰
مشروط ظہار	۲۶۱
ایک بیوی سے کئی مرتبہ ظہار	۲۶۱
بیک وقت دو بیویوں سے ظہار	۲۶۱
دوبارہ ظہار	۲۶۱
کفارہ کی ادائیگی سے پہلے جماع کی صورت میں حکم	۲۶۱
بیوی کو کس سے تشبیہ دینا ظہار ہے؟	۲۶۲
ظہار کے صریح اور کنایہ الفاظ	۲۶۳
عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں ظہار کے الفاظ	۲۶۴
کفارہ کا سبب	۲۶۴
کفارہ ادا کرنے سے پہلے بیوی کو ہاتھ لگانا	۲۶۵
کفارۂ ظہار کو طلاق بھی ختم نہیں کرسکتی	۲۶۵
کفارہ ادا نہ کرنے کی صورت میں بیوی کو حکم	۲۶۶
کفارۂ ظہار کے احکام	۲۶۶
اجمالی بیان	۲۶۶
غلام آزاد کرنا	۲۶۶
دو ماہ کے روزے رکھنا	۲۶۷
ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا	۲۶۸
کھانا کھلانے کے دوران بیوی کو چھونے کا حکم	۲۶۹
فصل پنجم: لعان	۲۷۱
قرآن میں لعان کا بیان	۲۷۱
واقعاتِ لعان	۲۷۱
ہلال بن امیہ کا مقدمہ	۲۷۲
عویمر عجلانی کا مقدمہ	۲۷۳
احکام لعان	۲۷۳
لعان کے بعد مہر کی واپسی	۲۷۴
لعان کے بعد دوبارہ نکاح	۲۷۵
چند دیگر واقعات	۲۷۵
ضابطہ لعان کی اہم دفعات	۲۷۶
۱- زنا کی حالت میں بیوی کو قتل کرنا	۲۷۶
۲- لعان کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے	۲۷۶
۳- عورت بھی لعان کا مطالبہ کرسکتی ہے	۲۷۶
۴- لعان کی شرائط اہلیت	۲۷۶
۵- وجوب لعان کے الفاظ	۲۷۸
۶- الزام کے بعد قسم سے انکار	۲۷۸
۷- عورت کا لعان سے انکار	۲۷۸
۸- لعان کے بعد پیدا ہونے والے بچے کا حکم	۲۷۹
۹- لعان کو وضع حمل تک ملتوی کرنا	۲۷۹
۱۰- بچے سے انکار کا متفق علیہ حکم	۲۷۹
۱۱- طلاق دینے کے بعد زنا کا الزام	۲۷۹
۱۲- لعان کے متفق علیہ نتائج	۲۸۰
دو اختلافی مسئلے	۲۸۰
فصل ششم: نکاح کتابیات	۲۸۱
اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح	۲۸۱
اختلافات سلف	۲۸۲
ابن عمرؓ کا مسلک	۲۸۳
ابن عباسؓ کا مسلک	۲۸۵
جمہور کا مسلک اور ان کے اختلافات	۲۸۵
صحیح مسلک	۲۸۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
مصالح و حِکَم	۲۸۷
مخلوط شادیوں کی مضرت	۲۸۸
اختلاف دین کے نقصانات	۲۸۸
اسلامی قانون ازدواج کی شانِ اعتدال	۲۸۹
مسلمہ اور غیر مسلم کے نکاح کی حرمت	۲۹۰
اس حرمت کی علت و مصلحت	۲۹۰
اس حکم کی بنیاد، ایک نفسیاتی حقیقت	۲۹۱
مسلم اور غیر مسلمہ کے نکاح کے قیود	۲۹۲
نکاح کتابیہ کی اجازت	۲۹۲
نکاح کتابیہ کی کراہیت	۲۹۳
منکوحہ کتابیہ کے لیے آزادیٔ عمل کے حدود	۲۹۵
موجودہ دور میں یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح	۲۹۵
قادیانی عورت سے مسلمان کا نکاح	۲۹۶
فصل ہفتم: تبدیلیٔ دین کی صورت میں احکام	۲۹۷
اگر زوجین میں سے ایک مسلمان ہوجائے	۲۹۷
چار بڑے احکام	۲۹۷
ان احکام کا تاریخی پس منظر	۲۹۸
مسئلے کی چار صورتیں	۲۹۸
فقہاء کے مسالک	۲۹۹
دارالاسلام میں شوہر کا مسلمان ہونا	۲۹۹
عورت کا مسلمان ہونا	۲۹۹
۲- دارالکفر میں ہجرت کے بغیر صرف مسلمان ہونا	۳۰۰
۳- مسلمان ہونے کے ساتھ ہجرت کرنا	۳۰۱
اس صورت میں نکاح کا حکم	۳۰۱
بعض صحابہ کا اپنی کافر بیویوں کو طلاق دینا	۳۰۱
نکاح نہ ٹوٹنے کے حق میں چند دلائل	۳۰۲
ان دلائل کا جواب	۳۰۲
ارتداد کی صورت میں احکام	۳۰۳
اگر دونوں ایک ساتھ مرتد ہوں	۳۰۳
اگر شوہر مرتد ہوجائے	۳۰۳
اگر عورت مرتد ہوجائے	۳۰۳
نومسلم شادی شدہ عورت غیر مسلم معاشرے میں	۳۰۴
دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت و مناکحت	۳۰۵
فصل ہشتم: نکاحِ متعہ	۳۰۷
تاریخی پس منظر	۳۰۷
حرمت کے دلائل	۳۰۸
متعہ سے متعلق روایات	۳۰۸
مسلم میں مروی روایات	۳۰۸
دو باتوں کی توضیح	۳۰۹
حالت اضطرار میں جواز کے قائلین	۳۰۹
ابن عباسؓ کا مسلک اور اس کی توضیح	۳۰۹
ایک اعتراض اور اس کا جواب	۳۱۰
فصل نہم: حرمتِ زنا و فواحش	۳۱۳
حرمت زنا	۳۱۳
حرمت فواحش	۳۱۳
زانی اور زانیہ کا نکاح	۳۱۴
زانی کا نکاح حرام ہونے کا مطلب	۳۱۴
زانی مسلم کا نکاح مشرک عورت سے؟	۳۱۵
احادیث کی روشنی میں آیت کی توضیح	۳۱۵
ایک گم نام خط اور اس کا جواب	۳۱۵
قحبہ گری اور اسلام	۳۱۷
عرب میں قحبہ گری کی صورتیں	۳۱۷
ارشادات نبوی	۳۱۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
حکم نامے کے اختتام پر سخت تنبیہ	۳۱۹
دورِ جدید میں افواج کے لیے قحبہ گری اور اسلام	۳۲۰
عملِ قومِ لوط اور اس کی سزا	۳۲۳
فقہا کی آرا	۳۲۴
جدید مغربی تہذیب میں اس کا عروج	۳۲۴
جنسی خواہش پوری کرنے کی دیگر حرام صورتیں	۳۲۵
استمنا بالید کا شرعی حکم	۳۲۶
عورت اور عورت کا جنسی اختلاط	۳۲۸
ایامِ ماہواری میں بیوی کے ساتھ تعلقات کی حدود	۳۲۹
فصل دہم: ضبطِ ولادت	۳۳۱
ضبطِ ولادت بصورتِ عزل	۳۳۱
قصداً بانجھ بننا	۳۳۲
ضبطِ ولادت کی تحریک کے نتائج	۳۳۲
عزل کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر	۳۳۳
افلاس کے اندیشے سے منعِ حمل	۳۳۵
اسقاطِ حمل	۳۳۶
آلات کے ذریعے توالد و تناسل	۳۳۶
باب پنجم	
احکامِ طلاق و خلع وغیرہ	
فصل اول: طلاق	۳۴۱
طلاق اور اس کی شرائط	۳۴۱
طلاقِ ثلاثہ گناہ ہے	۳۴۳
ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں	۳۴۴
تین طلاقیں، جہالت کا کرشمہ	۳۴۵
ضابطۂ طلاق قرآن و سنت اور فقہا کی تصریحات کی روشنی میں	۳۴۶
عدت کے لیے طلاق دینے کا مطلب	۳۴۶
۱- عدت کا آغاز کرنے کے لیے	۳۴۶
۲- عدت تک کے لیے	۳۴۷
اکابر مفسرین کی رائے	۳۴۷
احادیث میں اس کی وضاحت	۳۴۸
اقوالِ صحابہؓ	۳۴۹
فقہائے اسلام کا مرتب کردہ قانونِ طلاق	۳۵۰
مسلکِ حنفی	۳۵۰
مسلکِ مالکی	۳۵۱
مسلکِ حنبلی	۳۵۱
مسلکِ شافعی	۳۵۱
کسی طلاق کے حرام یا گناہ ہونے کا مطلب	۳۵۱
خلافِ سنت طلاق کا حکم	۳۵۲
طلاقِ ثلاثہ کا وقوع	۳۵۲
طلاقِ بدعت کے واقع ہونے کے دلائل	۳۵۲
ایک کمزور دلیل	۳۵۴
حیض میں طلاق دینے والے کو رجوع کا حکم کس معنی میں ہے	۳۵۵
رجوع کی مدت	۳۵۶
رجوع کا طریقہ	۳۵۷
فقہا کا اختلاف	۳۵۷
طلاقِ سنت اور طلاقِ بدعت کا فرق	۳۵۸
حلالہ یا سازشی نکاح	۳۵۸
طلاق کا صحیح طریقہ قرآن و سنت کی روشنی میں	۳۵۹
دو صاحبِ عدل آدمیوں کو گواہ بنانے کا حکم	۳۶۰
قرآن کے بیان کردہ قواعد	۳۶۰
سورۂ طلاق کے نزول کا مقصد	۳۶۱
جماع سے پہلے طلاق اور متعۂ طلاق	۳۶۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
۱-مطلقہ کتابیہ کا حکم	۳۶۳
۲-مس کرنے سے مراد	۳۶۳
۳-خلوت سے پہلے طلاق کی عدت نہیں	۳۶۳
۴-عدت، عورت پر اولاد اور شرع کا حق	۳۶۴
۵-متعۂ طلاق کی نوعیت	۳۶۴
۶-بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب	۳۶۴
نکاح سے پہلے طلاق	۳۶۵
فقہا کے ایک گروہ کی رائے	۳۶۵
دوسرے گروہ کی رائے	۳۶۵
ایک استفسار اور اِس کا جواب	۳۶۶
تفویضِ طلاق	۳۶۷
فقہا کے مستنبط کردہ احکام	۳۶۸
طلاق کے بعد بیوی کے لیے آزادی	۳۷۰
بیوی کو آزاد کرنے میں سختی ممنوع ہے	۳۷۰
طلاق کے بعد عورت سے چیزیں واپس لینا	۳۷۱
طلاق کے بعد مہر واپس نہیں لیا جا سکتا	۳۷۲
ایقاعِ طلاق کے بارے میں غیر مسلم عدالتوں کا فیصلہ	۳۷۲
غیرِ اسلامی عدالت کے فیصلے کی حیثیت	۳۷۲
فصل دوم: خُلع	۳۷۷
شرعی اصطلاح میں خُلع کا معنی	۳۷۷
خلع کی صورت میں واقعہ طلاق کی نوعیت	۳۷۷
عدتِ خلع	۳۷۷
ایک سوال کا جواب	۳۷۸
احکامِ خلع کی تفصیل	۳۷۹
صدرِ اول کے نظائر	۳۸۱
احکامِ خلع کا خلاصہ	۳۸۳
ایک بنیادی غلطی	۳۸۵
مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات	۳۸۶
فصل سوم: خیارِ فسخ	۳۸۹
عیوب میں خیارِ فسخ	۳۸۹
عِنّین و مَجبُوب وغیرہ	۳۹۰
جنون	۳۹۲
فصل چہارم: مسائل جزئیہ	۳۹۵
ارتدادِ احد الزوجین	۳۹۵
مفقود الخبر کے احکام	۳۹۶
مذہبِ مالکی	۳۹۸
حکم بصورتِ واپسی مفقود	۴۰۰
فصل پنجم: عدت کے احکام	۴۰۲
عدت ٹھیک شمار کرنے کا حکم	۴۰۲
مطلقہ عورت عدت کہاں گزارے	۴۰۲
دورانِ عدت رجوع کا حق	۴۰۳
حیض سے مایوس عورتوں کی عدت	۴۰۴
جن عورتوں کے حیض میں کسی طرح کی بے قاعدگی ہو	۴۰۴
جن عورتوں کو حیض نہ آتا ہو اُن کا اور حاملہ کا حکم	۴۰۶
ان احکام پر عمل کرنے کا ثمرہ	۴۰۸
شوہر کے وفات پانے کی صورت میں احکام	۴۰۸
دورانِ عدت بیوہ کے ساتھ نکاح کرنے کا وعدہ نہ کریں	۴۰۹
نان ونفقہ	۴۰۹
مطلقہ مبتوتہ کے لیے سکونت اور نفقہ	۴۰۹
اثبات کے حامیوں کے دلائل	۴۱۰
نفی کے حامیوں کے دلائل	۴۱۱
فاطمہ بنت قیس کی حدیث ناقابل قبول ہے	۴۱۲
حاملہ عورت کا نفقہ اور سکونت	۴۱۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
فصل ششم: حضانت	۴۱۵
زوجین کی علیحدگی کی صورت میں مدتِ رضاعت	۴۱۵
طلاق کی صورت میں بچے کی پرورش	۴۱۵
اسلام کا قانون معاشرت، ایک لاثانی قانون	۴۱۷
فصل ہفتم: عائلی قوانین کے کمیشن کا سوال نامہ اور اس کا جواب	۴۱۹
نکاح سے متعلق سوالات	۴۱۹
طلاق سے متعلق	۴۲۳
عورت کی طرف سے مطالبۂ طلاق	۴۲۴
اختلافِ مزاج کی وجہ سے فسخ نکاح	۴۲۵
عدالت سے طلاق لینے کی حیثیت	۴۲۵
تعدد ازواج	۴۲۶
مہر	۴۲۸
حضانت	۴۲۹
بیوی بچوں کا گزارا	۴۲۹
نفقہ	۴۲۹
مقدمہ عدالت میں آنے سے پہلے کا نفقہ	۴۳۱
تولیتِ املاک	۴۳۲
وراثت اور وصیت	۴۳۲
انفساخِ نکاح بذریعہ عدالت	۴۳۴
ازدواجی اور عائلی عدالت	۴۳۴
فصل ہشتم: اسلامی قانون ازدواج اور مزعومہ ترقی یافتہ قوانین کا تقابل	۴۳۷
اسلامی قانون میں اعتدال اور توازن	۴۳۷
الٰہی اور انسانی قانون کا فرق	۴۳۷
عیسائیت میں مسئلۂ طلاق	۴۳۸

عنوان	صفحہ
جدید قوانین ازدواج میں طلاق	۴۴۱
باب ششم	
اسلام کا معاشرتی انقلاب	
فصل اوّل: معاشرتی اصول	۴۴۹
عالم گیر معاشرے کے لیے سنہری اصول	۴۴۹
عالمی اصلاح کے لیے پوری نوع انسانی کو خطاب	۴۵۰
تین اہم اصولی حقیقتیں	۴۵۱
احادیث میں ان کی وضاحت	۴۵۲
زمین کے انتظام میں اصل چیز صلاح ہے	۴۵۴
مسلم معاشرے کے افراد کے مطلوبہ اوصاف	۴۵۴
اسلام	۴۵۵
ایمان	۴۵۵
اطاعت	۴۵۵
سچائی	۴۵۶
صبر	۴۵۶
خشوع	۴۵۶
انفاق	۴۵۶
روزے	۴۵۶
حیا	۴۵۶
ذکر	۴۵۷
اسلام کی اخلاقی اور تمدنی اصلاحات پر مخالفین کا طرزِ عمل	۴۵۸
فصل دوم: مجلسی آداب	۴۶۱
مجلس میں جگہ دینا	۴۶۱
دوسروں کا وقت ضائع نہ کرنے کی ہدایت	۴۶۲
تخلیہ میں گفتگو کرنے والے کے لیے صدقہ کی پابندی	۴۶۳
صدقے کی مقدار	۴۶۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
وجوبِ صدقہ کی منسوخی	۴۶۴
اجتماعی خورد ونوش کے آداب	۴۶۴
جن گھروں سے آدمی بلا اجازت کھا پی سکتا ہے؟	۴۶۴
معذور کے لیے بلا اجازت کھانے پینے کی اجازت	۴۶۴
بے تکلف دوستوں کے بارے میں حکم	۴۶۵
کھانا اکٹھے یا الگ الگ	۴۶۵
کسی کے ہاں کھانے کے آداب	۴۶۵
گھروں میں داخلے کے وقت سلام کا حکم	۴۶۶
سلام کا جواب	۴۶۶
ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنا	۴۶۷
ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا	۴۶۷
سلام مسلمانوں کے لیے شعار	۴۶۷
مصافحہ اور معانقہ	۴۶۷
بے جا سوالات کی ممانعت	۴۶۸
بے جا سوالات کرنے میں یہود کی روش	۴۶۹
یہودیوں کے روش سے بچنے کا حکم	۴۷۰
نجویٰ (خفیہ سرگوشی)	۴۷۰
منافقین کی خفیہ سرگوشیوں پر گرفت	۴۷۲
فصل سوم: لباس	۴۷۳
انسانیت کے لیے لباس کی ضرورت	۴۷۳
چند اہم حقیقتیں	۴۷۴
ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں اہلِ ایمان کے لیے	۴۷۵
عبادت کے وقت زینت لباس کا حکم	۴۷۵
لباس کا مسئلہ اجتماعی نقطہ نظر سے	۴۷۶
لباس کے مختلف اوضاع	۴۷۶

عنوان	صفحہ
مختلف اوضاع کے اسباب وعوامل	۴۷۶
دو بنیادی حقیقتیں	۴۷۷
غیر فطری تبدیلی کی صورت	۴۷۸
تغیر لباس کے حق میں دلائل	۴۷۹
تغیر لباس کے خلاف دلائل	۴۷۹
۱-تبدیلی کے عوامل فطری ہوتے ہیں	۴۷۹
۲-مصنوعی تبدیلی طرزِ معاشرت کو بگاڑتی ہے	۴۸۰
۳-اجتماعی زندگی کے ساتھ عدم مطابقت	۴۸۰
۴-وقت سے پہلے بلوغت	۴۸۰
۵-معیشت کا نقصان	۴۸۰
۶-قومی انفرادیت کی نفی	۴۸۰
۷-احساس کمتری کی نشانی	۴۸۱
۸-جعلی ترقی کا دھوکہ	۴۸۱
شرعی نقطہ نظر سے	۴۸۲
ستر	۴۸۲
فخر وغرور کی ممانعت	۴۸۳
غیر مسلموں کی مخصوص مذہبی علامتوں سے اجتناب	۴۸۳
مسلمانوں کے لباس کا امتیاز	۴۸۳
تشبّہ کا مسئلہ	۴۸۴
۱-صنفی تشبّہ	۴۸۴
۲-قومی تشبّہ	۴۸۵
۳-انفرادی تشبّہ	۴۸۵
۴-تشبّہ بالکفار	۴۸۵
ممانعت تشبّہ کی اصل وجہ	۴۸۶
لباس اور چہرے کی شرعی وضع	۴۸۹
ڈاڑھی کی شرعی حیثیت	۴۹۰
ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ	۴۹۱
کیا ڈاڑھی رکھنا صرف علما کے لیے ہے؟	۴۹۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

عنوان	صفحہ
سنت اور عادت کا اصولی فرق اور ڈاڑھی کا مسئلہ	۴۹۷
قزع اور تشبّہ بالکفار	۴۹۷
سر کے بالوں کا جواز و عدم جواز	۵۰۰
عورتوں کا بال کٹوانا	۵۰۱
عورتوں کے لیے زیور کا جواز	۵۰۱
فصل چہارم: حقوق العباد	۵۰۳
اللہ کی عبادت اور اس کے بندوں سے حسن سلوک	۵۰۳
حقوق العباد کے جائز حدود	۵۰۴
والدین سے حسن سلوک اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری	۵۰۴
ماں خدمت کی زیادہ حق دار ہے	۵۰۵
ناجائز کام پر والدین کو پٹائی کی دھمکی دینا جائز نہیں	۵۰۵
قادیانی باپ کے لیے دعائے مغفرت	۵۰۶
اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ کی سربراہِ خاندان کی ذمہ داری	۵۰۶
ذاتی کمائی میں رشتے داروں کے حقوق	۵۰۷
صلہ رحمی کا مفہوم اور اس کی اہمیت	۵۰۷
صلہ رحمی کی تلقین	۵۰۸
پس منظر	۵۰۸
عربی زبان میں لفظِ رحم کا استعمال	۵۰۸
مسلمانوں کے اپنے کافر رشتے داروں سے تعلقات	۵۰۹
لڑکیوں سے حسن سلوک	۵۱۰
بے رحمانہ طرزِ عمل کی وجوہات	۵۱۱
برکاتِ اسلام میں سے ایک بڑی برکت	۵۱۱
ہمسایوں کے حقوق	۵۱۲
یتامیٰ اور مساکین سے شفقت اور محبت کا سلوک	۵۱۳
یتامیٰ کے حقوق کا انتظامی اور قانونی تحفظ	۵۱۵
یتیم لڑکیوں کے حقوق کی اہمیت	۵۱۵
سرپرست کے لیے پرہیزگاری کی تلقین	۵۱۶
یتیموں کا مال ناحق طریقے سے کھانے کی ممانعت	۵۱۶
اموال یتامیٰ کو اپنے اموال کے ساتھ ملانے کی ممانعت	۵۱۷
یتیموں کا مال کس وقت ان کے سپرد کیا جائے	۵۱۷
نادان یتامیٰ کے اموال کا انتظامی مسئلہ	۵۱۷
یتیموں کے ساتھ سلوک کی صحیح نوعیت	۵۱۸
ملازمین کے حقوق	۵۱۸

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرضِ ناشر

کفر اور اسلام کی کش مکش ہر دور میں جاری رہی ہے۔ معرکۂ حق و باطل آج پوری دنیا میں برپا ہے۔ حق کی اپنی قوت تو بلاشبہ ناقابلِ شکست ہے مگر بدقسمتی سے اہلِ حق کمزور اور منتشر ہیں۔ دوسری جانب باطل قوتیں منظم بھی ہیں اور ہر قسم کے وسائل سے مالا مال بھی۔ عالمی تناظر میں آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ صیہونی، صلیبی اور برہمنی فوجیں عالمِ اسلام پر چڑھ دوڑی ہیں۔ پوری دنیا میں خونِ مسلم پانی سے بھی ارزاں ہو گیا ہے۔ عالمِ کفر کی کوشش یہ ہے کہ جس طرح مسلمان حکمرانوں نے شکست تسلیم کر لی ہے اور ان کی فوجیں اور وسائل غلبۂ کفر کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، اسی طرح فکری اور اعتقادی طور پر بھی مسلمان اپنی اصلیت کھو کر باطل کے رنگ میں رنگ جائیں۔ میڈیا کی یلغار سے طاغوت نے بلاشبہ امتِ مسلمہ کے افکار و عقاید اور اعمال و معاملات میں خاصی خطرناک دراڑیں پیدا کر دی ہیں مگر اس محاذ پر اسے حتمی کامیابی نہ ماضی میں ہوئی تھی نہ مستقبل میں ہو گی اور نہ آج ہی اس کا وقوع پذیر ہونا ممکن ہے۔ یہ فکری ہزیمت اس وجہ سے ممکن نہیں کہ قرآن و سنت اور ان سے اخذ کیے جانے والے علوم اپنے اندر اتنی قوت اور استدلال رکھتے ہیں کہ ان کے سامنے باطل نظریات کا چراغ نہیں جل سکتا۔ قرآن و سنت کو ہر دور میں اہلِ علم نے باطل نظریات کا پردہ چاک کرنے کے لیے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس کام کے کرنے والے انبیا کے وارث قرار پاتے ہیں۔

دورِ جدید میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے وراثت انبیا کا پوری طرح حق ادا کیا ہے۔ ان کی فکری و علمی راہ نمائی ہر مسلمان کے لیے بیش بہا نعمت ہے۔ مولانا کی تحریریں قرآن و سنت سے اخذ کردہ خالص، سچی اور سند سوچ کی عکاس ہیں۔ مولانا نے تفہیم القرآن کی صورت میں تفسیرِ قرآن کے میدان میں جو کارنامہ سرانجام دیا، وہ ان کی زندگی ہی میں اہلِ علم کی نظروں میں بہت وقیع اور معتبر ٹھہرا۔ تفہیم القرآن ہی کے انداز میں مولاناؒ حدیث اور فقہ پر بھی کام کرنا چاہتے تھے مگر مولانا کو ان منصوبوں پر اپنے قلمِ معجز بیان سے کام کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ ان کے قائم کردہ ادارے، ادارہ معارف اسلامی لاہور نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور الحمدللہ اس اہم اور مشکل میدان میں پیش رفت جاری ہے۔ تفہیم الاحادیث کے بعد تفہیم احکام القرآن پر کام شروع ہوا تو شائقین علم نے اسے بہت سراہا۔ مولانا عبدالوکیل علوی مدظلہ العالی نے احکام القرآن کے موضوع پر مولانا کی تفسیر اور دیگر کتب سے ان کی آرا کو جمع کر کے تفہیم احکام القرآن کے نام سے کئی جلدیں مرتب کردہ ہیں۔ پہلی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب یہ تیسری جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کی خدمت میں پہنچا چاہتی ہے۔ جلد اول ۴۸۲ صفحات پر مشتمل تھی اور جلد دوم سوا چھے سو صفحات پر محیط ہے، جب کہ زیرِ نظر جلد سوم تقریباً سوا پانچ سو صفحات میں مکمل ہوئی ہے۔

یہ تیسری جلد معاشرت کے موضوع پر ہے، جسے چھے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان ابواب کے موضوعات بالترتیب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی نظامِ معاشرت، قانونِ ازدواج، نکاح کے احکام، متفرق مباحث، احکامِ طلاق وخلع اور اسلام کا معاشرتی انقلاب ہیں۔ ہر باب کو حسبِ معمول فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں سات فصلیں، باب دوم میں تین، باب سوم میں پانچ، باب چہارم میں دس، باب پنجم میں آٹھ اور باب ششم میں چار فصلیں ہیں۔ کتاب کی ترتیب وتدوین میں تفہیم القرآن کے علاوہ مولانا کی جملہ کتب اور تحریروں سے اخذ واستنباط کیا گیا ہے۔ اس معرکہ آرا کتاب کے باقی حصے بھی مرتب ہو چکے ہیں اور ان کی نوک پلک درست کرنے کا کام جاری ہے۔

ادارہ معارفِ اسلامی کو وسائل کی قلت کا سامنا ہے مگر علمی کام اور مسودات اتنی بڑی تعداد میں تیار ہو چکے ہیں کہ ان کی طباعت کے لیے ایک خطیر رقم درکار ہے۔ ادارے کا عزم ہے کہ ان شاء اللہ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اللہ کی نصرت اور توکل کے سہارے ہم ان تمام وقیع مسودوں کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل کریں گے۔ آج کے دور میں جہاد میں شرکت کا یہ سب سے اہم میدان ہے۔ مولانا مودودیؒ کے ملفوظات، اسلام کی تعلیمات اور اس کے نظامِ شریعت کی تفہیم کے لیے ہر عام وخاص کو راہ نمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کا انداز علمی ہے مگر دقیق مضامین کو بھی وہ اردوئے مبین میں اس طرح پیش فرماتے ہیں کہ ایک کم تعلیم یافتہ اور عامی مسلمان بھی ان سے استفادہ کرنے میں دقت محسوس نہ کرے۔ احکام القرآن عام مسلمان کے لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں اور ملکوں کا نظام چلانے والے افراد اور اداروں کے لیے بھی راہ نما ہیں۔ احکام القرآن کو مرتب کرنا بڑا مشکل اور نازک کام ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عظیم کام اللہ کی خصوصی رحمت ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ پایا ہے۔ ادارہ معارف اسلامی نے اس ضمن میں اللہ کی توفیق اور اپنے رفقائے علمی کی کاوش ومحنت سے اب تک جو کام کیے ہیں، الحمدللہ انھیں خاصی پذیرائی بھی ملی ہے۔

اس کام کی تکمیل کے لیے مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی شبانہ روز محنتیں قابلِ امتنان ہیں۔ اللہ ان کی سعیِ مبارک کو شرفِ قبولیت بخشے۔ مولاناؒ کے ساتھ ادارے کے دیگر رفقا نے بھی بہت محنت کی ہے جبکہ کمپوزنگ اور طباعت کے شعبوں کے ذمہ داران نے بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پرخلوص کاوش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام احباب کو اس قیمتی دستاویز کے تیار کرنے اور طباعت کے قابل بنانے کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ ہمیں امید ہے کہ اہلِ علم ہمارے اس کام کو ان شاء اللہ مفید پائیں گے۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، منصورہ

مورخہ ۲۳ رصفر ۱۴۳۰ھ

بمطابق ۱۹ رفروری ۲۰۰۹ء

...........OOO...........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

اِسلامی نظامِ معاشرت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ (النساء: ۴:۱) لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت دُنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ وقرابت کے تعلّقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

چوں کہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حقوق بیان کرنے ہیں اور خصوصیّت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں، اس لیے تمہید اس طرح اُٹھائی گئی کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی اور دوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۱۹، النسآء، حاشیہ ۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

اجمالی خاکہ[۱]

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگِ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ خدا نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا تھا۔ پھر اسی جوڑے سے وہ سارے لوگ پیدا ہوئے جو دنیا میں آباد ہیں۔ ابتدا میں ایک مدت تک اس جوڑے کی اولاد ایک ہی امت بنی رہی۔ ایک ہی اس کا دین تھا۔ ایک ہی اس کی زبان تھی۔ کوئی اختلاف اس کے درمیان نہ تھا، مگر جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی، وہ زمین پر پھیلتے چلے گئے اور اس پھیلاؤ کی وجہ سے قدرتی طور پر مختلف نسلوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کی زبانیں الگ ہو گئیں۔ ان کے لباس الگ ہو گئے۔ رہن سہن کے طریقے الگ ہو گئے اور جگہ جگہ کی آب و ہوا نے ان کے رنگ روپ اور خدوخال تک بدل دیے۔ یہ سب اختلافات فطری اختلافات ہیں۔ واقعات کی دنیا میں موجود ہیں۔ اس لیے اسلام ان کو بطورِ ایک واقعے کے تسلیم کرتا ہے۔ وہ ان کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ ان کا یہ فائدہ مانتا ہے کہ انسان کا باہمی تعارف اور تعاون اسی صورت سے ممکن ہے۔ لیکن ان اختلافات کی بنا پر انسانوں میں نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کے جو تعصبات پیدا ہو گئے ہیں ان سب کو اسلام غلط قرار دیتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان اُونچ نیچ، شریف اور کمین، اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بنیاد پر کر لیے گئے ہیں اسلام کے نزدیک یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو۔ لہٰذا ایک دوسرے کے بھائی ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔

انسانیت کا یہ تصوّر اختیار کرنے کے بعد اسلام کہتا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان اصل فرق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ نسل، رنگ، وطن اور زبان کا نہیں، بلکہ خیالات، اخلاق، اور اُصولوں کا ہو سکتا ہے۔ ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے لحاظ سے چاہے ایک ہوں، لیکن اگر ان کے خیالات اور اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو زندگی میں دونوں کی راہیں الگ ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس مشرق اور مغرب کے انتہائی فاصلے پر رہنے والے دو انسان اگرچہ ظاہر میں کتنے ہی ایک دوسرے سے دور ہوں، لیکن اگر ان کے خیالات متفق ہیں اور اخلاق ملتے جلتے ہیں تو ان کی زندگی کا راستہ ایک ہو گا۔ اس نظریے کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری، اخلاقی اور اُصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے، جس میں انسان اور

۱۔ یہ دراصل ایک تقریر ہے جو اسلام کا معاشرتی نظام کے موضوع پر ۱۰ر فروری ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انسان کے ملنے کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں، بلکہ ایک عقیدہ اور ایک اخلاقی ضابطہ ہے۔ ہر وہ شخص جو ایک خدا کو اپنا مالک و معبود مانے اور پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کو اپنا قانونِ زندگی تسلیم کرے، اس معاشرے میں شامل ہوسکتا ہے، خواہ وہ افریقہ کا رہنے والا ہو یا امریکہ کا، خواہ وہ سامی نسل کا ہو یا آریہ نسل کا، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ ہندی بولتا ہو یا عربی۔ جو انسان بھی اس معاشرے میں شامل ہوں گے ان سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے۔ کسی قسم کے نسلی، قومی یا طبقاتی امتیازات ان کے درمیان نہ ہوں گے۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہ ہوگا۔ کوئی چھوت چھات ان میں نہ ہوگی۔ کسی کا ہاتھ لگنے سے کوئی ناپاک نہ ہوگا۔ شادی بیاہ اور کھانے پینے مجلسی میل جول میں ان کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹیں نہ ہوں گی۔ کوئی اپنی پیدائش یا اپنے پیشے کے لحاظ سے ذلیل یا کمین نہ ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات برادری یا حسب نسب کی بنا پر کوئی مخصوص حقوق حاصل نہ ہوسکیں گے۔ آدمی کی بزرگی اس کے خاندان یا اس کے مال کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ صرف اس وجہ سے ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے۔

یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو نسل و رنگ اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی ایک عالم گیر برادری قائم ہوسکتی ہے۔ نسلی اور وطنی معاشروں میں تو صرف وہ لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو کسی نسل یا وطن میں پیدا ہوئے ہوں، اس سے باہر کے لوگوں پر ہر ایسے معاشرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ مگر اس فکری اور اُصولی معاشرے میں ہر وہ شخص برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہوسکتا ہے جو ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرے۔ رہے وہ لوگ جو اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں تو یہ معاشرہ انھیں اپنے دائرے میں تو نہیں لیتا، مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انھیں دینے کے لیے تیار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ماں کے دو بچے اگر خیالات میں مختلف ہیں تو ان کے طریقِ زندگی بہرحال مختلف ہوں گے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح نسلِ انسانی کے دو گروہ یا ایک ملک میں رہنے والے لوگوں کے دو گروہ بھی اگر عقیدے اور اُصول میں اختلافات رکھتے ہیں تو ان کے معاشرے یقیناً الگ ہوں گے، مگر انسانیت بہرحال ان میں مشترک رہے گی۔ اس مشترک انسانیت کی بنا پر زیادہ سے زیادہ جن حقوق کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ سب اسلامی معاشرے نے غیر اسلامی معاشروں کے لیے تسلیم کیے ہیں۔

اسلامی نظامِ معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد آیئے اب ہم دیکھیں کہ وہ کیا اُصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے انسانی میل ملاپ کی مختلف صورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

انسانی معاشرت کا اوّلین اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنا ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے پڑتی ہے۔ اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ پھر اس سے رشتے اور کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی چیز پھیلتے پھیلتے ایک وسیع معاشرے تک جا پہنچتی ہے۔ پھر خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت، ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ادارہ تمدنِ انسانی کے بقا اور نشو ونما کے لیے صرف رنگروٹ ہی بھرتی نہیں کرتا، بلکہ اس کے کارکن دل سے اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کی جگہ لینے والے خود ان سے بہتر ہوں۔ اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے اور اس جڑ کی صحت و طاقت پر خود تمدن کی صحت و طاقت کا مدار ہے۔ اسی لیے اسلام معاشرتی مسائل میں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو صحیح ترین بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح صورت صرف وہ ہے جس کے ساتھ معاشرتی ذمے داریاں قبول کی گئی ہوں اور جس کے نتیجے میں ایک خاندان کی بنا پڑے۔ آزادانہ اور غیر ذمہ دارانہ تعلق کو وہ محض ایک معصوم سی تفریح یا ایک معمولی سی بے راہ روی سمجھ کر ٹال نہیں دیتا، بلکہ اس کی نگاہ میں یہ انسانی تمدن کی جڑ کاٹ دینے والا فعل ہے۔ اس لیے ایسے تعلق کو وہ حرام اور قانونی جرم قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے تمدن کش تعلقات رائج نہ ہونے پائیں، اور معاشرت کو ان اسباب سے پاک کر دینا چاہتا ہے جو اس غیر ذمہ دارانہ تعلق کے لیے محرک ہوتے ہوں یا اس کے مواقع پیدا کرتے ہوں۔ پردے کے احکام، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور تصاویر پر پابندیاں اور فواحش کی اشاعت کے خلاف رکاوٹیں سب اسی کی روک تھام کے لیے ہیں۔ اور ان کا مرکزی مقصد خاندان کے ادارے کو محفوظ اور مضبوط کرنا ہے۔ دوسری طرف ذمے دارانہ تعلق یعنی نکاح کو اسلام محض جائز ہی نہیں بلکہ اسے ایک نیکی، ایک کارِ ثواب، ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ سنِ بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ ہر نوجوان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ تمدن کی جن ذمے داریوں کا بار اس کے ماں باپ نے اٹھایا تھا اپنی باری آنے پر وہ بھی انھیں اٹھائے۔ اسلام رہبانیت کو نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فطرت اللہ کے خلاف ایک بدعت ٹھیراتا ہے۔ وہ ان تمام رسموں اور رواجوں کو بھی سخت ناپسند کرتا ہے جن کی وجہ سے نکاح ایک مشکل اور بھاری کام بن جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں نکاح کو آسان ترین اور زنا کو مشکل ترین فعل ہونا چاہیے، نہ یہ کہ نکاح مشکل اور زنا آسان ہو۔ اسی لیے اس نے چند مخصوص رشتوں کو حرام ٹھیرانے کے بعد تمام دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں ازدواجی تعلق کو جائز کر دیا ہے۔ ذات اور برادری کی تفریقیں اڑا کر تمام مسلمانوں میں آپس کے شادی بیاہ کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ مہر اور جہیز اس قدر ہلکے رکھنے کا حکم دیا ہے جنھیں فریقین بآسانی برداشت کر سکیں اور رسمِ نکاح ادا کرنے کے لیے کسی قاضی، پنڈت، پردہت یا دفتر رجسٹر کی کوئی ضرورت نہیں رکھی۔ اسلامی معاشرے کا نکاح ایک ایسی سادہ سی رسم ہے جو ہر کہیں دو گواہوں کے سامنے بالغ زوجین کے ایجاب و قبول سے انجام پا سکتی ہے مگر لازم ہے کہ یہ ایجاب و قبول خفیہ نہ ہو بلکہ بستی میں اعلان کے ساتھ ہو۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں ضبط قائم رکھے۔ بیوی کو شوہر کی اور اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی اطاعت و خدمت کا حکم دیا ہے۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے نظامِ خاندانی کو اسلام پسند نہیں کرتا جس میں کوئی انضباط نہ ہو اور گھر والوں کے اخلاق و معاملات درست رکھنے کا کوئی بھی ذمے دار نہ ہو۔ نظم بہرحال ایک ذمے دار ناظم ہی سے قائم ہو سکتا ہے اور اسلام کے نزدیک اس ذمے داری کے لیے خاندان کا باپ ہی فطرۃً موزوں ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

کہ مرد کو گھر کا ایک جابر و قاہر فرماں روا بنا دیا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت و رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لیے استعمال کرے نہ کہ زیادتی کے لیے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حق دیتا ہے اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیارات عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہو۔

خاندان کے محدود دائرے سے باہر قریب ترین سرحد رشتہ داری کی ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے یا بھائی اور بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غمگسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں صلۂ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔ وہ شخص اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے جو اپنے رشتہ داروں سے سرد مہری اور طوطا چشمی کا معاملہ کرے، مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ رشتہ داروں کی بے جا طرف داری کوئی اسلامی کام ہے۔ اپنے کنبے قبیلے کی ایسی حمایت جو حق کے خلاف ہو، اسلام کے نزدیک جاہلیت ہے۔ اسی طرح اگر حکومت کا کوئی افسر پبلک کے خرچ پر اقربا پروری کرنے لگے یا اپنے فیصلوں میں اپنے عزیزوں کے ساتھ بے جا رعایت کرنے لگے تو یہ بھی کوئی اسلامی کام نہیں ہے، بلکہ ایک شیطانی حرکت ہے۔ اسلام جس صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے وہ اپنی ذات سے ہونی چاہیے اور حق و انصاف کی حد کے اندر ہونی چاہیے۔

رشتہ داری کے تعلق کے بعد دوسرا قریب ترین تعلق ہمسائگی کا ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ، تیسرا وہ عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رُو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''مجھے ہمسائے کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی ہے کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا''۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو''[1]۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ: ''وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے''[2]۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ ''ایک عورت بہت نمازیں پڑھتی ہے، اکثر روزے رکھتی ہے، خوب خیرات کرتی ہے مگر اس کی بدزبانی سے اس کے پڑوسی عاجز ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ''وہ دوزخی ہے''۔ لوگوں نے عرض کیا کہ: ''ایک دوسری عورت ہے جس میں یہ خوبیاں تو نہیں ہیں مگر وہ پڑوسیوں کو تکلیف بھی نہیں دیتی''۔ فرمایا: ''وہ جنتی ہے''[3]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۶ ص ۱۷۲-۲۷۴
۲- ایضاً، ج ۶ ص ۱۷۳۔ اور ج ۷ ص ۳۹۳
۳- ایضاً، ج ۷، ص ۳۹۳۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو یہاں تک تاکید فرمائی تھی کہ اپنے بچوں کے لیے اگر پھل لاؤ تو یا تو ہمسائے کے گھر میں بھیجو ورنہ چھلکے باہر نہ پھینکو تاکہ غریب ہمسائے کا دل نہ دکھے[1]۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ: ''اگر تیرے ہمسائے تجھے اچھا سمجھتے ہیں تو واقعی تو اچھا ہے اور اگر ہمسائے کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو تو ایک بُرا آدمی ہے''[2] مختصر یہ کہ اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں، آپس میں ہمدرد، مددگار اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسا کریں اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان، مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ رہی وہ معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی برسوں ایک دوسرے سے ناآشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں تو ایسی معاشرت ہرگز اسلامی معاشرت نہیں ہو سکتی۔

ان قریبی رابطوں کے بعد تعلقات کا وہ وسیع دائرہ سامنے آتا ہے جو پورے معاشرے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دائرے میں اسلام ہماری اجتماعی زندگی کو جن بڑے بڑے اُصولوں پر قائم کرتا ہے وہ مختصراً یہ ہیں:

۱- نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور بدی و زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ (المائدہ:۵:۲)

۲- تمھاری دوستی اور دشمنی خدا کی خاطر ہونی چاہیے۔ جو کچھ دو اس لیے دو کہ خدا اس کو دینا پسند کرتا ہے اور جو کچھ روکو اس لیے روکو کہ خدا کو اس کا دینا پسند نہیں ہے۔ (ابوداؤد)

۳- تم وہ بہترین امت ہو جسے دنیا والوں کی بھلائی کے لیے اُٹھایا گیا ہے۔ تمھارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے۔ (آل عمران: ۳:۱۱۰)

۴- آپس میں بدگمانی نہ کرو۔ ایک دوسرے کے معاملات کا تجسس نہ کرو، ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اُکساؤ۔ آپس کے حسد اور بغض سے بچو۔ ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو۔ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو۔ (بخاری و مسلم)

۵- کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو۔ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

۶- غیر حق میں اپنی قوم کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمھارا اُونٹ کنویں میں گرنے لگا تو تم بھی اس کی دُم پکڑ کر اس کے ساتھ ہی جا گرے۔ (ابوداؤد، بیہقی)

۷- دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ (بخاری و مسلم[3])

(اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۴۴۰-۴۴۹)

اِسلام کی معاشرتی اصلاحات

[سورۂ احزاب میں] معاشرتی اصلاح کے متعلق حسب ذیل ہدایات دی گئیں:

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۹۳ ۲- ایضاً، ج ۷، ص ۳۹۴

۳- درج بالا تمام احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۶، ص ۳۶۵-۳۶۷، ۳۷۲-۳۷۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱- ازواجِ مطہرات کو حکم دیا گیا کہ ''اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو، بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ نکلو اور غیر مَردوں سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہو تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ کوئی شخص بے جا توقعات قائم کر لے''۔(۳۳:۳۲-۳۳)

۲- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مَردوں کے بلا اجازت داخل ہو جانے کو روک دیا گیا، اور ہدایت کی گئی کہ ''ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو''۔(۳۳:۵۳)

۳- غیر محرم مَردوں اور محرم رشتہ داروں کے درمیان فرق قائم کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ''ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے صرف مَحرم رشتہ دار ہی آزادی کے ساتھ آپ کے گھروں میں آ جا سکتے ہیں''۔(۳۳:۵۵)

۴- مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ''نبی کی بیویاں تمھاری مائیں ہیں اور ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان کے لیے ابداً حرام ہیں جس طرح اس کی حقیقی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں ہر مسلمان اپنی نیت کو بالکل پاک رکھے''۔(۳۳:۵۳-۵۴)

۵- مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ ''نبی کو اذیت دینا دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت اور رسوا کن عذاب کا موجب ہے اور اسی طرح کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا اور اس پر ناحق الزام لگانا بھی سخت گناہ ہے''۔(۳۳:۵۷-۵۸)

۶- تمام مسلمان عورتوں کو حکم دے دیا گیا کہ ''جب باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو چادروں سے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلا کریں''۔(۳۳:۵۹)

پھر جب واقعۂ افک سے مدینے کے معاشرے میں ایک ہلچل برپا ہوئی تو یہ سورۂ نور، اخلاق، معاشرت اور قانون کے ایسے احکام و ہدایات کے ساتھ نازل فرمائی گئی جن کا مقصد یہ تھا کہ اوّل تو مسلم معاشرے کو بُرائیوں کی پیداوار اور ان کے پھیلاؤ سے محفوظ رکھا جائے اور اگر وہ پیدا ہو ہی جائیں تو پھر ان کا پورا پورا تدارک کیا جائے۔ ان احکام و ہدایات کو ہم اسی ترتیب کے ساتھ یہاں خلاصۃً درج کرتے ہیں جس کے ساتھ وہ اس سورت میں نازل ہوئے ہیں تاکہ پڑھنے والے اندازہ کر سکیں کہ قرآن ٹھیک نفسیاتی موقع پر انسانی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے کس طرح قانونی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر بیک وقت تجویز کرتا ہے:

۱- زنا جسے معاشرتی جرم پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا [سورۂ نساء ۴:۱۵-۱۶] اب اس کو فوجداری جرم قرار دے کر اس کی سزا سو (۱۰۰) کوڑے مقرر کر دی گئی۔

۲- بدکار مَردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا اور ان کے ساتھ رشتۂ مناکحت جوڑنے سے اہل ایمان کو منع کر دیا گیا۔

۳- جو شخص دوسرے پر زنا کا الزام لگائے اور پھر ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے، اس کے لیے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

۴- شوہر اگر بیوی پر تہمت لگائے تو اس کے لیے لعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

۵- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقین کے جھوٹے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے ہر شریف آدمی کے خلاف ہر قسم کی تہمتیں قبول نہ کر لیا کرو، اور نہ ان کو پھیلاتے پھرو۔ اس طرح کی افواہیں اگر اُڑ رہی ہوں تو انھیں دبانا اور ان کا سدِّ باب کرنا چاہیے، نہ یہ کہ ایک منہ سے لے کر دوسرا منہ اسے آگے پھونکنا شروع کر دے۔ اس سلسلے میں یہ بات ایک اُصولی حقیقت کے طور پر سمجھائی گئی کہ طیب آدمی کا جوڑ طیب عورت ہی سے لگ سکتا ہے۔ خبیث عورت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اطوار سے اس کا مزاج چند روز بھی موافقت نہیں کر سکتا اور ایسا ہی حال طیب عورت کا بھی ہوتا ہے کہ اس کی روح طیب مرد ہی سے موافقت کر سکتی ہے نہ کہ خبیث سے۔ اب اگر رسول ﷺ کو تم جانتے ہو کہ وہ ایک طیب، بلکہ اطیب انسان ہیں تو کس طرح یہ بات تمھاری عقل میں سما گئی کہ ایک خبیث عورت ان کی محبوب ترین رفیقۂ حیات بن سکتی تھی۔ جو عورت عملاً زنا تک کر گزرے اس کے عام اطوار کب ایسے ہو سکتے ہیں کہ رسول ﷺ جیسا پاکیزہ انسان اس کے ساتھ یوں نباہ کرے۔ پس صرف یہ بات کہ ایک کمینے آدمی نے ایک بے ہودہ الزام کسی پر لگا دیا ہے۔ اسے قابلِ قبول کیا معنی قابلِ توجہ اور ممکن الوقوع سمجھ لینے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ الزام لگانے والا کون ہے اور الزام کس پر رہا ہے۔

۶- جو لوگ بیہودہ خبریں اور بری افواہیں پھیلائیں اور مسلم معاشرے میں فحش اور فواحش کو رواج دینے کی کوشش کریں، ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ہمت افزائی کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہیں۔

۷- یہ قاعدۂ کلیہ مقرر کیا گیا کہ مسلم معاشرے میں اجتماعی تعلقات کی بنیاد باہمی حسنِ ظن پر ہونی چاہیے۔ ہر شخص بے گناہ سمجھا جائے جب تک کہ اس کے گناہ گار ہونے کا ثبوت نہ ملے۔ نہ یہ کہ ہر شخص گناہ گار سمجھا جائے جب تک کہ اس کا بے گناہ ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

۸- لوگوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف نہ گھس جایا کریں، بلکہ اجازت لے کر جائیں۔

۹- عورتوں اور مردوں کو غضِ بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھورنے یا جھانک تاک کرنے سے منع کر دیا گیا۔

۱۰- عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔

۱۱- عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے محرم رشتہ داروں اور گھر کے خادموں کے سوا کسی کی سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔

۱۲- ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چھپا کر نکلیں، بلکہ بجنے والے زیور بھی پہن کر نہ نکلیں۔

۱۳- معاشرے میں عورتوں اور مردوں کو بن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں، حتیٰ کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی بن بیاہا نہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے کہ تجرد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مجرد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

۱۴- لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے مکاتبت کی راہ نکال دی گئی اور مالکوں کے علاوہ دوسروں کو بھی حکم دیا گیا کہ مکاتب غلاموں اور لونڈیوں کی مالی مدد کریں۔

۱۵- لونڈیوں سے کسب کرانا ممنوع قرار دیا گیا۔ عرب میں یہ پیشہ لونڈیوں ہی سے کرانے کا رواج تھا۔ اس لیے اس کی ممانعت دراصل قحبہ گری کی قانونی بندش تھی۔

۱۶- گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خلوت کے اوقات میں (یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت) گھر کے کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آنے کی عادت ڈالی جائے۔

۱۷۔ بوڑھی عورتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھنی اتار کر رکھ دیں تو مضائقہ نہیں، مگر حکم دیا گیا کہ تبرّج (بن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے) سے بچیں۔ نیز انھیں نصیحت کی گئی کہ بڑھاپے میں بھی اگر وہ اوڑھنیاں اپنے اوپر ڈالے رہیں تو بہتر ہے۔

۱۸- اندھے، لنگڑے، لولے اور بیمار کو یہ رعایت دی گئی کہ وہ کھانے کی کوئی چیز کسی کے ہاں سے بلا اجازت کھا لے تو اس کا شمار چوری اور خیانت میں نہ ہوگا۔ اس پر کوئی گرفت نہ کی جائے۔

۱۹- قریبی عزیزوں اور بے تکلف دوستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاں بلا اجازت بھی کھا سکتے ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے گھر میں کھا سکتے ہیں۔ اس طرح معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا گیا اور ان کے درمیان سے بیگانگی کے پردے ہٹا دیے گئے تاکہ آپس کی محبت بڑھے اور باہمی اخلاص کے رابطے، ان رخنوں کو بند کر دیں جس سے کوئی فتنہ پرداز پھوٹ ڈال سکتا ہو۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۱۵-۳۱۷، سورۃ النور موضوع اور مباحث)

...........OOO...........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

اساسی نظریات

یہ بات اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے قانون کی حکمت پر بھی خود ہی روشنی ڈالتا ہے۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے جو قانون اسلام میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق خود اسلام ہی نے ہم کو بتا دیا ہے کہ اس قانون کی بنیاد کن اصولِ حکمت اور کن حقائق فطرت پر ہے۔

زوجیت کا اساسی مفہوم

اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت، جس کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یہ ہے: وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ [الذاریات ۵۱:۴۹] اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

اس آیت میں قانونِ زوجی (law-sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کارگاہِ عالم کا انجینئر خود اپنی انجینئری کا یہ راز کھول رہا ہے کہ اس نے کائنات کی یہ ساری مشین قاعدۂ زوجیت پر بنائی ہے۔ یعنی اس مشین کے تمام پرزے جوڑوں (pairs) کی شکل میں بنائے گئے ہیں اور اس جہانِ خلق میں جتنی کاریگری تم دیکھتے ہو وہ سب انھی جوڑوں کی تزویج کا کرشمہ ہے۔

اب اس پر غور کیجیے کہ زوجیت کیا شے ہے۔ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ ایک شے میں فعل ہو اور دوسری شے میں قبول وانفعال۔ ایک شے میں تاثیر ہو اور دوسری میں تأثر۔ ایک شے میں عاقدیت ہو اور دوسری شے میں منعقدیت۔ یہی عقد وانعقاد اور فعل و انفعال اور تاثیر وتأثر اور فاعلیت وقابلیت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں اور انھی ترکیبات سے عالمِ خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب اپنے اپنے طبقے میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ پیدا ہوئی ہیں اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی اور اساسی حیثیت سے زوجیت کا یہی تعلق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل ہے اور دوسرا قابل ومنفعل۔ اگرچہ مخلوقات کے ہر طبقے میں اس تعلق کی کیفیت مختلف ہوتی ہے، مثلاً ایک تزویج وہ ہے جو بسائط اور عناصر میں ہوتی ہے، ایک وہ جو مرکبات غیر نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو اجسامِ نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو انواعِ حیوانی میں ہوتی ہے۔ یہ سب تزویجیں اپنی نوعیت اور کیفیت اور فطری مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن اصلِ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زوجیت ان سب میں وہی ایک ہے۔ ہر نوع میں خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو، فطرت کے اصل مقصد، یعنی وقوعِ ترکیب اور حصولِ ہیئت ترکیبی کے لیے ناگزیر یہ ہے کہ زوجین میں سے ایک میں قوتِ فعل ہو دوسرے میں قوتِ انفعال۔ آیتِ مذکورہ بالا کا یہ مفہوم متعین ہو جانے کے بعد اس سے قانونِ زوجیت کے تین ابتدائی اُصول مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جس فارمولے پر تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور جس طریقے کو اپنے کارخانے کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے۔ کارخانے کے مخالف اس کو گندہ اور قابلِ نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں، مگر خود کارخانے کا صانع اور مالک تو یہ کبھی نہ چاہے گا کہ اس کا کارخانہ بند ہو جائے۔ اس کا منشا تو یہی ہے کہ اس مشین کے تمام پرزے چلتے رہیں اور اپنے اپنے حصے کا کام پورا کریں۔

۲۔ فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل دونوں کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیتِ فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیت انفعالی میں کوئی ذلّت۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں قوتِ فعل اور کیفیاتِ فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی ادا کر سکے۔ اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیاتِ انفعالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت باحسن وجوہ بجا لا سکے۔ ایک معمولی مشین کے پُرزے کو بھی اگر کوئی شخص اس کے اصلی مقام سے ہٹا دے اور اس سے وہ کام لینا چاہے جس کے لیے وہ دراصل بنایا ہی نہیں گیا ہے، تو وہ احمق اور اناڑی سمجھا جائے گا۔ اوّل تو اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہی نہ ہوگی اور اگر وہ بہت زور لگائے گا تو بس اتنا کر سکے گا کہ مشین کو توڑ دے۔ ایسا ہی حال اس کائنات کی عظیم الشان مشین کا بھی ہے۔ جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوجِ فاعل کو زوجِ منفعل کی جگہ یا زوجِ منفعل کو زوجِ فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کر سکتے ہیں اور اس کی کوشش کر کے اور اس میں کامیابی کی اُمید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ مگر اس مشین کا صانع تو ہرگز ایسا نہ کرے گا۔ وہ تو فاعل پُرزے کو فعل ہی کی جگہ رکھے گا اور اسی حیثیت سے اس کی تربیت کرے گا۔ اور منفعل پُرزے کو انفعال ہی کی جگہ رکھے گا اور اس میں انفعالی استعداد ہی پرورش کرنے کا انتظام کرے گا۔

۳۔ فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر بہرحال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزت ہو اور انفعال اس کے مقابلے میں ذلیل ہو۔ بلکہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شے کسی دوسری شے پر فعل کرتی ہے وہ اس وجہ سے تو کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے۔ اس کے مقابلے میں طاقتور ہے، اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو شے اس کے فعل کو قبول کرتی ہے اور اس سے منفعل ہوتی ہے اس کے قبول و انفعال کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ مغلوب ہے۔ اس کے مقابلے میں کمزور ہے اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔ جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبولِ اثر کی استعداد۔ کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہو گا۔ اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہو جائے۔ غرض دنیا میں جتنے افعال واقع ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہو سکتا اگر ایک فاعل کے مقابلے میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ پس زوجین میں سے زوجِ فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جس کو مردانگی اور رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجا لانے کے لیے یہ صفت ناگزیر ہے۔ اس کے برعکس زوجِ منفعل کی فطرت انفعالیہ [illegible] جس کو نسائیت کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ زوجیت سے انفعالی پرزے کی خدمت بجا لانے کے لیے یہی صفت ناگزیر ہے۔ جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا تمغہ سمجھ کر منفعل کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں یا پھر سرے سے اس فضیلت کا انکار کر کے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو فاعل میں ہونی چاہئیں۔ لیکن جس انجینئر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے وہ ان کو مشین میں اس طرح نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں اور اہمیت و عنایت میں دونوں برابر، مگر فعل و انفعال کی طبیعت جس غالبیت و مغلوبیت کی مقتضی ہے وہی ان میں پیدا ہو تا کہ وہ تخلیق کے منشا کو پورا کر سکیں، نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے۔

یہ وہ اُصول ہیں جو زوجیت کے ابتدائی مفہوم ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ محض ایک مادّی وجود ہونے کی حیثیت سے عورت اور مرد کا زوج زوج ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ ان کے تعلقات میں یہ اُصول مرعی رکھے جائیں۔ چنانچہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو گا کہ فاطر السمٰوٰت والارض نے جو قانونِ معاشرت بنایا ہے اس میں ان تینوں کی پوری رعایت کی گئی ہے۔

انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے مقتضیات

اب ایک قدم آگے بڑھیے، عورت اور مرد کا وجود محض ایک مادّی وجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حیوانی وجود بھی ہے۔ اس حیثیت سے ان کا زوج ہونا کس چیز کا مقتضی ہے؟ قرآن کہتا ہے:

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ (الشوریٰ ۴۲:۱۱) اللہ نے تمھارے لیے خود تمھیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے۔ اس طریقے سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (البقرۃ ۲:۲۲۳) تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔

پہلی آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے جوڑے بنانے کا ایک ساتھ ذِکر کیا گیا ہے اور اس کا مشترک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے زوجی تعلق سے تناسُل کا سلسلہ جاری ہو۔

دوسری آیت میں انسان کو عام حیوانات سے الگ کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انواعِ حیوانات میں سے اس خاص نوع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے زوجین میں کھیتی اور کسان کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک حیاتیاتی حقیقت (biological fect) ہے۔ حیاتیات کے نقطۂ نظر سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے۔

ان دونوں آیتوں سے تین مزید اُصول حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے۔ خدا نے نوعِ انسان کو اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں اور بس ختم ہو جائیں۔ بلکہ اس کا ارادہ ایک اجلِ معیّن تک اس نوع کو باقی رکھنے کا ہے اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اس لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں۔ پس جو قانون خدا کی طرف سے ہو گا وہ کبھی صنفی میلان کو کچلنے اور فنا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم دینے والا نہیں ہو سکتا، بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجایش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کر سکے۔

۲۔ عورت اور مرد کو کھیتی اور کسان سے تشبیہ دے کر بتایا گیا ہے کہ انسانی زوجین کا تعلق دوسرے حیوانات کے زوجین سے مختلف ہے۔ انسانی حیثیت سے قطع نظر، حیوانی اعتبار سے بھی ان دونوں کی ترکیبِ جسمانی اس طور پر رکھی گئی ہے کہ ان کے تعلق میں وہ پائیداری ہونی چاہیے جو کسان اور اس کے کھیت میں ہوتی ہے۔ جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض بیج پھینک دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کو پانی دے، کھاد مہیا کرے اور اس کی حفاظت کرتا رہے، اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور ایک خودرو درخت اُگا دے، بلکہ جب وہ بارور ہوتی ہے تو درحقیقت اس کی محتاج ہوتی ہے کہ اس کا کسان اس کی پرورش اور اس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے۔

۳۔ انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتیاتی حیثیت سے (biologically) اسی نوعیّت کی ہے جو دوسری انواعِ حیوانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک صنف کا ہر فرد صنفِ مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے اور تناسل کا زبردست داعیہ، جو ان کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے ان تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔ پس فاطرِ کائنات کا بنایا ہوا قانون انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پروا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس میں صنفی انتشار (se›ual anarchy) کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہو جائے تو انسان کو پورا حیوان، بلکہ حیوانات سے بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

(التین ۹۵: ۴۔۶) ہم نے انسان کو بہت ہی اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ پھر (رفتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فطرتِ انسانی اور اس کے مقتضیات

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، طبیعتِ حیوانیہ، خلقتِ انسانی کی تہ میں زمین اور بنیاد کے طور پر ہے اور اسی زمین پر انسانیت کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ انسان کے انفرادی وجود اور اس کی نوعی ہستی، دونوں کو باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک کی خواہش اور ہر ایک کے حصول کی استعداد اللہ تعالیٰ نے اس کی حیوانی سرشت میں رکھ دی ہے اور فطرتِ الٰہی کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان خواہشات میں سے کسی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا جائے یا ان استعدادات میں سے کسی استعداد کو فنا کر دیا جائے، کیوں کہ یہ سب چیزیں بھی بہرحال ضروری ہیں اور ان کے بغیر انسان اور اس کی نوع زندہ نہیں رہ سکتی۔ البتہ فطرتِ حق یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں نرا حیوانی طریقہ اختیار نہ کرے، بلکہ اس کی انسانی سرشت جن امور کی مقتضی ہے اور اس میں جن فوق الحیوانی امور کی طلب رکھی گئی ہے ان کے لحاظ سے اس کا طریقہ انسانی ہونا چاہیے۔ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدودِ شرعی مقرر ہیں تا کہ انسان کے افعال کو ایک ضابطے کا پابند بنایا جائے اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ بھی کر دی گئی ہے کہ اگر افراط یا تفریط کا طریقہ اختیار کر کے ان حدود سے تجاوز کرو گے تو اپنے آپ کو خود تباہ کر لو گے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (الطلاق ۶۵:۱) جس نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا پس اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔

اب دیکھیے کہ صنفی معاملات میں قرآنِ مجید انسانی فطرت کی کن خصوصیات اور کن مقتضیات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

۱۔ دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اس کی تشریح یہ ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم ۳۰:۲۱) اللہ نے تمھارے لیے خود تمھیں میں سے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمھارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ ۲:۱۸۷) وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس سے پہلے جس آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے جوڑے بنانے کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا وہاں تخلیقِ زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا گیا تھا۔ اب حیوان سے الگ کر کے انسان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق ہو، دِل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے راز دار اور شریکِ رنج و راحت ہوں ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی وابستگی ہو جیسی لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے جیسا کہ ہم تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایۂ سکون و راحت ہے اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامۂ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون و راحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے، جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر اہلِ مغرب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ تمدن و عمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی بھی ہے اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

۲- یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے، بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اس کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ فطرتِ الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل و رضاعت کی طبعی صورت ہی میں ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید کہتا ہے:

حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (لقمان ۳۱: ۱۴) اس کی ماں نے اس کو جھٹکے پر جھٹکے اُٹھا کر پیٹ میں رکھا۔ پھر وہ دو سال کے بعد ماں کی چھاتی سے جدا ہوا۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ (الاحقاف ۴۶: ۱۵) اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا، تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھٹائی میں تیس مہینے صرف ہوئے۔

ایسا ہی حال مرد کا ہے، اگرچہ اولاد کی محبت میں وہ عورت سے کمتر ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ (الِ عمران ۳: ۱۴) لوگوں کے لیے خوش آیند ہے مرغوب چیزوں کی محبت، جیسے عورتیں، اولاد، اور......

یہی فطری محبت انسان اور انسان کے درمیان نسبی اور صہری رشتے قائم کرتی ہے۔ پھر ان رشتوں سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل اور قومیں بنتی ہیں اور ان کے تعلقات سے تمدن وجود میں آتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاۗءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ (الفرقان ۲۵: ۵۴) اور وہ خدا ہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا۔ پھر اس کو نسب اور شادی بیاہ کا رشتہ بنایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ (الحجرات ۴۹: ۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر تمھارے قبیلے بنا دیے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

پس ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدن کے ابتدائی اور طبعی موسسات ہیں اور ان کے قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

۳- انسانی فطرت کا اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کے نتائج اور اپنی گاڑھی کمائی میں سے اگر کچھ چھوڑے تو اپنی اولاد اور اپنے عزیزوں کے لیے چھوڑے، جن کے ساتھ وہ تمام عمر خونی اور رحمی رشتوں میں بندھا رہا ہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ (الانفال ۸: ۷۵) اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاۗءَكُمْ اَبْنَاۗءَكُمْ ۭ (الاحزاب ۳۳: ۴) جن کو تم منہ بولا بیٹا بنا لیتے ہو ان کو خدا نے تمھارا بیٹا نہیں بنایا۔ پس تقسیم میراث کے لیے بھی تحفظ انساب کی ضرورت ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۴- انساب کی فطرت میں حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کے جسم کے بعض حصے ایسے ہیں جن کے چھپانے کی خواہش خدا نے اس کی جبلّت میں پیدا کی ہے۔ یہی جبلّی خواہش ہے جس نے ابتدا سے انسان کو کسی نہ کسی نوع کا لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس باب میں قرآن قطعیت کے ساتھ جدید نظریے کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم کے جن حصوں میں مرد اور عورت کے لیے صنفی جاذبیت ہے، ان کے اظہار میں شرم کرنا اور ان کو چھپانے کی کوشش کرنا انسانی فطرت کا اقتضا ہے۔ البتہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کو کھول دے۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (الاعراف ۷:۲۰) پھر شیطان نے آدم اور ان کی بیوی کو بہکایا تا کہ ان کے جسم میں سے جو کچھ ان سے چھپایا گیا تھا اس کو ان پر ظاہر کر دے۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ (الاعراف ۷:۲۲) پس جب انھوں نے اس شجر کو چکھا تو ان پر ان کے جسم کے پوشیدہ حصے کھل گئے اور وہ ان کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔

پھر قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے لباس اسی لیے اتارا ہے کہ وہ تمھارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا ذریعہ بھی۔ مگر محض ستر چھپانا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمھارے دلوں میں تقویٰ بھی ہو۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ (الاعراف ۷:۲۶)

یہ اسلامی نظامِ معاشرت کے اساسی تصورات ہیں۔ ان تصورات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب اس نظامِ معاشرت کی تفصیلی صورت ملاحظہ کیجیے جو ان تصورات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس مطالعے کے دوران میں آپ کو گہری نظر سے اس امر کا تجسس کرنا چاہیے کہ اسلام جن نظریات کو اپنے قانون کی اساس قرار دیتا ہے ان کو عملی جزئیات و تفصیلات میں نافذ کرتے ہوئے کہاں تک یکسانی و ہمواری اور منطقی ربط و مطابقت قائم رکھتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے جتنے قوانین ہم نے دیکھے ہیں ان سب کی یہ مشترک اور نمایاں کمزوری ہے کہ ان کے اساسی نظریات اور عملی تفصیلات کے درمیان پورا منطقی ربط قائم نہیں رہتا۔ اُصول اور فروع میں صریح تناقض پایا جاتا ہے۔ کلیات جو بیان کیے جاتے ہیں ان کا مزاج کچھ اور ہوتا ہے اور عمل درآمد کے لیے جو جزئیات مقرر کیے جاتے ہیں ان کا مزاج کوئی اور صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فکر و تعقل کے آسمانوں پر چڑھ کر ایک نظریہ پیش کر دیا جاتا ہے، مگر جب عالم بالا سے اتر کر واقعات اور عمل کی دنیا میں آدمی اپنے نظریے کو عملی کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے تو یہاں عملی مسائل میں کچھ ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے خود اپنا نظریہ یاد نہیں رہتا۔ انسانی ساخت کے قوانین میں سے کوئی ایک قانون بھی اس کمزوری سے خالی نہیں پایا گیا۔ اب آپ دیکھیں اور خوردبین لگا کر انتہائی نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھیں کہ یہ قانون جو ریگستانِ عرب کے ایک اَن پڑھ انسان نے دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کے مرتب کرنے میں اس نے کسی مجلس قانون ساز اور کسی سلکٹ کمیٹی سے مشورہ تک نہیں لیا، اس میں بھی کہیں کوئی منطقی بے ربطی اور کسی تناقض کی جھلک پائی جاتی ہے؟

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء ص ۲۱۱-۲۲۶)

...........OOO...........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

اُصول وارکان

تنظیم معاشرت کے سلسلے میں سب سے اہم سوال، صنفی میلان کو انتشارِ عمل سے روک کر ایک ضابطے میں لانے کا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر تمدن کی شیرازہ بندی ہی نہیں ہوسکتی اور اگر ہو بھی جائے تو اس شیرازے کو بکھرنے اور انسان کو شدید اخلاقی و ذہنی انحطاط سے بچانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس غرض کے لیے اسلام نے عورت اور مرد کے تعلقات کو مختلف حدود کا پابند کر کے ایک مرکز پر سمیٹ دیا ہے۔

محرّمات

سب سے پہلے اسلامی قانون ان تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرتا ہے جو باہم مل کر رہنے یا نہایت قریبی تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً ماں اور بیٹا، باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن، پھوپھی اور بھتیجا، چچا اور بھتیجی، خالہ اور بھانجا، ماموں اور بھانجی، سوتیلا باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، سُسر اور بہو، سالی اور بہنوئی (بہن کی زندگی میں) اور رضائی رشتہ دار (سورۂ نساء ۴: ۲۳-۲۴) ان تعلقات کی حرمت قائم کر کے ان کو صنفی میلان سے اس قدر پاک کر دیا گیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں (بجز ایسے خبیث طینت بہائم کے جن کی بہیمیت کسی اخلاقی ضابطے کی حد میں رہنا قبول نہیں کرتی)۔

حرمتِ زنا

اس حد بندی کے بعد دوسری قید یہ لگائی گئی کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے کے نِکاح میں ہوں۔ وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (النسآء ۴: ۲۴)

اس کے بعد جو عورتیں باقی بچتی ہیں ان کے ساتھ ہر قسم کے بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۲) زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیوں کہ وہ بے حیائی ہے اور بہت بُرا راستہ ہے۔

نِکاح

اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضا اور کارخانہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قدرت کے مقررہ طریقے کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضروری تھا، سو وہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو۔ مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں، کھلے بندوں بے حیائی کے طریقے پر بھی نہیں، بلکہ باقاعدہ اعلان واظہار کے ساتھ، تاکہ تمھاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم اور مسلّم ہو جائے کہ فلاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ...... فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النسآء ۴: ۲۴-۲۵) ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں انھیں تمھارے لیے حلال کیا گیا کہ تم اپنے اموال کے بدلے میں (مہر دے کر) ان سے احصان (نکاح) کا باضابطہ تعلق قائم کرو نہ کہ آزاد شہوت رانی کا ...... پس ان عورتوں کے متعلقین کی رضامندی سے ان کے ساتھ نکاح کرو ...... اس طرح کہ وہ قید نکاح میں ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

یہاں اسلام کی شانِ اعتدال دیکھیے کہ جو صنفی تعلق دائرۂ ازدواج کے باہر حرام اور قابلِ نفرت تھا وہی دائرۂ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہے، کارِ ثواب ہے، اس کو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے اجتناب کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہے اور زوجین کا ایسا تعلق ایک عبادت بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر عورت اپنے شوہر کی جائز خواہش سے بچنے کے لیے نفل روزہ رکھ لے یا نماز وتلاوت میں مشغول ہو جائے تو وہ اُلٹی گنہ گار ہو گی۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے چند حکیمانہ اقوال ملاحظہ ہوں:

عَلَيْكُمْ بِالْبَاءَةِ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْصَنُ لِلْفَرْجِ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ وَ اِنَّ الصَّوْمَ لَهٗ وِجَاءٌ (الترمذی ابواب النکاح، و فی هذ المعنی حدیث فی کتاب النکاح للبخاری) تم کو نکاح کرنا چاہیے کیوں کہ وہ آنکھوں کو بدنظری سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اور جو شخص تم میں سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے کیوں کہ روزہ شہوت کو دبانے والا ہے۔[1]

وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّیْ اَصُوْمُ وَ اُفْطِرُ وَ اُصَلِّیْ وَ اَرْقُدُ وَ اَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ (بخاری کتاب النکاح) بخدا میں خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے میں تم سب سے بڑھ کر ہوں، مگر مجھے دیکھو کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقے سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔[2]

لَا تَصُوْمُ الْمَرْاَةُ وَبَعْلُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بخاری، باب صوم المرأة باذن زوجها) عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کے اذن کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے۔[3]

اِذَا بَاتَتِ الْمَرْاَةُ مُهَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰی تَرْجِعَ (بخاری، کتاب النکاح) جو عورت اپنے شوہر سے اجتناب کر کے اس سے الگ رات گزارے، اس پر ملائکہ لعنت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ رجوع نہ کرے۔[4]

اِذَا رَاٰی اَحَدُكُمُ امْرَاَةً فَاَعْجَبَتْهُ فَلْيَاْتِ اَهْلَهٗ، فَاِنَّ مَعَهَا مِثْلَ الَّذِیْ مَعَهَا (ترمذی، باب ما جاء الرجل یری

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۱۶، اشاعت سوم
۲- ایضاً ص ۱۷
۳- ایضاً ص ۲۳۲
۴- ایضاً ص ۲۳۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

المرأۃ فتعجبہ) جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے اور اس کے حسن سے متاثر ہو تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے۔ کیوں کہ اس کے پاس وہی ہے جو اس کے پاس تھا۔[1]

ان تمام احکامات و ہدایات سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ صنفی انتشار کے تمام دروازے مسدود کیے جائیں، زوجی تعلقات کو دائرۂ ازدواج کے اندر محدود کیا جائے، اس دائرے کے باہر جس حد تک ممکن ہو کسی قسم کی صنفی تحریکات نہ ہوں اور جو تحریکات خود طبیعت کے اقتضا یا اتفاقی حوادث سے پیدا ہوں، ان کی تسکین کے لیے ایک مرکز بنا دیا جائے۔ عورت کے لیے اس کا شوہر اور شوہر کے لیے اس کی بیوی ۔۔۔ تاکہ انسان تمام غیر طبعی اور خود ساختہ ہیجانات اور انتشارِ عمل سے بچ کر اپنی مجتمع قوّت (conservated energy) کے ساتھ نظامِ تمدن کی خدمت کرے اور وہ صنفی محبت اور کشش کا مادّہ جو اللہ تعالیٰ نے اس کارخانے کو چلانے کے لیے ہر مرد و عورت میں پیدا کیا ہے، تمام تر ایک خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام میں صَرف ہو۔ ازدواج ہر حیثیت سے پسندیدہ ہے، کیوں کہ وہ فطرتِ انسانی اور فطرتِ حیوانی دونوں کے منشا اور قانونِ الٰہی کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ اور ترکِ ازدواج ہر حیثیت سے ناپسندیدہ، کیوں کہ وہ دو بُرائیوں میں سے ایک بُرائی کا حامل ضرور ہوگا۔ یا تو انسان قانونِ فطرت کے منشا کو پورا ہی نہ کرے گا اور اپنی قوتوں کو فطرت سے لڑنے میں ضائع کر دے گا، یا پھر وہ اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر غلط اور ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کو پورا کرے گا۔

خاندان کی تنظیم

صنفی میلان کو خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد اسلام خاندان کی تنظیم کرتا ہے اور یہاں بھی وہ پورے توازن کے ساتھ قانونِ فطرت کے ان تمام پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق متعین کرنے میں جس درجہ عدل و انصاف اس نے ملحوظ رکھا ہے، اس کی تفصیلات میں نے ایک الگ کتاب میں بیان کی ہیں جو حقوق الزوجین کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی طرف مراجعت کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جا سکتی تھی وہ اسلام نے قائم کر دی ہے۔ لیکن اسلام اس مساوات کا قائل نہیں ہے جو قانونِ فطرت کے خلاف ہو۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے ہیں ویسے ہی عورت کے ہیں۔ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرۃ ۲:۲۲۸) لیکن زوج فاعل ہونے کی حیثیت سے ذاتی فضیلت (بمعنی عزّت نہیں، بلکہ بمعنی غلبۂ تقدم) مرد کو حاصل ہے۔ وہ اس نے پورے انصاف کے ساتھ مرد کو عطا کی ہے، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرۃ ۲:۲۲۸) اس طرح عورت اور مرد میں فاضل اور مفضول کا فطری تعلق تسلیم کرکے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسبِ ذیل قواعد پر کی ہے۔

مرد کی قوّامیت

خاندان میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے، اخلاق اور معاملات کا نگران ہے، اس کی

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۲۳۷، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیوی اور بچوں پر اس کی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے) اور اس پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النسآء ۴: ۳۴) مرد عورتوں پر قوام[1] ہیں۔ اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر ونفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اَلرَّجَلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ (بخاری، کتاب النکاح، باب قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَ اَهْلِیْکُمْ نَارًا) مرد اپنے بیوی بچوں پر حکمران ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔[2]

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النسآء ۴: ۳۴) صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے ناموس کی محافظ ہیں۔[3]

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا خَرَجَتِ الْمَرْاَۃُ مِنْ بَیْتِهَا وَ زَوْجُهَا کَارِهٌ لَعَنَهَا کُلُّ مَلَکٍ فِی السَّمَآءِ وَ کُلُّ شَیْءٍ مَرَّتْ عَلَیْهِ غَیْرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ حَتّٰی تَرْجِعَ (کشف الغمہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن وانس کے سوا ہر وہ چیز جس پر سے وہ گزرتی ہے

۱- قوّام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت ونگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔

یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت وخبر گیری کے تحت رہنا چاہیے۔ (تفہیم القرآن، اول، ص ۳۴۹، النساء: حاشیہ ۵۶-۵۷)

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۲۷، اشاعت سوم

۳- حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمھارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمھارے پیچھے تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ (تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۲۹، اشاعت سوم)

یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت سے اہم اور اقدم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شوہر خدا کی معصیت کا حکم دے یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا عورت کا فرض ہے۔ (تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۲۹، اشاعت سوم) اس صورت میں اگر وہ اس کی اطاعت کرے گی تو گناہ گار ہو گی۔ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی بیوی کو نفل نماز یا نفل روزہ ترک کرنے کے لیے کہے تو لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ اس صورت میں اگر وہ نوافل ادا کرے گی تو مقبول نہ ہوں گے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۳۴۹، النسآء، حاشیہ ۵۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھٹکار بھیجتی ہے، تاوقتیکہ وہ واپس نہ ہو۔[1]

وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۔ النساء ۴:۳۴) اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو ان کو نصیحت کرو (نہ مانیں تو) خواب گاہوں میں ان سے ترک تعلق کرو (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو۔ پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کے لیے کوئی بہانہ نہ ڈھونڈو۔

وَ قَالَ النَّبِیُّ صلی اللّٰه عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: لَا طَاعَةَ لِمَنْ لَّمْ يُطِعِ اللّٰهَ (رواہ احمد) وَلَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ (رواہ احمد من حديث عمران بن حصين) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی شخص کی فرماں برداری نہیں کی جاسکتی۔ فرماں برداری صرف معروف میں ہے (یعنی ایسے حکم میں جو جائز اور معقول ہو)۔[2]

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ (العنکبوت ۲۹:۸) اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ادب سے پیش آئے۔ لیکن اگر وہ تجھ کو حکم دیں کہ تو میرے ساتھ کوئی شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہے تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کر۔

اس طرح خاندان کی تنظیم اس طور پر کی گئی ہے کہ اس کا ایک سردار اور صاحب امر ہو۔ جو شخص اس نظم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے اس کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید ہے کہ مَنْ اَفْسَدَ امْرَأَةً عَلٰی زَوْجِهَا فَلَيْسَ مِنَّا (کشف الغمه) جو کوئی کسی عورت کے تعلقات اس کے شوہر سے خراب کرنے کی کوشش کرے اس کا کچھ تعلق ہم سے نہیں۔[3]

عورت کا دائرۂ عمل

اس تنظیم میں عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔ کسبِ مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔ اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰی بَيْتِ زَوْجِهَا وَهِیَ مَسْئُوْلَةٌ (بخاری، باب قوا انفسكم و اهليكم نارا) عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمران ہے اور وہ اپنی حکومت کے دائرے میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔[4]

اس کو ایسے تمام فرائض سے سبک دوش کیا گیا ہے جو بیرونِ خانہ کے امور سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مثلاً:

☆ اس پر نمازِ جمعہ واجب نہیں (ابوداؤد، باب الجمعة للمملوك و المرأة)۔[5]

☆ اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اگرچہ بوقتِ ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لیے جاسکتی ہے جیسا کہ آگے چل کر بہ تحقیق بیان کروں گا۔☆

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۲۹، اشاعت سوم ۲- ایضاً، ج ۵، ص ۲۳۰ ۳- ایضاً

۴- ایضاً، ج ۵، ص ۳۱۹ ۵- ایضاً، ج ۵، ص ۳۲۰ ☆- ج ۵، ص ۳۴۶-۳۴۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

☆ اس کے لیے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے (بخاری، باب اتباع النسآء الجنائز)[۱]

☆ اس پر نمازِ باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے، لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا۔[۲]

☆ اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی (ترمذی، باب ماجاء فی کراھیة ان تسافر المرأة وحدھا. ابوداؤد، باب فی المرأة تحج بغیر محرم)[۳]

غرض ہر طریقے سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانونِ اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے جیسا کہ آیت وَقَرۡنَ فِيۡ بُيُوۡتِكُنَّ[۴] (الاحزاب ۳۳:۳۳) کا منشا ہے۔ لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لیے

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵ ص۳۲۱، اشاعت سوم ۲- ایضاً، ج۵ ص۳۲۷ ۳- ایضاً، ج۵ ص۳۲۱-۳۲۴

۴- بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ کے لیے خاص ہے۔ کیونکہ آیت کی ابتدا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ سے کی گئی ہے۔ لیکن اس پوری آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے کون سی ہدایت ایسی ہے جو امہاتِ مومنین کے ساتھ خاص ہو؟ فرمایا گیا ہے:

اگر تم پرہیزگار ہو تو دبی زبان سے لگاوٹ کے انداز میں کسی سے بات نہ کرو تاکہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہ تمھارے متعلق کچھ امیدیں اپنے دل میں نہ پال لے۔ جو بات کرو سیدھے سادے انداز میں کرو۔ اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔ جاہلیت کے بناؤ سنگار نہ کرتی پھرو۔ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ گندگی کو تم سے دور کر دے۔

ان ہدایات پر غور کیجیے۔ ان میں سے کون سی چیز ہے جو عام مسلمان عورتوں کے لیے نہیں ہے؟ کیا مسلمان عورتیں پرہیزگار نہ بنیں؟ کیا وہ غیر مردوں سے لگاوٹ کی باتیں کیا کریں؟ کیا وہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگار کرتی پھریں؟ کیا وہ نماز و زکوٰۃ اور اطاعتِ خدا اور رسول سے انحراف کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کو گندگی میں رکھنا چاہتا ہے؟ اگر یہ سب ہدایات سب مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں تو صرف وَقَرۡنَ فِيۡ بُيُوۡتِكُنَّ ہی کو ازواجِ نبیؐ کے ساتھ خاص کرنے کی کیا وجہ ہے؟

دراصل غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت میں لوگوں کو یہ الفاظ نظر آئے کہ اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، لیکن اندازِ بیان بالکل اس طرح کا ہے جیسے کسی بچے سے کہا جائے کہ تم کوئی عام بچوں کی طرح تو ہو نہیں کہ بازاروں میں پھرو اور بے ہودہ حرکات کرو، تمھیں تمیز سے رہنا چاہیے۔ ایسا کہنے سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ دوسرے بچوں کے لیے بازاری پن اور بے ہودہ حرکات پسندیدہ ہیں اور خوش تمیزی ان کے حق میں مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ اس سے حسنِ اخلاق کا ایک معیار قائم کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ ہر وہ بچہ جو شریف بچوں کی طرح رہنا چاہتا ہو۔ اس معیار پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ قرآن میں عورتوں کے لیے نصیحت کا یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ عرب جاہلیت کی عورتوں میں ویسی ہی آزادی تھی جیسی اس وقت یورپ میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بتدریج ان کو اسلامی تہذیب کا نوگر بنایا جا رہا تھا اور ان کے لیے اخلاقی حدود اور ضابطۂ معاشرت کی قیود مقرر کی جا رہی تھیں۔ اس حالت میں امہات المومنین کی زندگی کو خاص طور پر منضبط کیا گیا تاکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن جائیں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جائے۔ ٹھیک یہی رائے علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

یہ حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیویوں کے حق میں نازل ہوا ہے، مگر اس کی مراد عام ہے، جس میں آپ اور دوسرے سب مسلمان شریک ہیں۔ کیونکہ ہم آپ کی پیروی پر مامور ہیں اور وہ سب احکام جو آپ کے لیے نازل ہوئے ہیں، ہمارے لیے بھی ہیں۔ بجز ان امور کے جن کے متعلق تصریح ہے کہ وہ آپ کے لیے خاص ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص، جلد سوم، ص۵۵) [مؤلف]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کا کوئی سر دھرا نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے محافظ خاندان کی مفلسی، قلتِ معاش، بیماری، معذوری یا اور ایسے ہی وجوہ سے عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی تمام صورتوں کے لیے قانون میں کافی گنجایش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: قَدْ اَذِنَ اللّٰهُ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوائِجِكُنَّ (بخاری، باب خروج النسآء لحوائجہن و فی ھذا المعنی حدیث فی المسلم، باب اباحة الخروج النسآء لقضاء حاجة الانسان) اللہ تعالیٰ نے تم کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہو۔[1]

مگر اس قسم کی اجازت جو محض حالات اور ضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے۔ اسلامی نظامِ معاشرت کے اس قاعدے میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے۔ یہ تو محض ایک وسعت اور رخصت ہے، اور اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء ص ۲۲۶-۲۳۸)

ضروری پابندیاں

بالغ عورت کو اپنے ذاتی معاملات میں کافی آزادی بخشی گئی ہے۔ مگر اس کو اس حد تک خود اختیاری عطا نہیں کی گئی جس حد تک بالغ مرد کو عطا کی گئی ہے۔ مثلاً مرد اپنے اختیارات سے جہاں چاہے جا سکتا ہے، لیکن عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ یا بیوہ، ہر حال میں ضروری ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ محرم ہو۔

لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تُسَافِرَ سَفَرًا يَكُوْنُ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ فَصَاعِدًا اِلَّا وَمَعَهَا اَبُوْهَا اَوْ اَخُوْهَا اَوْ زَوْجُهَا اَوِ ابْنُهَا اَوْ ذُوْ مَحْرَمٍ مِّنْهَا (ترمذی، باب ماجاء فی کراهية ان تسافر المرأة وحدها) کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں ہے کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی محرم مرد ہو۔[2]

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَيْضًا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ مُسْلِمَةٍ تُسَافِرُ مَسِيْرَةَ لَيْلَةٍ اِلَّا وَمَعَهَا رَجُلٌ ذُوْ حُرْمَةٍ مِّنْهَا (ابوداؤد، باب فی المرأة تحج بغير محرم) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ ایک رات کا سفر کرے تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک محرم مرد نہ ہو۔[3]

ان روایات میں جو اختلاف مقدارِ سفر کی تعیین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل ایک دن یا دو دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل و حرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجب فتنہ ہو۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدارِ سفر معین کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں۔

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۲۲-۳۲۵، اشاعت سوم ۲۔ ایضاً، ج ۵، ص ۳۲۲ ۳۔ ایضاً، ج ۵، ص ۳۲۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرد کو اپنے نکاح کے بارے میں پوری آزادی حاصل ہے۔ مسلمان یا کتابیہ عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ نکاح کرسکتا ہے اور لونڈی بھی رکھ سکتا ہے۔ لیکن عورت اس معاملے میں کلیۃً خود مختار نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کرسکتی۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ط (الممتحنه ۶۰:۱۰) نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال۔

وہ اپنے غلام سے بھی تمتع نہیں کرسکتی۔ قرآن میں جس طرح مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے اس طرح عورت کو نہیں دی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک عورت نے مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ج (النسآء ۴:۴) کی غلط تاویل کر کے اپنے غلام سے تمتع کیا تھا۔ آپؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؓ نے یہ معاملہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلسِ شوریٰ میں پیش کیا اور سب نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ قَبَّحَهَا اللّٰهُ تَاوَّلَتْ كِتَابَ اللّٰهِ غَيْرَ تَأْوِيْلِهٖ (اس نے کتاب اللہ کو غلط معنی پہنائے) ایک اور عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسے ہی ایک فعل کی اجازت مانگی تو آپؓ نے اس کو سخت سزا دی اور فرمایا لَنْ تَزَالَ الْعَرَبُ بِخَيْرٍ مَّا مَنَعَتْ نِسَآؤُهَا یعنی عرب کی بھلائی اسی وقت تک ہے جب تک اس کی عورتیں محفوظ ہیں۔ (کشف الغمه للشعرانی)

غلام اور کافر کو چھوڑ کر آزاد مسلمان مردوں میں سے عورت اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرسکتی ہے، لیکن اس معاملے میں بھی اس کے لیے اپنے باپ، دادا، بھائی اور دوسرے اولیا کی رائے کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اولیا کو یہ حق نہیں کہ عورت کی مرضی کے خلاف کسی سے اس کا نکاح کردیں، کیوں کہ ارشادِ نبوی ہے اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا[1] اور لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ[2] مگر عورت کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی رائے کے خلاف جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں مرد کے نکاح کا ذکر ہے وہاں نَكَحَ يَنْكَحُ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خود نکاح کرلینے کے ہیں۔ مثلاً: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ (البقرة ۲:۲۲۱) "مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو"، فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (النسآء ۴:۲۵) "ان سے ان کے گھر والوں کی اجازت لے کر نکاح کرلو"۔ مگر جہاں عورت کے نکاح کا ذکر آیا ہے وہاں عموماً باب اِفعال سے اِنکاح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی نکاح کردینے کے ہیں۔ مثلاً: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور ۲۴:۳۲) اپنے بے شوہر عورتوں کے نکاح کرو، وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ط (البقرة ۲:۲۲۱) "اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے، اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے، مگر یہ تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کے لیے ارادہ و عمل کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظامِ معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے

۱۔ بیوہ اپنے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق اپنے ولی سے زیادہ رکھتی ہے۔ (ترمذی أبواب النكاح، باب ماجاء فی استئمار البکر والثیب) تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵، ص ۴۲، اشاعت سوم

۲۔ باکرہ لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔ [مؤلف] (ابن ماجه أبواب النكاح باب ما جاء فی استئمار البکر والثیب) تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵، ص ۴۲، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے، اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اس کی اطاعت کرے خواہ وہ اس کا شوہر ہو، باپ یا بھائی۔

عورت کے حقوق

اس طرح اسلام نے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النسآء ۴:۳۴) کو ایک فطری حقیقت تسلیم کرنے کے ساتھ ہی لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرۃ ۲:۲۲۸) کی بھی ٹھیک ٹھیک تعیین کر دی ہے۔ عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کو وہ بعینہٖ قبول کرتا ہے۔ جتنا فرق ہے اسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے، اور جیسا فرق ہے اس کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعیین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے، ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیے گئے ہیں ان سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔ دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اُٹھا کر وہ نظامِ معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصے کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی کی بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو، مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے، نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا اس کے لیے اور تمدن کے لیے مفید ہے اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورت کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں، اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائیدار ضمانتیں مہیا کی ہیں، ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظامِ معاشرت میں نہیں ملتی۔

معاشی حقوق: سب سے اہم اور ضروری چیز جس کی بدولت تمدن میں انسان کی منزلت قائم ہوتی ہے اور جس کے ذریعے سے وہ اپنی منزلت کو برقرار رکھتا ہے، وہ اس کی معاشی حیثیت کی مضبوطی ہے۔ اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حیثیت سے کمزور کیا ہے اور یہی معاشی بے بسی معاشرت میں عورت کی غلامی کا سب سے بڑا سبب بنی ہے۔ یورپ نے اس حالت کو بدلنا چاہا مگر اس طرح کہ عورت کو ایک کمانے والا فرد بنا دیا۔ یہ ایک دوسری عظیم تر خرابی کا باعث بن گیا۔ اسلام بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دیتا ہے۔ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رشتہ داروں سے اس کو وراثت [1] ملتی ہے۔ نیز شوہر سے اس کو مہر بھی ملتا ہے اور ان تمام ذرائع سے جو کچھ مال اس کو پہنچتا ہے اس میں ملکیت اور قبض وتصرّف کے پورے حقوق اسے دیے گئے ہیں، جن میں مداخلت کرنے کا اختیار نہ اس کے باپ کو حاصل ہے، نہ شوہر کو، نہ کسی اور کو۔ مزید برآں اگر وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر، یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اس کی مالک بھی کلیۃً وہی ہے۔ اور ان سب کے باوجود اس کا نفقہ ہر حال میں اس کے شوہر پر واجب ہے۔ بیوی خواہ کتنی ہی مالدار ہو، اس کا شوہر اس کے نفقے سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اسلام میں عورت کی معاشی حیثیت اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ بسا اوقات وہ مرد سے زیادہ بہتر حالت میں ہوتی ہے۔

تمدنی حقوق: [اسلام میں عورت کو جو معاشرتی وتمدنی حقوق دیے گئے ہیں اُن میں سے چند اہم حقوق درج ذیل ہیں]:

۱- عورت کو شوہر کے انتخاب کا پورا حق دیا گیا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اس کا نِکاح نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مسلم کے ساتھ نِکاح کر لے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر اس کی نظرِ انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے، جو اس کے خاندان کے مرتبے سے گرا ہوا ہو تو صرف اس صورت میں اس کے اولیا کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

۲- ایک ناپسندیدہ یا ظالم یا ناکارہ شوہر کے مقابلے میں عورت کو خلع اور فسخ وتفریق کے وسیع حقوق دیے گئے ہیں۔

۳- شوہر کو بیوی پر جو اختیارات اِسلام نے عطا کیے ہیں، ان کے استعمال میں حسنِ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ [النسآء ۴:۱۹] (عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو)۔ اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ [البقرۃ ۲:۲۳۷] (آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَآئِهٖ وَ اَلْطَفُهُمْ بِاَهْلِهٖ (تم میں اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے ہیں اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ لطف ومہربانی کا سلوک کرنے والے ہیں) [2]۔ یہ محض اخلاقی ہدایات ہی نہیں ہیں۔ اگر شوہر اپنے اختیارات کے استعمال میں ظلم سے کام لے تو عورت کو قانون سے مدد لینے کا حق بھی حاصل ہے۔

۴- بیوی اور مطلقہ عورتوں اور ایسی تمام عورتوں کو جن کے نِکاح ازروئے قانون فسخ کیے گئے ہوں، یا جن کو حُکمِ تفریق کے ذریعے سے شوہر سے جُدا کیا گیا ہو، نِکاحِ ثانی کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے۔ اور اس امر کی تصریح کردی گئی ہے کہ ان پر شوہرِ سابق یا اس کے کسی رشتہ دار کا کوئی حق باقی نہیں۔ یہ وہ حق ہے جو آج تک یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں بھی عورت کو نہیں ملا ہے۔

۱- وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلے میں نصف رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں، جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف اس کے شوہر ہی پر واجب نہیں ہے، بلکہ شوہر نہ ہونے کی صورت میں باپ، بھائی، بیٹا یا دوسرے اولیا پر اس کی کفالت واجب ہے۔ پس جب عورت پر وہ ذمہ داریاں نہیں ہیں جو مرد پر ہیں تو وراثت میں اس کا حصہ بھی وہ نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔ (مؤلف)

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۴۳-۲۴۴، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۵- دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات قائم کی گئی ہے۔ جان و مال اور عزت کے تحفظ میں اسلامی قانون عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتا۔

عورتوں کی تعلیم: عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے، بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اس قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی حاصل کرتی تھیں۔ آپ نے ان کے لیے اوقات متعین فرما دیے تھے جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نہ صرف عورتوں کی، بلکہ مردوں کی بھی معلمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ و تابعین ان سے حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سکھانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: اَیُّمَا رَجُلٍ کَانَتْ عِنْدَهٗ وَلِیْدَةٌ فَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا وَ اَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَادِیْبَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا وَ تَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ [بخاری، کتاب النکاح] جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب تعلیم دے اور عمدہ تہذیب و شائستگی سکھائے، پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کر لے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔[1]

پس جہاں تک نفسِ تعلیم و تربیت کا تعلق ہے اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اسے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہے، بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

عورت کا اصلی اُٹھان (emancipation)

یہ تو صرف حقوق کا ذکر ہے، مگر اس سے اس احسانِ عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا میں ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجبِ ننگ و عار تھی۔ سسرالی رشتے ذلیل رشتے سمجھے جاتے تھے، حتیٰ کہ سسر اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۴۳-۲۴۵، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رواج ہو گیا تھا۔[۱] جُہلا تو درکنار علما اور پیشوایانِ مذہب تک میں مدّتوں یہ سوال زیرِ بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اس کو رُوح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا نہ تہذیب وثقافت تھی اور نہ حقوقِ مدنیت۔ یہ چیزیں جس عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیبِ انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی ومحکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزّتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی عزّت کا کوئی مقام ہے۔ مَرد اس پر ظلم وستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس کے ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی 'داسی' کہتی تھی۔ 'پتی ورتا' اس کا دھرم تھا۔ اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانون اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک انقلابِ عظیم برپا کیا وہ اسلام ہے۔ اسلام نے ہی عورت اور مَرد دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزّت اور اس کے حق کا تخیّل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں اور بیداریِ اناث کے جو الفاظ آپ سُن رہے ہیں، یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے بلند ہوئی تھی اور جس نے افکارِ انسانی کا رُخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہی ہیں جنھوں نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مَرد ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النسآء ۴:۱) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔

خدا کی نگاہ میں عورت اور مَرد میں کوئی فرق نہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (النساء ۴:۳۲) مَرد جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائیں گے اور عورتیں جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائیں گی۔

ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مَرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ مَرد اگر ابراہیم بن ادھم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شے نہیں روک سکتی۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (ال عمران ۳:۱۹۵) ان کے

۱۔ قرآنِ مجید اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے: وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۵۸) يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۚ أَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ أَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ [النحل ۱۶:۵۸-۵۹] اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے، اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلّت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رب نے ان کی دعا کے جواب میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہو۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النسآء ۴: ۱۲۴)
اور جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ہو ایمان دار تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنھوں نے مرد کو بھی خبردار کیا اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ (البقرۃ ۲: ۲۲۸) عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جس نے ذلت اور عار کے مقام سے اُٹھا کر عورت کو عزت کے مقام پر پہنچایا۔ وہ حضور ﷺ ہی ہیں جنھوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لیے ننگ و عار نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسانی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے۔

مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَا وَهُوَ وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ (مسلم، کتاب البر والصلة والادب) جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔[1]

مَنِ ابْتُلِیَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَیْهِنَّ كُنَّ لَهٗ سِتْرًا مِنَ النَّارِ (مسلم، کتاب مذکور) جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ اچھی طرح ان کی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔[2]

حضور ﷺ ہی نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی تیرے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْاَةُ الصَّالِحَةُ (نسائی، کتاب النکاح) دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔[3]

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْيَا النِّسَآءُ وَالطِّيْبُ وَ جُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِیْ فِی الصَّلٰوةِ (نسائی، کتاب عشرة النسآء) دنیا کی چیزوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب عورت اور خوشبو ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔[4]

لَيْسَ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا شَیْءٌ اَفْضَلَ مِنَ الْمَرْاَةِ الصَّالِحَةِ (ابن ماجه، کتاب النکاح) دنیا کی بہترین نعمتوں میں کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں ہے۔[5]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت، اور قدر و منزلت اور حسن سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

سَاَلَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ؟ قَالَ اُمُّكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ اُمُّكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ اُمُّكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ اَبُوْكَ (بخاری کتاب الادب) ایک شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ! مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا تیری

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۴۲، اشاعت سوم ۲- ایضاً ۳- ایضاً ص ۲۴۳
۴- ایضاً ۵- ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ماں کا۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔[1]

اَللّٰهُ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَاتِ (بخاری، کتاب الادب) اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔[2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی اور حسّیات کی نزاکت اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ اُنوثت کے لیے عیب نہیں، اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہو اس فطرت پر قائم رکھ کر ہی اُٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مَردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے اَلْمَرْاَةُ كَالضِّلَعِ اِنْ اَقَمْتَهَا كَسَرْتَهَا وَ اِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَ فِيْهَا عِوَجٌ (بخاری، باب مدارات النسآء)[3]

اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلے اور درحقیقت آخری شخص ہیں جنھوں نے عورت کی نسبت نہ صرف مَرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح ذہنیت پیدا کی، جس کی بنیاد جذبات پر نہیں، بلکہ خالص عقل اور علم پر تھی۔ پھر آپؐ نے باطنی اصلاح پر ہی اکتفا نہ فرمائی بلکہ قانون کے ذریعے سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور مَردوں کے ظلم کی روک تھام کا بھی انتظام کیا اور عورتوں میں اتنی بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے لیے قانون سے مدد لیں۔

سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں عورتوں کو ایک ایسا رحیم و شفیق حامی اور ایسا زبردست محافظ مل گیا تھا کہ اگر ان پر ذرا سی بھی زیادتی ہوتی تو وہ شکایت لے کر بے تکلف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوڑ جاتی تھیں، اور مَرد اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی بیویوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک شکایت لے جانے کا موقع نہ مل جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے ہم اپنی عورتوں سے بات کرنے میں احتیاط کرتے تھے کہ مبادا ہمارے حق میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تب ہم نے کھل کر بات کرنی شروع کی۔ (بخاری، باب الوصاة بالنسآء)[4]

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں پر دست درازی کرنے کی عام ممانعت فرما دی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ عورتیں بہت شوخ ہوگئی ہیں، ان کو مطیع کرنے کے لیے مارنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔ اُگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ جس روز اجازت ملی اسی روز ستر عورتیں اپنے گھروں میں پٹی گئیں۔ دوسرے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہوگیا۔ سرکار نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

لَقَدْ طَافَ اللَّيْلَةَ بِاٰلِ مُحَمَّدٍ سَبْعُوْنَ امْرَاَةً، كُلُّ امْرَاَةٍ تَشْتَكِيْ زَوْجَهَا فَلَا تَجِدُوْنَ اُولٰئِكَ خِيَارَكُمْ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکر لگایا ہے۔ ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی۔ جن لوگوں نے یہ حرکت

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۳۹، اشاعت سوم ۲- ایضاً ص ۲۳۹ ۳،۴- ایضاً ص ۲۳۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی ہے، وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔[1]

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جس کی نظیر دنیا کی [کسی] سوسائٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادّی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزّت اور ترقی کے ان بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے۔ اور اس کا عورت ہونا کسی مرتبے میں بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے۔ افکارِ انسانی کا ارتقاب بھی اس مقام تک نہیں پہنچا ہے جس پر اسلام پہنچا ہے۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت کی حیثیت سے نہیں دیا ہے، بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے، جیسی پرانے دورِ جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں، ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزّت نہیں۔ عزّت اگر ہے تو اس مرد مؤنث یا زنِ مذکر کے لیے ہے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت، مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدّن و معاشرت میں مرد ہی کے سے کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزّت نہیں، رجولیت کی عزّت ہے۔ پھر احساسِ پستی کی ذہنی اُلجھن (emferiority complex) کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ مغربی عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے، حالانکہ کوئی مرد زنانہ لباس پہن کر برسرِ عام آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ بیوی بننا لاکھوں مغربی عورتوں کے نزدیک موجبِ ذلّت ہے، حالانکہ شوہر بننا کسی مرد کے نزدیک ذلّت کا موجب نہیں۔ مردانہ کام کرنے میں عورتیں عزّت محسوس کرتی ہیں، حالانکہ خانہ داری اور پرورشِ اطفال جیسے خاص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزّت محسوس نہیں کرتا۔ پس بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے عورت کو بحیثیت عورت ہونے کے کوئی عزّت نہیں دی ہے۔ یہ کام اسلام اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدّن و معاشرت میں اس کے فطری مقام ہی پر رکھ کر عزّت و شرف کا مرتبہ عطا کیا۔ اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجے کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدّن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھ کر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے، جس کے لیے فطرت نے اسے بنایا ہے اور پھر ہر ایک کو اس کی جگہ پر ہی رکھتے ہوئے عزّت اور ترقی اور کامیابی کے یکساں مقام بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں انوثت اور رجولیت دونوں انسانیت کے لیے ضروری اجزا ہیں۔ تعمیرِ تمدّن کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں۔ وہ یکساں مفید اور یکساں قدر کی مستحق ہیں۔ نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ اُنوثت میں کوئی ذلّت۔ جس طرح مرد کے لیے عزّت اور ترقی اور کامیابی اس میں ہے کہ وہ مرد ہے اور مردانہ خدمات انجام دے اسی طرح عورت کے لیے بھی عزّت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات انجام دے۔ ایک صالح تمدّن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرۂ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے، عزّت اور شرف عطا کرے، تعلیم و تربیت سے اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو چمکائے اور اسی دائرے میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں کھولے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷، ص ۲۰۸-۲۲-۲۵۶)

............OOO............

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۴۰، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

تحفّظات

یہ اسلامی نظامِ معاشرت کا پورا خاکہ تھا۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے اس خاکے کی اہم خصوصیات کو پھر ایک نظر دیکھ لیجیے۔

۱- اس نظام کا منشا یہ ہے کہ اجتماعی ماحول کو حتی الامکان شہوانی ہیجانات اور تحریکات سے پاک رکھا جائے، تاکہ انسان کی جسمانی و ذہنی قوتوں کو ایک پاکیزہ اور پُرسکون فضا میں نشوو ارتقا کا موقع ملے اور وہ اپنی محفوظ اور مجتمع قوت کے ساتھ تعمیرِ تمدن میں اپنے حصے کا کام انجام دے سکے۔

۲- صنفی تعلقات بالکل دائرۂ ازدواج میں محدود ہوں اور اس دائرے کے باہر نہ صرف انتشارِ عمل کو روکا جائے، بلکہ انتشارِ خیال کا بھی امکانی حد تک سدِّ باب کردیا جائے۔

۳- عورت کا دائرۂ عمل مرد کے دائرے سے الگ ہو۔ دونوں کی فطرت اور ذہنی وجسمانی استعداد کے لحاظ سے تمدن کی الگ الگ خدمات اُن کے سپرد کی جائیں، اور اُن کے تعلقات کی تنظیم اس طور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار رہوں، مگر حدود سے تجاوز کرکے کوئی کسی کے کام میں خلل انداز نہ ہوسکے۔

۴- خاندان کے نظم میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہو اور گھر کے تمام افرادِ صاحبِ خانہ کے تابع رہیں۔

۵- عورت اور مرد دونوں کو پورے انسانی حقوق حاصل ہوں، اور دونوں کو ترقی کی بہتر سے بہتر مواقع بہم پہنچائے جائیں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی اُن حدود سے تجاوز نہ کرسکے جو معاشرت میں اس کے لیے مقرر کردی گئی ہیں۔

اس نقشے پر جس نظامِ معاشرت کی تاسیس کی گئی ہے اس کو چند ایسے تحفّظات کی ضرورت ہے جن سے اس کا نظم اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ برقرار رہے۔ اسلام میں یہ تحفظات تین قسم کے ہیں:

۱- اصلاحِ باطن

۲- تعزیری قوانین

www.kitabosunnat.com

۳- انسدادی تدابیر

یہ تینوں تحفظات نظامِ معاشرت کے مزاج اور مقاصد کی ٹھیک مناسبت ملحوظ رکھ کر تجویز کیے گئے ہیں اور مل جُل کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اصلاحِ باطن کے ذریعے سے انسان کی تربیت اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خود بخود اس نظامِ معاشرت کی اطاعت پر آمادہ ہو، عام اس سے کہ خارج میں کوئی طاقت اس کی اطاعت پر مجبور کرنے والی ہو یا نہ ہو۔

تعزیری قوانین کے ذریعے سے ایسے جرائم کا سدِّ باب کیا جاتا ہے جو اس نظام کو توڑنے اور اس کے ارکان کو منہدم کرنے والے ہوں۔

انسدادی تدابیر کے ذریعے سے اجتماعی زندگی میں ایسے طریقے رائج کیے گئے ہیں جو سوسائٹی کے ماحول کو غیر طبعی ہیجانات اور مصنوعی تحریکات سے پاک کر دیتے ہیں اور صنفی انتشار کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم سے جن لوگوں کی اصلاحِ باطن مکمل نہ ہوئی ہو، اور جن کو تعزیری قوانین کا خوف بھی نہ ہو، ان کی راہ میں یہ طریقے ایسی رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں کہ صنفی انتشار کی جانب میلان رکھنے کے باوجود اُن کے لیے عملی اقدام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہی وہ طریقے ہیں جو عورت اور مَرد کے دائروں کو عملاً الگ کرتے ہیں، خاندان کے نظم کو اس کی صحیح اسلامی صورت پر قائم کرتے ہیں اور اُن حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو عورتوں اور مَردوں کی زندگی میں امتیاز قائم رکھنے کے لیے اسلام نے مقرر کی ہیں۔

اصلاحِ باطن

اسلام میں اطاعتِ امر کی بنیاد کلیۃً ایمان پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص خدا اور اس کی کتاب اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہی شریعت کے اوامر و نواہی کا اصل مخاطب ہے اور اس کو اوامر کا مطیع اور نواہی سے مجتنب بنانے کے لیے صرف یہ علم ہو جانا کافی ہے کہ فلاں امر خدا کا امر ہے اور فلاں نہی خدا کی نہی ہے۔ پس جب ایک مومن کو خدا کی کتاب سے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ فحش اور بدکاری سے منع کرتا ہے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس سے پرہیز کرے اور اپنے دِل کو بھی اس کی طرف مائل ہونے سے پاک رکھے۔ اسی طرح جب ایک مومن عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول نے معاشرت میں اس کے لیے کیا حیثیت مقرر کی ہے تو اس کے بھی ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ برضا و رغبت اس حیثیت کو قبول کرے اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس لحاظ سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہدایات دینے سے پہلے ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور دلوں میں اس کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تو اصلاحِ باطن کا وہ اساسی ذریعہ ہے جس کا تعلق صرف اخلاقیات ہی سے نہیں بلکہ پورے نظامِ اسلامی سے ہے۔ اس کے بعد خاص کر اخلاق کے دائرے میں اسلام نے تعلیم و تربیت کا ایک نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

حیا: پہلے اشارۃً یہ کہا جا چکا ہے کہ زنا اور چوری اور جھوٹ اور تمام دوسرے معاصی، جن کا ارتکاب فطرتِ حیوانی کے غلبے سے انسان کرتا ہے، سب کے سب فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں۔ قرآن ایسے تمام افعال کو مُنکر کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

'منکر' کا لفظی ترجمہ 'مجہول' یا 'غیر معروف' ہے۔ ان افعال کو منکر کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایسے افعال ہیں جن سے فطرتِ انسانی آشنا نہیں ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جب انسان کی فطرت ان سے ناآشنا ہے اور حیوانی طبیعت اس پر زبردستی ہجوم کر کے اس کو ان افعال کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے، تو خود انسان ہی کی فطرت میں کوئی ایسی چیز بھی ہونی چاہیے جو تمام منکرات سے نفرت کرنے والی ہو۔ شارع حکیم نے اس چیز کی نشاندہی کر دی ہے۔ وہ اس کو 'حیا' سے تعبیر کرتا ہے۔

حیا کے معنی شرم کے ہیں۔ اسلام کی مخصوص اصطلاح میں حیا سے مراد وہ 'شرم' ہے جو کسی امرِ منکر کی جانب مائل ہونے والا انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور اپنے خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی حیا وہ قوت ہے جو انسان کو فحشا اور منکر کا اقدام کرنے سے روکتی ہے، اور اگر وہ جبلّتِ حیوانی کے غلبے سے کوئی بُرا فعل کر گزرتا ہے تو یہی چیز اس کے دِل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اِسلام کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حیا کے اسی چھپے ہوئے مادّے کو فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے نکال کر علم و فہم اور شعور کی غذا سے اس کی پرورش کرتی ہے اور مضبوط حاسّۂ اخلاقی بنا کر اس کو نفسِ انسانی میں ایک کوتوال کی حیثیت سے متعین کر دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس حدیثِ نبوی کی تفسیر ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقٌ، وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ[1] ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اِسلام کا اخلاق حیا ہے۔ اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ[2] جب تجھ میں حیا نہیں تو جو تیرا جی چاہے کر۔ کیوں کہ جب حیا نہ ہوگی تو خواہش جس کا مبدأ جبلّتِ حیوانی ہے تجھ پر غالب آ جائے گی اور کوئی منکر تیرے لیے منکر ہی نہ رہے گا۔

انسان کی فطری حیا ایک ایسے اَن گھڑ مادے کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ابھی کوئی صورت اختیار نہ کی ہو۔ وہ تمام منکرات سے بالطبع نفرت تو کرتی ہے مگر اس میں سوجھ بوجھ نہیں ہے، اس وجہ سے وہ نہیں جانتی کہ کسی خاص فعلِ منکر سے اس کو کس لیے نفرت ہے، یہی نادانستگی رفتہ رفتہ اس کے احساسِ نفرت کو کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ حیوانیت کے غلبے سے انسان منکرات کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس ارتکاب کی پیہم تکرار آخر کار حیا کے احساس کو بالکل باطل کر دیتی ہے۔ اِسلام کی اخلاقی تعلیم کا مقصد اسی نادانی کو دور کرنا ہے۔ وہ اس کو نہ صرف کھلے ہوئے منکرات سے روشناس کراتی ہے، بلکہ نفس کے چور خانوں تک میں نیتوں اور ارادوں اور خواہشوں کی جو بُرائیاں چھپی ہوتی ہیں ان کو بھی اس کے سامنے نمایاں کر دیتی ہے اور ایک ایک چیز کے مفسدوں سے اس قدر حساس بنا دیتی ہے کہ منکر کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اس سے مخفی نہیں رہتا اور نیت و خیال کی ذرا سی لغزش کو بھی وہ تنبیہ کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔

حیا کا دائرہ کار: اِسلامی اخلاقیات میں حیا کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ چنانچہ تمدّن و معاشرت کا جو شعبہ انسان کی صنفی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس میں بھی اِسلام نے اصلاحِ اخلاق کے لیے اسی چیز

۱- موطا کتاب الجامع، باب ماجاء فی الحیاء — ابن ماجہ، کتاب الزھد باب الحیا

۲- ابن ماجہ، کتاب الزھد باب الحیا— ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحیاء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے کام لیا ہے۔ وہ صنفی معاملات میں نفسِ انسانی کی نازک سے نازک چوریوں کو پکڑ کر حیا کو ان سے خبردار کرتا ہے اور ان کی نگرانی پر مامور کر دیتا ہے۔ یہاں ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

دل کے چور: قانون کی نظر میں زنا کا اطلاق صرف جسمانی اتّصال پر ہوتا ہے۔ مگر اخلاق کی نظر میں دائرۂ ازدواج کے باہر صنفِ مقابل کی جانب ہر میلان، ارادے اور نیت کے اعتبار سے زنا ہے۔ اجنبی کے حسن سے آنکھ کا لطف لینا، اس کی آواز سے کانوں کا لذّت یاب ہونا، اس سے گفتگو کرنے میں زبان کا لوچ کھانا، اس کے کوچے کی خاک چھاننے کے لیے قدموں کا بار بار اُٹھنا، یہ سب زنا کے مقدمات اور خود معنوی حیثیت سے زنا ہیں۔ قانون اس زنا کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہ دِل کا چور ہے اور صرف دِل ہی کا کوتوال اس کو گرفتار کر سکتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ اس کی مخبری اس طرح کرتی ہے:

اَلْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ وَ زِنَا هُمَا النَّظَرُ، وَالْيَدَانِ تَزْنِيَانِ وَ زِنَاهُمَا الْبَطْشُ، وَالرِّجْلَانِ تَزْنِيَانِ وَ زِنَاهُمَا الْمَشْىُ وَ زِنَااللِّسَانِ النُّطْقُ، وَ النَّفْسُ تَتَمَنّٰى وَ تَشْتَهِىْ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَالِكَ كُلَّهٗ اَوْ يُكَذِّبُهٗ (مسند احمد، ج ۲، ص ۳۴۳، السنن الکبری، ج ۷، ص ۸۹) آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کی زنا نظر ہے۔ اور ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا دست درازی ہے۔ اور پاؤں زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا اس راہ میں چلنا ہے اور زبان کی زنا گفتگو ہے اور دِل کی زنا تمنا اور خواہش ہے۔ آخر میں صنفی اعضا یا تو ان سب کی تصدیق کر دیتے ہیں یا تکذیب۔[1]

فتنۂ نظر: نفس کا سب سے بڑا چور نگاہ ہے، اس لیے قرآن اور حدیث دونوں سب سے پہلے اس کی گرفت کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور ۲۴: ۳۰-۳۱) اے نبی! مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو [غیر عورتوں کی دید سے] باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے اللہ باخبر ہے۔ اور اے نبی! مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو [غیر مردوں کی دید سے] باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے:

اِبْنَ اٰدَمَ لَكَ اَوَّلُ نَظْرَةٍ وَ اِيَّاكَ وَالثَّانِيَةَ (الجصاص، احکام القرآن للجصاص، ج ۳، سورۂ نور) آدم زادے! تیری پہلی نظر تو معاف ہے مگر خبردار دوسری نظر نہ ڈالنا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

يَا عَلِىُّ لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُوْلٰى وَ لَيْسَتْ لَكَ الْاٰخِرَةُ (ابو داؤد، کتاب النکاح، باب ما یؤمر به من غض البصر) اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نہ ڈالو۔ پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری نہیں۔[3] حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ: اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا: فوراً نظر پھیر لو۔ (ابو داؤد باب مذکور)[4]

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۹۸-۲۹۹، اشاعت سوم
۲، ۳۔ ایضاً ص ۳۰۰، ۴۔ ایضاً ص ۳۰۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جذبۂ نمایشِ حسن: اس فتنۂ نظر کا ایک شاخسانہ وہ بھی ہے جو عورت کے دِل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اس کا حسن دیکھا جائے۔ یہ خواہش ہمیشہ جلی اور نمایاں ہی نہیں ہوتی، دِل کے پردوں میں کہیں نہ کہیں نمایشِ حسن کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور وہی لباس کی زینت میں، بالوں کی آرایش میں، باریک اور شوخ کپڑوں کے انتخاب میں اور ایسے ایسے خفیف جزئیات تک میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ قرآن نے ان سب کے لیے ایک جامع اصطلاح تبرّجِ جاھلیّت استعمال کی ہے۔ ہر وہ زینت اور ہر وہ آرایش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے لذتِ نظر بننا ہو، تبرّجِ جاھلیّت کی تعریف میں آجاتی ہے۔ اگر برقع بھی اس غرض کے لیے خوبصورت اور خوش رنگ انتخاب کیا جائے کہ نگاہیں اس سے لذت یاب ہوں تو یہ بھی تبرّجِ جاھلیّت ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کا تعلق عورت کے اپنے ضمیر سے ہے۔ اس کو خود ہی اپنے دِل کا حساب لینا چاہیے کہ اس میں کہیں یہ ناپاک جذبہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ اس حکمِ خداوندی کی مخاطب ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ [الاحزاب ۳۳:۳۳] (اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں جس بناؤ سنگار کی نمایش کرتی پھرتی تھیں، وہ اب نہ کرو) جو آرایش ہر بُری نیت سے پاک ہو وہ اسلام کی آرایش ہے اور جس میں ذرہ برابر بھی بری نیت شامل ہو وہ جاہلیت کی آرایش ہے۔

فتنۂ زبان: شیطانِ نفس کا ایک دوسرا ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے ذریعے سے پیدا ہوتے اور پھیلتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں۔ کوئی بُرا جذبہ نمایاں نہیں ہے۔ مگر دِل کا چھپا ہوا چور آواز میں حلاوت، لہجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلاوٹ پیدا کیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے:

إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (الاحزاب ۳۳:۳۲) اگر تمھارے دِل میں خدا کا خوف ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دِل میں (بدنیتی کی) بیماری ہو، وہ تم سے کچھ اُمیدیں وابستہ کر لے گا۔ بات کرو تو سیدھے سادے طریقے سے کرو (جس طرح انسان انسان سے بات کیا کرتا ہے) [1]۔

یہی دِل کا چور ہے جو دوسروں کے جائز ناجائز صنفی تعلقات کا حال بیان کرنے میں بھی مزے لیتا ہے اور سننے میں بھی۔ اسی لطف کی خاطر عاشقانہ غزلیں کہی جاتی ہیں اور عشق و محبت کے افسانے جھوٹ سچ ملا کر جگہ جگہ بیان کیے جاتے ہیں اور سوسائٹی میں ان کی اشاعت اس طرح ہوتی ہے جیسے پولے پولے آنچ لگتی چل جائے۔ قرآن اس پر بھی تنبیہ کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (النور ۲۴:۱۹) جو لوگ چاہتے

۱- ضرورت پیش آنے پر کسی مرد سے بات کرنے میں مضائقہ نہیں ہے، لیکن ایسے مواقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو ایسا ہونا چاہیے جس سے بات کرنے والے مرد کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع بھی قائم کی جا سکتی ہے۔ اس کے لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، اس کی باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، اس کی آواز میں دانستہ کوئی شیرینی گھلی ہوئی نہ ہو جو سننے والے مرد کے جذبات میں انگیخت پیدا کر دے اور اسے آگے قدم بڑھانے کی ہمت دلائے۔ اس طرزِ گفتگو کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ یہ کسی ایسی عورت کو زیب نہیں دیتا جس کے دل میں خدا کا خوف اور بدی سے پرہیز کا جذبہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ فاسقات و فاجرات کا طرزِ کلام ہے نہ کہ مومنات متقیات کا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص۸۹، الاحزاب حاشیہ ۴۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ میں بے حیائی کی اشاعت ہو، ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔

فتنۂ زبان کے اور بھی بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبے میں دِل کا ایک نہ ایک چور اپنا کام کرتا ہے۔ اِسلام نے ان سب کا سراغ لگایا ہے اور ان سے خبردار کیا ہے۔ عورت کو اجازت نہیں کہ اپنے شوہر سے دوسری عورتوں کی کیفیات بیان کرے۔

لَا تُبَاشِرُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ حَتّٰى تَصِفَهَا لِزَوْجِهَا كَاَنَّهٗ يَنْظُرُ اِلَيْهَا (ترمذی، باب ما جاء فی کراھیة مباشرة المرأة بالمرأة)
عورت عورت سے خلا ملا نہ کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی کیفیت اپنے شوہر سے اسی طرح بیان کردے کہ گویا وہ خود اس کو دیکھ رہا ہے۔[1]

عورت اور مَرد دونوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ اپنے پوشیدہ ازدواجی معاملات کا حال دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کریں، کیوں کہ اس سے بھی فحش کی اشاعت ہوتی ہے اور دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ (ابوداؤد، باب من ذکر الرجل ما یکون من اصابته اھله)

نماز باجماعت میں اگر امام غلطی کرے، یا اس کو کسی حادثہ پر متنبہ کرنا ہو تو مَردوں کو سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ صرف دستک دیں زبان سے کچھ نہ بولیں۔ (ابو داؤد، باب التصفیق فی الصلوٰة، بخاری باب التصفیق للنسآء)

دیگر حرکات: بسا اوقات زبان خاموش رہتی ہے، مگر دوسری حرکات سے سامعہ کو متأثر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی نیت کی خرابی سے ہے اور اِسلام اس کی بھی ممانعت کرتا ہے:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ[1] (النور ۲۴:۳۱) اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے (یعنی جو زیور وہ اندر پہنے ہوئی ہیں) اس کا حال معلوم ہو (یعنی جھنکار سنائی دے)۔

فتنۂ خوشبو: خوشبو بھی ان قاصدوں میں سے ایک ہے جو ایک نفسِ شریر کا پیغام دوسرے نفسِ شریر تک پہنچاتے ہیں۔ یہ خبر رسانی کا سب سے زیادہ لطیف ذریعہ ہے، جس کو دوسرے تو خفیف ہی سمجھتے ہیں، مگر اِسلامی حیا اتنی حساس ہے کہ اس کی طبع نازک پر یہ لطیف تحریک بھی گراں ہے۔ وہ ایک مسلمان عورت کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ خوشبو میں بسے ہوئے کپڑے پہن کر راستوں سے گزرے یا محفلوں میں شرکت کرے، کیوں کہ اس کا حسن اور اس کی زینت پوشیدہ بھی رہی تو کیا فائدہ ہوا، اس کی عطریت تو فضا میں پھیل کر جذبات کو متحرک کر رہی ہے۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اَلْمَرْأَةُ اِذَا سْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِا لْمَجْلِسِ فَهِيَ كَذَا وَكَذَا يَعْنِيْ زَانِيَةً[2] (ترمذی، باب ما جاء فی کراھیة خروج المعطرة) نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو عورت عطر لگا کر لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔

اِذَا شَهِدَتْ اِحْدَاكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّ طِيْبًا[3] (مؤطا و مسلم) جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔

طِيْبُ الرِّجَالِ مَا ظَهَرَ رِيْحُهٗ وَ خَفِيَ لَوْنُهٗ، وَ طِيْبُ النِّسَآءِ مَا ظَهَرَ لَوْنُهٗ وَ خَفِيَ رِيْحُهٗ[4] (ترمذی، باب ما جاء فی

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵، ص ۳۰۰، اشاعت سوم
۲- ایضاً، ص ۳۳۶ ۳- ایضاً، ص ۳۳۵ ۴- ایضاً، ص ۳۳۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طیب الرجال والنسآء۔ ابو داؤد، ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابته اهله) مَردوں کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو۔ اور عورتوں کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کا رنگ نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔[1]

فتنۂ عریانی: ستر کے باب میں اسلام نے انسانی شرم وحیا کی جس قدر صحیح اور مکمل نفسیاتی تعبیر کی ہے اس کا جواب دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ آج دنیا کی مہذب ترین قوموں کا بھی یہ حال ہے کہ ان کے مَردوں اور عورتوں کو اپنے جسم کا کوئی حصّہ کھول دینے میں باک نہیں۔ ان کے ہاں لباس محض زینت کے لیے ہے، ستر کے لیے نہیں ہے۔ مگر اسلام کی نگاہ میں زینت سے زیادہ ستر کی اہمیت ہے۔ وہ عورت اور مَرد دونوں کو جسم کے وہ تمام حصّے چھپانے کا حکم دیتا ہے جس میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ عریانی ایک ایسی ناشائستگی ہے جس کو اسلامی حیا کسی حال میں بھی برداشت نہیں کرتی۔ غیر تو غیر اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہوں۔ [اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چند ہدایات آگے لباس اور ستر کے احکام میں آرہی ہیں]۔

اِذَا اَتٰی اَحَدُکُمْ اَهْلَهٗ فَلْيَسْتَتِرْ وَلَا يَتَجَرَّدْ تَجَرُّدَ الْعَيْرَيْنِ (ابن ماجه باب، التستر عندالجماع) جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس کو چاہیے کہ ستر کا لحاظ رکھے بالکل گدھوں کی طرح دونوں ننگے نہ ہو جائیں۔[2]

قَالَتْ عَائِشَةُ: مَا نَظَرْتُ اِلٰی فَرْجِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ (شمائل ترمذی، باب ما جاء فی حیاء رسول الله) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔[3]

اس سے بڑھ کر شرم وحیا یہ ہے کہ تنہائی میں بھی عریاں رہنا اسلام کو گوارا نہیں۔ اس لیے کہ اَللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُّسْتَحْيٰ مِنْهُ (ترمذی، باب حفظ العورة) اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔ حدیث میں آتا ہے:

اِيَّاكُمْ وَالتَّعَرِّیَ فَاِنَّ مَعَكُمْ مَنْ لَّا يُفَارِقُكُمْ اِلَّا عِنْدَ الْغَائِطِ وَ حِيْنَ يُفْضِی الرَّجُلُ اِلٰی اَهْلِهٖ فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَ اَكْرِمُوْهُمْ[4] (ترمذی، باب ما جاء فی الاستتار عندالجماع) خبردار! کبھی برہنہ نہ رہو کیوں کہ تمھارے ساتھ خدا کے فرشتے لگے ہوئے ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے بجز ان اوقات کے جن میں تم رفعِ حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو۔ لہٰذا تم ان

۱- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَمْنَعُوْا اِمَآءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ لِيَخْرُجْنَ وَهُنَّ تَفِلَاتٌ، (ابوداؤد۔ احمد) اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو، مگر وہ خوشبو لگا کر نہ آئیں۔ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد سے نکل کر جارہی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ اس کے پاس سے گزرے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے۔ انھوں نے اسے روک کر پوچھا: اے خدائے جبار کی بندی! کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ بولے: میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر غسلِ جنابت نہ کرلے☆ (ابو داؤد، ابن ماجه، احمد، نسائی)۔ ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذَا اسْتَعْطَرَتِ الْمَرْاَةُ فَمَرَّتْ عَلَی الْقَوْمِ لِيَجِدُوْا رِيْحَهَا فَهِیَ كَذَا وَ كَذَا قَالَ قَوْلًا شَدِيْدًا (ترمذی، ابو داؤد، نسائی)۔ جو عورت عطر لگا کر راستے سے گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے۔ آپؐ نے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے۔☆☆

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵ ص۲۹۶، اشاعت سوم ۳- ایضاً ۴- ایضاً ص۲۹۷

☆- تفہیم الاحادیث، ج۳، ص۱۲۲-۱۲۳ ☆☆- ایضاً ص۱۲۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے شرم کرو اور ان کی عزت کا لحاظ رکھو۔

اِسلام کی نگاہ میں وہ لباس درحقیقت لباس ہی نہیں ہے جس میں سے بدن جھلکے اور ستر نمایاں ہو:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: نِسَآءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيْلاتٌ مَائِلاتٌ رُؤُوْسُهُنَّ كَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا (مسلم، باب النسآء الكاسيات العاريات) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہیں اور دوسروں کو رجھائیں اور خود دوسروں پر ریجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ جنت میں ہرگز نہ ہوں گی اور نہ اس کی بو پائیں گی۔[1]

ہم نے صِرف چند مثالیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ ان سے اِسلام کے معیارِ اخلاق اور اس کی اخلاقی اسپرٹ کا اندازہ ہو جائے۔ اِسلام سوسائٹی کے ماحول اور اس کی فضا کو فحشاء و منکر کی تمام تحریکات سے پاک کر دینا چاہتا ہے۔ ان تحریکات کا سرچشمہ انسان کے باطن میں ہے۔ فحشاء و منکر کے جراثیم وہیں پرورش پاتے ہیں اور وہیں سے ان چھوٹی چھوٹی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے جو آگے چل کر فساد کی موجب بنتی ہیں۔ جاہل انسان ان کو خفیف سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، مگر حکیم کی نگاہ میں دراصل وہی اخلاق و تمدن و معاشرت کو تباہ کر دینے والی خطرناک بیماریوں کی جڑ ہیں۔ لہٰذا اِسلام کی تعلیم اخلاق باطن ہی میں حیا کا اتنا زبردست احساس پیدا کر دینا چاہتی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا احتساب کرتا رہے۔ اور بُرائی کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اگر پایا جائے تو اس کو محسوس کر کے وہ آپ ہی اپنی قوتِ ارادی سے اس کا استیصال کر دے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۷۔ ۲۷۲)

...........OOO...........

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۹۷، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

تعزیری قوانین

اسلام کے تعزیری قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان کو سیاست کے شکنجے میں اس وقت تک نہ کسا جائے جب تک وہ نظامِ تمدّن کو برباد کرنے والی کسی حرکت کا بالفعل مرتکب نہ ہو جائے۔ مگر جب وہ ایسا کر گزرے تو پھر اس کو خفیف سزائیں دے دے کر گناہ کرنے اور سزا بھگتنے کا خوگر بنانا درست نہیں ہے۔ ثبوتِ جرم کی شرائط بہت سخت رکھو[1]۔ لوگوں کو حدودِ قانون کی زد میں آنے سے جہاں تک ممکن ہو بچاؤ[2]۔ مگر جب کوئی شخص قانون کی زد میں آ جائے تو اسے ایسی سزا دو کہ نہ صرف وہ خود اس جرم کے اعادے سے عاجز ہو جائے، بلکہ دوسرے ہزاروں انسان بھی جو اس فعل کی جانب اقدام کرنے والے ہوں اس عبرت ناک سزا کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں۔ کیوں کہ قانون کا مقصد سوسائٹی کو جرائم سے پاک کرنا ہے نہ یہ کہ لوگ بار بار جرم کریں اور بار بار سزا بھگتیں۔

نظامِ معاشرت کی حفاظت کے لیے اسلامی تعزیرات نے جن افعال کو جرمِ مستلزمِ سزا قرار دیا ہے وہ صرف دو ہیں۔ ایک زِنا، دوسرے قَذف (یعنی کسی پر زنا کی تہمت لگانا)۔

حدِ زِنا

زنا کے متعلق ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے یہ فعل انسان کی انتہائی پستی کا نتیجہ ہے۔ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ دراصل اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کی انسانیت حیوانیت سے مغلوب ہو چکی ہے اور وہ انسانی سوسائٹی کا ایک صالح رکن بن کر نہیں رہ سکتا۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ ان عظیم ترین جرائم میں سے ایک ہے جو انسانی تمدّن کی عین

۱- اسلامی قانونِ شہادت میں ثبوتِ جرم کی شرائط عموماً نہایت سخت ہیں، مگر جرمِ زنا کے ثبوت کی شرطیں سب سے زیادہ سخت رکھی گئی ہیں۔ عام طور پر تمام معاملات کے لیے اسلامی قانون صرف دو گواہوں کو کافی سمجھتا ہے مگر زنا کے لیے کم از کم چار گواہ ضروری قرار دیے گئے ہیں۔

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ کَانَ لَهٗ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهٗ، فَاِنَّ الْاِمَامَ یُخْطِئُ فِی الْعَفْوِ خَیْرٌ مِنْ اَنْ یُخْطِئَ فِی الْعُقُوْبَةِ (ترمذی، ابواب الحدود۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، ج۵، ص۳۸۲) مسلمانوں کو سزا سے بچاؤ جہاں تک ممکن ہو۔ اگر مجرم کے لیے براءت کی کوئی صورت ہو تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ امام کا معاف کرنے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بنیاد پر حملہ کرتے ہیں۔ ان وجوہ سے اِسلام نے اس کو بجائے خود ایک قابلِ تعزیر گناہ قرار دیا ہے خواہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا جرم مثلاً جبر واکراہ یا کسی شخصِ غیر کی حق تلفی شریک ہو یا نہ ہو۔ قرآنِ مجید کا حُکم یہ ہے کہ

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور ۲:۲۴) زناکار عورت اور زناکار مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور قانونِ الٰہی کے معاملے میں تم کو ان پر ہرگز رحم نہ کھانا چاہیے، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب ان کو سزا دی جائے تو مسلمانوں میں سے ایک جماعت ان کو دیکھنے کے لیے حاضر رہے۔

اس باب میں اِسلامی قانون اور مغربی قانون میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ مغربی قانون زنا کو بجائے خود کوئی جرم نہیں سمجھتا۔ اس کی نگاہ میں یہ فعل صِرف اس وقت جرم ہوتا ہے جب کہ اس کا ارتکاب جبر واکراہ کے ساتھ کیا جائے یا کسی ایسی عورت کے ساتھ کیا جائے جو دوسرے شخص کے نکاح میں ہو۔ بالفاظِ دیگر اس قانون کے نزدیک زنا خود جرم نہیں ہے بلکہ جرم دراصل جبر یا حق تلفی ہے۔ بخلاف اس کے اِسلامی قانون کی نظر میں یہ فعل خود ایک جرم ہے اور جبر واکراہ یا حقِ غیر میں مداخلت سے اس پر ایک اور جرم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے سزا کے باب میں بھی دونوں کے طریقے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مغربی قانون زنا بالجبر میں صِرف سزائے قید پر اکتفا کرتا ہے اور منکوحہ عورت کے ساتھ زنا کرنے پر عورت کے شوہر کو صِرف تاوان کا مستحق قرار دیتا ہے۔ یہ سزا جرم روکنے والی نہیں، بلکہ لوگوں کو اور جرأت دلانے والی ہے۔ اسی لیے ان ممالک میں جہاں یہ قانون رائج ہے، زنا کا ارتکاب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں اِسلامی قانون زنا پر ایسی سخت سزا دیتا ہے جو سوسائٹی کو اس جرم اور ایسے مجرموں سے ایک مدّت کے لیے پاک کر دیتی ہے۔ جن ممالک میں زنا پر یہ سزا دی گئی ہے وہاں اس فعل کا ارتکاب کبھی عام نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ حدِ شرعی جاری ہو جائے، پھر پورے ملک کی آبادی پر ایسی ہیبت چھا جاتی ہے کہ برسوں تک کوئی شخص اس کے ارتکاب کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ مجرمانہ میلانات رکھنے والوں کے ذہن پر ایک طرح کا نفسیاتی آپریشن ہے جس سے ان کے نفس کی خود بخود اصلاح ہو جاتی ہے۔

مغربی ضمیر سو کوڑوں کی سزا پر نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ انسان کو جسمانی تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے اخلاقی شعور کا نشوونما ابھی تک ناقص ہے۔ وہ زنا کو پہلے صِرف ایک عیب سمجھتا تھا اور اب اسے محض ایک کھیل، ایک تفریح سمجھتا ہے جس سے دو انسان تھوڑی دیر کے لیے اپنا دِل بہلا لیتے ہیں۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ قانون اس فعل سے رواداری برتے اور اس وقت تک کوئی باز پرس نہ کرے جب تک کہ زانی دوسرے شخص کی آزادی یا اس کے قانونی حقوق میں خلل انداز نہ ہو۔ پھر اس میں خلل اندازی کی صورت میں بھی وہ اس کو ایسا جرم سمجھتا ہے جس سے بس ایک ہی شخص کے حقوق متاثر ہوتے ہیں، اس لیے معمولی سزا یا تاوان اس کے نزدیک ایسے جرم کی کافی سزا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص زنا کا یہ تصور رکھتا ہو وہ اس فعل پر سو کوڑوں کی سزا کو ایک ظالمانہ سزا ہی سمجھے گا۔ مگر جب اس کا اخلاقی و اجتماعی شعور ترقی کرے گا اور اس کو معلوم ہو گا کہ زنا خواہ بالرضا ہو یا بالجبر، اور خواہ بیاہی ہوئی عورت کے ساتھ ہو یا بن بیاہی کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ، بہر حال وہ ایک اجتماعی جرم ہے۔ اور پوری سوسائٹی پر اس کے نقصانات عائد ہوتے ہیں، تو سزا کے متعلق بھی اس کا نظریہ خود بخود بدل جائے گا۔ اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ سوسائٹی کو ان نقصانات سے بچانا ضروری ہے۔ اور چوں کہ زنا کی تحریک کرنے والے اسباب انسان کی حیوانی جبلت میں نہایت گہری جڑیں رکھتے ہیں اور ان جڑوں کو محض قید و بند اور مالی تاوان کے زور سے نہیں اکھاڑا جا سکتا، لہٰذا اس کا سدِ باب کرنے کے لیے شدید تدابیر استعمال کیے بغیر چارہ نہیں۔ ایک شخص یا دو شخصوں کو شدید جسمانی آزار پہنچا کر لاکھوں اشخاص کو بے شمار اخلاقی اور عمرانی مضرتوں سے بچا دینا اس سے بہتر ہے کہ مجرموں کو تکلیف سے بچا کر ان کی پوری قوم کو ایسے نقصانات میں مبتلا کیا جائے جو آنے والی بے گناہ نسلوں تک بھی متوارث ہونے والے ہوں۔

سو کوڑوں کی سزا کو ظالمانہ قرار دینے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو مغربی تہذیب کی بنیادوں پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اس تہذیب کی ابتدا ہی جماعت کے مقابلے میں فرد کی حمایت کے جذبہ سے ہوئی ہے اور اس کا سارا خمیر انفرادی حقوق کے ایک مبالغہ آمیز تصور سے تیار ہوا ہے۔ اس لیے فرد خواہ جماعت پر کتنا ہی ظلم کرے، اہلِ مغرب کو کچھ زیادہ ناگوار نہیں ہوتا، بلکہ اکثر حالات میں وہ اسے بخوشی گوارا کر لیتے ہیں۔ البتہ جماعتی حقوق کی حفاظت کے لیے جب فرد پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کی ساری ہمدردیاں جماعت کے بجائے فرد کے ساتھ ہوتی ہیں۔ علاوہ بریں تمام اہلِ جاہلیت کی طرح جاہلیتِ مغرب کے پیروؤں کی بھی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معقولات کے بجائے محسوسات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جو نقصان ایک فرد پر مرتب ہوتا ہے وہ چوں کہ محدود شکل میں محسوس طور پر ان کے سامنے آتا ہے اس لیے وہ اسے ایک امرِ عظیم سمجھتے ہیں۔ بخلاف اس کے وہ اس نقصان کی اہمیت کا ادراک نہیں کر سکتے جو وسیع پیمانے پر تمام سوسائٹی اور اس کی آئندہ نسلوں کو پہنچتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی وسعت اور اپنی دُور رسی کی بنا پر محسوس نہیں ہوتا۔

حدِ قذف

زنا کے جو نقصانات ہیں انھی سے ملتے جلتے نقصانات تُہمتِ زنا (قذف) کے بھی ہیں۔ کہ یہ شریف عورت پر زنا کی جھوٹی تُہمت لگانا تنہا اس ایک کے لیے بدنامی کا موجب نہیں، بلکہ اس سے خاندانوں میں دشمنی پھیلتی ہے، انساب مُشتبہ ہوتے ہیں، ازدواجی تعلقات میں خرابی واقع ہوتی ہے اور ایک شخص محض ایک مرتبہ زبان ہلا کر بیسیوں انسانوں کو برسوں کے لیے مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔ قرآن نے اس جرم کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور ۲۴:۴) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں پھر چار گواہ اس کے ثبوت میں پیش نہ کریں ان کو اسی کوڑے لگاؤ اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، ایسے لوگ خود ہی بدکار ہیں۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء ص ۲۷۷-۲۷۸)

...........OOO...........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

انسدادی تدابیر

اس طرح اِسلام کا قانونِ فوجداری اپنی سیاسی طاقت سے ایک طرف تو بدکاری کو زبردستی روک دیتا ہے، اور دوسری طرف سوسائٹی کے شریف ارکان کو بدنیت لوگوں کی بدزبانی سے بھی محفوظ کر دیتا ہے۔ اِسلام کی اخلاقی تعلیم انسان کو اندر سے درست کرتی ہے تاکہ اس میں بدی اور گناہ کی طرف رجحان ہی پیدا نہ ہو، اور اس کا تعزیری قانون اس کو باہر سے درست کرتا ہے تاکہ اخلاقی تربیت کے ناقص رہ جانے سے اگر اس قسم کے رجحانات پیدا ہو جائیں اور قوت سے فعل میں آنے لگیں، تو ان کو بجبر روک دیا جائے۔

ان دونوں تدبیروں کے درمیان چند مزید تدبیریں اس غرض کے لیے اختیار کی گئی ہیں کہ اصلاحِ باطن کی اخلاقی تعلیم کے لیے مددگار ہوں۔ ان تدبیروں سے نظامِ معاشرت کو اس طرح درست کیا گیا ہے کہ اخلاقی تربیت کے نقائص سے جو کمزوریاں افرادِ جماعت میں باقی رہ جائیں ان کو ترقی کرنے اور قوت سے فعل میں آنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ سوسائٹی میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں برے میلانات کو نشوونما دینے والی آب و ہوا مفقود ہو، ہیجان انگیز تحریکات ناپید ہوں، صنفی انتشار کے اسباب انتہائی حد تک کم ہو جائیں اور ایسی تمام صورتوں کا سدِ باب ہو جائے جن سے نظامِ تمدن میں برہمی پیدا ہونے کا امکان ہو۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان تدبیروں میں سے ایک ایک کو بیان کرتے ہیں۔

مَردوزن کے باہمی اختلاط کی ممانعت

آپؐ نے عورتوں اور مَردوں کے اختلاط کو روکنے کی عملاً بھی کوشش فرمائی اور قولاً بھی اس سے منع فرمایا۔ اِسلامی زندگی میں جمعہ اور جماعت کی جو اہمیت ہے، کسی صاحبِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ جمعہ کو اللہ نے خود فرض کیا ہے اور نماز باجماعت کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عذر مسجد میں حاضر نہ ہو اور اپنے گھر میں نماز پڑھے تو نبی ﷺ کے قول کے مطابق اس کی نماز مقبول ہی نہیں ہوتی (ابوداؤد، ابنِ ماجہ، دار قطنی، حاکم، بروایت ابن عباس)۔ لیکن نبی ﷺ نے عورتوں کو جمعہ کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا (ابوداؤد بروایتِ امِ عطیہ، دارِ قطنی و بیہقی بروایتِ جابر، ابو داؤد و حاکم بروایتِ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طارق بن شہاب)۔ اور نماز با جماعت میں عورتوں کی شرکت نہ صرف یہ کہ لازم نہیں رکھی، بلکہ اس کی اجازت ان الفاظ میں دی کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انھیں روکو نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرمادی کہ ان کے لیے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَمْنَعُوْٓا اِمَآءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہِ، اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو (ابوداؤد)۔ دوسری روایات ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ اور ان سے ملتے جلتے الفاظ میں ہیں اِئْذَنُوْا لِلنِّسَآءِ اِلَی الْمَسَاجِدِ بِاللَّیْلِ[1] عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد)۔ اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے کہ لَا تَمْنَعُوا نِسَآئَکُمُ الْمَسَاجِدَ وَ بُیُوْتُھُنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ[2] اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روکو نہیں، اگرچہ ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں (احمد، ابوداؤد)۔ اُمِ حُمَید ساعدیہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ مجھے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ فرمایا: تمھارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور تمھارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلّے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمھارا اپنے محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے (احمد، طبرانی)۔ قریب قریب اِسی مضمون کی روایت ابوداؤد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں خَیْرُ مَسَاجِدِ النِّسَآءِ قَعْرُ بُیُوْتِھِنَّ،[3] عورتوں کے لیے بہترین مسجد ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں (احمد، طبرانی)، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دور بنی امیہ کی حالت دیکھ کر فرماتی ہیں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جواب ہیں تو ان کا مسجدوں میں آنا اسی طرح بند فرمادیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کیا گیا تھا (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے داخل ہونے کے لیے ایک الگ دروازہ مخصوص کر دیا تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دورِ حکومت میں مَردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی سخت ممانعت فرماتے تھے (ابوداؤد، باب اعتزال النسآء فی المساجد اور باب ما جاء فی خروج النسآء الی المساجد)۔ جماعت میں عورتوں کی صفیں مَردوں سے پیچھے رکھی جاتی تھیں اور نماز کے خاتمے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد کچھ دیر توقف فرماتے تھے تاکہ مَردوں کے اٹھنے سے پہلے عورتیں اٹھ کر چلی جائیں (احمد و بخاری، بروایت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا)۔ آپ کا ارشاد تھا کہ مَردوں کی بہترین صف سب سے آگے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے پیچھے (یعنی عورتوں سے قریب) کی صف۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے پیچھے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے آگے کی (یعنی مَردوں کے قریب کی) صف ہے (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد) عیدین کی نماز میں عورتیں شریک ہوتی تھیں، مگر ان کی جگہ مَردوں سے الگ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبے کے بعد عورتوں کی طرف جا کر ان کو الگ خطاب فرماتے تھے (ابوداؤد، بروایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔ بخاری و مسلم بروایت ابن عباسؓ)۔ ایک مرتبہ مسجد نبوی کے باہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ راستے میں مَرد اور عورت سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس پر آپؐ نے عورتوں سے فرمایا: اِسْتَأْخِرْنَ فَاِنَّہٗ لَیْسَ لَکُنَّ اَنْ تَحْتَضِنَّ الطَّرِیْقَ، عَلَیْکُنَّ بِحَافَاتِ الطَّرِیْقِ،[4] ٹھیر جاؤ، تمھارے لیے سڑک کے بیچ میں چلنا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۳۱-۳۳۳

۲- ایضاً، ج ۵، ص ۳۳۰

۳- ایضاً، ج ۳، ص ۱۲۶

۴- ج ۳، ص ۱۲۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

درست نہیں ہے، کنارے پر چلو۔ یہ ارشاد سنتے ہی عورتیں کنارے ہو کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں (ابو داؤد)۔

ان احکام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجلس اسلام کے مزاج سے کیسی سخت مغایرت رکھتی ہے۔ جو دین خدا کے گھر میں عبادت کے موقع پر بھی دونوں صنفوں کو خلط ملط نہیں ہونے دیتا اس کے متعلق کون تصور کر سکتا ہے کہ وہ کالجوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور جلسوں میں اسی اختلاط کو جائز رکھے گا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۳۹۵-۳۹۶، النور، حاشیہ ۴۹)

[اُوپر کی ہدایات پر غور کریں] تو ربّ العٰلمین کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں خواہ مخواہ اپنی آواز یا اپنے زیوروں کی جھنکار غیر مردوں کو نہ سنائیں اور اگر بضرورت اجنبیوں سے بولنا پڑ جائے تو پوری احتیاط کے ساتھ بات کریں۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ نیز اگر نماز باجماعت میں کوئی عورت موجود ہو اور امام کوئی غلطی کرے تو مرد کی طرح سبحان اللہ کہنے کی اُسے اجازت نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام متنبّہ ہو جائے۔

اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دِین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلاضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آ کر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سُریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (air hostess) بنائی جائیں اور انھیں خاص طور پر مسافروں کا دِل لُبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بَن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گُھل مِل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے۔ اس میں کہیں اس کلچر کی گنجایش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۸۹-۹۰، الاحزاب، حاشیہ ۴۷)

لباس اور ستر کے احکام

احکامِ معاشرت کے سلسلے میں اِسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ اس نے برہنگی کا استیصال کیا اور مردوں اور عورتوں کے لیے ستر کے حدود مقرر کر دیے۔ اس معاملے میں عرب جاہلیت کا جو حال تھا، آج کل کی مہذب ترین قوموں کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف ننگے ہو جاتے تھے[1]۔ غسل اور قضائے حاجت میں پردہ کرنا ان کے

---

[1] حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مِسوَر بن مخرمہ ایک پتھر اٹھائے آ رہے تھے۔ راستے میں تہ بند کھل کر گر پڑا اور وہ اسی حال میں پتھر اٹھائے چلے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ جاؤ پہلے اپنا جسم ڈھانکو اور ننگے نہ پھرا کرو (مسلم، باب الاعتناء بحفظ العورۃ)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نزدیک غیر ضروری تھا۔ کعبے کا طواف بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا تھا اور اسے ایک اچھی عبادت سمجھا جاتا تھا[1]۔ عورتیں تک طواف کے وقت برہنہ ہو جاتی تھیں[2]۔ ان کی عورتوں کا لباس ایسا تھا جس میں سینے کا کچھ حصّہ کھلا رہتا تھا اور بازو اور پنڈلیوں کے بھی بعض حصّے کھل جاتے تھے[3]۔ بالکل یہی کیفیت آج یورپ امریکہ اور جاپان کی بھی ہے۔ اور مشرقی ممالک میں بھی کوئی دوسرا نظامِ معاشرت ایسا نہیں ہے جس میں کشف و ستر کے حدود باقاعدہ مقرر کیے گئے ہوں۔ اِسلام نے اس باب میں انسان کو تہذیب کا پہلا سبق سکھایا۔ اس نے بتایا کہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ (الاعراف ۲۶:۷) اے اولادِ آدم! اللہ نے تم پر لباس اسی لیے اتارا ہے کہ تمھارے جسموں کو ڈھانکے اور تمھارے لیے موجبِ زینت ہو۔

اس آیت کی رُو سے جسم ڈھانکنے کو ہر مرد و عورت کے لیے فرض کر دیا گیا۔ نبی ﷺ نے سخت احکام دیے کہ کوئی شخص کسی کے سامنے برہنہ نہ ہو:

مَلْعُوْنٌ مَّنْ نَّظَرَ اِلٰی سَوْأَةِ اَخِيْهِ[4] (احکام القرآن للجصّاص) ملعون ہے وہ جو اپنے بھائی کے ستر پر نظر ڈالے۔

لَايَنْظُرِ الرَّجُلُ اِلٰی عَوْرَةِ الرَّجُلِ وَلَا الْمَرْأَةُ اِلٰی عَوْرَةِ الْمَرْأَةِ[5] (مسلم، باب تحریم النظر الی العورات) کوئی مرد کسی مرد کو اور کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے۔

لَاَنْ اُخِرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَانْقَطِعَ نِصْفَيْنِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَنْظُرَ اِلٰی عَوْرَةِ اَحَدٍ اَوْ يَنْظُرَ اِلٰی عَوْرَتِيْ[6] (المبسوط، کتاب الاستحسان) خدا کی قسم! میں آسمان سے پھینکا جاؤں اور میرے دو ٹکڑے ہو جائیں، یہ میرے لیے زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ میں کسی کے پوشیدہ مقام کو دیکھوں یا کوئی میرے پوشیدہ مقام کو دیکھے۔

اِيَّاكُمْ وَ التَّعَرِّيْ فَاِنَّ مَعَكُمْ مَنْ لَّا يُفَارِقُكُمْ اِلَّا عِنْدَ الْغَآئِطِ وَ حِيْنَ يُفْضِيْ الرَّجُلُ اِلٰی اَهْلِهٖ فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَ اَكْرِمُوْهُمْ[7] (ترمذی، باب ماجاء فی الاستتار) خبردار کبھی برہنہ نہ رہو، کیونکہ تمھارے ساتھ وہ ہے جو تم سے کبھی جُدا نہیں ہوتا، سوائے قضائے حاجت اور مباشرت کے وقت کے۔ لہٰذا تم ان سے شرم کرو اور ان کی عزّت کا لحاظ رکھو۔

اِذَا اَتٰی اَحَدُكُمْ اَهْلَهٗ فَلْيَسْتَتِرْ وَلَا يَتَجَرَّدْ تَجَرُّدَ الْعَيْرَيْنِ[8] (ابن ماجه، باب التستر عند الجماع) جب تم میں سے کوئی

۱- ابنِ عباسؓ، مجاہد، طاؤس اور زُہری کی متفقہ روایت ہے کہ کعبہ کا طواف برہنگی کی حالت میں کیا جاتا تھا۔

۲- مسلم، کتاب التفسیر میں عرب کی یہ رسم بیان کی گئی ہے کہ ایک عورت برہنہ ہو کر طواف کرتی۔ پھر حاضرین سے کہتی کہ ''کون مجھے ایک کپڑا دیتا ہے کہ میں اس سے اپنا بدن ڈھانکوں''۔ اس طرح مانگنے والی کو کپڑا دینا ایک ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔

۳- تفسیر کبیر، آیة وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُيُوْبِهِنَّ (النور ۳۱:۲۴)

۴- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۹۳

۵- ایضاً

۶- ایضاً

۷- ایضاً، ج ۵، ص ۲۹۶

۸- ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت بھی ستر ڈھانکے اور بالکل گدھوں کی طرح ننگا نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ زکوٰۃ کے اونٹوں کی چراگاہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ان کا چرواہا جنگل میں ننگا لیٹا ہے۔ آپؐ نے اسی وقت اسے معزول کر دیا اور فرمایا: لَا يَعْمَلُ لَنَا مَنْ لَّا حَيَاءَ لَهٗ[1] جو شخص بے شرم ہے وہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔

مَردوں کے لیے ستر کے حدود: ان احکام کے ساتھ عورتوں اور مَردوں کے لیے جسم ڈھانکنے کے حدود بھی الگ الگ مقرر کیے گئے۔ اصطلاح شرعی میں جسم کے اس حصّے کو ستر کہتے ہیں، جس کو ڈھانکنا فرض ہے۔ مَردوں کے لیے ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصّہ 'ستر' قرار دیا گیا اور حُکم دیا گیا کہ اس کو نہ کسی کے سامنے کھولیں اور نہ کسی دوسرے شخص کے اس حصّے پر نظر ڈالیں۔

عَنْ اَبِیْ اَیُوْبَ الْاَنْصَارِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَا فَوْقَ الرُّكْبَتَيْنِ مِنَ الْعَوْرَةِ وَ اَسْفَلَ مِنَ السُّرَّةِ مِنَ الْعَوْرَةِ[2] (دار قطنی) جو کچھ گھٹنے کے اُوپر ہے وہ چھپانے کے لائق ہے اور جو کچھ ناف سے نیچے ہے وہ چھپانے کے لائق ہے۔

عَوْرَةُ الرَّجُلِ مَا بَيْنَ سُرَّتِهٖ اِلٰى رُكْبَتِهٖ[3] (مبسوط) مَرد کے لیے ناف سے گھٹنے تک کا حصّہ چھپانے کے لائق ہے۔

عَنْ عَلِيِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَا تُبْرِزْ فَخِذَكَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى فَخِذِ حَيٍّ وَّلَا مَيِّتٍ[4] (تفسیر کبیر، آیۃ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۔النور ۲۴:۳۰) اپنی ران کو کسی کے سامنے نہ کھول اور نہ کسی زندہ شخص یا مُردہ شخص کی ران پر نظر ڈال[5]۔

یہ حُکم عام ہے جس سے بیویوں کے سوا اور کوئی مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ اَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ[6] (احکام القرآن للجصاص، جلد سوم، ص ۳۷۲) اپنے ستر کی حفاظت کرو بجز اپنی بیویوں کے اور اُن لونڈیوں کے جو تمھارے تصرّف میں ہوں[7]۔

عورتوں کے لیے ستر کے حدود: عورتوں کے لیے ستر کے حدود اس سے زیادہ وسیع رکھے گئے ہیں۔ ان کو حُکم دیا گیا کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو تمام لوگوں سے چھپائیں۔ اس حُکم میں باپ، بھائی اور تمام رشتہ دار مَرد شامل ہیں۔ اور شوہر کے سوا کوئی مَرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۲۹۴ ۲- ایضاً

۳- ایضاً ۴- ایضاً

۵- اور حضرت جَرہَد اسلمیؓ جو اصحابِ صفہ میں سے ایک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کھلی ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ؟ کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کے قابل چیز ہے؟ (ترمذی، ابو داؤد، مؤطا، بحوالہ: تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۳، النور حاشیہ ۳۰)

۶- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۹۵

۷- ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ اَوْ مَامَلَكَتْ يَمِيْنُكَ، اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لونڈی کی سوا ہر ایک سے محفوظ رکھو۔ سائل نے پوچھا: اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا: فَاللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى اَحَقُّ اَنْ يُّسْتَحْيَا مِنْهُ، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ بحوالہ: تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۳، النور حاشیہ ۳۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لَا یَحِلُّ لِامْرَأَۃٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تَخْرُجَ یَدَیْھَا اِلَّا اِلٰی ھٰھُنَا وَ قَبَضَ نِصْفَ الذِّرَاعِ[1] (ابن جریر) نبی ﷺ نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو، جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا ہاتھ اس سے زیادہ کھولے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی کلائی کے نصف حصے پر ہاتھ رکھا۔

اَلْجَارِیَۃُ اِذَا حَاضَتْ لَمْ یَصْلُحْ اَنْ یُرٰی مِنْھَا اِلَّا وَجْھُھَا وَ یَدَاھَا اِلَی الْمَفْصَلِ[2] (ابوداؤد) جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آنا چاہیے سوائے چہرے اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے بھتیجے عبداللہ بن الطفیل کے سامنے زینت کے ساتھ آئی تو نبی ﷺ نے اس کو ناپسند کیا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ تو میرا بھتیجا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

اِذَا عَرَقَتِ الْمَرْأَۃُ لَمْ یَحِلَّ لَھَا اَنْ تُظْھِرَ اِلَّا وَجْھَھَا اِلَّا مَادُوْنَ ھٰذَا وَ قَبَضَ عَلٰی ذِرَاعِ نَفْسِہٖ فَتَرَکَ بَیْنَ قَبْضَتِہٖ وَ بَیْنَ الْکَفِّ مِثْلَ قَبْضَتِہٖ اُخْرٰی[3] (ابن جریر) جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور سوائے اس کے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ باقی تھی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا جو آنحضرت ﷺ کی سالی تھیں، ایک مرتبہ آپ کے سامنے باریک لباس پہن کر حاضر ہوئیں۔ اس حال میں کہ جسم اندر سے جھلک رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فوراً نظر پھیر لی اور فرمایا:

یَآ اَسْمَآءُ اِنَّ الْمَرْأَۃَ اِذَا بَلَغَتِ الْمَحِیْضَ لَمْ یَصْلُحْ اَنْ یُرٰی مِنْھَا اِلَّا وَھٰذَا وَ اَشَارَ اِلٰی وَجْھِہٖ وَ کَفِّہٖ[4] (تکملۃ فتح القدیر) اے اسماءؓ! عورت جب سن بلوغ کو پہنچ جائے تو درست نہیں کہ اس کے جسم میں سے کچھ دیکھا جائے بجز اس کے اور اس کے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

حفصہ بنت عبدالرحمان رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ ایک باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو پھاڑ دیا اور ایک موٹی اوڑھنی ان پر ڈالی۔ (مؤطا امام مالک)

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ لَعَنَ اللّٰہُ الْکَاسِیَاتِ الْعَارِیَاتِ[5]، اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی کی ننگی رہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اپنی عورتوں کو ایسے کپڑے نہ پہناؤ جو جسم پر اس طرح چست ہوں کہ سارے جسم کی ہیئت نمایاں ہو جائے۔ (المبسوط، کتاب الاستحسان)

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۷۸-۲۸۵)

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۲۸۱

۲- ایضاً، ج ۵، ص ۲۸۱

۳- ایضاً، ج ۵، ص ۲۸۱

۴- ایضاً، ج ۵، ص ۲۸۲

۵- ایضاً، ج ۵، ص ۲۹۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عورت کے لیے عورت کے حدود ستر: اور عورت کے لیے عورت کے ستر کے حدود وہی ہیں جو مرد کے لیے مرد کے ستر کے ہیں، یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے سامنے عورت نیم برہنہ رہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ڈھانکنا فرض ہے اور دوسرے حصوں کا ڈھانکنا فرض نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم ص ۳۸۵، النور حاشیہ ۳۲)

[مذکورہ بالا] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم ستر میں داخل ہے، جس کو اپنے گھر میں اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی چھپانا اس پر واجب ہے۔ وہ شوہر کے سوا کسی کے سامنے اپنے ستر کو نہیں کھول سکتی، خواہ وہ اس کا باپ، بھائی، یا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ ایسا باریک لباس بھی نہیں پہن سکتی جس میں ستر نمایاں ہوتا ہو[1]۔

اس باب میں جتنے احکام ہیں وہ سب جوان عورت کے لیے ہیں۔ ستر کے احکام اس وقت سے عائد ہوتے ہیں جب سے عورت سنِ رشد کے قریب پہنچ جائے اور اس وقت تک نافذ رہتے ہیں جب تک اس میں صنفی کشش باقی رہے۔ اس عمر سے گزر جانے کے بعد ان میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ (النور ۲۴:۶۰) اور بڑی بوڑھی عورتیں جو نکاح کی اُمید نہیں رکھتیں، اگر اپنے دوپٹے اتار رکھا کریں تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں بشرطیکہ اپنی زینت کی نمایش مقصود نہ ہو اور اگر وہ احتیاط رکھیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے۔

یہاں تخفیف کی علت صاف بیان کر دی گئی ہے۔ نکاح کی اُمید باقی نہ رہنے سے ایسی عمر مُراد ہے جس میں صنفی خواہشات فنا ہو جاتی ہیں اور کوئی کشش بھی باقی نہیں رہتی۔ تاہم مزید احتیاط کے طور پر یہ شرط لگا دی گئی کہ زینت کی نمایش مقصود نہ ہو۔ یعنی اگر صنفی خواہشات کی ایک چنگاری بھی سینے میں باقی ہو تو دوپٹہ وغیرہ اتار کر بیٹھنا درست نہیں۔ تخفیف صرف ان بوڑھیوں کے لیے ہے جن کو سن رسیدگی نے لباس کی قیود سے بے پروا کر دیا ہو اور جن کی طرف بجز احترام کی نظروں کے اور کسی قسم کی نظریں اٹھنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایسی عورتیں گھر میں بغیر دوپٹے اور اوڑھنی کے بھی رہ سکتی ہیں۔

اِستیذان

اس کے بعد دوسری حد یہ قائم کی گئی کہ گھر کے آدمیوں کو بلا اطلاع اچانک گھروں میں داخل ہونے سے منع کر دیا تا کہ عورتوں کو کسی ایسے حال میں نہ دیکھیں جن میں مردوں کو نہیں دیکھنا چاہیے۔

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ (النور ۲۴:۵۹) اور جب تمھارے لڑکے

۱۔ اس معاملے میں صرف اتنی رعایت ہے کہ اپنے محرم رشتے داروں (مثلاً باپ، بھائی وغیرہ) کے سامنے عورت اپنے جسم کا اتنا حصہ کھول سکتی ہے جسے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہو، جیسے آٹا گوندھتے ہوئے آستینیں اوپر چڑھا لینا، یا گھر کا فرش دھوتے ہوئے پائنچے کچھ اُوپر کر لینا (تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۵، النور حاشیہ ۳۲)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ اسی طرح اجازت لے کر گھر میں آئیں جس طرح ان کے بڑے ان سے پہلے اجازت لے کر آتے تھے۔

یہاں بھی عِلّتِ حُکم پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔ استیذان کی حد اسی وقت شروع ہوتی ہے جبکہ صنفی احساس پیدا ہو جائے۔ اس سے پہلے اجازت مانگنا ضروری نہیں۔ اس کے ساتھ غیر لوگوں کو بھی حُکم دیا گیا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوں۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَدۡخُلُوا بُيُوتًا غَيۡرَ بُيُوتِكُمۡ حَتّٰى تَسۡتَاۡنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰٓى اَهۡلِهَا (النور ۲۴: ۲۷) اے اہلِ ایمان! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو، جب تک کہ اہلِ خانہ سے پوچھ نہ لو اور جب داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔

اصل مقصد اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ کے درمیان حد بندی کرنا ہے تا کہ اپنی خانگی [زندگی] میں عورتیں اور مَرد اجنبیوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ اہلِ عرب ابتدا میں ان احکام کی عِلّت کو نہ سمجھ سکے، اس لیے بسا اوقات وہ گھر کے باہر سے گھروں میں جھانک لیتے تھے۔ ایک مرتبہ خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ آپؐ اپنے حجرے میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص نے تابدان میں سے جھانکا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو جھانک رہا ہے تو میں تیری آنکھ میں کوئی چیز چبھو دیتا۔ استیذان کا حُکم تو نظروں سے بچانے ہی کے لیے دیا گیا ہے (بخاری، باب الاستیذان من اجل البصر)۔ اس کے بعد آپؐ نے اعلان فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت دیکھے تو گھر والوں کو حق ہے کہ اس کی آنکھ پھوڑ دیں (مسلم، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ)۔

پھر اجنبی مَردوں کو حُکم دیا گیا کہ کسی دوسرے کے گھر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو گھروں میں نہ چلے جائیں، بلکہ باہر پردے کی اوٹ سے مانگیں:

وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ ؕ (الاحزاب ۳۳: ۵۳) اور جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردے کی اُوٹ سے مانگو۔ اس میں تمھارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزگی ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔

یہاں بھی حد بندی کے مقصد پر ذٰلِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ ؕ سے پوری روشنی ڈال دی گئی ہے۔ عورتوں اور مَردوں کو صنفی میلانات اور تحریکات سے بچانا ہی اصل مقصود ہے، اور یہ حد بندیاں اسی لیے کی جا رہی ہیں کہ عورتوں اور مَردوں کے درمیان خلا ملا اور بے تکلفی نہ ہونے پائے۔

یہ احکام صرف اجانب ہی کے لیے نہیں، بلکہ گھر کے خدّام کے لیے بھی ہیں۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت بلال اور حضرت انس رضی اللہ عنہما نے سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے کسی بچے کو مانگا تو آپ نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر دیا (فتح القدیر) حالانکہ یہ دونوں حضور ﷺ کے خدّامِ خاص تھے اور آپؐ کے پاس گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۵-۲۸۹)

استیذان کے احکام: يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَدۡخُلُوا بُيُوتًا غَيۡرَ بُيُوتِكُمۡ حَتّٰى تَسۡتَاۡنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰٓى اَهۡلِهَا ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (النور ۲۴: ۲۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو، یہ طریقہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔

سورۂ نور کے آغاز میں جو احکام دیے گئے تھے وہ اس لیے تھے کہ معاشرے میں بُرائی رونما ہو جائے تو اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ اب وہ احکام دیے جارہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے بُرائیوں کی پیدائش ہی کو روک دیا جائے اور تمدن کے طور طریقوں کی اصلاح کر کے ان اسباب کا سدِ باب کر دیا جائے جن سے اس طرح کی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان احکام کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں۔

☆ - اوّلاً یہ کہ واقعۂ اِفک پر تبصرہ کرنے کے معاً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشخیص میں زوجۂ رسول ﷺ جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نفوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا اور اللہ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے، اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دید سے اور آزادانہ میل جول سے روکا جائے، عورتوں کو ایک قریبی حلقے کے سوا غیر محرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے۔ قحبہ گری کے پیشے کا قطعی انسداد کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عورتوں کی بے پردگی اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مجرد رہنا، اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت ساری و جاری رہتی ہے اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں، اُن کے کان، اُن کی زبانیں، اُن کے دل، سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (scandal) میں پڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان احکام سے زیادہ صحیح و مناسب اور مؤثر کوئی دوسری تدبیر نہ تھی، ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

☆ دوسری بات جو اس موقع پر سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ شریعتِ الٰہی کسی بُرائی کو محض حرام کر دینے، یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ ان اسباب کا بھی خاتمہ کر دینے کی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اس بُرائی میں مبتلا ہونے پر اکساتے ہوں، یا اس کے لیے مواقع بہم پہنچاتے ہوں، یا اس پر مجبور کر دیتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسبابِ جرم، حرکاتِ جرم اور وسائل و ذرائعِ جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے، تاکہ آدمی کو اصل جرم کی عین سرحد پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹہلتے رہیں اور روز پکڑے جائیں اور سزائیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (prosecutor) ہی نہیں ہے، بلکہ ہمدرد، مصلح اور مددگار بھی ہے، اس لیے وہ تمام تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کی لیے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو بُرائیوں سے بچنے میں مدد دی جائے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۷۹، النور حاشیہ ۲۳)

لفظ استیناس کی حکمت: استیذان کے لیے اصل میں لفظ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا استعمال ہوا ہے، جس کو عموماً حَتّٰی تَسْتَاْذِنُوْا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے معنی میں لے لیا ہے، لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اگر حَتّٰی تَسْتَأْذِنُوْا فرمایا جاتا تو آیت کے معنی یہ ہوتے کہ ''لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو' اس طرزِ تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حَتّٰی تَسْتَأْنِسُوْا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

استیناس کا مادّہ اُنس ہے جو اردو زبان میں بھی اُسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادّے سے استیناس کا لفظ بولیں گے تو اس کے معنی ہوں گے 'اُنس معلوم کرنا' یا 'اپنے سے مانوس کرنا'۔ پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ''لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ ان کو مانوس نہ کرلو یا ان کا اُنس معلوم نہ کرلو'، یعنی یہ معلوم نہ کرلو کہ تمھارا آنا صاحب خانہ کو ناگوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ 'اجازت لینے' کے بجائے 'رضا لینے' کے الفاظ سے کیا ہے کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۷۶، النور حاشیہ ۲۴)

دورِ جاہلیت کا طریقہ: جاہلیت میں اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حُيِّيْتُمْ صَبَاحًا، حُيِّيْتُمْ مَسَاءً (صبح بخیر، شام بخیر) کہتے ہوئے بے تکلف ایک دوسرے کے گھر میں گھس جاتے تھے اور بسا اوقات گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر نادیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے یہ اُصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیے (privacy) کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تخلیے میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر خلل انداز ہو۔ اس حکم کے نازل ہونے پر نبی ﷺ نے معاشرے میں جو آداب اور قواعد جاری فرمائے انھیں ہم ذیل میں نمبروار بیان کرتے ہیں:

تخلیہ کا حق: ۱۔ حضور ﷺ نے تخلیے کے اس حق کو صرف گھروں میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا جس کی رو سے دوسرے کے گھر میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتیٰ کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ثوبان (نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اِذَا دَخَلَ الْبَصَرُ فَلَا اِذْنَ ''جب نگاہ داخل ہوگئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا'' (ابوداؤد)۔ حضرت ہُزیل بن شُرَحْبِیل کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے ہاں حاضر ہوا اور عین دروازے پر کھڑا ہو کر اجازت مانگنے لگا۔ حضور ﷺ نے اسے فرمایا: هٰكَذَا عَنْكَ، فَاِنَّمَا الْاِسْتِيْذَانُ مِنَ النَّظَرِ ''پرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اس لیے ہے کہ نگاہ نہ پڑے'' (ابوداؤد)۔ حضور ﷺ کا اپنا قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے، کیونکہ اس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔ آپؐ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے (ابوداؤد)۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ خادمِ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں باہر سے جھانکا۔ حضور ﷺ اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوئے تھے۔ آپؐ اس کی طرف اس طرح بڑھے کہ جیسے اس کے پیٹ میں جھونک دیں گے[1] (ابو داؤد)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ نَّظَرَ فِیْ کِتَابِ اَخِیْهِ بِغَیْرِ اِذْنِهٖ فَاِنَّمَا یَنْظُرُ فِی النَّارِ (ابو داؤد) جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر ڈالی وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لَوْ اَنَّ امْرَأً اطلع عَلَیْکَ بغیر اذن فخذفت بحصاۃ ففقأت عینه ما کان علیک من جناح، اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں"۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے: من اطلع دار قوم بغیر اذنهم ففقؤا عینه، فقد هَدَرَتْ عینه، جس نے کسی کے گھر میں جھانکا اور گھر والوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کچھ مؤاخذہ نہیں[2]۔ امام شافعی نے اس ارشاد کو بالکل لفظی معنوں میں لیا ہے اور وہ جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حنفیہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ حکم محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گھس آئے اور گھر والوں کے روکنے پر وہ باز نہ آئے اور گھر والے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کشمکش اور مزاحمت میں اس کی آنکھ پھوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو گھر والوں پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔

۲۔ فقہا نے نگاہ ہی کے حکم میں سماعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی، مگر اس کے کان تو گھر والوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظر ہی کی طرح تخلیہ کے حق میں بے جا داخلت ہے۔

۳۔ اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی صورت ہی میں نہیں ہے، بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا: کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے بھی اجازت طلب کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میرے سوا ان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں؟ فرمایا: اتحب ان تراها عریانة، "کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے"؟ (ابن جریر عن عطاء بن یسار مرسلاً)۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: علیکم ان تستاذنوا علی امهاتکم و اخواتکم (ابنِ کثیر) "اپنی ماں بہنوں کے پاس بھی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ"۔ بلکہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم کھنکار دینا چاہیے۔ اُن کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب کبھی گھر میں آنے لگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آ رہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آن کھڑے ہوں (ابن جریر)

۴۔ اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کسی کے گھر پر اچانک کوئی مصیبت آ جائے، مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور گھس آئے۔ ایسے مواقع پر مدد کے لیے بلا اجازت جا سکتے ہیں۔

۱۔ یہ ساری روایات تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۰۲ پر ملاحظہ ہوں۔ ۲۔ ایضاً، ج ۵، ص ۳۷۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ناواقف کار لوگوں کا طرزِ عمل: اوّل اوّل جب استیذان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آداب سے واقف نہ تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی ﷺ کے ہاں آیا اور دروازے پر سے پکار کر کہنے لگا: أألج ''کیا میں گھس آؤں''؟ نبی ﷺ نے اپنی لونڈی روضہ سے فرمایا: یہ شخص اجازت مانگنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ ذرا اُٹھ کر اسے بتاؤ کہ یوں کہنا چاہیے: السلام علیکم أأدخل (ابن جریر۔ ابوداؤد)۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا: ''میں ہوں'' آپؐ نے دو تین مرتبہ فرمایا: ''میں ہوں''؟ میں ہوں یعنی اس میں میں ہوں سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو (ابوداؤد)۔ ایک صاحب کَلَدَہ بن حَنبل ایک کام سے نبی ﷺ کے ہاں گئے اور سلام کے بغیر یوں ہی جا بیٹھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''باہر جاؤ اور السلام علیکم کہہ کر اندر آؤ'' (ابوداؤد)۔

استیذان کا درست طریقہ: استیذان کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنا نام بتا کر اجازت طلب کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے: السلام علیکم یا رسول اللہ، ایدخل عمر (ابوداؤد) اجازت لینے کے لیے حضور ﷺ نے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پکارنے کی حد مقرر کر دی اور فرمایا: اگر تیسری مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ یہی حضور ﷺ کا اپنا طریقہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں گئے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپ واپس ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کی زبان مبارک سے میرے لیے جتنی بار بھی سلام ورحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے۔ اس لیے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا (ابوداؤد، احمد)۔ یہ تین مرتبہ پکارنا پے در پے نہ ہونا چاہیے، بلکہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر پکارنا چاہیے تاکہ صاحب خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

اجازت یا تو خود صاحبِ خانہ کی معتبر ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے، مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اور ذِمّہ دار قسم کا فرد۔ کوئی چھوٹا سا بچہ اگر کہہ دے کہ آ جاؤ تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہو جانا چاہیے۔

اجازت طلب کرنے میں بے جا اصرار کرنا، یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں دروازے پر جم کر کھڑے ہو جانا جائز نہیں ہے۔ اگر تین دفعہ استیذان کے بعد صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ ملنے سے انکار کر دے تو واپس چلے جانا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۷۶-۳۷۹، النور حاشیہ ۲۵)

استیذان کے یہ احکام دینے کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (النور ۲۴:۲۸) پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دیدی جائے، اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

کسی کے خالی گھر میں داخل ہو جانا جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ صاحبِ خانہ نے آدمی کو خود اس بات کی اجازت دی ہو۔ مثلاً اس نے آپ سے کہہ دیا ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرے میں بیٹھ جایئے گا، یا وہ کسی اور جگہ پر ہو اور آپ کی اطلاع ملنے وہ کہلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ورنہ محض یہ بات کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، یا اندر سے کوئی نہیں بولتا، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کر دیتی کہ وہ بلا اجازت داخل ہو جائے۔

اس پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔ ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ کسی سے نہ ملنا چاہے تو انکار کر دے، یا کوئی مشغولیت ملاقات میں مانع ہو تو معذرت کر دے۔ اِرۡجِعُوۡا (واپس ہو جاؤ) کے حکم کا فقہا نے یہ مطلب لیا ہے کہ اس صورت میں دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ آدمی کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ملاقات پر مجبور کرے، یا اس کے دروازے پر ٹھہر کر اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۷۹، النور حاشیہ ۲۶-۲۷)

عوامی مقامات میں داخلہ: لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ مَسۡكُوۡنَةٍ فِيۡهَا مَتَاعٌ لَّكُمۡ ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ (النور ۲۴:۲۹) البتہ تمھارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمھارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو، تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو، سب کی اللہ کو خبر ہے۔

اس سے مُراد ہیں ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دوکانیں، مسافر خانے وغیرہ جہاں لوگوں کے لیے داخلہ کی عام اجازت ہو۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۷۹، النور حاشیہ ۲۸)

حکم کا آغاز نبی ﷺ کے گھر سے: يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتَ النَّبِىِّ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡذَنَ لَـكُمۡ اِلٰى طَعَامٍ غَيۡرَ نٰظِرِيۡنَ اِنٰٮهُ ۙ (الاحزاب ۳۳:۵۳) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔

یہ اُس حکمِ عام کی تمہید ہے جو تقریباً ایک سال کے بعد سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں دیا گیا۔ قدیم زمانے میں اہلِ عرب بے تکلف ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے ملنا ہوتا تو وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پکارنے اور اجازت لے کر اندر جانے کا پابند نہ تھا۔ بلکہ اندر جا کر عورتوں اور بچوں سے پوچھ لیتا تھا کہ صاحبِ خانہ گھر میں ہے یا نہیں۔ یہ جاہلانہ طریقہ بہت سی خرابیوں کا موجب تھا۔ اور بسا اوقات اس سے بہت گھناؤنے اخلاقی مفاسد کا بھی آغاز ہو جاتا تھا۔ اس لیے پہلے نبی ﷺ کے گھروں میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی شخص، خواہ وہ قریبی دوست یا دُور پرے کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، آپ کے گھر میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ پھر سورۂ نور میں اس قاعدے کو تمام مسلمانوں کے گھروں میں رائج کرنے کا عام حکم دے دیا گیا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۱۹-۱۲۰، الاحزاب حاشیہ ۹۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غلاموں اور نابالغوں سے مُراد: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (النور ۲۴:۵۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لازم ہے کہ تمھارے مملوک اور تمھارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں، تین اوقات میں اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں، صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اُتار کر رکھ دیتے ہو، اور عشا کی نماز کے بعد۔ یہ تین اوقات تمھارے لیے پردے کے وقت ہیں۔ اِن کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ اُن پر۔ تمھیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔

جمہور مفسرین و فقہا کے نزدیک مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مُراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں، کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ابن عمر رضی اللہ عنہما اور مجاہد اس آیت میں مملوکوں سے مُراد صرف غلام لیتے ہیں اور لونڈیوں کو اِس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے جو حُکم بیان کیا گیا ہے، اُس کو دیکھتے ہوئے اس تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تخلیہ کے اوقات میں جس طرح خود اپنے بچوں کو اچانک آ جانا مناسب نہیں، اُسی طرح خادمہ کا بھی آ جانا غیر مناسب ہے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس آیت کا حُکم بالغ و نابالغ دونوں قسم کے مملوکوں کے لیے عام ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو متن میں اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بالغوں کا سا خواب دیکھنے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ اسی سے فقہاء نے لڑکوں کے معاملہ میں احتلام کو بلوغ کا آغاز مانا ہے اور اِس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن جو ترجمہ ہم نے متن میں اختیار کیا ہے وہ اس بنا پر قابلِ ترجیح ہے کہ یہ حُکم لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لیے ہے، اور احتلام کو علامتِ بلوغ قرار دینے کے بعد حُکم صرف لڑکوں کے لیے خاص ہو جاتا ہے، کیونکہ لڑکی کے معاملے میں ایامِ ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے نہ کہ احتلام۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حُکم کا منشا یہ ہے کہ جب تک گھر کے بچے اُس عمر کو نہ پہنچیں جس میں اِن کے اندر صنفی شعور پیدا ہوا کرتا ہے، وہ اِس قاعدے کی پابندی کریں اور جب اُس عمر کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے لیے وہ حُکم ہے جو آگے آ رہا ہے۔

اوقاتِ تخلیہ: ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ اصل میں لفظ عَوْرَات استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ''یہ تین اوقات تمھارے لیے عورات ہیں''۔ عورت اُردو میں تو صنفِ اُناث کے لیے بولا جاتا ہے، مگر عربی میں اِس کے معنی خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اُس چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کا کُھل جانا آدمی کے لیے باعث شرم ہو، جس کا ظاہر ہو جانا اُس کو ناگوار ہو، نیز اس معنی میں بھی یہ مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنی باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور آیت کے مفہوم میں کسی نہ کسی حد تک بھی شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن اوقات میں تم لوگ تنہا، یا اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتے ہو جن میں گھر کے بچوں اور خادموں کا اچانک تمھارے پاس آ جانا مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کو یہ ہدایت کرو کہ اِن تین وقتوں میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جب وہ تمھاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

ان تین وقتوں کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے مملوک ہر وقت عورتوں اور مردوں کے پاس اُن کے کمرے میں یا اُن کے تخلیے کی جگہ میں بلا اجازت آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلا اجازت آ جائیں تو تمھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ پھر یہ تمھاری اپنی حماقت ہوگی کہ کام کاج کے اوقات میں اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھو۔ البتہ اگر تخلیے کے مذکورہ بالا تین اوقات میں وہ بلا اجازت آ جائیں تو وہ قصور وار ہیں۔ اگر تمھاری تربیت و تعلیم کے باوجود یہ حرکت کریں، ورنہ تم خود گناہ گار ہوا گر تم نے اپنے بچوں اور مملوکوں کو یہ تہذیب نہیں سکھائی۔

مخصوص اوقات کے علاوہ اجازت کی وجہ: لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ ،ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر، تمھیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔

یہ وجہ ہے اُس اجازت عام کی جو تین اوقات مذکورہ کے سوا دوسرے تمام اوقات میں بچوں اور مملوکوں کو بلا اجازت آنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس سے اُصولِ فقہ کے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں، اور ہر حکم کی کوئی نہ کوئی عِلّت ضرور ہے۔ خواہ وہ بیان کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۴۲۰-۴۲۲، النور حواشی ۸۵-۹۰)

تخلیہ اور لمس کی ممانعت

تیسری حد بندی یہ کی گئی کہ شوہر کے سوا کوئی مرد کسی عورت کے پاس نہ تخلیہ میں رہے اور نہ اس کے جسم کو مس کرے، خواہ وہ قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ [اس سلسلے میں آپؐ نے جو احکام ارشاد فرمائے وہ درج ذیل ہیں:]

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: اِيَّاكُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَى النِّسَآءِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَرَأَيْتَ الْحَمُوَ قَالَ: اَلْحَمُوُ الْمَوْتُ[1] (ترمذی، باب ما جاء فی کراھیة الدخول علی المغیبات۔ بخاری، باب لا یخلون رجل بامرأة الاذو محرم۔ مسلم، باب تحریم الخلوة بالاجنبیة) عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا وہ تو موت ہے۔

لَا تَلِجُوْا عَلَى الْمُغِيْبَاتِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِىْ مِنْ اَحَدِكُمْ مَجْرَى الدَّمِ[2] (ترمذی، باب کراھیة الدخول علی المغیبات) شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ کیونکہ شیطان تم میں سے کسی کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔

یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۹-۲۹۰)

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۰۷

۲- ایضاً، ج ۷، ص ۳۸۱، ج ۵، ص ۳۰۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَخْلُوَنَّ بِامْرَأَةٍ لَّيْسَ مَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ مِّنْهَا فَاِنَّ ثَالِثَهُمَا الشَّيْطَانُ ''جو شخص اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس عورت کا کوئی محرم نہ ہو، کیونکہ تیسرا اس وقت شیطان ہوتا ہے''۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۴، النور حاشیہ ۴۹)

عَنْ عَمْرِو بْنِ عَاصٍ قَالَ: نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنْ نَّدْخُلَ عَلَى النِّسَآءِ بِغَيْرِ اِذْنِ اَزْوَاجِهِنَّ[1] (ترمذی، باب فی النهی عن الدخول علی النسآء الا باذن ازواجهن) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عورتوں کے پاس ان کے شوہروں کی اجازت کے بغیر جانے سے منع فرمادیا۔

لَا يَدْخُلَنَّ رَجُلٌ بَعْدَ يَوْمِىْ هٰذَا عَلٰى مَغِيْبَتِهٖ اِلَّا مَعَهٗ رَجُلٌ اَوِ اثْنَانِ[2] (مسلم، باب تحريم الخلوة بالاجنبية) آج کے بعد سے کوئی شخص کسی عورت کے پاس اس کے شوہر کے غیاب میں نہ جائے، تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک دو آدمی اور نہ ہوں۔

ایسے ہی احکام لمس کے متعلق بھی ہیں:

قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ مَّسَّ كَفَّ امْرَأَةٍ لَّيْسَ مِنْهَا بِسَبِيْلٍ وُضِعَ عَلٰى كَفِّهٖ جَمْرَةٌ يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ[3] (تكمله فتح القدير) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی عورت کا ہاتھ چھوئے گا جس کے ساتھ اس کا جائز تعلق نہ ہو، اس کی ہتھیلی پر قیامت کے روز انگارا رکھا جائے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے صرف زبانی اقرار لے کر بیعت لیا کرتے تھے، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔ آپؐ نے کبھی ایسی عورت کے ہاتھ کو مس نہیں کیا جو آپؐ کے نکاح میں نہ ہو[4]۔ (بخاری، باب بيعة النسآء۔ مسلم، باب كيفية بيعة النسآء)

اُمیمہ بنت رُقیقہ کا بیان ہے کہ میں چند عورتوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے حاضر ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اقرار لیا کہ شرک، چوری، زنا، بہتان تراشی و افترا پردازی اور نبی کی نافرمانی سے احتراز کرنا۔ جب اقرار ہو چکا تو ہم نے عرض کیا کہ تشریف لائیے تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، صرف زبانی اقرار کافی ہے''[5]۔ (نسائی، باب بيعة النسآء۔ ابن ماجه، باب بيعة النسآء)

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۰-۲۹۱)

ابوداؤد نے مراسیل میں شعبی کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ایک چادر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھائی گئی۔ آپؐ نے بس اسے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا''۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۴۹، الممتحنہ حاشیہ ۲۳)

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۰۷ ۲- ایضاً، ج ۵، ص ۳۰۷ ۳- ایضاً ج ۵، ص ۳۰۸

۴- ایضاً، ج ۷، ص ۳۰۸ ۵- ج ۵، ص ۳۰۸-۳۰۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ احکام بھی صرف جوان عورتوں کے لیے ہیں۔ سن رسیدہ عورتوں کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا جائز ہے اور ان کو چھونا بھی ممنوع نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک قبیلہ میں جاتے تھے جہاں انھوں نے دودھ پیا تھا اور آپ اس قبیلہ کی بوڑھی عورتوں سے مصافحہ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ ایک بوڑھی عورت سے پاؤں اور سر دبوایا کرتے تھے۔ یہ امتیاز جو بوڑھی اور جوان عورتوں کے درمیان کیا گیا ہے، خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل دونوں صنفوں کے درمیان ایسے اختلاط کو روکنا مقصود ہے جو فتنے کا سبب بن سکتا ہے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۹ تا ۲۹۲)

محرموں اور غیر محرموں کے درمیان فرق: یہ تو وہ احکام تھے جن میں شوہر کے سوا تمام مرد شامل ہیں، خواہ وہ محرم ہوں یا غیر محرم۔ عورت ان میں سے کسی کے سامنے اپنا ستر، یعنی چہرے اور ہاتھ کے سوا جسم کا کوئی حصّہ نہیں کھول سکتی، بالکل اسی طرح جس طرح مرد کسی کے سامنے اپنا ستر یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصّہ نہیں کھول سکتا۔ سب مردوں کو گھر میں اجازت لے کر داخل ہونا چاہیے اور ان میں سے کسی کا عورت کے پاس خلوت میں بیٹھنا یا اس کے جسم کو ہاتھ لگانا جائز نہیں[1]۔

اس کے بعد محرموں اور غیر محرموں کے درمیان تفریق کی جاتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ آزادی اور بے تکلفی کے کون سے مدارج ایسے ہیں جو صرف محرم مردوں کے سامنے برتے جا سکتے ہیں اور غیر محرم مردوں کے سامنے برتنے جائز نہیں ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو عرفِ عام میں پردہ یا حجاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۲-۲۹۳)

آپؐ نے اس کو بھی جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے جسم کو لگے۔ چنانچہ آپؐ مردوں سے بیعت تو ہاتھ میں ہاتھ لے کر کرتے تھے، لیکن عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ آپؐ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی غیر عورت کے جسم کو نہیں لگا۔ آپؐ عورت سے صرف زبانی عہد لیتے تھے اور جب وہ عہد کر چکتی تھی تو فرماتے: ''جاؤ بس تمھاری بیعت ہو گئی''[2]۔ (ابو داؤد، کتاب الخراج)

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۷، النور حاشیہ ۴۹)

غضِ بصر کے احکام

مردوں کو غضِ بصر کا حکم: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (النور ۲۴: ۳۰) اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے

۱- جسم کو ہاتھ لگانے کے معاملہ میں محرموں اور غیر محرموں کے درمیان کافی فرق ہے۔ بھائی اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے سواری پر چڑھا یا اُتار سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بات کسی غیر مرد کے لیے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی سفر سے واپس آتے تو حضرت فاطمہؓ کو گلے لگا کر سر کا بوسہ لیتے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کے سر کا بوسہ لیتے تھے۔

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۰۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔

غضِ بصر کے معنی: غَضّ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے، گھٹانے اور پست کرنے کے۔ غضِ بصر کا ترجمہ عام طور پر 'نگاہ نیچی کرنا یا رکھنا' کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس حکم کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کر نہ دیکھنا اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزادانہ چھوڑ دینا ہے۔ یہ مفہوم 'نظر بچانے' سے ٹھیک ادا ہوتا ہے، یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب نہ ہو اس سے نظر ہٹالی جائے، قطع نظر اس سے کہ آدمی نگاہ نیچے کرے یا کسی اور طرف اسے بچالے جائے۔

مِنْ اَبْصَارِهِمْ میں 'مِنْ' کی حیثیت: مِنْ اَبْصَارِهِمْ میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے، بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا جائے، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات سیاق وسباق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے وہ ہے مَردوں کا عورتوں کو دیکھنا، یا دوسرے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا یا فحش مناظر پر نگاہ جمانا۔

غضِ بصر کا حکم احادیث میں: کتاب اللہ کے اس حکم کی تشریح سُنّت نے کی ہے۔ اس کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں:

آدمی کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن یہ معاف نہیں ہے کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو وہاں پر نظر دوڑائے۔ نبی ﷺ نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے۔ دیکھنا آنکھوں کی زنا ہے۔ لگاوٹ کی بات چیت زبان کی زنا ہے۔ آواز سے لذت لینا کانوں کی زنا ہے۔ ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کی زنا ہے۔ بدکاری کی یہ ساری تمہیدیں جب پوری ہو چکتی ہیں تب شرم گاہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں، یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں[1] (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد) حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولی ولیست لک الآخرۃ (احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ دارمی) اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔ پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری معاف نہیں۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا: فوراً نگاہ پھیر لو، یا نیچی کر لو[2] (مسلم۔ احمد۔ ترمذی۔ نسائی)۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ النَّظَرَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِیْسَ مَسْمُوْمٌ، مَنْ تَرَکَهَا مَخَافَتِیْ اَبْدَلْتُهٗ اِیْمَانًا یَّجِدُ حَلَاوَتَهٗ فِیْ قَلْبِهٖ (طبرانی) نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دِل میں پائے گا۔ ابواُمامہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مَامِنْ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۹۸-۲۹۹

۲- عَن جریر سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم عن نظر الفُجَأۃ، فقال: اصرف بصرک (ابو داؤد بحوالہ: پردہ، جون ۱۹۶۰ء، ص ۲۹۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مُسْلِمٍ يَنْظُرُ اِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ ثُمَّ يَغُضُّ بَصَرَهٗ اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ عِبَادَةً يَّجِدُ حَلَاوَتَهَا (مسند احمد) جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۱، النور حاشیہ ۲۹)

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: مَنْ نَظَرَ اِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ اَجْنَبِيَّةٍ عَنْ شَهْوَةٍ صُبَّ فِيْ عَيْنَيْهِ الْاٰنُكُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (تكملة فتح القدير) نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی اجنبی عورت کے محاسن پر شہوت کی نظر ڈالے گا قیامت کے روز اس کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۸)

امام جعفر صادق اپنے والد امام محمد باقر سے اور وہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ کے چچازاد بھائی فضل بن عباس رضی اللہ عنہ (جو اس وقت ایک نوجوان لڑکے تھے) مَشعرِ حَرام سے واپسی کے وقت حضور ﷺ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے۔ راستے سے جب عورتیں گزرنے لگیں تو فضل رضی اللہ عنہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی ﷺ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے دوسری طرف پھیر دیا (ابوداؤد)۔ اسی حجۃ الوداع کا قصہ ہے کہ قبیلۂ خَثعم کی ایک عورت راستہ میں حضور ﷺ کو روک کر حج کے متعلق ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ نبی ﷺ نے ان کا منہ پکڑ کر دوسری طرف کر دیا[1] (بخاری۔ ابوداؤد۔ ترمذی)۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۰-۳۹۱، النور حاشیہ ۲۹)

بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں، جن میں اجنبیہ کو دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی مریضہ کسی طبیب کے زیرِ علاج ہو، یا کوئی عورت کسی مقدمہ میں قاضی کے سامنے بحیثیت گواہ یا بحیثیت فریق پیش ہو، یا کسی آتش زدہ مقام میں کوئی عورت گھر گئی ہو، یا پانی میں ڈوب رہی ہو، یا اس کی جان یا آبرو کسی خطرے میں مبتلا ہو۔ ایسی صورتوں میں چہرہ تو درکنار حسبِ ضرورت ستر کو بھی دیکھا جا سکتا ہے، جسم کو ہاتھ بھی لگایا جا سکتا ہے، بلکہ ڈوبتی ہوئی یا جلتی ہوئی عورت کو گود میں اُٹھا کر لانا بھی صرف جائز ہی نہیں، فرض ہے۔ شارع کا حکم یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں جہاں تک ممکن ہو اپنی نیت کو پاک رکھو، لیکن اقتضائے بشریت سے اگر جذبات میں کوئی خفیف سی تحریک پیدا ہو جائے تب بھی کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ ایسی نظر اور ایسے لمس کے لیے ضرورت داعی ہوئی ہے اور فطرت کے مقتضیات کو بالکل روک دینے پر انسان قادر نہیں ہے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۸-۲۹۹)

غضِ بصر کے حکم سے مستثنیٰ صورتیں: غضِ بصر کے اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو، مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو۔ اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۰۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہے۔ مُغیرہ بن شُعبہ کی روایت ہے کہ میں نے ایک جگہ نِکاح کا پیغام دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے لڑکی کو دیکھ بھی لیا ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اُنْظُرْ اِلَیْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰی اَنْ یُّؤْدَمَ بَیْنَکُمَا (احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابنِ ماجہ۔ دارمی) اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تمھارے درمیان موافقت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کہیں شادی کا پیغام بھیجا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اُنْظُرْ اِلَیْهَا فَاِنَّ فِیْ اَعْیُنِ الْاَنْصَارِ شَیْئًا (مسلم۔ نسائی۔ احمد) لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوتی ہے۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اِذَا خَطَبَ اَحَدُکُمُ الْمَرْاَۃَ فَقَدَرَ اَنْ یَّرٰی مِنْهَا بَعْضَ مَا یَدْعُوْهُ اِلٰی نِکَاحِهَا فَلْیَفْعَلْ (احمد۔ ابوداؤد) تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نِکاح کا خواستگار ہو تو حتی الامکان اسے دیکھ کر یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اس کے ساتھ نِکاح کی طرف راغب کرنے والی ہو۔ مسند احمد میں ابوحُمید ہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اس غرض کے لیے دیکھنے کی اجازت کو فَلَا جُنَاحَ کے الفاظ میں بیان کیا، یعنی ایسا کر لینے میں مضایقہ نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی اجازت دی گئی کہ لڑکی کی بے خبری میں بھی اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی سے فقہا نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ بضرورت دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔ مثلاً تفتیشِ جرائم کے سلسلے میں کسی مُشتبہ عورت کو دیکھنا، یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

غضِ بصر کے حُکم کا منشا یہ بھی ہے کہ آدمی کسی عورت یا مَرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: لَا یَنْظُرِ الرَّجُلُ اِلٰی عَوْرَۃِ الرَّجُلِ وَلَا تَنْظُرِ الْمَرْاَۃُ اِلٰی عَوْرَۃِ الْمَرْاَۃِ (احمد۔ مسلم۔ ابوداود۔ ترمذی) کوئی مَرد کسی مَرد کے ستر کو نہ دیکھے اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا: لَا تَنْظُرْ اِلٰی فَخِذِ حَیٍّ وَّ لَا مَیِّتٍ (ابوداؤد، ابنِ ماجہ) کسی زندہ یا مُردہ انسان کی ران پر نگاہ نہ ڈالو۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۲، النور حاشیہ ۲۹)

عورتوں کے لیے غضِ بصر کے بارے میں روایات: وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (النور ۲۴:۳۱)

اور اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں۔

عورتوں کے لیے بھی غضِ بصر کے احکام وہی ہیں جو مَردوں کے لیے ہیں۔ یعنی انھیں قصداً غیر مَردوں کو نہ دیکھنا چاہیے، نگاہ پڑ جائے تو ہٹا لینی چاہیے اور دوسروں کے ستر کو دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن مَرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کے مَرد کو دیکھنے کے معاملے میں احکام تھوڑے سے مختلف ہیں۔

عبداللہ بن اُمِ مکتوم کا واقعہ: ایک طرف حدیث میں ہم کو یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت اُمِ سَلمہ اور حضرت میمونہ نبی ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابن اُمِ مکتوم آ گئے۔ نبی ﷺ نے دونوں بیویوں سے فرمایا: اِحْتَجِبَا مِنْهُ، ان سے پردہ کرو۔ بیویوں نے عرض کیا: یا رسول اللّٰہِ اَلَیْسَ اَعْمٰی لَا یُبْصِرُنَا وَلَا یَعْرِفُنَا، یارسول اللہ کیا یہ اندھے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے۔فرمایا: اَفَعَمْیَاوَانِ اَنْتُمَا، اَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِہٖ، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھتیں؟ حضرت امِ سلمہ تصریح کرتی ہیں کہ ذَالِکَ بَعْدَ اَنْ اُمِرَ بِالْحِجَابِ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردے کا حکم آ چکا تھا[1] (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی)۔اوراس کی تائید مؤطا کی یہ روایت کرتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک نابینا آیا تو انھوں نے اس سے پردہ کیا۔کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں؟ یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔جواب میں ام المومنین نے فرمایا: لٰکِنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْہِ، میں تو اسے دیکھتی ہوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حبشیوں کے کرتب دیکھنے کا واقعہ: دوسری طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی ملتی ہے کہ ۷ھ میں حبشیوں کا وفد مدینے آیا اور اس نے مسجد نبوی کے احاطے میں ایک تماشا کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ تماشا دکھایا[2] (بخاری۔ مسلم۔ احمد)۔

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی طلاق کے بعد رہائش کا مسئلہ: تیسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو جب ان کے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں تو سوال پیدا ہوا کہ وہ عدت کہاں گزاریں۔ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُمّ شریک انصاریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رہو۔ پھر فرمایا: ''ان کے ہاں میرے صحابہ بہت جاتے رہتے ہیں (کیونکہ وہ ایک بڑی مالدار اور فیاض خاتون ہیں، بکثرت لوگ ان کے ہاں مہمان رہتے اور وہ ان کی ضیافت کرتی تھیں) لہٰذا تم [اپنے عم زاد (تفہیم الاحادیث، ج۵ص ۱۶۲)] ابن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ہاں رہو، وہ اندھے آدمی ہیں تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکوگی''[3] (مسلم۔ ابوداؤد)۔

فرقِ مراتب کا خیال: اِن روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے مَردوں کو دیکھنے کے معاملے میں اتنی سختی نہیں ہے جتنی مَردوں کے عورتوں کو دیکھنے کے معاملے میں ہے۔ایک مجلس میں آمنے سامنے بیٹھ کر دیکھنا ممنوع ہے۔اور کوئی حقیقی ضرورت پیش آ جائے تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دیکھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔امام غزالی اور ابنِ حجر عسقلانی نے بھی روایات سے قریب قریب یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔شوکانی نَیْلُ الاوطار میں ابنِ حجر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ''جواز کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملے میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔مسجدوں میں، بازاروں اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منہ پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مَرد ان کو نہ دیکھیں، مگر مَردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تاکہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملے میں حکم مختلف ہے''[4] (نیل الاوتار، ج۶ ص ۱۰۱) تاہم یہ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵ ص ۳۰۴ ۲- ایضاً، ج۵ ص ۳۰۴ ۳- ایضاً ج۵ ص ۱۶۰-۱۹۲

جہاں فتنے کا احتمال زیادہ تھا وہاں رہنے سے منع فرما دیا۔ جہاں احتمال کم تھا وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ بہر حال اس عورت کو کہیں رہنا ضرور تھا۔لیکن جہاں کوئی حقیقی ضرورت نہ تھی وہاں خواتین کو ایک غیر مرد کے ساتھ ایک مجلس میں جمع ہونے اور روبرو اس کو دیکھنے سے روک دیا۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء ص ۳۰۳)

۴- عورت کے مَردوں کو دیکھنے اور مرد کے عورتوں کو دیکھنے میں نفسیات کے اعتبار سے ایک نازک فرق ہے۔مرد کی فطرت میں اقدام ہے۔کسی چیز کو پسند کرنے کے بعد وہ اس کے حصول کی سعی میں پیش قدمی کرتا ہے۔مگر عورت کی فطرت میں تمانع اور فرار ہے، جب (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ عورتیں اطمینان سے مَردوں کو گھوریں اور انؐ کے حسن سے آنکھیں سینکیں۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۳-۳۸۴، النور حاشیہ ۳۱)

ان مراتب کی حکمت: یہ سب مراتب حکمت پر مبنی ہیں اور جو شخص مغزِ شریعت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ غضِ بصر کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام میں شدّت اور تخفیف کا مدار کن امور پر ہے۔ شارع کا اصل مقصد تم کو نظر بازی سے روکنا ہے۔ ورنہ اسے تمھاری آنکھوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ آنکھیں ابتدا میں بڑی معصوم نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ نفس کا شیطان ان کی تائید میں بڑے بڑے پرفریب دلائل پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ذَوقِ جمال ہے جو فطرت نے تم میں ودیعت کیا ہے۔ جمالِ فطرت کے دوسرے مظاہر و تجلّیات کو جب تم دیکھتے ہو اور ان سے بہت ہی پاک لُطف اُٹھاتے ہو تو جمالِ انسانی کو بھی دیکھو اور روحانی لُطف اُٹھاؤ۔ مگر اندر ہی اندر یہ شیطان لطف اندوزی کی لے کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذَوقِ جمال ترقی کر کے شوقِ وصال بن جاتا ہے۔ کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کی جرأت رکھتا ہو کہ دنیا میں جس قدر بدکاری اب تک ہوئی ہے اور اب ہو رہی ہے اس کا پہلا اور سب سے بڑا محرک یہی آنکھوں کا فتنہ ہے؟ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اپنی صنفِ مقابل کے کسی حسین اور جوان فرد کو دیکھ کر اس میں وہی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو ایک خوبصورت پھول کو دیکھ کر ہوتی ہیں؟ اگر دونوں قسم کی کیفیات میں فرق ہے اور ایک کے برخلاف دوسری کیفیت کم و بیش شہوانی کیفیت ہے تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ایک ذَوقِ جمال کے لیے بھی وہی آزادی ہونی چاہیے جو دوسرے ذَوقِ جمال کے لیے ہے؟ شارع تمھارے ذَوقِ جمال کو مٹانا تو نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک جوڑا انتخاب کر لو اور جمال کا جتنا ذوق تم میں ہے اس کا مرکز صرف اسی ایک کو بنا لو۔ پھر جتنا چاہو اس سے لطف اُٹھاؤ۔ اس مرکز سے ہٹ کر دیدہ بازی کرو گے تو فواحش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اگر ضبطِ نفس یا دوسرے موانع کی بنا پر آوارگیِ عمل میں مبتلا نہ بھی ہوئے تو آوارگیِ خیال سے کبھی نہ بچ سکو گے۔ تمھاری بہت سی قوّت آنکھوں کے رستے ضائع ہو گی۔ بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت تمھارے دِل کو ناپاک کرے گی۔ بار بار فریبِ محبت میں گرفتار ہو گے اور بہت سی راتیں بیداری کے خواب دیکھنے میں جاگ جاگ کر ضائع کرو گے۔ بہت سے حسین ناگوں اور ناگنوں سے ڈسے جاؤ گے۔ تمھاری بہت سی قوّتِ حیات دِل کی دھڑکن اور خون کے ہیجان میں ضائع ہو جائے گی۔ یہ نقصان کیا کچھ کم ہے؟ اور یہ سب اپنے مرکز دید سے ہٹ کر دیکھنے ہی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اپنی آنکھوں کو قابو میں رکھو۔ بغیر حاجت کے دیکھنا اور ایسا دیکھنا جو فتنے کا سبب بن سکتا ہو قابلِ حذر ہے۔ اگر دیکھنے کی حقیقی ضرورت ہو یا اس کا کوئی تمدنی فائدہ ہو تو احتمالِ فتنہ کے باوجود دیکھنا جائز ہے اور اگر حاجت نہ ہو، لیکن فتنے کا بھی احتمال نہ ہو تو عورت کے لیے مَرد کو دیکھنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تک کہ اس کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہو جائے، وہ کبھی اس قدر دراز دست اور جری اور بے باک نہیں ہو سکتی کہ کسی کو پسند کرنے کے بعد اس کی طرف پیش قدمی کرے۔ شارع نے اس فرق کو ملحوظ رکھ کر عورتوں کے لیے غیر مردوں کو دیکھنے کے معاملے میں وہ سختی نہیں کی ہے جو مردوں کے لیے غیر عورتوں کو دیکھنے میں کی ہے۔ (پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۱-۳۰۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائز ہے، مگر مرد کے لیے عورت کو دیکھنا جائز نہیں، الاّ یہ کہ اچانک نظر پڑ جائے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵)

ایک غلط استدلال اور اس کا جواب: اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی، تبھی تو غضِ بصر کا حکم دیا گیا ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا جاچکا ہوتا تو پھر نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال۔

یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعہ کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے یہ اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں جبکہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں پردہ رائج ہونے کے باوجود بہر حال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہٰذا محض غضِ بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مُستلزِم ہے۔ اور واقعہ کے اعتبار سے یہ اس لیے غلط ہے کہ سورۂ احزاب میں احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا۔ اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی ﷺ کے عہد مبارک میں اس کا رائج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۱، النور حاشیہ ۲۹)

اظہارِ زینت کی ممانعت

غضِ بصر کا حکم عورت اور مرد دونوں کے لیے تھا۔ اس کے چند احکام خاص عورتوں کے لیے ہیں۔ ان میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ ایک محدود دائرے کے باہر اپنی "زینت" کے اظہار سے پرہیز کرو۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۴)

اعتدال کے حدود میں بناؤ سنگھار: عورتوں کو اعتدال کے ساتھ بناؤ سنگھار کرنے کی آپ نے نہ صرف اجازت دی ہے، بلکہ بسا اوقات خود اس کی ہدایت فرمائی ہے، مگر اس میں حد سے گزر جانے کو بڑی سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اُس زمانے میں جس قسم کے بناؤ سنگھار عرب کی عورتوں میں رائج تھے۔ اُن میں سے حسب ذیل چیزوں کو آپ نے قابلِ لعنت اور سبب ہلاکتِ اقدام قرار دیا: اپنے بالوں میں دوسرے بال ملا کر ان کو زیادہ لمبا اور گھنا دکھانے کی کوشش کرنا۔ جسم کے مختلف حصّوں کو گودنا اور مصنوعی تِل بنانا۔ بال اکھاڑ اکھاڑ کر بھویں خاص وضع کی بنانا اور روئیں نوچ نوچ کر منہ صاف کرنا۔ دانتوں کو گھِس گھِس کر باریک بنانا، یا دانتوں کے درمیان مصنوعی چھینیاں پیدا کرنا۔ زعفران ورس وغیرہ کے مصنوعی ابٹنے مل کر چہرے پر مصنوعی رنگ پیدا کرنا۔ یہ احکام صحاح ستہ اور مُسنَد احمد میں حضرت عائشہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر، حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم سے معتبر سندوں کے ساتھ مروی ہیں۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۶، النور حاشیہ ۴۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اظہارِ زینت کے حدود: چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم ستر ہے، جس کو باپ، چچا، بھائی اور بیٹے تک کے سامنے کھولنا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ عورت پر بھی عورت کے ستر کا کھلنا مکروہ ہے[1]۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد اظہار زینت کے حدود ملاحظہ کیجیے:

۱- عورت کو اجازت دی گئی ہے کہ اپنی زینت کو ان رشتہ داروں کے سامنے ظاہر کرے: شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور بھانجے۔

۲- اس کو یہ بھی اجازت دی گئی ہے کہ اپنے غلاموں کے سامنے اظہارِ زینت کرے (نہ کہ دوسروں کے غلاموں کی سامنے)۔

۳- وہ ایسے مَردوں کے سامنے بھی زینت کے ساتھ آ سکتی ہے جو تابع، یعنی زیردست اور ماتحت ہوں اور عورتوں کی طرف میلان و رغبت رکھنے والے مَردوں میں سے نہ ہوں[2]۔

۱- عورت کے لیے عورت کے جسم کا ناف سے گھٹنے تک حصہ کا دیکھنا اسی طرح حرام ہے جس طرح مرد کے لیے دوسرے مرد کا یہی حصہ جسم دیکھنا حرام ہے۔ اس کے سوا باقی حصہ جسم کو دیکھنا اس کے لیے مکروہ ہے، قطعی حرام نہیں ہے۔ (مؤلف)

۲- اس حکم کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: اوالتابعین غیر اولی الاربة من الرجال، ای الاجراء والاتباع الذین لیسوا باکفاء وھم مع ذالک فی عقولھم وله وخوث، فلاھمة لھم الی النسآء ولا یشتھونھن، یعنی اس سے مراد وہ مزدور، ملازم اور تابعدار مرد ہیں، جو عورتوں کے ہمسر نہ ہوں۔ نیز چالاک اور تیز قسم کے لوگ نہ ہوں بلکہ سیدھے سادھے لوگ ہوں جو عورتوں کی طرف شہوانی میلان نہ رکھتے ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۳، النور ۳۱)

شہوانی میلان نہ رکھنے کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سرے سے شہوت ہی مفقود ہو، جیسے بوڑھے لوگ، ناقص العقل، ابلہ یا پیدائشی مخنث۔ دوسرے یہ کہ ان میں مردانہ قوت اور عورتوں کی طرف طبعی میلان موجود تو ہو مگر اپنی ماتحتی و زیردستی کی وجہ سے وہ اس شخص کے گھر کی عورتوں کے ساتھ کسی قسم کے شہوانی جذبات وابستہ نہ کر سکتے ہوں جس کے ہاں مزدور یا ملازم کی حیثیت سے وہ کام کرتے ہوں، یا جس کے ہاں فقیر و مسکین کی حیثیت سے وہ خیرات طلب کرنے کے لیے جایا کرتے ہوں۔

او التابعین غیر اولی الاربة من الرجال کا اطلاق ان دونوں قسم کے آدمیوں پر ہوگا، لیکن یہ خیال رہے کہ اس طرح کے تمام وہ مرد جن کے سامنے عورتوں کو زینت کے ساتھ آنے کی اجازت دی جائے ان میں لازماً یہ دو صفتیں موجود ہونی چاہییں۔ ایک یہ کہ وہ اس گھر کے تابع ہوں جس کی عورتیں ان کے سامنے آ رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس گھر کی عورتوں کے ساتھ شہوانی غرض وابستہ کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتے ہوں اور یہ دیکھنا ہر خاندان کے قوام کا کام ہے کہ ایسے جن تابعین کو وہ گھر میں آنے کی اجازت دے رہا ہے ان پر غیر اولی الاربة ہونے کا جو گمان اس نے ابتداءً کیا تھا وہ صحیح ثابت ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر ابتدائی اجازت کے بعد آگے چل کر کسی وقت یہ شبہہ کرنے کی گنجایش نکل آئے کہ وہ اولی الاربة میں سے نہیں تو اجازت منسوخ کر دینی چاہیے۔ اس معاملے میں بہترین نظیر اس مخنث کی ہے جسے نبی ﷺ نے گھروں میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی اور پھر ایک واقعہ کے بعد اس کو نہ صرف گھروں میں آنے سے روک دیا، بلکہ مدینہ سے ہی نکال دیا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک مخنث تھا جو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹھا ہوا ان کے بھائی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں نبی ﷺ تشریف لے آئے اور مکان میں داخل ہوتے ہوئے آپ ﷺ نے سنا کہ وہ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہہ رہا تھا: ''اگر کل طائف فتح ہو گیا تو میں بادیہ بنت غیلان ثقفی کو تمہیں دکھاؤں گا جس کا حال یہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

۳- عورت ایسے بچوں کے سامنے بھی اظہارِ زینت کرسکتی ہے جن میں ابھی صنفی احساسات پیدا نہ ہوئے ہوں۔ قرآن میں اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَظۡهَرُوۡا عَلٰی عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ فرمایا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''ایسے بچے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ نہ ہوئے ہوں''۔

۴- اپنے میل جول کی عورتوں کے سامنے بھی عورت کا زینت کے ساتھ آنا جائز ہے۔ قرآن میں النسآء (عورتوں) کے الفاظ نہیں کہے گئے بلکہ نِسَآئِهِنَّ (اپنی عورتوں) کے الفاظ کہے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شریف عورتیں، یا اپنے کنبے یا رشتے، یا اپنے طبقے کی عورتیں مُراد ہیں۔ ان کے ماسوا عورتیں جن میں ہر قسم کی مجہول الحال، اور مُشتبہ چال چلن والیاں، اور آوارہ و بدنام سب ہی شامل ہوتی ہیں، اس اجازت سے خارج ہیں۔ اسی بنا پر جب شام کے علاقے میں مسلمان گئے اور ان کی خواتین وہاں کی نصرانی اور یہودی عورتوں کے ساتھ بے تکلفانہ ملنے لگیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مسلمان عورتوں کو اہلِ کتاب کی عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے سے منع کردو (ابن جریر، تفسیر آیۃ مذکورہ)۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے تصریح کی ہے کہ ''مسلمان عورت کفار اور اہل الذمہ کی عورتوں کے سامنے اس سے زیادہ ظاہر نہیں کرسکتی جو اجنبی مَردوں کے سامنے ظاہر کرسکتی ہے'' (تفسیر کبیر، آیۃ مذکورہ)۔ اس سے کوئی مذہبی امتیاز مقصد نہ تھا، بلکہ مسلمان عورتوں کو ایسی عورتوں کے اثرات سے بچانا مقصود تھا جن کے اخلاق اور تہذیب کا صحیح حال معلوم نہ ہو، یا جس حد تک معلوم ہو وہ اِسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہو۔ رہیں وہ غیر مسلم عورتیں جو شریف اور باحیا اور نیک خصلت ہوں تو وہ نِسَائِهِنَّ ہی میں شُمار ہوں گی۔

ان حدود پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ جس زینت کے اظہار کی اجازت اس محدود حلقہ میں دی گئی ہے وہ سترِ عورت کے ماسوا ہے۔ اس سے مُراد زیور پہننا، اچھے ملبوسات سے آراستہ ہونا، سرمہ اور حنا اور بالوں کی آرایش اور دوسری وہ آرائشیں ہیں جو عورتیں اپنی انوثت کے اقتضا سے اپنے گھر میں کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے کہ جب سامنے سے آتی ہے تو اس کے پیٹ میں چار بل نظر آتے ہیں اور جب پیچھے پلٹتی ہے تو آٹھ بل''۔ اس کے بعد ایک شرمناک فقرے میں اس نے اس عورت کے ستر کی تعریف کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ باتیں سن کر فرمایا: لقد غلغلت النظر الیها یا عدو اللّٰہ (تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵، ص۳۱۲)، اے دشمنِ خدا تو نے تو اسے خوب نظریں گاڑ کر دیکھا ہے۔ پھر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ یہ عورتوں کے احوال سے واقف ہے، لہٰذا اب یہ تمھارے پاس نہ آنے پائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی بس نہ کیا بلکہ اسے مدینہ سے نکال کر بیداء میں رہنے کا حکم دیا۔ کیونکہ اس نے بنت غیلان کے ستر کا جو نقشہ کھینچا تھا، اس سے آپ نے اندازہ فرمایا کہ اس شخص کے زنانہ پن کی وجہ سے عورتیں اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلف ہو جاتی ہیں جتنی اپنی ہم جنس عورتوں سے ہو سکتی ہیں۔ اور اس طرح یہ ان کے اندرونی احوال سے واقف ہو کر ان کی تعریفیں مردوں کے سامنے بیان کرتا ہے، جس سے بڑے فتنے برپا ہو سکتے ہیں۔ (بذل المجھود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی قوله تعالٰی غیر اولی الاربة من الرجال) [مؤلف]

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

دوسرے یہ کہ اس قسم کی آرایشوں کے اظہار کی اجازت یا تو ان مَردوں کے سامنے دی گئی ہے جن کو ابدی حرمت نے عورتوں کے لیے حرام کردیا ہے، یا ان مَردوں کے سامنے جن کے اندر صنفی میلانات نہیں ہیں، یا ان کے سامنے جو فتنے کا سبب نہ بن سکتے ہوں۔ چنانچہ عورتوں کے لیے نِسَآءِ هِنَّ کی قید ہے اور بچوں کے لیے لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شارع کا منشا عورتوں کے اظہارِ زینت کو ایسے حلقے میں محدود کرنا ہے جس میں ان کے حسن اور ان کی آرایش سے کسی قسم کے ناجائز جذبات پیدا ہونے اور صنفی انتشار کے اسباب فراہم ہوجانے کا اندیشہ نہیں ہے۔

اس حلقے کے باہر جتنے مَرد ہیں ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ ان کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کرو، بلکہ چلنے میں پاؤں بھی اس طرح نہ مارو کہ چھپی ہوئی زینت کا حال آواز سے ظاہر ہو اور اس ذریعے سے توجہات تمھاری طرف منعطف ہوں۔ اس فرمان میں جس زینت کو اجانب سے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہی زینت ہے جس کو ظاہر کرنے کی اجازت اُوپر کے محدود حلقے میں دی گئی ہے، مقصود بالکل واضح ہے۔ عورتیں اگر بن ٹھن کر ایسے لوگوں کے سامنے آئیں گی جو صنفی خواہشات رکھتے ہیں اور جن کے داعیاتِ نفس کو ابدی حرمت نے پاکیزہ اور معصوم جذبات سے مبدّل بھی نہیں کیا ہے، تو لامحالہ اس کے اثرات وہی ہوں گے جو مقتضائے بشریت ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ایسے اظہارِ زینت سے ہر عورت فاحشہ ہی ہو کر رہے گی اور ہر مَرد بالفعل بدکار ہی بن کر رہے گا۔ مگر اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ زینت وآرایش کے ساتھ عورتوں کے علانیہ پھرنے اور محفلوں میں شریک ہونے سے بے شُمار جلی اور خفی، نفسانی اور مادی نقصانات رُونما ہوتے ہیں۔ آج یورپ اور امریکہ کی عورتیں اپنے اور اپنے شوہروں کی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنی آرایش پر خرچ کررہی ہیں اور روز بروز ان کا یہ خرچ اتنا بڑھتا چلا جارہا ہے کہ ان کے معاشی وسائل اس کے تحمل کی قوت نہیں رکھتے[1]۔ کیا یہ جنون انہی پرشوق نگاہوں نے پیدا نہیں کیا ہے جو بازاروں اور دفتروں اور سوسائٹی کے اجتماعات میں آراستہ خواتین کا استقبال کرتی ہیں؟ پھر غور کیجیے کہ آخر عورتوں کی آرایش کا اس قدر شوق پیدا ہونے اور طوفان کی طرح بڑھنے کا سبب کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ مَردوں سے خراجِ تحسین وصول کرنا اور ان کی نظروں میں کھُب جانا چاہتی ہیں[2]۔ یہ کس لیے؟ کیا یہ بالکل ہی معصوم جذبہ ہے؟ کیا اس کی تہ میں وہ صنفی خواہشات چھپی ہوئی نہیں ہیں جو اپنے

۱- حال میں کیمیائی سامان بنانے والوں کی نمایش ہوئی تھی جس میں ماہرین کے بیانات سے معلوم ہوا کہ انگلستان کی عورتیں اپنے سنگھار پر دو کروڑ پونڈ اور امریکہ کی عورتیں ساڑھے بارہ کروڑ پونڈ سالانہ خرچ کرتی ہیں اور قریب قریب ۹۰ فی صد عورتیں کسی نہ کسی طریقے کے میک اپ (make-up) کی خوگر ہیں۔

۲- خوبصورت بننے کا جنون عورتوں میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اس کی خاطر وہ اپنی جانیں تک دے رہی ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہلکی پھلکی گڑیا سی بن کر رہیں اور ان کے جسم پر ایک اونس بھی ضرورت سے زیادہ گوشت نہ ہو۔ خوبصورتی کے لیے پنڈلی، ران، اور سینہ کے جو ناپ ماہرین نے مقرر کردیے ہیں، ہر لڑکی اپنے آپ کو اس پیمانے کے اندر رکھنا چاہتی ہے۔ گویا اس کم بخت کی زندگی کا کوئی مقصد دوسروں کی نگاہوں میں مرغوب بننے کے سوا نہ رہا۔ اس مقصد کے لیے یہ بےچاریاں فاقے کرتی ہیں، جسم کو نشوونما دینے والی غذاؤں سے قصداً اپنے آپ کو محروم رکھتی ہیں، لیموں کے رس، تلخ قہوہ اور ایسی ہی ہلکی غذاؤں پر جیتی ہیں۔ اور طبی مشورے کے بغیر، بلکہ اس کے خلاف ایسی دوائیں استعمال کرتی ہیں جو انہیں دبلا کریں۔ اس جنوں کی خاطر بہت سی عورتوں نے اپنی جانیں دی ہیں اور دے رہی ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں بوڈاپسٹ کی مشہور ایکٹرس جوسی لاباں یکایک حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے مرگئی۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ کئی سال سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فطری دائرے سے نکل کر پھیل جانا چاہتی ہیں اور جن کے مطالبات کا جواب دینے کے لیے دوسری جانب بھی ویسی خواہشات موجود ہیں؟ اگر آپ اس سے انکار کریں گے تو شاید کل آپ یہ دعویٰ کرنے میں بھی تامل نہ کریں کہ جوالامکھی پہاڑ پر جو دھواں نظر آتا ہے اس کی تہ میں کوئی لاوا باہر نکلنے کے لیے بے تاب نہیں ہے۔ آپ اپنے عمل کے مختار ہیں جو چاہے کیجیے۔ مگر حقائق سے انکار نہ کیجیے۔ یہ حقیقتیں اب کچھ مستور بھی نہیں رہیں سامنے آچکی ہیں اور اپنے نتائج، آفتاب سے زیادہ روشن نتائج کے ساتھ آچکی ہیں۔ آپ ان نتائج کو دانستہ یا نادانستہ قبول کرتے ہیں۔ مگر اسلام ان کو ٹھیک اسی مقام پر روک دینا چاہتا ہے جہاں سے ان کے ظہور کی ابتدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی نظر اظہارِ زینت کے بظاہر معصوم آغاز پر نہیں، بلکہ اس نہایت غیر معصوم انجام پر ہے جو تمام سوسائٹی پر قیامت کی سی تاریکی لے کر پھیل جاتا ہے۔ مَثَلُ الرَّافِلَةِ فِی الزِّیْنَةِ فِیْ غَیْرِ اَھْلِھَا کَمَثَلِ ظُلْمَةٍ یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا نُوْرَلَھَا[1] (ترمذی، باب ماجاء فی کراھیة خروج النسآء فی الزینة) اجنبیوں میں زینت کے ساتھ ناز و انداز سے چلنے والی عورت ایسی ہے جیسے روز قیامت کی تاریکی کہ اس میں کوئی نور نہیں۔

از خود ظاہر ہونے والی زینت: قرآن میں جہاں اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار کرنے کی ممانعت ہے۔ وہاں ایک استثنا بھی ہے اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی زینت کے ظاہر ہونے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے جو خود ظاہر ہو جائے۔ لوگوں نے اس استثنا سے بہت کچھ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان الفاظ میں کچھ زیادہ فائدہ اُٹھانے کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ شارع صرف یہ کہتا ہے کہ تم اپنے ارادے سے غیروں کے سامنے اپنی زینت ظاہر نہ کرو، لیکن جو زینت خود ظاہر ہو جائے یا اضطراراً ظاہر رہنے والی ہو اس کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ مطلب صاف ہے۔ تمھاری نیت اظہارِ زینت کی نہ ہونی چاہیے۔ تم میں یہ جذبہ، یہ ارادہ ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ اپنی آرایش غیروں کو دکھاؤ یا اور کچھ نہیں تو چھپے ہوئے زیوروں کی جھنکار ہی سنا کر ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قصداً نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہی تھی اور جسم گھٹانے کی پیٹنٹ دوائیں استعمال کیے جاتی تھی۔ آخر اس کی قوتوں نے یکا یک جواب دے دیا۔ اس کے بعد پے در پے بوڈاپسٹ ہی میں تین اور ایسے ہی حادثے پیش آئے۔ ماگدا بر میلی جو اپنے حسن اور کمالات کے لیے تمام ہنگری میں مشہور تھی، اسی 'ہلکے پن' کے شوق کی نذر ہوئی۔ پھر ایک مغنیہ لوئیسا زابو جس کے گانوں کی ہر طرف دھوم تھی، ایک رات عین اسٹیج پر اپنا کام کرتی ہوئی ہزار ہا ناظرین کے سامنے غش کھا کر گر پڑی۔ اس کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ اس کا جسم موجودہ زمانے کے معیارِ حسن پر پورا نہیں اترتا۔ اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے بے چاری نے مصنوعی تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں اور دو مہینے میں ۶۰ پونڈ وزن کم کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل حد سے زیادہ کمزور ہو گیا اور ایک دن وہ بھی خریدارانِ حسن کی بھینٹ چڑھ کر رہی۔ اس کے بعد ایمولا نامی ایک اور ایکٹرس کی باری آئی اور اس نے مصنوعی تدبیروں سے اپنے آپ کو اتنا ہلکا کیا کہ ایک مستقل دماغی مرض میں مبتلا ہو گئی اور اسٹیج کے بجائے اسے پاگل خانے کی راہ لینی پڑی۔ اس قسم کی مشہور شخصیتوں کے واقعات تو اخباروں میں آ جاتے ہیں، مگر کون جانتا ہے کہ یہ حسن اور معشوقیت کا جنون جو گھر گھر پھیلا ہوا ہے روزانہ کتنی صحتوں اور کتنی زندگیوں کو تباہ کرتا ہوگا؟ کوئی بتائے کہ یہ عورتوں کی آزادی ہے یا ان کی غلامی؟ اس نام نہاد آزادی نے تو ان پر مردوں کی خواہشات کا استبداد اور زیادہ مسلّط کر دیا ہے۔ اس نے تو ان کو ایسا غلام بنلیا ہے کہ وہ کھانے پینے، اور تندرست رہنے کی آزادی سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان غریبوں کا تو جینا اور مرنا اب بس مردوں ہی کے لیے رہ گیا ہے۔ [مؤلف]

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۲۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

توجہ اپنی طرف مائل کرو۔ تم کو اپنی طرف سے تو اخفائے زینت کی اختیاری کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اگر کوئی چیز اضطراراً کھل جائے تو اس پر خدا تم سے کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔ تم جن کپڑوں میں زینت کو چھپاؤ گے۔ وہ تو بہر حال ظاہر ہی ہوں گے۔ تمھارا قد و قامت، تناسب جسمانی، ڈیل ڈول تو ان میں محسوس ہوگا۔ کسی ضرورت یا کام کاج کے لیے کبھی ہاتھ یا چہرے کا کوئی حصّہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔ کوئی حرج نہیں اگر ایسا ہو۔ تمھاری نیت اس کے اظہار کی نہیں۔ تم اس کے اظہار پر مجبور بھی ہو۔ اگر ان چیزوں سے بھی کوئی کمینہ لذت لیتا ہے تو لیا کرے۔ اپنی بدنیتی کی سزا خود بھگتے گا۔ جتنی ذمہ داری تمدن اور اخلاق کی خاطر تم پر ڈالی گئی تھی اس کو تم نے اپنی حد تک پورا کر دیا۔

مفسّرین کے نزدیک آیت کا مفہوم: یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا۔ مفسّرین کے درمیان اس کے مفہوم میں جتنے اختلافات ہیں، ان سب پر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تمام اختلافات کے باوجود ان کے اقوال کا مفاد وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابراہیم نخعی اور حسن بصری کے نزدیک زینتِ ظاہرہ سے مُراد وہ کپڑے ہیں جن میں زینت باطنہ کو چھپایا جاتا ہے، مثلاً برقع یا چادر۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، عطاء، ابن عمر، انس، ضحاک، سعید بن جبیر، اوزاعی اور عامہ حنفیہ کے نزدیک اس سے مُراد چہرہ اور ہاتھ ہیں اور وہ اسبابِ زینت بھی اس استثنا میں داخل ہیں جو چہرے اور ہاتھ میں عادتاً ہوتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کی حنا اور انگوٹھی اور آنکھوں کا سرمہ وغیرہ۔

سعید بن المسیب کے نزدیک صرف چہرہ مستثنیٰ ہے اور ایک قول حسن بصری سے بھی ان کی تائید میں منقول ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چہرہ چھپانے کی طرف مائل ہیں۔ ان کے نزدیک زینتِ ظاہرہ سے مُراد ہاتھ اور چوڑیاں، کنگن اور انگوٹھیاں ہیں۔

مِسوَر بن مخرمہ اور قتادہ ہاتھوں کو ان کی زینت سمیت کھولنے کی اجازت دیتے ہیں، مگر چہرے کے باب میں ان کے اقوال سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ پورے چہرے کے بجائے وہ صرف آنکھیں کھولنے کو جائز رکھتے ہیں[1]۔ ان اختلافات کے منشا پر غور کیجیے۔ ان سب مفسّرین نے اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے یہی سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی زینت کو ظاہر کرنے کی اجازت دیتا ہے جو اضطراراً ظاہر ہو جائے یا جس کو ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آ جائے۔ چہرے اور ہاتھوں کی نمائش کرنا یا ان کو مطمحِ انظار بنانا ان میں سے کسی کا بھی مقصود نہیں۔ ہر ایک نے اپنے فہم اور عورتوں کی ضروریات کے لحاظ سے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ضرورت کس حد تک کسی چیز کو بے حجاب کرنے کے لیے داعی ہوتی ہے۔ یا کیا چیز اضطراراً کھل سکتی ہے یا عادتاً کھلتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی مقید نہ کیجیے۔ ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے۔ وہ خود اپنے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں۔ کب کھولے اور کب نہ کھولے۔ کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے۔ اس باب میں قطعی

۱۔ یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر اور علامہ جصاص کی احکام القرآن سے ماخوذ ہیں۔ [مؤلف]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

احکام نہ شارع نے دیے ہیں نہ اختلافِ احوال وضروریات کو دیکھتے ہوئے یہ مقتضائے حکمت ہے کہ قطعی احکام وضع کیے جائیں۔ جو عورت اپنی حاجات کے لیے باہر جانے اور کام کاج کرنے پر مجبور ہے اس کو کسی وقت ہاتھ بھی کھولنے کی ضرورت پیش آئے گی اور چہرہ بھی۔ ایسی عورت کے لیے بلحاظِ ضرورت اجازت ہے اور جس عورت کا حال یہ نہیں ہے اس کے لیے بلاضرورت قصداً کھولنا درست نہیں۔

پس شارع کا مقصد یہ ہے کہ اپنا حسن دکھانے کے لیے اگر کوئی چیز بے حجاب کی جائے تو یہ گناہ ہے۔ خود بخود بلاارادہ کچھ ظاہر ہو جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ حقیقی ضرورت اگر کچھ کھولنے پر مجبور کرے تو اس کا کھولنا بالکل جائز ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اختلافِ احوال سے قطع نظر کر کے نفسِ چہرہ کا کیا حکم ہے؟ شارع اس کے کھولنے کو پسند کرتا ہے یا ناپسند؟ اس کے اظہار کی اجازت محض ناگزیر ضرورت کے طور پر دی گئی ہے یا اس کے نزدیک چہرہ غیروں سے چھپانے کی چیز ہی نہیں ہے؟ ان سوالات پر سورۂ احزاب والی آیت میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

(پردہ، جون، ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۵-۳۱۷)

سینوں پر دوپٹے ڈالنے کا حکم: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ (النور ۲۴:۳۱) اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں، جن کی گرہ جوڑے کی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی۔ سامنے گریبان کا ایک حصہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینے کا بالائی حصہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ چھاتیوں پر قمیص کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی اور پیچھے دو دو تین تین چوٹیاں لہراتی رہتی تھیں (تفسیر کشاف، جلد ۲، ص ۹۰- ابن کثیر، جلد ۳، ص ۲۸۳-۲۸۴)۔

اس آیت کے نزول کے بعد مسلمان عورتوں میں دوپٹہ رائج کیا گیا، جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آج کل کی صاحبزادیوں کی طرح بس اسے بل دے کر گلے کا ہار بنا لیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ اسے اوڑھ کر سر، کمر، سینہ، سب اچھی طرح ڈھانک لیے جائیں۔ اہل ایمان خواتین نے قرآن کا یہ حکم سنتے ہی فوراً جس طرح اس کی تعمیل کی اس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورۂ نور نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سن کر لوگ اپنے گھروں کی طرف پلٹے اور جا کر انھوں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کو اس کی آیات سنائیں۔ انصار کی عورتوں میں سے کوئی ایسی نہ تھی جو آیت وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ کے الفاظ سن کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی ہو۔ ہر ایک اٹھی اور کسی نے اپنا کمر پٹہ کھول کر اور کسی نے چادر اٹھا کر فوراً اس کا دوپٹہ بنایا اور اوڑھ لیا[۱]۔ دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت جتنی عورتیں مسجد نبوی میں حاضر ہوئیں سب دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مزید تفصیل یہ بتاتی ہیں کہ عورتوں نے باریک کپڑے چھوڑ کر اپنے موٹے موٹے کپڑے چھانٹے اور ان کے دوپٹے بنائے (ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۸۴- ابوداؤد، کتاب اللباس)۔

دوپٹے کی نوعیت: یہ بات کہ دوپٹہ باریک کپڑے کا نہ ہونا چاہیے، ان احکام کے مزاج اور مقصد پر غور کرنے سے خود

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۸۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہی آدمی کی سمجھ میں آ جاتی ہے، چنانچہ انصار کی خواتین نے حکم سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا منشا کس طرح کے کپڑے کا دوپٹہ بنانے سے پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن صاحبِ شریعت ﷺ نے اس بات کو بھی صرف لوگوں کے فہم پر نہیں چھوڑ دیا، بلکہ خود اس کی تصریح فرما دی۔ دِحیہ کلبی کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس مصر کی بنی ہوئی باریک ململ (قَباطی) آئی۔ آپ نے اس میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور فرمایا ایک حصہ پھاڑ کر اپنا کرتہ بنا لو اور ایک حصہ اپنی بیوی کو دوپٹہ بنانے کے لیے دے دو۔ مگر ان سے کہہ دینا کہ تَجعَلُ تَحتَهٗ ثَوبًا لَا یَصِفُهَا اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لیں تا کہ جسم کی ساخت اندر سے نہ جھلکے[۱] (ابوداؤد، کتاب اللباس)۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۶-۳۸۷، النور حاشیہ ۳۶)

گھر سے باہر نکلنے کے احکام

اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھنے کا حکم: وَقَرنَ فِی بُیُوتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجنَ تَبَرُّجَ الجَاهِلِیَّةِ الاُولٰی (الاحزاب ۳۳:۳۳) اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔

اصل میں لفظ قَرنَ استعمال ہوا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اس کو 'قرار' سے ماخوذ بتایا ہے اور بعض نے 'وقار' سے۔ اگر اس کو قرار سے لیا جائے تو معنی ہوں گے: 'قرار پکڑو، ٹک رہو'۔ اور اگر وقار سے لیا جائے تو مطلب ہوگا: 'سکون سے رہو، چین سے بیٹھو'۔ دونوں صورتوں میں آیت کا منشا یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرہ عمل اس کا گھر ہے۔ اس کو اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہییں اور گھر سے باہر صرف بضرورت ہی نکلنا چاہیے۔ یہ منشا خود آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور نبی ﷺ کی احادیث اس کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ حافظ ابوبکر بزّار حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ساری فضیلت تو مرد لوٹ لے گئے، وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے؟ جواب میں فرمایا: مَن قَعَدَت مِنکُنَّ فِی بَیتِهَا فَاِنَّهَا تُدرِکُ عَمَلَ المُجَاهِدِینَ[۲] جو تم میں سے گھر میں بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی۔ مطلب یہ ہے کہ مجاہد دِل جمعی کے ساتھ اسی وقت تو خدا کی راہ میں لڑ سکتا ہے جبکہ اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہو۔ اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی ہو اور اسے کوئی خطرہ اس امر کا نہ ہو کہ پیچھے وہ کوئی گل کھلا بیٹھے گی۔ یہ اطمینان جو عورت اسے فراہم کرے گی وہ گھر بیٹھے اس کے جہاد میں برابر کی حصہ دار ہوگی۔ ایک اور روایت جو بزّار اور ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اس میں وہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ اِنَّ المَرأَةَ عَورَةٌ فَاِذَا خَرَجَت استَشرَفَهَا الشَّیطَانُ وَاَقرَبُ مَا تَکُونُ بِرَوحَةِ رَبِّهَا وَهِیَ فِی قَعرِ بَیتِهَا[۳] عورت مستور رہنے کے قابل چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۲۸۲

۲- ایضاً، ج ۵ ص ۲۹۳

۳- ایضاً، ج ۷ ص ۲۹۳-۲۹۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کو تا کتا ہے اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے گھر میں ہو۔[1]

(تفہیم القرآن، چہارم، ص۹۰، الاحزاب حاشیہ ۴۸)

بن ٹھن کر باہر نکلنے کی ممانعت: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ، اور سابق دورِ جاہلیت کی سج دھج نہ دکھاتی پرو۔

اس آیت میں دو اہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا سمجھنا آیت کے منشا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک تبرّج، دوسرے جاہلیتِ اُولیٰ۔

تبرّج کے معنی عربی زبان میں نمایاں ہونے، اُبھرنے اور کھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ ہر ظاہر اور مرتفع چیز کے لیے عرب لفظ 'برج' استعمال کرتے ہیں۔ 'برج' کو برج اس کے ظہور و ارتفاع کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے۔ بادبانی کشتی کے لیے 'بارجہ' کا لفظ اسی لیے بولا جاتا ہے کہ اس کے بادبان دُور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے جب لفظ تبرّج استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حسن لوگوں کو دکھائے، دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان دوسروں کے سامنے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چٹک مٹک سے، اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ یہی تشریح اس لفظ کی اکابر اہلِ لغت اور اکابر مفسرین نے کی ہے۔ مُجاہد، قتادہ اور ابنِ ابی نجیح کہتے ہیں: التبرّج المشی یتبختر وتکسر وَ تغنج، تبرج کے معنی ہیں ناز و ادا کے ساتھ لچکے کھاتے اور اٹھلاتے ہوئے چلنا۔ مُقاتل کہتے ہیں: ابداء قلائدها و قرطها و عنقها، عورت کا اپنے ہار اور اپنے بُندے اور اپنا گلا نمایاں کرنا۔ المبرد کا قول ہے: ان تبدی من محاسنها ما یجب علیها ستره، یہ کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کر دے جن کو اسے چھپانا چاہیے۔ ابوعُبیدہ کی تفسیر ہے: ان تخرج من محاسنها ما تستدعی به شهوة الرجال، یہ کہ عورت اپنے جسم و لباس کے حسن کو نمایاں کرے جس سے مَردوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔

جاہلیت کا لفظ قرآنِ مجید میں اس مقام کے علاوہ تین جگہ اور استعمال ہوا ہے۔ ایک آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں،

۱۔ قرآن مجید کے اس صاف اور صریح حکم کی موجودگی میں اس بات کی آخر کیا گنجائش ہے کہ مسلمان عورتیں کونسلوں اور پارلیمنٹوں کی ممبر بنیں، بیرونِ خانہ کی سوشل سرگرمیوں میں دوڑتی پھریں، سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کریں، کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں، مردانہ ہسپتالوں میں نرسنگ کی خدمت انجام دیں، ہوائی جہازوں اور ریل کاروں میں مسافر نوازی کے لیے استعمال کی جائیں، اور تعلیم و تربیت کے لیے امریکہ و انگلستان بھیجی جائیں؟ عورت کے بیرونِ خانہ سرگرمیوں کے جواز میں بڑی سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جنگِ جمل میں حصہ لیا تھا، لیکن یہ استدلال جو لوگ پیش کرتے ہیں، انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا خیال اس باب میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے زوائد الزھد میں اور ابن المُنذر، ابنِ ابی شَیبہ اور ابن سعد رحمہم اللہ نے اپنی کتابوں میں مسروق کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تلاوت قرآن کرتے ہوئے اس آیت وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا، کیونکہ اس پر انہیں اپنی وہ غلطی یاد آ جاتی تھی جو ان سے جنگِ جمل میں ہوئی تھی۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص۹۰-۹۱، الاحزاب حاشیہ ۴۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جہاں اللہ کی راہ میں لڑنے سے جی چرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ''اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیت کے سے گمان رکھتے ہیں''۔ دوسرے سورۂ مائدہ، آیت ۵۰ ر میں، جہاں خدا کے قانون کے بجائے کسی اور قانون کے مطابق اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا: ''کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں''۔ تیسرے سورۂ فتح آیت ۲۶ ر میں جہاں کفارِ مکہ کے اِس فعل کو 'حمیّت جاہلیہ' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انھوں نے محض تعصب کی بنا پر مسلمانوں کو عمرہ نہ کرنے دیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوالدّرداء رضی اللہ عنہ نے کسی شخص سے جھگڑا کرتے ہوئے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا: ''تم میں ابھی تک جاہلیت موجود ہے''۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تین کام جاہلیت کے ہیں: دوسروں کے نسب پر طعن کرنا، ستاروں کی گردش سے فال لینا، مُردوں پر نوحہ کرنا''[۱]۔ ان تمام استعمالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جاہلیت سے مُراد اِسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرزِ عمل ہے جو اِسلامی تہذیب و ثقافت اور اِسلامی اخلاق و آداب اور اِسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔ اور جاہلیت اولیٰ کا مطلب وہ بُرائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حسن کا نمایش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو، کیونکہ تمھارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ اس سے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دورِ جاہلیت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بَن ٹھن کر نکلنا، چہرے اور جسم کے حسن کو زیب و زینت اور چست لباسوں یا عریاں لباسوں سے نمایاں کرنا اور ناز و ادا سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اِسلام میں نہیں چل سکتے[۲]۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۹۱-۹۲، الاحزاب حاشیہ ۴۹)

حاجات کے لیے نکلنے کی اجازت: حدیث میں ہے کہ احکامِ حجاب نازل ہونے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقاضا تھا کہ یارسول اللہ! اپنی خواتین کو پردہ کرائیے۔ ایک مرتبہ اُمّ المومنین حضرت سَودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا رات کے وقت باہر نکلیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھ لیا اور پکار کر کہا کہ سودہ رضی اللہ عنہا! ہم نے تم کو پہچان لیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح خواتین کا گھروں سے نکلنا ممنوع ہو جائے۔ اس کے بعد جب احکامِ حجاب نازل ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بن آئی۔ انھوں نے عورتوں کے باہر نکلنے پر زیادہ روک ٹوک شروع کر دی۔ ایک مرتبہ پھر حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وہی صورت پیش آئی۔ وہ گھر سے نکلیں اور عُمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: قَدْ اَذِنَ اللّٰہُ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِکُنَّ[۱] اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۸، ص ۲۵۲

۲- اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جارہی ہے وہ قرآن کی رو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کارفرماؤں کے پاس آ گیا ہے جس سے اسلام کی یہ رُوح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جارہی ہے تو بات دوسری ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس سے معلوم ہوا کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کے حکم کا منشا یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے قدم کبھی باہر نکالیں ہی نہیں۔ حاجات وضروریات کے لیے ان کو نکلنے کی پوری اجازت ہے۔ مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے، نہ غیر محدود۔ عورتیں اس کی مجاز نہیں ہیں کہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں پھریں اور مردانہ اجتماعات میں گھل مل جائیں۔ حاجات وضروریات سے شریعت کی مُراد ایسی واقعی حاجات وضروریات ہیں جن میں درحقیقت نکلنا اور باہر کام کرنا عورتوں کے لیے ناگزیر ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ تمام عورتوں کے لیے تمام زمانوں میں نکلنے اور نہ نکلنے کی ایک ایک صورت بیان کرنا اور ہر ہر موقع کے لیے رخصت کے علیحدہ علیحدہ حدود مقرر کر دینا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شارع نے زندگی کے عام حالات میں عورتوں کے لیے نکلنے کے جو قاعدے مقرر کیے تھے اور حجاب کی حدود میں جس طرح کمی وبیشی کی تھی اس سے قانونِ اسلامی کی اسپرٹ اور اس کے رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس کو سمجھ کر انفرادی حالات اور جزوی معاملات میں حجاب کے حدود اور موقع ومحل کے لحاظ سے ان کی کمی وبیشی کے اُصول ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے ہم مثال کے طور پر چند مسائل بیان کرتے ہیں۔

مسجد میں آنے کی اجازت اور اس کے حدود: یہ معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے اہم فرض نماز ہے اور نماز میں حضورِ مسجد اور شرکتِ جماعت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ مگر نماز باجماعت کے باب میں جو احکام مَردوں کے لیے ہیں، ان کے بالکل برعکس احکام عورتوں کے لیے ہیں۔ مَردوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو مسجد میں جماعت کے ساتھ ہو اور عورتوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو گھر میں انتہائی خلوت کی حالت میں ہو۔ امام احمد اور طبرانی نے امِ حُمید سَاعِدیہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

قَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّي أُحِبُّ الصَّلٰوةَ مَعَكَ. قَالَ: قَدْ عَلِمْتُ. صَلٰوتُكِ فِيْ بَيْتِكِ خَيْرٌ لَّكِ مِنْ صَلٰوتِكِ فِيْ حُجْرَتِكِ وَ صَلٰوتُكِ فِيْ حُجْرَتِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ دَارِكِ. وَ صَلٰوتُكِ فِيْ دَارِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ مَسْجِدِ قَوْمِكِ وَ صَلٰوتُكِ فِيْ مَسْجِدِ قَوْمِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ مَسْجِدِ الْجُمُعَةِ[2] انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے معلوم ہے، مگر تیرا ایک گوشے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے حجرے میں نماز پڑھے۔ اور حجرے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے گھر کے دالان میں نماز پڑھے اور تیرا دالان میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھے اور تیرا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ مسجدِ جامع میں نماز پڑھے[3]۔

اسی مضمون کی حدیث ابوداؤد میں ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

۱۔ یہ متعدد احادیث کا لب لباب ہے۔ ملاحظہ ہو: مسلم، باب اباحة الخروج للنسآء لقضاء حاجة الانسان. بخاری، باب الخروج النسآء احوائجهن، باب آية الحجاب

۲۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۲۶

۳۔ عورت کو اس قدر خلوت میں نماز پڑھنے کی ہدایت جس مصلحت سے دی گئی ہے، اس کو خود عورتیں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مہینہ میں چند روز ایسے آتے ہیں جن میں عورت کو مجبوراً نماز ترک کرنی پڑتی ہے اور اس طرح وہ بات ظاہر ہو جاتی ہے جسے کوئی حیادار (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صَلٰوةُ الْمَرْأَةِ فِیْ بَیْتِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِیْ حُجْرَتِهَا وَ صَلٰوتُهَا فِیْ مِخْدَعِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِیْ بَیْتِهَا [۱] (باب ما جاء فی خروج النسآء الی المساجد) عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے اور اس کا اپنے چور خانہ میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھے۔

دیکھیے یہاں ترتیب بالکل اُلٹ گئی ہے۔ مرد کے لیے سب سے ادنیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ وہ ایک گوشۂ تنہائی میں پڑھے اور سب سے افضل یہ کہ وہ بڑی سے بڑی جماعت میں شریک ہو، مگر عورت کے لیے اس کے برعکس انتہائی خلوت کی نماز میں فضیلت ہے اور اس خفیہ نماز کو نہ صرف نماز با جماعت پر ترجیح دی گئی ہے بلکہ اس نماز سے بھی افضل کہا گیا ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت مسلمان کے لیے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یعنی مسجد نبوی کی جماعت، جس کے امام خود امام الانبیا محمد ﷺ تھے۔ آخر اس فرق و امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ یہی نا کہ شارع نے عورت کے باہر نکلنے کو پسند نہیں کیا اور جماعت میں ذکور و اناث کے خلط ملط ہونے کو روکنا چاہا۔

مگر نماز ایک مقدس عبادت ہے اور مسجد ایک پاک مقام ہے۔ شارع حکیم نے اختلاطِ صنفین کو روکنے کے لیے اپنے منشا کا اظہار تو فضیلت اور عدمِ فضیلت کی تفریق سے کر دیا۔ مگر ایسے پاکیزہ کام کے لیے ایسی پاک جگہ آنے سے عورتوں کو منع نہیں کیا۔ حدیث میں یہ اجازت جن الفاظ کے ساتھ آئی ہے وہ شارع کی بے نظیر حکیمانہ شان پر دلالت کرتے ہیں، فرمایا:

لَا تَمْنَعُوْا اِمَآءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اِذَا اسْتَاذَنَتِ امْرَأَةُ اَحَدِ کُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَلَا یَمْنَعْهَا (بخاری و مسلم) خدا کی لونڈیوں کو خدا کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔ جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو وہ اس کو منع نہ کرے۔

لَا تَمْنَعُوْا نِسَآءَ کُمُ الْمَسَاجِدَ وَ بُیُوْتُهُنَّ خَیْرٌ لَّهُنَّ (ابوداؤد) اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو مگر ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔ [۲]

یہ الفاظ خود ظاہر کر رہے ہیں کہ شارع عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکتا تو نہیں ہے، کیونکہ مسجد میں نماز کے لیے جانا کوئی برا فعل نہیں جس کو ناجائز قرار دیا جا سکے۔ مگر مصالح اس کے بھی مقتضی نہیں کہ مساجد میں ذکور و اناث کی جماعت مخلوط ہو جائے۔ لہٰذا ان کو آنے کی اجازت تو دے دی۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجدوں میں بھیجو، یا اپنے ساتھ لایا کرو، بلکہ صرف یہ کہا کہ اگر وہ افضل نماز کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا ہی چاہیں اور اجازت مانگیں تو منع نہ کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) عورت اپنے بھائی بہنوں پر بھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہت سی عورتیں اسی شرم کی وجہ سے تارکِ صلوٰۃ ہو جاتی ہیں۔ شارع نے اس بات کو محسوس کر کے ہدایت فرمائی کہ چھپ کر خلوت کے ایک گوشے میں نماز پڑھا کرو تا کہ کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ تم کب نماز پڑھتی ہو اور کب چھوڑ دیتی ہو۔ مگر یہ صرف ہدایت ہے۔ تاکید اور حکم نہیں ہے۔ عورتیں گھر میں اپنی الگ جماعت کر سکتی ہیں اور عورت ان کی امامت کر سکتی ہے۔ ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا کو آنحضرت ﷺ نے اجازت دی تھی کہ عورتوں کی امامت کریں (ابوداؤد) دارِ قطنی اور بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت کی اور صف کے بیچ میں کھڑی ہو کر نماز پڑھائی۔ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت جب عورتوں کی جماعت کو نماز پڑھائے تو اسے امام کی طرح صف کے آگے نہیں، بلکہ صف کے درمیان کھڑا ہونا چاہیے۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۲۹ ۲- ایضاً، ج ۵، ص ۳۳۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو روحِ اسلام کے بڑے راز داں تھے، شارع کے اس حُکم کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ مؤطا میں مذکور ہے کہ ان کی بیوی عاتکہ بنت زید سے ہمیشہ اس معاملے میں ان کی کشاکش رہا کرتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ چاہتے تھے کہ وہ مسجد میں جائیں۔ مگر انھیں جانے پر اصرار تھا۔ وہ اجازت مانگتیں تو آپ ٹھیک ٹھیک حُکمِ نبوی پر عمل کر کے بس خاموش ہو جاتے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم تمھیں روکتے نہیں ہیں۔ مگر صاف صاف اجازت بھی نہ دیں گے۔ وہ بھی اپنی بات کی پکی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ خدا کی قسم میں جاتی رہوں گی جب تک کہ صاف الفاظ میں منع نہ کریں گے[۱]۔

مسجد میں آنے کی شرائط: حضورِ مساجد کی اجازت دینے کے ساتھ چند شرائط بھی مقرر کر دی گئیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ دن کے اوقات میں مسجد نہ جائیں، بلکہ صِرف ان نمازوں میں شریک ہوں جو اندھیرے میں پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی عشاء اور فجر۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اِئْذَنُوا لِلنِّسَآءِ بِاللَّيْلِ اِلَى الْمَسَاجِدِ (ترمذی، باب خروج النساء الی المسجد۔ و فی هذا المعنی حدیث اخرجه البخاری فی باب خروج النساء الی المساجد باللیل و الغلس) قَالَ نَافِعٌ مَوْلَى ابْنِ عُمَرَ: وَكَانَ اخْتِصَاصُ اللَّيْلِ بِذٰلِكَ لِكَوْنِهٖ اَسْتَرَ وَ اَخْفٰى[۲] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد خاص حضرت نافع کہتے ہیں کہ رات کی تخصیص اس لیے کہ رات کی تاریکی میں اچھی طرح پردہ داری ہو سکتی ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَيُصَلِّ الصُّبْحَ فَيَنْصَرِفُ النِّسَآءُ مُتَلَفِّفَاتٌ بِمُرُوطِهِنَّ مَا يُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ[۳] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ جب عورتیں نماز کے بعد اپنی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوئی مسجد سے پلٹتیں تو تاریکی کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مسجد میں زینت کے ساتھ نہ آئیں اور نہ خوشبو لگا کر آئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ قبیلۂ مُزَینہ کی ایک بہت بنی سنوری ہوئی عورت بڑے ناز و تبختر ساتھ چلتی ہوئی آئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اپنی عورتوں کو زینت اور تبختر کے ساتھ مسجد میں آنے سے روکو (ابن ماجه، باب فتنة النساء)۔ خوشبو کے متعلق فرمایا کہ جس رات تم کو نماز میں شریک ہونا ہو اس رات کو کسی قسم کا عطر لگا کر نہ آؤ۔ نہ بخور استعمال کرو۔

۱۔ یہ حال صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی بیوی کا نہ تھا بلکہ عہدِ نبوی میں بکثرت عورتیں نماز باجماعت کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں۔ ابو داؤد میں ہے کہ مسجدِ نبوی میں بسا اوقات عورتوں کی دو دو صفیں ہو جاتی تھیں (باب ما یکره الرجل ما یکون من اصابة اهله)۔

۲۔ تفهیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۳۱

۳۔ ترمذی، باب التغلیس فی الفجر۔ اسی مضمون کی احادیث بخاری، باب وقت الفجر۔ مسلم، باب استحباب التکبیر بالصبح فی اول وقتها، ابو داؤد، باب وقت الصبح اور دوسری کتبِ حدیث میں بھی مروی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ نماز پڑھانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مرد بیٹھے رہتے تھے تاکہ عورتیں اٹھ کر چلی جائیں۔ اس کے بعد آپؐ اور سب لوگ کھڑے ہوتے۔ (تفهیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بالکل سادہ لباس میں آؤ۔ جو عورت خوشبو لگا کر آئے گی اس کی نماز نہ ہوگی[۱] (مؤطا باب خروج النسآء الی المساجد۔ مسلم، باب خروج النسآء الی المسجد۔ ابن ماجہ، باب فتنۃ النسآء)۔

تیسری یہ ہے کہ عورتیں جماعت میں مَردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہوں اور نہ آگے کی صفوں میں آئیں۔ انہیں مَردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ خَیْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُھَا وَ شَرُّھَا اٰخِرُھَا۔ وَ خَیْرُ صُفُوْفِ النِّسَآءِ اٰخِرُ ھَا وَ شَرُّھَا اَوَّلُھَا، مَردوں کے لیے بہترین مقام آگے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام پیچھے کی صفوں میں اور عورتوں کے لیے بہترین مقام پیچھے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام آگے کی صفوں میں۔ جماعت کے باب میں حضور ﷺ نے یہ قاعدہ ہی مقرر کر دیا تھا کہ عورت اور مَرد پاس پاس کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں، خواہ وہ شوہر اور بیوی یا ماں اور بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میری نانی مُلَیکہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد آپ نماز کے لیے اُٹھے، مَیں اور یتیم (یہ غالباً حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی کا نام تھا) حضور ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور مُلَیکہ رضی اللہ عنہا ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[۲] (ترمذی، باب ماجاء فی الرجل یصلی و معہ رجال و نساء)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ہمارے گھر میں نماز پڑھی۔ مَیں اور یتیم آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور میری ماں اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[۳] (بخاری، باب المرأۃ وحدھا تکون صفاً)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نماز کے لیے اٹھے۔ مَیں آپ کے پہلو میں کھڑا ہوا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[۴] (نسائی، باب موقف الامام اذا کان معہ صبی و امرأۃ)۔

www.kitabosunnat.com

چوتھی شرط یہ ہے کہ عورتیں نماز میں آواز بلند نہ کریں۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ اگر نماز میں امام کو کسی چیز پر متنبہ کرنا ہو تو مَرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں دستک دیں[۵] (بخاری، باب التصفیق للنساء۔ ابو داؤد، باب التصفیق فی الصلوۃ)۔

ان تمام حدود و قیود کے باوجود جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جماعت میں ذکور و اناث کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ ہوا تو آپ نے مسجد میں عورتوں کے لیے ایک دروازہ مختص فرما دیا اور مَردوں کو اس دروازہ سے آنے جانے کی ممانعت کر دی[۵] (ابو داؤد، باب اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال)۔

حج میں عورتوں کا طریقہ: اسلام کا دوسرا اجتماعی فریضہ حج ہے۔ یہ مَردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ مگر حتی الامکان عورتوں کو طواف کے موقع پر مَردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روکا گیا ہے۔ بخاری میں عطاء سے روایت ہے کہ عہدِ نبوی میں عورتیں مَردوں کے ساتھ طواف کرتی تھیں مگر خلط ملط نہ ہوتی تھیں[۶] (باب طواف النساء مع الرجال) فتح الباری میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طواف میں عورتوں اور مَردوں کو گڈمڈ ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مَرد کو آپ نے عورتوں کے مجمع میں دیکھا تو پکڑ کر کوڑے لگائے[۷] (فتح الباری، جلد سوم، ص ۳۱۲) مؤطا میں

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۳۳ ۲- ایضاً ج ۵، ص ۳۳۳-۳۳۴۔ ۳- ایضاً
۴- ایضاً ۵- ایضاً، ج ۵، ص ۳۴۰ ۶- ایضاً ۷- ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے بال بچوں کو مزدلفہ سے منٰی آگے روانہ کر دیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کے آنے سے پہلے صبح کی نماز اور رمی سے فارغ ہو جائیں۔ نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا صبح اندھیرے منہ منٰی تشریف لے جاتی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتوں کے لیے یہی دستور تھا (مؤطا، ابواب الحج، باب تقدیم النساء والصبیان)۔

جمعہ وعیدین میں عورتوں کی شرکت: جمعہ وعیدین کے اجتماعات اسلام میں جیسی اہمیت رکھتے ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ ان کی اہمیت کو مدِنظر رکھ کر شارع نے خاص طور پر ان اجتماعات کے لیے وہ شرط اڑا دی جو عام نمازوں کے لیے تھی۔ یعنی یہ کہ دن میں شریک جماعت نہ ہوں۔ اگرچہ جمعہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ عورتیں فرضیتِ جمعہ سے مستثنٰی ہیں (ابوداؤد، باب الجمعة للمملوک) اور عیدین میں بھی عورتوں کی شرکت ضروری نہیں، لیکن اگر وہ چاہیں تو نماز با جماعت کی دوسری شرائط کی پابندی کرتے ہوئے ان جماعتوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی خواتین کو عیدین میں لے جاتے تھے۔

عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُخْرِجُ الْاَبْكَارَ وَالْعَوَاتِقَ وَ ذَوَاتِ الْخُدُوْرِ وَالْحُيَّضَ فِي الْعِيْدَيْنِ فَاَمَّا الْحُيَّضُ فَيَعْتَزِلْنَ الْمُصَلّٰى وَ يَشْهَدُوْنَ دَعْوَةَ الْمُسْلِمِيْنَ[1] (ترمذی، باب خروج النساء فی العیدین) ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنواری اور جوان لڑکیوں اور گھر گرہستنوں اور ایام والی عورتوں کو عیدین میں لے جاتے تھے۔ جو عورتیں نماز کے قابل نہ ہوتیں وہ جماعت سے الگ رہتیں اور دعا میں شریک ہو جاتی تھیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَ يُخْرِجُ بَنَاتَهٗ وَ نِسَائَهٗ فِي الْعِيْدَيْنِ[2] (ابن ماجه، باب ما جاء فی خروج النساء فی العیدین) ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو عیدین میں لے جاتے تھے۔

زیارتِ قبور و شرکتِ جنازات: مسلمان کے جنازے میں شریک ہونا شریعت میں فرضِ کفایہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے متعلق جو تاکیدی احکام ہیں، واقف کاروں سے پوشیدہ نہیں، مگر یہ سب مردوں کے لیے ہیں۔ عورتوں کو شرکتِ جنازات سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس ممانعت میں سختی نہیں ہے اور کبھی کبھی اجازت بھی دی گئی ہے۔ لیکن شارع کے ارشادات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا جنازوں میں جانا کراہت سے خالی نہیں۔ بخاری میں اُمِ عطیہ کی حدیث ہے، کہ نُهِيْنَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَلَمْ يَعْزِمْ عَلَيْنَا[3] (بخاری، باب اتباع النساء الجنازة) ابن ماجہ اور نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ ایک عورت نظر آئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈانٹا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا عمر دعها، اے عمرؓ! اسے چھوڑ دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت میت کی کوئی عزیز قریب ہوگی۔ شدتِ غم سے مجبور ہو کر ساتھ چلی آئی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جذبات کی رعایت کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ ڈپٹ سے منع فرمایا۔[4]

ایسی ہی صورت زیارتِ قبور کی بھی ہے۔ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں۔ اپنے مردہ عزیزوں کی یاد ان کے دلوں میں

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵ ص۳۳۶
۲- ایضاً، ج۵ ص۳۳۷
۳- ایضاً، ج۵ ص۳۴۱
۴- ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زیادہ گہری ہوتی ہے۔ ان کے جذبات کو بالکل پامال کر دینا شارع نے پسند نہ فرمایا۔ مگر یہ صاف کہہ دیا کہ عورتوں کا کثرت سے قبروں پر جانا ممنوع ہے۔ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ[1] (ترمذی ، باب ماجاء فی کراھیة زیارة القبور للنساء) رسول اللہ ﷺ نے بکثرت قبروں پر جانے والیوں کو ملعون ٹھیرایا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی قبر پر تشریف لے گئیں تو فرمایا وَاللّٰہِ لَوْ شَھِدْتُکَ مَا زُرْتُکَ[2] (ترمذی، باب ماجاء فی زیارة القبور للنساء) بخدا اگر میں تمھاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو اب تمھاری قبر کی زیارت کو نہ آتی۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک عورت کو قبر کے پاس بیٹھے روتے دیکھا تو اسے منع نہ فرمایا، بلکہ صرف اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ[3] فرما دیا (بخاری، باب زیارة القبور) ۔

ان احکام پر غور کیجیے۔ نماز ایک مقدس عبادت ہے۔ مسجد ایک پاک مقام ہے۔ حج میں انسان انتہائی پاکیزہ خیالات کے ساتھ خدا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ جنازوں اور قبروں کی حاضری میں ہر شخص کے سامنے موت کا تصور رہتا ہے اور غم والم کے بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سب مواقع ایسے ہیں جن میں صنفی جذبات یا تو بالکل مفقود ہوتے ہیں یا رہتے بھی ہیں تو دوسرے پاکیزہ تر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، مگر اس کے باوجود شارع نے ایسے اجتماعات میں بھی مردوں اور عورتوں کی سوسائٹی کا مخلوط ہونا پسند نہ کیا۔ مواقع کی پاکیزگی، مقاصد کی طہارت اور عورتوں کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھ کر انھیں گھر سے نکلنے کی اجازت تو دے دی۔ بعض مواقع پر خود بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن حجاب کی اتنی قیود لگا دیں کہ فتنے کے ادنیٰ احتمالات بھی باقی نہ رہیں۔ پھر حج کے سوا تمام دوسرے امور کے متعلق فرما دیا کہ ان میں عورتوں کا شریک نہ ہونا زیادہ بہتر ہے۔

جس قانون کا یہ رجحان ہو کیا اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مدرسوں اور کالجوں میں، دفتروں اور کارگاہوں میں، پارکوں اور تفریح گاہوں میں، تھیٹروں اور سینماؤں میں، قہوہ خانوں اور رقص گاہوں میں اختلاطِ صنفین کو جائز رکھے گا؟

جنگ میں عورتوں کی شرکت: حدودِ حجاب کی سختی آپ نے دیکھ لی۔ اب دیکھیے کہ ان میں نرمی کہاں اور کس ضرورت سے کی گئی ہے۔

مسلمان جنگ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ عام مصیبت کا وقت ہے۔ حالات مطالبہ کر رہے ہیں کہ قوم کی پوری اجتماعی قوت دفاع میں صرف کر دی جائے۔ ایسی حالت میں اسلام قوم کی خواتین کو عام اجازت دیتا ہے کہ وہ جنگی خدمات میں حصہ لیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اس کے پیش نظر ہے کہ جو ماں بننے کے لیے بنائی گئی ہے وہ سر کاٹنے اور خون بہانے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیر و خنجر دینا اس کی فطرت کو مسخ کرنا ہے۔ اس لیے وہ عورتوں کو اپنی جان اور آبرو کی حفاظت کے لیے تو ہتھیار اُٹھانے کی اجازت دیتا ہے، مگر بالعموم عورتوں سے مصافی خدمات لینا اور انھیں فوجوں میں بھرتی کرنا اس کی پالیسی سے

۱- ابن ماجہ میں یہی مضمون حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۴۳-۳۴۴

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۴۳-۳۴۴ ۳- ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خارج ہے۔ وہ جنگ میں ان سے صرف یہ خدمت لیتا ہے کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، پیاسوں کو پانی پلائیں، سپاہیوں کے لیے کھانا پکائیں اور مجاہدین کے پیچھے کیمپ کی حفاظت کریں۔ ان کاموں کے لیے پردے کی حدود انتہائی حد تک کم کر دی گئی ہیں، بلکہ ان خدمات کے لیے تھوڑی ترمیم کے ساتھ وہی لباس پہننا شرعاً جائز ہے جو آج کل عیسائی نَنیں پہنتی ہیں۔

تمام احادیث سے ثابت ہے کہ جنگ میں ازواجِ مطہرات اور خواتینِ اسلام آنحضرت ﷺ کے ساتھ جاتیں اور مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ یہ طریقہ احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد بھی جاری رہا[1] (بخاری، باب حمل الرجل المرأة فی الغزو)۔ ترمذی میں ہے: اُمِ سلیم رضی اللہ عنہا اور انصار کی چند دوسری خواتین اکثر لڑائیوں میں حضور ﷺ کے ساتھ تھیں[2] (ترمذی، باب ماجاء فی خروج النساء فی الغزو)۔ بخاری میں ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے عرض کیا: میرے لیے دعا فرمائیے کہ میں بھی بحری جنگ میں جانے والوں کے ساتھ رہوں۔ آپ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا مِنْھُمْ[3] (بخاری، باب غزوة المرأة فی البحر)۔ جنگ احد کے موقع پر جب مجاہدین اسلام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور امِ سلیم رضی اللہ عنہا اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لادلادکر لاتی تھیں اور لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس حال میں میں نے ان کو پائنچے اُٹھائے دوڑ دوڑ کر آتے جاتے دیکھا۔ ان کی پنڈلیوں کا نچلا حصہ کھلا ہوا تھا[4] (بخاری، باب غزوة النساء و قتالھن مع الرجال۔ مسلم، باب غزوة النساء مع الرجال جلد ۲ ص ۷۶)۔ ایک دوسری خاتون امِ سَلیط رضی اللہ عنہا کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جنگ احد میں دائیں اور بائیں جدھر میں دیکھتا تھا امِ سَلیط میری حفاظت کے لیے جان لڑاتی ہوئی نظر آتی تھی"۔ اسی جنگ میں رُبَیّع بنت معوذ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھ خواتین کی ایک جماعت زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھی اور یہی عورتیں مجروحین کو اُٹھا اُٹھا کر مدینہ لے جارہی تھیں[5] (بخاری، باب مداواة النساء الجرحیٰ فی الغزو)۔ جنگِ حُنین میں اُمِ سُلیم ایک خنجر ہاتھ میں لیے پھر رہی تھیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا: یہ کس لیے ہے؟ کہنے لگیں کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی[6] (مسلم، باب غزوة النسآء مع الرجال) امِ عطیہ رضی اللہ عنہا سات لڑائیوں میں شریک ہوئیں۔ کیمپ کی حفاظت، سپاہیوں کے لیے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا[7] (ابنِ ماجه، باب العَبِید والنسآء یشھدون مع المسلمین)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جو خواتین اس قسم کی جنگی خدمات انجام دیتی تھیں ان کو اموالِ غنیمت میں سے انعام دیا جاتا تھا[8] (مسلم، باب النسآء الغازیات یرفخ لھن)۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی پردے کی نوعیت کسی جاہلی رسم کی سی نہیں ہے، جس میں مصالح اور ضروریات کے لحاظ سے کمی و بیشی نہ ہوسکتی ہو۔ جہاں حقیقی ضروریات پیش آجائیں وہاں اس کے حدود کم بھی ہوسکتے ہیں، نہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے جاسکتے ہیں، بلکہ جن اعضا کو سترِ عورت میں داخل کیا گیا ہے ان کے بھی بعض حصے اگر حسبِ ضرورت کھل جائیں تو

۱،۲- تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۴۵

۳،۴،۵،۶- تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۴۶-۳۴۷

۷،۸- تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۴۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مضایقہ نہیں، لیکن جب ضرورت رفع ہو جائے تو حجاب کو پھر انہی حدود پر قائم ہو جانا چاہیے جو عام حالات کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ جس طرح یہ پردہ جاہلی پردہ نہیں ہے، اسی طرح اس کی تخفیف بھی جاہلی آزادی کے مانند نہیں۔ مسلمان عورت کا حال یورپین عورت کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ ضروریاتِ جنگ کے لیے اپنی حدود سے باہر نکلی، تو اس نے جنگ ختم ہونے کے بعد اپنی حدود میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۳۱-۳۴۹)

محرم کے بغیر سفر کی ممانعت: آپؐ نے عورت کو محرم کے بغیر تنہا یا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔ بخاری و مسلم میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا مَعَهَا ذُوْمَحْرَمٍ وَّلَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ اِلَّا مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ، کوئی مرد کسی عورت سے خلوت میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم نہ ہو اور کوئی عورت سفر نہ کرے جب تک کہ اس کا کوئی محرم اس کے ساتھ نہ ہو۔ ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کیا: میری بیوی حج کو جا رہی ہے اور میرا نام فلاں مہم پر جانے والوں میں لکھا جا چکا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: فَانْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِکَ[1]، اچھا تو تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کو چلے جاؤ۔ اس مضمون کی متعدد احادیث ابن عمر، ابو سعید خُدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے معتبر کتبِ حدیث میں مروی ہیں جن میں صرف مدتِ سفر یا مسافتِ سفر کے اعتبار سے اختلافِ بیان ہے، مگر اس امر میں اتفاق ہے کہ کسی مومن عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کو مانتی ہو، محرم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں ہے۔

ان میں سے کسی حدیث میں ۱۲ میل یا اس سے زیادہ کے سفر پر پابندی کا ذکر ہے، کسی میں ایک دن، کسی میں ایک شب روز، کسی میں دو دن اور کسی میں تین دن کی حد بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان احادیث کو نہ تو ساقط الاعتبار بنا دیتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے یہی ضروری ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اس حد کو قانونی مقدار قرار دینے کی کوشش کریں، جو اس روایت میں بیان ہوئی ہو۔ اس لیے کہ اس اختلاف کی یہ معقول وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ مختلف مواقع پر جیسی صورتِ معاملہ حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوئی ہو اسی کے لحاظ سے آپؐ نے حُکم بیان فرمایا ہو۔ مثلاً کوئی عورت تین دن کی مسافت پر جا رہی ہو اور آپؐ نے اسے محرم کے بغیر جانے سے منع فرمایا ہو، اور کوئی ایک دن کی مسافت پر جا رہی ہو اور آپؐ نے اسے بھی روک دیا ہو۔ اس میں مختلف سائلوں کے الگ الگ حالات اور ہر ایک کو آپ کے مختلف جوابات اصل چیز نہیں ہیں، بلکہ اصل چیز وہ قاعدہ ہے جو اُوپر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ والی روایت میں ارشاد ہوا ہے، یعنی سفر جسے عرفِ عام میں سفر کہا جاتا ہے محرم کے بغیر کسی عورت کو نہ کرنا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۹۴، النور حاشیہ ۴۹)

ان احکام کی روشنی میں ایک مسلمان کا طرزِ عمل: اللہ اور رسول کی ان صاف صاف ہدایات کو دیکھ لینے کے بعد ایک

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۸۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مومن انسان کے لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو وہ ان کی پیروی کرے اور اپنی اور اپنے گھر کی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو ان اخلاقی فتنوں سے پاک کر دے جن کے سدِ باب کے لیے اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسول نے سُنّت میں اس قدر تفصیلی احکام دیے ہیں۔ یا پھر اگر وہ اپنے نفس کی کمزوری کے باعث ان کی یا ان میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کم از کم اسے گناہ سمجھتے ہوئے کرے اور اس کو گناہ مانے اور خواہ مخواہ کی تاویلوں سے گناہ کو صواب بنانے کی کوشش نہ کرے۔

ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر جو لوگ قرآن وسُنّت کے صریح احکام کے خلاف مغربی معاشرت کے طور طریقے اختیار کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر انھی کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور علانیہ دعوے کرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں سر سے پردے کا حکم موجود ہی نہیں ہے، وہ گناہ اور نافرمانی پر جہالت اور منافقانہ ڈھٹائی کا اور اضافہ کر لیتے ہیں، جس کی قدر نہ دنیا میں کوئی شریف آدمی کر سکتا ہے نہ آخرت میں خدا سے اس کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں تو منافقوں سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا اور رسول کے ان احکام کو غلط اور ان طریقوں کو صحیح و برحق سمجھتے ہیں جو انھوں نے غیر مسلم قوموں سے سیکھے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ اس کے بعد بھی اگر وہ مسلمان ہوں تو پھر اسلام اور کفر کے الفاظ قطعاً بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نام بدل دیتے اور علانیہ اسلام سے نکل جاتے تو ہم کم از کم ان کی اخلاقی جرأت کا اعتراف کرتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی وہ مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ انسانیت کی اس سے زیادہ ذلیل قسم غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اس سیرت و اخلاق کے لوگوں سے کوئی جعل سازی، کوئی فریب، کوئی دغابازی اور کوئی خیانت بھی خلافِ توقع نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص۳۹۶-۳۹۷، النور حاشیہ ۴۹)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

پردہ

دو اہم اور پیچیدہ مسائل: مرد و عورت اور فرد و جماعت کا تعلق

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ہیں، جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے اور جن کے حل کرنے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک دنیا کے حکما و عقلا پریشان و سرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے۔ کیونکہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ اور اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذراسی بھی کجی آ جائے تو

تا ثریا مے رود دیوار کج

اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے، جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذراسی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اس کے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ ایک طرف ان دونوں مسائل کی اہمیت کا یہ حال ہے اور دوسری طرف ان کی پیچیدگی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک فطرت کے تمام حقائق پر کسی کی نظر پوری طرح حاوی نہ ہو وہ ان کو حل نہیں کرسکتا۔ سچ کہا تھا جس نے کہا تھا کہ انسان عالمِ اصغر ہے۔ اس کے جسم کی ساخت، اس کے نفس کی ترکیب، اس کی قوتیں اور قابلیتیں، اس کی خواہشات وضروریات اور جذبات واحساسات اور اپنے وجود سے باہر کی بے شمار اشیا کے ساتھ اس کے فعلی وانفعالی تعلقات، یہ سب چیزیں ایک دنیا کی دنیا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ انسان کو پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا، جب تک کہ اس دنیا کا ایک ایک گوشہ نگاہ کے سامنے روشن نہ ہو جائے، اور انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل نہیں کیے جاسکتے جب تک کہ خود انسان کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے۔

یہی وہ پیچیدگی ہے جو عقل وحکمت کی ساری کاوشوں کا مقابلہ ابتدا سے کررہی ہے اور آج تک کیے جارہی ہے۔ اول تو اس دُنیا کے تمام حقائق ابھی تک انسان پر کھلے ہی نہیں۔ انسانی علوم میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں ہے جو کمال کے آخری مرتبے پر پہنچ چکا ہو۔ یعنی جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ جتنی حقیقتیں اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتی ہیں ان سب کا اس نے احاطہ کرلیا ہے۔ مگر جو حقائق روشنی میں آ چکے ہیں ان کی وسعتوں اور باریکیوں کا بھی یہ عالم ہے کہ کسی انسان کی بلکہ انسانوں کے کسی گروہ کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نظر بھی ان سب پر بیک وقت حاوی نہیں ہوتی۔ ایک پہلو سامنے آتا ہے اور دوسرا پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ کہیں نظر کوتاہی کرتی ہے اور کہیں شخصی رجحانات حاجبِ نظر بن جاتے ہیں۔ اس دوہری کمزوری کی وجہ سے انسان خود اپنی زندگی کے ان مسائل کو حل کرنے کی جتنی تدبیریں بھی کرتا ہے وہ ناکام ہوئی ہیں اور تجربہ آخر کار ان کے نقص کو نمایاں کر دیتا ہے۔ صحیح حل صرف اسی وقت ممکن ہے، جب کہ نقطۂ عدل کو پالیا جائے اور نقطۂ عدل پایا نہیں جاسکتا جب تک کہ تمام حقائق نہ سہی کم از کم معلوم حقائق ہی کے سارے پہلو یکساں طور پر نگاہ کے سامنے نہ ہوں۔ مگر جہاں منظر کی وسعت بجائے خود اتنی زیادہ ہو کہ بینائی اس پر چھا نہ سکے اور اس کے ساتھ نفس کی خواہشات اور رغبت و نفرت کے میلانات کا یہ زور ہو کہ جو چیزیں صاف نظر آتی ہوں ان کی طرف سے بھی خود بخود نگاہ پھر جائے۔ وہاں نقطۂ عدل کس طرح مل سکتا ہے؟ وہاں تو جو حل بھی ہوگا اس میں لامحالہ یا افراط پائی جائے گی یا تفریط۔

اُوپر جن دو مسائل کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے صرف پہلا مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے زیرِ بحث ہے۔ اس باب میں جب ہم تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو افراط اور تفریط کی کھینچ تان کا ایک عجیب سلسلہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت جو ماں کی حیثیت سے آدمی کو جنم دیتی اور بیوی کی حیثیت سے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں مَرد کی رفیق رہتی ہے، خادمہ بلکہ لونڈی کے مرتبے میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کو بیچا اور خریدا جاتا ہے۔ اس کو ملکیت اور وراثت کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اسی کو گناہ اور ذِلّت کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی شخصیت کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ وہی عورت اُٹھائی اور ابھاری جارہی ہے، مگر اس شان سے کہ اس کے ساتھ بد اخلاقی اور بد نظمی کا طوفان اُٹھ رہا ہے۔ وہ جسمانی خواہشات کا کھلونا بنائی جاتی ہے، اس کو واقعی شیطان کی ایجنٹ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور اس کے ابھرنے کے ساتھ انسانیت کے گرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان دونوں انتہاؤں کو ہم محض نظری حیثیت سے افراط اور تفریط کے ناموں سے موسوم نہیں کرتے، بلکہ تجربہ جب ان کے مُضر نتائج کا پورا پورا ریکارڈ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ تب ہم اخلاق کی زبان میں ایک انتہا کو افراط اور دوسرے کو تفریط کہتے ہیں۔ تاریخ کا پس منظر جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، ہم کو یہ بھی دکھاتا ہے کہ جب ایک قوم وحشت کے دور سے نکل کر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھتی ہے تو اس کی عورتیں لونڈیوں اور خدمت گاروں کی حیثیت سے اس کے مَردوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بدویانہ طاقتوں کا زور اسے آگے بڑھائے لیے جاتا ہے، مگر تمدّنی ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے پورے نصف حصّے کو پستی کی حالت میں رکھ کر وہ آگے نہیں جاسکتی۔ اس کو اپنی ترقی کی رَفتار رُکتی نظر آتی ہے۔ اور ضرورت کا احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ اس نصف ثانی کو بھی نصف اول کے ساتھ چلنے کے قابل بنائے۔ مگر جب وہ اس نقصان کی تلافی شروع کرتی ہے تو صرف تلافی پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ عورت کی آزادی سے خاندانی نظام (جو تمدّن کی بنیاد ہے) منہدم ہو جاتا ہے۔ عورتوں اور مَردوں کے اختلاط سے فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ شہوانیت اور عیش پرستی پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ساتھ ذہنی، جسمانی اور مادی قوتوں کا تنزل بھی لازمی طور پر رونما ہوتا ہے جس کا آخری انجام ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۱۱-۱۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پردہ عورتوں کے لیے حفاظت کا اہم ذریعہ

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط (الاحزاب ۳۳:۵۹) یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔

'پہچان لی جائیں' سے مُراد یہ ہے کہ ان کو اس سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ وہ شریف اور باعصمت عورتیں ہیں، آوارہ اور کھلاڑی نہیں ہیں کہ کوئی بدکردار انسان ان سے اپنے دِل کی تمنا پوری کرنے کی اُمید کر سکے۔ 'نہ ستائی جائیں' سے مُراد یہ ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

اس مقام پر ذرا ٹھیر کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ قرآن کا یہ حُکم، اور وہ مقصدِ حُکم جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دیا ہے، اِسلامی قانونِ معاشرت کی کیا روح ظاہر کرتا ہے۔ سورۂ نور آیت ۳۱ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ عورتیں اپنی آرایش و زیبایش کو فلاں فلاں قسم کے مَردوں اور عورتوں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ اور زمین پر پاؤں مارتی ہوئی بھی نہ چلیں کہ لوگوں کو اس زینت کا علم ہو جو انھوں نے چھپا رکھی ہے۔ اُس حُکم کے ساتھ اگر سورۂ احزاب کی اِس آیت کو ملا کر پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں چادر اوڑھنے کا جو حُکم ارشاد ہوا ہے اس کا منشا اجنبیوں سے زینت چھپانا ہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ منشا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جبکہ چادر بجائے خود سادہ ہو، ورنہ ایک مزیّن اور جاذبِ نظر کپڑا لپیٹ لینے سے تو یہ منشا اُلٹا اور فوت ہو جائے گا۔ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حُکم نہیں دے رہا ہے، بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اُوپر لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگھٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چھپ جائے۔ پھر اس حُکم کی عِلت اللہ تعالیٰ خود یہ بیان فرماتا ہے کہ یہ وہ مناسب ترین طریقہ ہے جس سے یہ مسلمان خواتین پہچان لی جائیں گی اور اذیّت سے محفوظ رہیں گی۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ہدایت ان عورتوں کو دی جا رہی ہے جو مَردوں کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی نظر بازی اور ان کے شہوانی التفات سے لذت اندوز ہونے کے بجائے اس کو اپنے لیے تکلیف دہ اور اذیت ناک محسوس کرتی ہیں، جو معاشرے میں اپنے آپ کو آبرو باختہ، شمعِ انجمن قسم کی عورتوں میں شُمار نہیں کرنا چاہتیں، بلکہ عفت مآب چراغِ خانہ ہونے کی حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہیں۔ ایسی شریف اور نیک خواتین سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم فی الواقع اس حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہو اور مَردوں کی ہوسناک توجُّہات حقیقت میں تمھارے لیے موجبِ لذت نہیں، بلکہ موجبِ اذیت ہیں تو پھر اس کے لیے مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ تم خوب بناؤ سنگھار کر کے پہلی رات کی دُلھن بن کر گھروں سے نکلو اور دیکھنے والوں کی حریص نگاہوں کے سامنے اپنا حُسن اچھی طرح نکھار کر پیش کرو، بلکہ اس غرض کے لیے تو مناسب ترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم ایک سادہ چادر میں اپنی ساری آرایش و زیبایش کو چھپا کر نکلو، اپنے چہرے پر گھونگھٹ ڈالو اور اس طرح چلو کہ زیور کی جھنکار بھی لوگوں کو تمھاری طرف متوجہ نہ کرے۔ جو عورت باہر نکلنے سے پہلے بن ٹھن کر تیار ہوتی ہے اور اس وقت تک گھر سے قدم نہیں نکالتی جب تک سات سنگھار نہ کر لے، اس کی غرض اس کے سوا آخر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا بھر کے مَردوں کے لیے اپنے آپ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو جنتِ نگاہ بنانا چاہتی ہے اور انھیں خود دعوتِ التفات دیتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتی ہے کہ دیکھنے والوں کی بھوکی نگاہیں اسے تکلیف دیتی ہیں، اس کے بعد اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ 'معاشرے کی بیگم' اور 'مقبولِ عام خاتون' ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہونا چاہتی، بلکہ عفت مآب گھر گرہستن بن کر رہنا چاہتی ہے تو یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کا قول اس کی نیت متعین نہیں کرتا، بلکہ اس کی اصل نیت وہ ہوتی ہے جو اس کے عمل کی شکل اختیار کرتی ہے، لہٰذا جو عورت جاذبِ نظر بن کر غیر مردوں کے سامنے جاتی ہے اس کا یہ عمل خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ اس لیے فتنے کے طالب لوگ اس سے وہی توقعات وابستہ کرتے ہیں جو ایسی عورت سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ تم بیک وقت چراغِ خانہ اور شمعِ محفل نہیں بن سکتی ہو۔ چراغِ خانہ بننا ہے تو اُن طریقوں کو چھوڑ دو جو شمعِ انجمن بننے کے لیے موزوں ہیں اور وہ طرزِ زندگی اختیار کرو جو چراغِ خانہ بننے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا اس کے خلاف، اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطۂ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے، بہرحال اگر وہ تعبیر کی بددیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف یہ مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کرے، گا یہ تسلیم کر کے کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے۔ یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۳۱-۱۳۲، الاحزاب حاشیہ ۱۱۱)

پردہ کے احکام

قرآنِ مجید کی جن آیات میں 'پردہ' کے احکام بیان ہوئے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ٥ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ (النور ۲۴: ۳۰-۳۱) اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا طریقہ ہے یقیناً اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے۔ اور وہ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، اپنی عورتیں، اپنے غلام، وہ مرد خدمت گار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے، وہ لڑکے جو ابھی عورتوں کی پردہ کی باتوں سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں۔ (نیز اُن کو حکم دو کہ) وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طرح نہ مارتی چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے (آواز کے ذریعہ) اس کا اظہار ہو۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى (الاحزاب ۳۳:۳۲-۳۳) اے نبی کی بیویو! تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں۔ اگر تمھیں پرہیزگاری منظور ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دِل میں کوئی خرابی ہے وہ تم سے کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھے۔ بات سیدھی سادھی طرح کرو اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور اگلے زمانہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ (الاحزاب ۳۳:۵۹) اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اُوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور ان کو ستایا نہ جائے گا۔

اِن آیات پر غور کیجیے۔ مَردوں کو تو صرف اتنی تاکید کی گئی ہے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور فواحش سے اپنے اخلاق کی حفاظت کریں۔ مگر عورتوں کو مَردوں کی طرح ان دونوں چیزوں کا حکم بھی دیا گیا ہے اور پھر معاشرت اور برتاؤ کے بارے میں چند مزید ہدایتیں بھی دی گئی ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان کے اخلاق کی حفاظت کے لیے صرف غضِ بصر اور حفظِ فروج کی کوشش ہی کافی نہیں ہے، بلکہ کچھ اور ضوابط کی بھی ضرورت ہے۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان مجمل ہدایات کو نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اِسلامی معاشرت میں کس طرح نافذ کیا ہے اور ان کے اقوال اور اعمال سے ان ہدایات کی معنوی اور عملی تفصیلات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

اِسلام میں پردے کے احکام کا آغاز: یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (الاحزاب ۳۲) نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ دِل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔

یہاں آخر پیراگراف تک کی آیات وہ ہیں جن سے اِسلام میں پردے کے احکام کا آغاز ہوا ہے۔ ان آیات میں خطاب نبی ﷺ کی بیویوں سے کیا گیا ہے، مگر مقصود تمام مسلمان گھروں میں اِن اصلاحات کو نافذ کرنا ہے۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو مخاطب کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ جب نبی ﷺ کے گھر سے اس پاکیزہ طرزِ زندگی کی ابتدا ہوگی تو باقی سارے مسلمان گھرانوں کی خواتین خود اس کی تقلید کریں گی، کیونکہ یہی گھر اُن کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اِن احکام کا اطلاق: بعض لوگ صرف اس بنیاد پر کہ اِن آیات کا خطاب نبی ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے ہے، یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ احکام انھی کے لیے خاص ہیں۔ لیکن آگے اِن آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے کہ کون سی بات ایسی ہے جو حضور ﷺ کی ازواج کے لیے خاص ہو اور باقی مسلمان عورتوں کے لیے مطلوب نہ ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہوسکتا تھا کہ صرف ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ہی گندگی سے پاک ہوں اور وہی اللہ و رسول کی اطاعت کریں اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہی نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں؟ اگر یہ منشا نہیں ہو سکتا تو پھر گھروں میں چین سے بیٹھنے اور تبرّج جاہلیت سے پرہیز کرنے اور غیر مَردوں کے ساتھ دبی زبان سے بات نہ کرنے کا حکم ان کے لیے کیسے خاص ہو سکتا ہے اور باقی مسلمان عورتیں اس سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتی ہیں؟ کیا کوئی معقول دلیل ایسی ہے جس کی بنا پر ایک ہی سلسلۂ کلام کے مجموعی احکام میں سے بعض کو عام اور بعض کو خاص قرار دیا جائے؟

رہا یہ فقرہ کہ "تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو" تو اس سے بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ عام عورتوں کو تو بن ٹھن کر نکلنا چاہیے اور غیر مَردوں سے خوب لگاوٹ کی باتیں کرنی چاہییں، البتہ تم ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ طرزِ کلام کچھ اس طرح کا ہے جیسے ایک شریف آدمی اپنے بچے سے کہتا ہے کہ "تم بازاری بچوں کی طرح نہیں ہو، تمھیں گالی نہیں بکنی چاہیے" اس سے کوئی عقلمند آدمی بھی کہنے والے کا یہ مدعا اخذ نہ کرے گا کہ وہ صرف اپنے بچے کے لیے گالیاں بکنے کو بُرا سمجھتا ہے، دوسرے بچوں میں یہ عیب موجود رہے تو اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۸۸-۸۹، الاحزاب حاشیہ ۴۶)

آیتِ حجاب: وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ (الاحزاب ۳۳: ۵۳) نبی کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔

یہی آیت ہے جس کو آیت حجاب کہا جاتا ہے۔ بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر چکے تھے کہ یا رسول اللہ! آپؐ کے ہاں بھلے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ کاش آپ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پردہ کرنے کا حکم دے دیتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "اگر آپ کے حق میں میری بات مانی جائے تو کبھی میری نگاہیں آپ کو نہ دیکھیں" لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون سازی میں خود مختار نہ تھے، اس لیے آپ اشارۂ الٰہی کے منتظر رہے۔ آخر کار یہ حکم آ گیا کہ محرم مَردوں کے سوا (جیسا کہ آگے آیت ۵۵ میں آ رہا ہے) کوئی مَرد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نہ آئے، اور جس کو بھی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔ اِس حکم کے بعد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اِس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔[1]

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۲۱، الاحزاب حاشیہ ۹۸)

۱۔ آیت کا آخری فقرہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہیں انھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے رُودر رُو بات کرنے سے روکتی ہے، اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مصلحت یہ بتاتی ہے کہ "تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے یہ طریقہ زیادہ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پردہ سے مستثنیٰ عورتیں: وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (النور ۲۴:۶۰)اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں، نکاح کی اُمیدوار نہ ہوں وہ اگر اپنی چادریں اُتار کر رکھ دیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو اُن کے حق میں اچھا ہے۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اصل میں لفظ اَلْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی ''عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوں'' یا ''بیٹھی ہوئی عورتیں''۔ اس سے مُراد ہے سنِ یاس، یعنی عورت کا اس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس کی اپنی خواہشات بھی مرچکی ہوں اور اس کو دیکھ کر مَردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ نہ پیدا ہوسکتا ہو۔ اسی معنی کی طرف بعد کا فقرہ اشارہ کررہا ہے۔

اصل الفاظ ہیں یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ ''اپنے کپڑے اتاردیں'' مگر ظاہر ہے کہ اس سے مُراد سارے کپڑے اُتار کر برہنہ ہو جانا تو نہیں ہوسکتا[1]۔ اس لیے تمام فقہا اور مفسّرین نے بالاتفاق اس سے مُراد وہ چادریں لی ہیں جن سے زینت کو چھپانے کا حُکم سورۂ الاحزاب کی آیت یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ میں دیا گیا ہے۔

اصل الفاظ ہیں غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ''زینت کے ساتھ تبرج کرنے والی نہ ہوں''۔ تَبَرُّج کے معنی ہیں اظہار و نمایش کے۔ بارِج اُس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر چھت نہ ہو۔ اسی معنی میں عورت کے لیے یہ لفظ اُس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ مَردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرایش کا اظہار کرے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ چادر اُتار دینے کی یہ اجازت اُن بوڑھی عورتوں کو دی جارہی ہے جن کے اندر بن ٹھن کر رہنے کا شوق باقی نہ رہا ہو اور جن کے صنفی جذبات سرد پڑھ چکے ہوں۔ لیکن اگر اس آگ میں کوئی چنگاری ابھی باقی ہو اور وہ نمایشِ زینت کی شکل اختیار کررہی ہو تو پھر اس اجازت سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۴۲۳، النور حواشی ۹۲-۹۴)

وہ رشتہ دار جن سے پردہ نہ کرنے کی اجازت ہے: وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مناسب ہے'' اُس میں سے آخر یہ نرالی رُوح کیسے کشید کی جاسکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا بے تکلف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے کہ یہ اسلام کی 'رُوح' ہے جو میں نے نکالی ہے۔ آخر وہ اسلام کی کون سی رُوح ہے جو قرآن و سُنّت کے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۲۱-۱۲۲، الاحزاب حاشیہ ۹۸)

۱- جیسے فاطمہ بنت قیسؓ کی حدیث میں آتا ہے: تضعین ثوبک عنده، یعنی ابنِ اُمِ مکتومؓ کے پاس اپنی اوڑھنی اُتار سکتی ہو۔ کیونکہ وہ نابینا ہے دیکھ نہیں سکتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بَنِىٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِىٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ (النور ۲۴:۳۱) وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں، مگر اِن لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے مملوک، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔

جس حلقے میں ایک عورت اپنی پوری زینت کے ساتھ آزادی سے رہ سکتی ہے وہ اِن لوگوں پر مشتمل ہے۔ اِس حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہیں، خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی، بہر حال ایک عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ آئے۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے فقرے میں جو حکم دیا گیا تھا، اس کا مطلب یہاں کھول دیا گیا ہے کہ اس محدود حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہوں، ان کی سامنے ایک عورت کو اپنی آرایش قصداً یا بے پروائی کے ساتھ خود نہ ظاہر کرنی چاہیے۔ البتہ جو اِن کی کوشش کے باوجود یا اِن کے ارادے کے بغیر ظاہر ہو جائے یا جس کا چھپانا ممکن نہ ہو وہ اللہ کے ہاں معاف ہے۔

اصل میں لفظ آباء استعمال ہوا ہے، جس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں، بلکہ دادا پڑدادا اور نانا پڑنانا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی ددھیال اور ننھیال اور اپنے شوہر کے ددھیال اور ننھیال کے ان سب بزرگوں کے سامنے اس طرح آ سکتی ہے جس طرح اپنے والد اور خسر کے سامنے آ سکتی ہے۔

بیٹوں میں پوتے، پڑپوتے اور نواسے پڑنواسے سب شامل ہیں اور اس معاملے میں سگے، سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے سوتیلے بچوں کی اولاد کے سامنے عورت اسی طرح آزادی کے ساتھ اظہارِ زینت کر سکتی ہے جس طرح خود اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے سامنے کر سکتی ہے۔

'بھائیوں' میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے بھائی سب شامل ہیں۔

بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہے۔ یعنی اِن کے پوتے پڑپوتے اور نواسے پڑنواسے سب اس میں شامل ہیں۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۷-۳۸۸، النور حاشیہ ۳۷-۳۹)

محرم مرد: لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِىٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۚ (الاحزاب ۳۳: ۵۵) ازواجِ نبی کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں (اور عورتو!) تمھیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں، علامہ آلوسی کی یہ تشریح بھی قابلِ ذکر ہے کہ "بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آ جاتے ہیں جو ایک عورت کے لیے حرام ہوں، خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلۂ والدین ہیں۔ یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا کہ بھائیوں اور بھتیجوں کا ذکر آ جانے کے بعد ان کے ذکر کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے''۔ (روح المعانی)

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۳۳، الاحزاب حاشیہ ۱۰۲)

اس مقام پر شہادتِ الٰہی کے ذکر کی حکمت: اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا (الحزاب ۳۳:۵۵) اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس حکمِ قطعی کے آ جانے کے بعد آئندہ کسی ایسے شخص کو گھروں میں بے حجاب آنے کی اجازت نہ دی جائے جو ان مستثنیٰ رشتہ داروں کے دائرے سے باہر ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خواتین کو یہ روش ہرگز نہ اختیار کرنی چاہیے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں تو پردے کی پابندی کریں مگر جب وہ موجود نہ ہو تو غیر محرم مردوں کے سامنے پردہ اُٹھا دیں۔ ان کا یہ فعل چاہے ان کے شوہر سے چھپا رہ جائے خدا سے تو نہیں چھپ سکتا۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۱۲۳، الاحزاب حاشیہ ۱۰۵)

عورت کا عورت سے پردہ: اَوْ نِسَآئِھِنَّ (۲۴:۳۱) اپنے میل جول کی عورتیں۔

اصل میں لفظ نِسَآئِھِنَّ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے 'ان کی عورتیں'۔ اس سے کون عورتیں مُراد ہیں؟ یہ بحث تو بعد کی ہے۔ سب سے پہلے جو بات قابلِ غور اور قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ محض 'عورتوں' (النسآء) کا لفظ استعمال نہیں کیا جس سے مسلمان عورت کے لیے تمام عورتوں اور ہر قسم کی عورتوں کے سامنے بے پردہ ہونا اور اظہارِ زینت کرنا جائز ہو جاتا۔ بلکہ نِسَآئِھِنَّ کہہ کر عورتوں کے ساتھ اُس کی آزادی کو بہرحال ایک خاص دائرے تک محدود کر دیا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ دائرہ کوئی سا ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسا دائرہ ہے؟ اور وہ کون عورتیں ہیں جن پر لفظ نِسَآئِھِنَّ کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں فقہا اور مفسّرین کے اقوال مختلف ہیں:

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مُراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں یا کسی اور قسم کی، اُن سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح مَردوں سے کیا جاتا ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد اور ابن جریج کی یہی رائے ہے۔ اور یہ لوگ اپنی تائید میں یہ واقعہ بھی پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعُبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا ''میں نے سنا ہے مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں۔ حالانکہ جو عورت اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ اس کے جسم پر اس کے اہلِ ملت کے سوا کسی اور کی نظر پڑے''۔ یہ خط جب حضرت ابوعُبیدہ رضی اللہ عنہ کو ملا تو وہ ایک دَم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: ''خدایا جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کے لیے اِن حماموں میں جائے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے''۔ (ابنِ جریر، بیہقی، ابن کثیر)

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مُراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر فی الواقع اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی تھا تو پھر نِسَآئِهِنَّ کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس صورت میں تو محض اَلنِّسَآءِ کہنا چاہیے تھا۔

تیسری رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جول کی عورتیں، اُن کی جانی بوجھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی اور ان کے کام کاج میں حصّہ لینے والی عورتیں مُراد ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اور مقصود اُن عورتوں کو اس دائرے سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں کہ اُن کے اخلاق و تہذیب کا حال معلوم نہ ہو، یا جن کے ظاہری حالات مشتبہ ہوں اور اُن پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔ اِس رائے کی تائید اُن صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس ذمی عورتوں کی حاضری کا ذِکر آتا ہے۔ اِس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا وہ مذہبی اختلاف نہیں، بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیا اور نیک اطوار والی عورتیں جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلّق رکھنے والی ہوں، اُن سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیا، آبرو باختہ اور بد اطوار عورتیں، خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اخلاق کے لیے ان کی صحبت غیر مَردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کن نہیں ہے۔ رہیں اَن جانی عورتیں، جن کی حالت معلوم نہیں ہے، تو اِن سے ملاقات کی حد ہمارے نزدیک وہی ہے جو غیر محرم رشتہ داروں کی سامنے آزادی کی زیادہ سے زیادہ حد ہو سکتی ہے، یعنی یہ کہ عورت صِرف منہ اور ہاتھ اُن کے سامنے کھولے، باقی اپنا سارا جسم اور آرائش چھپا کر رکھے۔

(تفہیم القرآن، سوم ص۳۸۹-۳۹۰، النور حاشیہ ۴۳)

تین نہایت اہم مسائل: آگے بڑھنے سے پہلے تین مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے، کیونکہ اِن کو نہ سمجھنے سے متعدد اُلجھنیں واقع ہوتی ہیں۔

۱- تمام محرمات کے سامنے چہرہ کھولنا جائز ہے: پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اظہارِ زینت کی آزادی کو صِرف اُن رشتہ داروں تک محدود سمجھتے ہیں جن کا نام یہاں لیا گیا ہے۔ باقی سب لوگوں کو، حتیٰ کہ سگے ماموں تک کو اُن رشتہ داروں میں شمار کرتے ہیں جن سے پردہ کیا جانا چاہیے اور دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ان کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سگے چچا اور ماموں تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو رضاعی چچا اور ماموں سے بھی پردہ کرنے کی حضرت عائشہ کو اجازت نہ دی۔ صحاح ستہ اور مُسنَد احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی روایت ہے کہ ابوالقُعَیس کے بھائی افلح ان کے ہاں آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ چونکہ پردے کا حکم آ چکا تھا، اِس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ تم تو میری بھتیجی ہو۔ کیونکہ میرے بھائی ابوالقُعَیس کی بیوی کا تم نے دودھ پیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں تامل تھا کہ یہ رشتہ بھی ایسا ہے جس میں پردہ اُٹھا دینا جائز ہو۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور آپ نے فرمایا کہ وہ تمھارے پاس آسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے خود اِس آیت کو اس معنی میں نہیں لیا ہے کہ اس میں جن جن رشتہ داروں کا ذِکر آیا ہے ان سے پردہ نہ ہو اور باقی سب سے ہو۔ بلکہ آپ نے اس سے یہ اُصول اخذ کیا ہے کہ جن جن رشتہ داروں سے ایک عورت کا نکاح حرام ہے وہ سب اسی آیت کے حُکم میں داخل ہیں، مثلاً چچا، ماموں، داماد، اور رضاعی رشتہ دار۔ تابعین میں سے حضرت حسن بصری نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ اور اسی کی تائید علامہ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمائی ہے (ج ۳، ص ۳۹)۔

۲- غیر محرم رشتہ داروں کا معاملہ: دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے ابدی حرمت کا رشتہ نہ ہو (یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ عورت کا نکاح جائز ہو) وہ نہ تو محرم رشتہ داروں کے حُکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلف اِن کے سامنے اپنی زینت کے ساتھ آئیں اور نہ بالکل اجنبیوں کے حُکم ہیں کہ عورتیں ان سے ویسا مکمل پردہ کریں جیسا غیروں سے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ٹھیک ٹھیک کیا رویہ ہونا چاہیے، یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا تعین ہو نہیں سکتا۔ اس کے حدود مختلف رشتہ داروں کے معاملے میں اُن کے رشتے، اُن کی عمر، عورت کی عمر، خاندانی تعلقات و روابط، اور فریقین کے حالات (مثلاً مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہوں گے اور ہونے چاہییں۔ اس معاملے میں نبی ﷺ کا اپنا طرزِ عمل جو کچھ تھا اس سے ہم کو یہی رہنمائی ملتی ہے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو نبی ﷺ کی سالی تھیں، آپ کے سامنے ہوتی تھیں اور آخر وقت تک آپ کے اور ان کے درمیان کم از کم چہرے اور ہاتھوں کی حد تک کوئی پردہ نہ تھا۔ حجۃ الوداع نبی ﷺ کی وفات سے صرف چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے اور اس وقت بھی یہی حالت قائم تھی (ملاحظہ ہو ابوداؤد، كتاب الحج، باب المحرم يؤدب غلامه)۔ اسی طرح حضرت امِ ہانی جو ابوطالب کی صاحبزادی اور نبی ﷺ کی چچازاد بہن تھیں، آخر وقت تک حضور ﷺ کے سامنے ہوتی رہیں اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ انھوں نے آپ سے کبھی نہیں کیا۔ فتح مکہ کے موقع کا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتی ہیں جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے (ملاحظہ ہو ابوداؤد، كتاب الصوم، باب فى النية فى الصوم والرخصة فيه)۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے فضل کو اور ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب (نبی ﷺ کے حقیقی چچازاد بھائی) اپنے بیٹے عبدالمطلب کو نبی ﷺ کے ہاں یہ کہہ کر بھیجتے ہیں کہ اب تم لوگ جوان ہو گئے ہو، تمھیں جب تک روزگار نہ ملے تمھاری شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا تم رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر نوکری کی درخواست کرو۔ یہ دونوں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مکان پر حضور ﷺ خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت زینب فضل کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں اور عبدالمطلب بن ربیعہ کے والد سے بھی ان کا وہی رشتہ ہے جو فضل سے۔ لیکن وہ ان دونوں کے سامنے نہیں ہوتیں اور حضور ﷺ کی موجودگی میں ان کے ساتھ پردے کے پیچھے بات کرتی ہیں (ابوداؤد، كتاب الخراج)۔ ان دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر دیکھا جائے تو مسئلے کی صورت وہی کچھ سمجھ میں آتی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے جو اُوپر ہم بیان کر آئے ہیں[1]۔

۳- اگر رشتے میں شُبہہ پڑ جائے، اس کا حکم: تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جہاں رشتے میں شُبہہ پڑ جائے وہاں محرم رشتہ داروں سے بھی احتیاطاً پردہ کرنا چاہیے۔ بخاری و مسلم اور ابو داؤد میں ہے کہ حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا اُمّ المومنین کا ایک بھائی لونڈی زادہ تھا (یعنی ان کے باپ کی لونڈی کے بطن سے تھا) اُس کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ان کے بھائی عُقبہ نے وصیت کی کہ اس لڑکے کو اپنا بھتیجا سمجھ کر اس کی سرپرستی کرنا، کیونکہ وہ دراصل میرے نُطفے سے ہے۔ یہ مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہا کا دعویٰ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ ''بیٹا اس کا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، رہا زانی تو اس کے حصے میں کنکر پتھر''۔ لیکن ساتھ ہی آپ نے حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اس لڑکے سے پردہ کرنا (احتجبی منه)، کیونکہ یہ اطمینان نہ رہا تھا کہ وہ واقعی ان کا بھائی ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم،ص ۳۸۸-۳۸۹، النور حاشیہ ۴۲)

نا سمجھ بچوں سے پردے کی نوعیت: اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَظۡهَرُوۡا عَلٰی عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ ۪ (النور ۲۴:۳۱) اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی تک واقف نہ ہوئے ہوں۔

یعنی جن میں ابھی صنفی احساسات پیدا نہ ہوئے ہوں۔ یہ تعریف زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس کی عمر تک کے لڑکوں پر

۱- (س) کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ کہ سسرال اور میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہمارے آج کل کے نظامِ معاشرت میں بالعموم عورتیں پردہ نہیں کرتیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے اندر؟

(ج) شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کا بیوی کو حکم دے۔ اور اگر وہ ایسا حکم دے تو ایک مسلمان عورت کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ سورۂ نور کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ نے ان رشتہ داروں کی فہرست دے دی ہے جن کے سامنے ایک مسلمان عورت اپنی زینت کے ساتھ آ سکتی ہے۔ ان کے سوا کسی اور کے سامنے اظہارِ زینت کا حکم دینا کسی مسلمان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں سے پردہ کی نوعیت ہے۔ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے بغیر زینت کے، سادہ لباس میں، پورے ستر کے ساتھ آ سکتی ہیں، مگر صرف اس حد تک ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔ یہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنا اور تنہائی میں بیٹھنا جس کا رواج ہماری موجودہ سوسائٹی میں بڑی کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے، شرعی احکام کے قطعی خلاف ہے اور بعض رشتہ داروں، مثلاً دیوروں کے ساتھ ایسے تعلقات کی تو حدیث میں صریح ممانعت موجود ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کا جو حکم ہے وہ میں نے بتا دیا ہے، مگر مسلمانوں میں رواج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کو دُور کرنے کے لیے بڑی جرأت اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف بکثرت مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف یہی لوگ رشتہ داروں کے معاملہ میں تمام حدودِ شرعیہ کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس معاملے میں اگر کوئی شخص احکامِ شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد کرنا چاہے تو شاید بہت سے خاندانی تعلقات کو توڑے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔

(رسائل و مسائل، اول، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۵۵-۱۵۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صادق آسکتی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اگرچہ نابالغ ہوں، مگر ان میں صنفی احساسات بیدار ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۳۹۳، النور حاشیہ ۴۶)

غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ سے پردے کا حکم اَوِالتّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ (النور: ۳۱) وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں۔

اصل میں اَلتّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ کے الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ ہوگا ''مردوں میں سے وہ مرد جو تابع ہوں خواہش نہ رکھنے والے''۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محرم مردوں کے سوا دوسرے کسی مرد کے سامنے ایک مسلمان عورت صرف اُس صورت میں اظہارِ زینت کرسکتی ہے جب کہ اس میں دو صفات پائی جاتی ہوں:

ایک یہ کہ وہ تابع، یعنی زیردست اور ماتحت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خواہش نہ رکھنے والا ہو۔ یعنی اپنی عمر یا جسمانی عدم اہلیت، یا عقلی کمزوری، یا فقر و مسکنت، یا زیردستی و محکومی کی بنا پر جس میں یہ طاقت یا جرأت نہ ہو کہ وہ صاحبِ خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن، یا ماں کے متعلق کوئی بُری نیت دل میں لاسکے۔ اس حکم کو جو شخص بھی فرماں برداری کی نیت سے، نہ کہ نافرمانی کی گنجایش ڈھونڈنے کی نیت سے، پڑھے گا وہ اول نظر ہی میں محسوس کرلے گا کہ آج کل کے بیرے، خانسامے، شوفر، اور دوسرے جوان جوان نوکر تو بہرحال اس تعریف میں نہیں آتے۔ مفسرین اور فقہا نے اس کی جو تشریحات کی ہیں، ان پر نظر ڈال لینے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اہلِ علم ان الفاظ کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں:

ابنِ عباس: اس سے مراد وہ سیدھا سادھا بدھو (مُغفّل) آدمی ہے جو عورتوں سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

قتادہ: ایسا دست نگر آدمی جو پیٹ کی روٹی پانے کے لیے تمھارے ساتھ لگا رہے۔

مجاہد: ابلہ جو روٹی چاہتا ہے اور عورتوں کا طالب نہیں ہے۔

شعبی: وہ جو صاحبِ خانہ کا تابع دست نگر ہو اور جس کی اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ عورتوں پر نگاہ ڈال سکے۔

ابنِ زید: وہ جو کسی خاندان کے ساتھ لگا رہے، حتیٰ کہ گویا اسی گھر کا ایک فرد بن گیا ہو اور اسی گھر میں پلا بڑھا ہو۔ جو گھر والوں کی عورتوں پر نگاہ نہ رکھتا ہو، نہ اس کی ہمت ہی کرسکتا ہو۔ وہ ان کے ساتھ اس لیے لگا رہتا ہو کہ ان سے اس کو روٹی ملتی ہے۔

طاؤس اور زُہری: بے وقوف آدمی جس میں نہ عورتوں کی طرف رغبت ہو اور نہ اس کی ہمت۔ (ابنِ جریر، ج ۱۸، ص ۹۵-۹۶-ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۲۸۵)

ان تشریحات سے بھی زیادہ واضح تشریح وہ واقعہ ہے جو نبی ﷺ کے زمانے میں پیش آیا تھا اور جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور احمد رحمہم اللہ وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ مدینہ طیبہ میں ایک مخنث تھا جسے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور دوسری خواتین غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ میں شمار کرکے اپنے ہاں آنے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی ﷺ اُم المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ نے اس کو حضرت اُمِ سلمہ کے بھائی عبداللہ بن ابی اُمیہ سے باتیں کرتے سُن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف فتح ہوجائے تو غیلان ثقفی کی بیٹی بادیہ کو حاصل کیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بغیر نہ رہنا۔ پھر اُس نے بادِیہ کے حسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی اور اس کے پوشیدہ اعضا تک کی صفت بیان کر ڈالی۔ نبی ﷺ نے یہ باتیں سُنیں تو فرمایا: ''خدا کے دشمن! تو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں''۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو، آیندہ وہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اِس کے بعد آپ ﷺ نے اسے مدینے سے باہر نکال دیا اور دوسرے مخنثوں کو بھی گھروں میں گھسنے سے منع فرما دیا، کیونکہ اِن کو مخنث سمجھ کر عورتیں اِن سے احتیاط نہ کرتی تھیں۔ اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے[1]۔ اس سے معلوم ہوا کہ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص جسمانی طور پر بدکاری کے لائق نہیں ہے۔ اگر اس میں دَبی ہوئی صنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں سے دِلچسپی رکھتا ہے تو بہر حال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم ص ۳۹۱-۳۹۲، النور حاشیہ ۴۵)

حدِ عقل کو پہنچ جانے والوں کے لیے احکام: وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (النور ۲۴: ۵۹) اور جب تمھارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ اُسی طرح اجازت لے کر آیا کریں جس طرح اُن کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں۔ اِس طرح اللہ اپنی آیات تمھارے سامنے کھولتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔

لڑکوں کے معاملے میں احتلام اور لڑکیوں کے معاملے میں ایام ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے، لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک، اِن جسمانی تغیرات سے خالی رہ جائیں ان کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

اختلافِ فقہا: امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اِس صورت میں ۱۵ برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس صورت میں ۱۷ برس کی لڑکی اور ۱۸ برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا۔ یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں، بلکہ فقیہانہ اجتہاد پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ تمام دنیا میں ہمیشہ ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر ہی کو غیر محتلم لڑکوں اور غیر حائضہ لڑکیوں کے معاملے میں حدِ بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اور مختلف زمانوں میں جسمانی نشوونما کے حالات مختلف ہُوا کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عموماً کسی ملک میں جن عمروں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتلام اور ماہواری ہونے شروع ہوتے ہوں اُن کا اوسط فرق نکال لیا جائے اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے مُعتاد وقت پر نہ ظاہر ہوں، اُن کے لیے زیادہ سے زیادہ مُعتاد عمر پر اس اوسط کا اضافہ کر کے اُسے بلوغ کی عمر قرار دے دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعموم کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے ۱۵ برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہوگا اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لیے ہم ساڑھے سولہ برس کی عمر کو سنِ بلوغ قرار دے سکیں گے۔ اسی قاعدے پر مختلف ممالک کے اہلِ قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔

۱۵ برس والی حدیث: ۱۵ برس کی حد کے حق میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۱۱-۳۱۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ میں ۱۴ ؍ برس کا تھا جب غزوۂ اُحد کے موقع پر نبی ﷺ کے سامنے پیش ہوا اور آپ ﷺ نے مجھے شریکِ جنگ ہونے کی اجازت نہ دی۔ پھر غزوۂ خندق کے موقع پر جب کہ میں ۱۵ ؍ برس کا تھا، مجھے دوبارہ پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے مجھ کو اجازت دے دی۔[۱] (صحاح ستہ و مسند احمد)۔ لیکن یہ روایت دو وجوہ سے قابلِ استدلال نہیں ہے۔ اول یہ کہ غزوۂ اُحد شوال ۳ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ خندق بقول محمد بن اسحاق شوال ۵ھ میں اور بقول ابن سعد ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ دونوں واقعات کے درمیان پورے دو سال یا اس سے زیادہ کا فرق ہے۔ اب اگر غزوۂ اُحد کے زمانے میں ابن عمر ۱۴ ؍ برس کے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ غزوۂ خندق کے زمانے میں وہ صرف ۱۵ ؍ برس کے ہوں؟ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ۱۳ ؍ سال ۱۱ ؍ مہینے کو ۱۴ ؍ سال اور ۱۵ ؍ برس ۱۱ ؍ مہینے کی عمر کو ۱۵ ؍ سال کہہ دیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے لیے بالغ ہونا اور چیز ہے اور معاشرتی معاملات میں قانوناً بالغ ہونا اور چیز۔ ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے کے لیے دلیل بنایا جاسکے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ غیر محتلم لڑکے کے لیے ۱۵ ؍ برس کی عمر مقرر کرنا ایک قیاسی و اجتہادی حکم ہے، کوئی منصوص حکم نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۴۲۲-۴۲۳، النور حاشیہ ۹۶)

اپنے غلاموں سے پردہ: أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ (النور ۲۴: ۳۱) یا اپنے مملوک۔

اِس حکم کا مطلب سمجھنے میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ ایک گروہ اس سے مُراد صرف وہ لونڈیاں لیتا ہے جو کسی عورت کی مِلک میں ہوں۔ اِن حضرات کے نزدیک ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ لونڈی خواہ مشرکہ ہو یا اہلِ کتاب ہی میں سے، مسلمان مالکہ اس کے سامنے تو اظہارِ زینت کرسکتی ہے، مگر غلام، چاہے وہ عورت کا اپنا مملوک ہی کیوں نہ ہو، پردے کے معاملہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی آزاد اجنبی مَرد کی ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعودؓ، مجاہد، حسن بصری، ابنِ سیرین، سعید بن مسیب، طاؤس اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور ایک قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ ان بزرگوں کا استدلال یہ ہے کہ غلام کے لیے اُس کی مالکہ محرم نہیں ہے، اگر وہ آزاد ہوجائے تو اپنی اسی سابق مالکہ سے نکاح کرسکتا ہے۔ لہٰذا محض غلامی اس امر کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت اس کے سامنے وہ آزادی برتے جس کی اجازت محرم مَردوں کے سامنے برتنے کے لیے دی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں، جو لونڈی اور غلام دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ پھر اسے لونڈیوں کے لیے خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر موقع و محل ان کا مفہوم لونڈیوں کے لیے خاص کر رہا ہے۔ پہلے نِسَآئِهِنَّ فرمایا، پھر مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ ارشاد ہوا۔ نِسَآئِهِنَّ کے الفاظ سن کر عام آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ اس سے مُراد وہ عورتیں ہیں جو کسی عورت کی ملنے جلنے والی یا رشتہ دار ہوں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی کہ شاید لونڈیاں اس میں شامل نہ ہوں۔ اس لیے مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ کہہ کر یہ بات صاف کردی گئی کہ آزاد عورتوں کی طرح لونڈیوں کے سامنے بھی اظہارِ زینت کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۶، ص ۱۰۰-۱۰۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اجازت میں لونڈی اور غلام دونوں شامل ہیں۔ یہ حضرت عائشہ اور اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا اور بعض ائمہ اہل بیت کا مذہب ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ اِن کا استدلال صرف لفظ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے عموم ہی سے نہیں ہے، بلکہ وہ سُنت سے بھی اپنی تائید میں شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام عبداللہ بن سعدة الفزاری کو لیے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ اِس وقت ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں جس سے سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا: لَيْسَ عَلَيْكِ بَأْسٌ، اِنَّمَا هُوَ اَبُوْكِ وَ غُلَامُكِ [1]۔ کوئی حرج نہیں، یہاں بس تمھارا باپ ہے اور تمھارا غلام ہے۔ (ابوداؤد، احمد، بیھقی بروایت انس بن مالک. ابنِ عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ غلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا۔ انھوں نے اسے پرورش کیا اور پھر آزاد کر دیا، مگر اس احسان کا جو بدلہ اس نے دیا وہ یہ تھا کہ جنگ صفین کے زمانے میں وہ حضرت علیؓ کا بدترین دشمن اور امیر معاویہؓ کا پرجوش حامی تھا) اسی طرح وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اِذَا كَانَ الاحدا كن مكاتب و كان له ما يؤدی فلتحتجب منه [2] جب تم میں سے کوئی اپنے غلام سے مکاتبت کرے اور وہ مالِ کتابت ادا کرنے کی مقدرت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ ایسے غلام سے پردہ کرے (ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ، بروایت اُمِ سلمہ)۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۰-۳۹۱، النور حاشیہ ۴۴)

چہرے کا پردہ

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ (الاحزاب ۳۳:۵۹) اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اُوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس تدبیر سے یہ بات زیادہ متوقع ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی اور انھیں ستایا نہ جائے گا۔

یہ آیت خاص چہرے کو چھپانے کے لیے ہے۔ جلابیب جمع ہے جلباب کی جس کے معنی چادر کے ہیں۔ اِدْنَاء کے معنی اِرْخَاء یعنی لٹکانے کے ہیں۔ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "اپنے اُوپر اپنی چادروں میں سے ایک حصہ لٹکا لیا کریں"۔ یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے۔ مگر اصل مقصود وہ خاص وضع نہیں ہے جس کو عرفِ عام میں گھونگھٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے، خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے۔ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں اس طرح مستور ہو کر باہر نکلیں گی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف عورتیں ہیں، بے حیا نہیں ہیں، اس لیے کوئی اُن سے تعرّض نہ کرے گا۔

قرآنِ مجید کے تمام مفسّرین نے اِس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اُوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۹۵
۲- ایضاً، ج ۷، ص ۳۹۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے چہروں کو ڈھانک لیا کریں (تفسیر ابن جریر ، ج ۲۲ ،ص ۲۹)۔

امام محمد بن سیرین نے حضرت عبیدہ بن سفیان بن الحارث الحضرمی سے دریافت کیا کہ اِس حکم پر عمل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اُنھوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی اور ناک اور ایک آنکھ چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی (تفسیر ابن جریر ،حوالہ مذکورہ۔احکام القرآن، ج ۳،ص ۴۵۷)۔

علامہ ابنِ جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ جب اپنے گھروں سے کسی حاجت کے لیے نکلیں تو لونڈیوں کے سے لباس نہ پہنیں کہ سر اور چہرے کھلے ہوئے ہوں، بلکہ وہ اپنے اُوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں تاکہ کوئی فاسق اِن سے تعرض نہ کر سکے اور سب جان لیں کہ وہ شریف عورتیں ہیں (تفسیر ابن جریر، حوالۂ مذکورہ)۔

علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت پردہ داری اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ بدنیت لوگ اس کے حق میں طمع نہ کر سکیں (احکام القرآن، ج ۳،ص ۴۵۸)۔

علامہ نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں لکھتے ہیں:

ابتدائے عہدِ اسلام میں عورتیں زمانہ جاہلیت کی طرح قمیص اور دوپٹے کے ساتھ نکلتی تھیں اور شریف عورتوں کا لباس ادنیٰ طبقے کی عورتوں سے مختلف نہ تھا۔ پھر حکم دیا گیا کہ وہ چادریں اوڑھیں اور اپنے سر اور چہروں کو چھپائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ شریف عورتیں ہیں، فاحشہ نہیں ہیں (تفسیر غرائب القرآن، برحاشیہ ابن جریر، ج ۲۲،ص ۳۲)۔

امام رازی لکھتے ہیں:

جاہلیت میں اشراف کی عورتیں اور لونڈیاں سب کھلی پھرتی تھیں اور بدکار لوگ ان کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شریف عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اُوپر چادر ڈالیں اور یہ فرمایا کہ ذٰلِكَ اَدْنٰىٓ اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ تو اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس لباس سے پہچان لیا جائے گا کہ وہ شریف عورتیں ہیں اور اُن کا پیچھا نہ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بدکار نہیں ہیں۔ کیونکہ جو عورت چہرہ چھپائے گی درآں حالیکہ چہرہ 'عورت'[1] نہیں ہے جس کا چھپانا فرض ہو تو کوئی شخص اُس سے توقع نہ کرے گا کہ ایسی شریف عورت کشفِ 'عورت' پر آمادہ ہو جائے گی۔ پس اس لباس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ وہ ایک پردہ دار عورت ہے اور اس سے بدکاری کی توقع نہ کی جا سکے گی (تفسیر کبیر، ج ۶،ص ۵۹۱)۔

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ، یعنی جب وہ اپنی حاجات کے لیے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنے چہروں اور اپنے جسموں کو چھپا لیں۔ یہاں لفظ مِنْ تبعیض کے لیے ہے۔ یعنی چادروں کے ایک حصّہ کو منہ پر ڈالا جائے اور ایک حصّہ کو جسم پر لپیٹ لیا جائے

۱۔ 'عورت' اصطلاح میں جسم کے اُس حصے کو کہتے ہیں جس کو بیوی یا شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانے کا حکم ہے۔ مرد کے جسم کا بھی وہ حصہ جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے، اس معنی میں 'عورت' ہی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ یعنی اِس سے اُن کے اور لونڈیوں اور مغنیات کے درمیان تمیز ہو جائے گی۔ فَلَا يُؤْذَيْنَ، اور مُشتبہ چال چلن کے لوگ اِن سے تعرض کی جرأت نہ کر سکیں گے (تفسیر بیضاوی، ج ۴، ص ۱۶۸)۔

اِن اقوال سے ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مبارک دور سے لے کر آٹھویں صدی تک ہر زمانے میں اِس آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا ہے اور وہ مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے ہم نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت کے نزول کے بعد سے عہدِ نبوی میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی تھیں، اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج بند ہو گیا تھا۔ ابوداؤد، ترمذی، مؤطا اور دوسری کتبِ حدیث میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو حالتِ احرام میں چہروں پر نقاب ڈالنے اور دستانے پہننے سے منع فرما دیا تھا۔ اَلْمُحْرِمَةُ لَا تَنْتَقِبُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَيْنِ۔ وَنَهَى النِّسَآءَ فِيْ اِحْرَامِهِنَّ عَنِ الْقُفَّازَيْنِ وَالنِّقَابِ[1]۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس عہدِ مبارک میں چہروں کو چھپانے کے لیے نقاب اور ہاتھوں کو چھپانے کے لیے دستانوں کا عام رواج ہو چکا تھا۔ صرف احرام کی حالت میں اِس سے منع کیا گیا۔ مگر اِس سے بھی یہ مقصد نہ تھا کہ حج میں چہرے منظرِ عام پر پیش کیے جائیں، بلکہ دراصل مقصد یہ تھا کہ احرام کی فقیرانہ وضع میں نقاب عورت کے لباس کا جز نہ ہو، جس طرح عام طور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں تصریح کی گئی ہے کہ حالتِ احرام میں بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور عام خواتینِ اسلام نقاب کے بغیر اپنے چہروں کو اجانب سے چھپاتی تھیں۔ ابوداؤد میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّوْنَ بِنَا وَ نَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مُحْرِمَاتٌ فَاِذَا حَاذُوْا بِنَا سَدَلَتْ اِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَّأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا فَاِذَا جَاوَزُوْنَا كَشَفْنَاهُ[2] (باب فی المحرمة تغطی وجهها)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سوار ہمارے قریب سے گزرتے تھے اور ہم عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالتِ احرام میں ہوتی تھیں۔ پس جب وہ لوگ ہمارے سامنے آ جاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے سروں کی طرف سے اپنے چہروں پر ڈال لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو منہ کھول لیتی تھیں۔

مؤطا امام مالک میں ہے:

عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْمُنْذِرِ قَالَتْ: كُنَّا نُخَمِّرُ وُجُوْهَنَا وَ نَحْنُ مُحْرِمَاتٌ وَّ نَحْنُ مَعَ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ فَلَا تُنْكِرُهُ عَلَيْنَا[3] (باب تخمیر المحرم وجهه) فاطمہ بنت منذر کا بیان ہے کہ ہم حالتِ احرام میں اپنے چہروں پر کپڑا ڈال لیا کرتی تھیں۔ ہمارے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تھیں۔ اُنھوں نے ہم کو اس سے منع نہیں کیا (یعنی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ احرام کی حالت میں نقاب استعمال کرنے کی جو ممانعت ہے اس کا اطلاق ہمارے اس فعل پر بھی ہوتا ہے)۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۳۹

۲- ایضاً، ج ۵، ص ۳۳۸

۳- ایضاً، ج ۵، ص ۳۳۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فتح الباری، کتاب الحج میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے:

تسدل المرأۃ جلبابھا من فوق رأسھا علی وجھھا[1] عورت حالتِ احرام میں اپنی چادر اپنے سر پر سے چہرے پر لٹکا لیا کرے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۷-۳۲۲)

واقعۂ اِفک سے استدلال: واقعۂ اِفک کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے اُس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آ کر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سوگئی۔ صبح کو صفوان بن مُعطّل رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرا تو دور سے کسی کو پڑے دیکھ کر اِدھر آ گیا: فَعَرَفَنِیْ حِیْنَ رَاٰنِیْ وَکَانَ قَدْ رَاٰنِیْ قَبْلَ الْحِجَابِ. فَاسْتَیْقَظْتُ بِاسْتِرْجَاعِهٖ حِیْنَ عَرَفَنِیْ فَخَمَّرْتُ وَجْھِیْ بِجِلْبَابِیْ[2] (بخاری۔ مسلم۔ احمد۔ ابنِ جریر۔ سیرت ابنِ ھشام) وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ حجاب کے حُکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھے پہچان کر جب اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ ڈھانک لیا۔

ابو داؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون اُمِ خلّاد کا لڑکا ایک جنگ میں شہید ہوگیا تھا۔ وہ اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، مگر اِس حال میں بھی چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے حیرت کے ساتھ کہا کہ اِس وقت بھی تمھارے چہرے پر نقاب ہے؟ یعنی بیٹے کی شہادت کی خبر سُن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اور تم اِس اطمینان کے ساتھ باپردہ آئی ہو۔ جواب میں کہنے لگیں اَنْ اُرْزَأَ ابْنِیْ فَلَنْ اُرْزَأَ حَیَائِیْ[3] میں نے بیٹا تو ضرور کھویا ہے مگر اپنی حیا تو نہیں کھودی۔ ابو داؤد ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخواست دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مَرد کا؟ اس نے عرض کیا عورت ہی کا ہے۔ فرمایا ''عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن ہی مہندی سے رنگ لیے ہوتے''۔ (ابوداؤد– نسائی– احمد)[4]۔

رہے حج کے موقع کے وہ واقعات جن کا ہم نے اُوپر ذِکر کیا ہے تو وہ عہدِ نبوی میں چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے۔ کیونکہ اِحرام کے لباس میں نقاب کا استعمال ممنوع ہے۔ تاہم اِس حالت میں بھی محتاط خواتین غیر مَردوں کے سامنے چہرہ کھول دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالت احرام مکہ کی طرف جارہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں[5] (ابوداؤد، باب فی محرمۃ تغطی وجھھا)۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۱-۳۸۲، النور حاشیہ ۲۹)

اِلَّا مَا ظَھَرَ کا مفہوم: وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَاظَھَرَ مِنْھَا (النور ۲۴:۳۱) اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۴۰ ۲- ایضاً، ج ۵، ص ۳۷۵-۳۷۶ ۳، ۴، ۵- ایضاً ج ۵، ص ۲۷۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

'بناؤ سنگھار' ہم نے 'زینت' کا ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے دوسرا لفظ آرایش بھی ہے۔ اِس کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے: خوشنما کپڑے، زیور، اور سر، منہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی مختلف آرایشیں جو بالعموم عورتیں دنیا میں کرتی ہیں، جن کے لیے موجودہ زمانے میں (میک اپ) کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اِس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصا مبہم بنا دیا ہے، ورنہ بجائے خود بات بالکل صاف ہے، پہلے فقرے میں ارشاد ہوا ہے کہ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ وہ وزیبایش کو ظاہر نہ کریں اور دوسرے فقرے میں اِلَّا بول کر اِس حکمِ نہی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ ہے مَاظَهَرَ مِنْهَا جو کچھ اِس آرایش وزیبایش میں سے ظاہر ہو، یا ظاہر ہو جائے۔ اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اِس کا اظہار اور اس کی نمایش نہ کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے چادر کا ہوا سے اُڑ جانا اور کسی زینت کا کھل جانا) یا جو آپ سے آپ ظاہر ہو (جیسے وہ چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہر حال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہر حال وہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے) اِس پر خدا کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اِس آیت کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حسن بَصری، ابنِ سیرین اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے۔ اِس کے برعکس بعض مفسّرین نے مَاظَهَرَ مِنْهَا کا مطلب لیا ہے مَا يُظْهِرُ الْإِنْسَانُ عَلَى الْعَادَةِ الْجَارِيَةِ (جسے عادۃً انسان ظاہر کرتا ہے) اور پھر وہ اِس میں منہ اور ہاتھوں کو اِن کی تمام آرایشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ عورت اپنے منہ کو مسّی اور سرمے اور سُرخی پاؤڈر سے اور اپنے ہاتھوں کو انگوٹھی، چھلے اور چوڑیوں اور کنگن وغیرہ سے آراستہ رکھ کر لوگوں کے سامنے کھولے پھرے۔ یہ مطلب ابنِ عبّاس رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہاے حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے (احکام القرآن جصّاص، ج ۳، ص ۳۸۸-۳۸۹)۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ مَا ظَهَرَ کے معنی مَا يُظْهِرُ عربی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ 'ظاہر ہونے' اور 'ظاہر کرنے' میں کھلا ہوا فرق ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر 'ظاہر کرنے' سے روک کر 'ظاہر ہونے' کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اِس رخصت کو 'ظاہر کرنے' کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور ان روایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں حکمِ حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں، اور حکمِ حجاب میں منہ کا پردہ شامل تھا، اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ اِس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں۔ حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے۔ رہا حجاب تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے جسے عورتوں اور غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے، اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکامِ حجاب کی ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۸۵-۳۸۶، النور حاشیہ ۳۴-۳۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نقاب: جو شخص آیتِ قرآنی کے الفاظ اور اُن کی مقبولِ عام اور متفق علیہ تفسیر، اور عہدِ نبوی ﷺ کے تعامل کو دیکھے گا اُس کے لیے اِس حقیقت سے انکار کی مجال باقی نہ رہے گی کہ شریعتِ اِسلامیہ میں عورت کے لیے چہرے کو اجانب سے مستور رکھنے کا حکم ہے، اور اِس پر خود نبی ﷺ کے زمانے سے عمل کیا جاتا رہا ہے۔ نقاب اگر لفظاً نہیں تو معناً و حقیقتاً خود قرآنِ عظیم کی تجویز کردہ چیز ہے۔ جس ذاتِ مقدس پر قرآن نازل ہوا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے خواتینِ اسلام نے اِس چیز کو اپنے خارج البیت لباس کا جزو بنایا تھا اور اِس زمانے میں بھی اِس چیز کا نام 'نقاب' ہی تھا۔

جی ہاں! یہ وہی 'نقاب' (Veil) ہے جس کو یورپ انتہا درجہ کی مکروہ اور گھناؤنی چیز سمجھتا ہے۔ جس کا محض تصور ہی فرنگی ضمیر پر ایک بارِ گراں ہے، جس کو ظلم اور تنگ خیالی اور وحشت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ ہاں یہ وہی چیز ہے جس کا نام کسی مشرقی قوم کی جہالت اور تمدّنی پسماندگی کے ذِکر میں سب سے پہلے لیا جاتا ہے، اور جب یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مشرقی قوم تمدّن و تہذیب میں ترقی کر رہی ہے تو سب سے پہلے جس بات کا ذِکر بڑے انشراح و انبساط کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اِس قوم سے 'نقاب' رخصت ہوگئی ہے۔ اب شرم سے سر جھکا لیجیے کہ یہ چیز بعد کی ایجاد نہیں، خود قرآن نے اِس کو ایجاد کیا ہے اور محمد ﷺ اِس کو رائج کر گئے ہیں۔ مگر محض سر جھکانے سے کام نہ چلے گا۔ شُتر مرغ اگر شکاری کو دیکھ کر ریت میں سر چھپا لے تو شکاری کا وجود باطل نہیں ہو جاتا۔ آپ بھی اپنا سر جھکائیں گے تو سر ضرور جھک جائے گا، مگر قرآن کی آیت نہ مٹے گی۔ نہ تاریخ سے ثابت شُدہ واقعات محو ہو جائیں گے۔ تاویلات سے اِس پر پردہ ڈالیے گا تو یہ 'شرم کا داغ' اور زیادہ چمک اُٹھے گا۔ جب وحیِ مغرب پر ایمان لا کر آپ اس کو 'شرم کا داغ' مان ہی چکے ہیں، تو اِس کو دُور کرنے کی اب ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس اِسلام ہی سے اپنی براءت کا اعلان فرما دیں جو نقاب، گھونگھٹ، سترِ وجوہ جیسی 'گھناؤنی' چیز کا حکم دیتا ہے۔ آپ ہیں 'ترقی' کے خواہش مند۔ آپ کو درکار ہے 'تہذیب'۔ آپ کے لیے وہ مذہب کیسے قابلِ اتباع ہو سکتا ہے جو خواتین کو شمعِ انجمن بننے سے روکتا ہو، حیا اور پردہ داری اور عفت مآبی کی تعلیم دیتا ہو، گھر کی ملکہ کو اہلِ خانہ کے سوا ہر ایک کے لیے قرۃ العین بننے سے منع کرتا ہو، بھلا ایسے مذہب میں 'ترقی' کہاں! ایسے مذہب کو تہذیب سے کیا واسطہ! 'ترقی' اور 'تہذیب' کے لیے تو ضروری ہے کہ عورت...... نہیں لیڈی صاحبہ...... باہر نکلنے سے پہلے دو گھنٹے تک تمام مشاغل سے دست کش ہو کر صِرف اپنی تزئین و آرایش میں مشغول ہو جائیں، تمام جسم کو معطّر کریں، رنگ اور وضع کی مناسبت سے انتہا درجہ کا جاذبِ نظر لباس زیب تن فرمائیں، مختلف قسم کے غازوں سے چہرے اور بانہوں کی تنویر بڑھائیں، ہونٹوں کو لپ سٹک سے مزیّن کریں، کمانِ اَبرو کو درست اور آنکھوں کو تیر اندازی کے لیے چُست کرلیں، اور ان سب کرشموں سے مسلّح ہو کر گھر سے باہر نکلیں تو شان یہ ہو کہ ہر کرشمہ دامنِ دِل کو کھینچ کھینچ کر ''جا ایں جا است'' کی صدا لگا رہا ہو، پھر اِس سے بھی ذوقِ خود آرائی کی تسکین نہ ہو، آئینہ اور سنگھار کا سامان ہر وقت ساتھ رہے، تا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسبابِ زینت کے خفیف ترین نقصانات کی بھی تلافی کی جاتی رہے۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، اِسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد میں بُعد المشرقین ہے اور وہ شخص سخت غلطی کرتا ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام کی تعبیر کرتا ہے۔ مغرب میں اشیا کی قدر و قیمت کا جو معیار ہے، اسلام کا معیار اس سے بالکل مختلف ہے۔ مغرب جن چیزوں کو نہایت اہم اور مقصودِ حیات سمجھتا ہے، اسلام کی نگاہ میں اُن کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اسلام جن چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، مغرب کی نگاہ میں وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ اب جو مغربی معیار کا قائل ہے، اس کو تو اسلام کی ہر چیز قابلِ ترمیم ہی نظر آئے گی۔ وہ اسلامی احکام کی تعبیر کرنے بیٹھے گا تو اُن کی تحریف کر ڈالے گا۔ اور تحریف کے بعد بھی ان کو اپنی زندگی میں کسی طرح نصب نہ کر سکے گا۔ کیونکہ قدم قدم پر قرآن اور سنّت کی تصریحات اِس کی مزاحمت کریں گی۔ ایسے شخص کو عملی طریقوں کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جن مقاصد کے لیے ان طریقوں کو اختیار کیا گیا ہے، وہ خود کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔ اگر وہ مقاصد ہی سے اتفاق نہیں رکھتا تو حصولِ مقاصد کے طریقوں پر بحث کرنے اور اُن کو مسخ و محرّف کرنے کی فضول زحمت کیوں اُٹھائے؟ کیوں نہ اُس مذہب ہی کو چھوڑ دے جس کے مقاصد کو وہ غلط سمجھتا ہے؟ اور اگر اسے مقاصد سے اتفاق ہے تو بحث صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ ان مقاصد کے لیے جو عملی طریقے تجویز کیے گئے ہیں وہ مناسب ہیں یا نامناسب۔ اور اس بحث کو بآسانی طے کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ طریقہ صرف شریف لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں۔ رہے منافقین، تو وہ خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقات میں سب سے ارذل مخلوق ہیں۔ اُن کو یہی زیب دیتا ہے کہ دعویٰ ایک چیز پر اعتقاد رکھنے کا کریں اور در حقیقت اعتقاد دوسری چیز پر رکھیں۔

نقاب اور بُرقع کے مسئلے میں جس قدر بحثیں کی جا رہی ہیں وہ دراصل اسی نفاق پر مبنی ہیں۔ ایڑی سے چوٹی تک کا زور یہ ثابت کرنے میں صَرف کیا گیا ہے کہ پردے کی یہ صورت اسلام سے پہلے کی قوموں میں رائج تھی اور جاہلیت کی یہ میراث عہدِ نبوی کے بہت مدّت بعد مسلمانوں میں تقسیم ہوئی۔ قرآن کی ایک صریح آیت اور عہدِ نبوی کے ثابت شدہ تعامل اور صحابہ وتابعین کی تشریحات کے مقابلے میں تاریخی تحقیقات کی یہ زحمت آخر کیوں اُٹھائی گئی؟ صرف اس لیے کہ زندگی کے وہ مقاصد پیشِ نظر تھے اور ہیں جو مغرب میں مقبولِ عام ہیں۔ 'ترقی' اور 'تہذیب' کے وہ تصورات ذہن نشین ہو گئے ہیں جو اہلِ مغرب سے نقل کیے گئے ہیں۔ چونکہ بُرقع اوڑھنا اور نقاب ڈالنا اُن مقاصد کے خلاف ہے اور اُن تصورات سے کسی طرح میل نہیں کھاتا، لہٰذا تاریخی تحقیق کے زور سے اُس چیز کو مٹانے کی کوشش کی گئی جو اسلام کی کتابِ آئین میں ثبت ہے۔ یہ کھلی ہوئی منافقت، جو بہت سے مسائل کی طرح اِس مسئلہ میں بھی برتی گئی ہے، اِس کی اصل وجہ وہی بے اُصولی اور عقل کی خِفّت اور اخلاقی جرأت کی کمی ہے، جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتباعِ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن کے مقابلہ میں تاریخ کو لا کر کھڑا کرنے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہ آتا۔ یا تو یہ اپنے مقاصد کو اسلام کے مقاصد سے بدل ڈالتے (اگر مسلمان رہنا چاہتے) یا علانیہ اس مذہب سے الگ ہو جاتے جو ان کے معیارِ ترقی کے لحاظ سے مانعِ ترقی ہے۔

جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ عقلِ عام (common sense) بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے، جن کو اسلام اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہی تو ہے۔ انسان کی خلقی و پیدائشی زینت، یا دوسرے الفاظ میں انسانی حُسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے۔ جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب وانجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کے کسی گہرے علم کی بھی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دِل کو ٹٹو لیے۔ اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجیے۔ اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے۔ منافق اگر آفتاب کے وجود کو بھی اپنے مقصد کے خلاف دیکھے گا تو دِن دہاڑے کہہ دے گا کہ آفتاب موجود نہیں۔ اَلبتہ صداقت سے کام لیجیے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک (sec appeal) میں جسم کی ساری زینتوں سے زیادہ حصّہ اس فطری زینت کا ہے جو اللہ نے چہرے کی ساخت میں رکھی ہے۔ اگر آپ کو کسی لڑکی سے شادی کرنی ہو اور آپ اُسے دیکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہتے ہوں تو سچ بتائیے کہ کیا دیکھ کر آپ فیصلہ کریں گے؟ ایک شکل اس کے دیکھنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ چہرے کے سوا وہ پوری کی پوری آپ کے سامنے ہو۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ ایک جھروکے میں سے وہ صرف اپنا چہرہ دِکھا دے۔

بتائیے دونوں شکلوں میں سے کون سی شکل کو آپ ترجیح دیں گے؟ سچ بتائیے کیا سارے جسم کی بہ نسبت چہرے کا حسن آپ کی نگاہ میں اہم ترین نہیں ہے؟

اس حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد آگے بڑھیے۔ اگر سوسائٹی میں صنفی انتشار اور لامرکزی ہیجانات وتحریکات کو روکنا مقصود ہی نہ ہو، تب تو چہرہ کے کیا معنی، سینہ اور بازو اور پنڈلیاں اور رانیں سب ہی کچھ کھول دینے کی آزادی ہونی چاہیے، جیسی کہ اِس وقت مغربی تہذیب میں ہے۔ اِس صورت میں اُن حدود وقیود کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو اِسلامی قانونِ حجاب کے سلسلے میں آپ اُوپر سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں، لیکن اگر اصل مقصد اِسی طوفان کو روکنا ہو تو اِس سے زیادہ خلافِ حکمت اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب ایسا ہے تو اِسلام نے ناگزیر حاجات وضروریات کے لیے چہرہ کھولنے کی اجازت کیوں دی جیسا کہ تم خود پہلے بیان کر چکے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اِسلام کا کوئی غیر معتدل اور یک رُخا قانون نہیں ہے۔ وہ ایک طرف مصالحِ اخلاق کا لحاظ کرتا ہے تو دوسری طرف انسان کی حقیقی ضرورتوں کا بھی لحاظ کرتا ہے۔ اور اِن دونوں کے درمیان اس نے غایت درجہ کا تناسب اور توازن قائم کیا ہے۔ وہ اخلاقی فتنوں کا سدِّ باب بھی کرنا چاہتا ہے اور اِس کے ساتھ کسی انسان پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنا نہیں چاہتا جن کے باعث وہ اپنی حقیقی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرے اور نقاب کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں۔ کیونکہ ستر پوشی اور اخفائے زینت سے ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ مگر چہرے اور ہاتھوں کو دائماً چھپائے رہنے سے عورتوں کو اپنی حاجات میں سخت مشکل پیش آ سکتی ہے۔ پس عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں اور اس قاعدے میں اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا کے استثنا سے یہ آسانی پیدا کر دی گئی کہ اگر حقیقت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس کو کھول سکتی ہیں، بشرطیکہ نمایشِ حسن مقصود نہ ہو بلکہ رفعِ ضرورت مدِ نظر ہو۔ پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے اُن کا سدِ باب اس طرح کیا گیا کہ مَردوں کو غضِ بصر کا حکم دے دیا گیا تا کہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجات کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کر لیں، اور بے ہودگی کے ساتھ اس کو گھورنے سے باز رہیں۔

پردہ داری کے اِن احکام پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی پردہ کوئی جاہلی رسم نہیں، بلکہ ایک عقلی قانون ہے۔ جاہلی رسم ایک جامد چیز ہوتی ہے۔ جو طریقہ جس صورت سے رائج ہو گیا، کسی حال میں اس کے اندر تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز چھپا دی گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے چھپا دی گئی۔ اب مرتے مر جائیں مگر اس کا کھلنا غیر ممکن۔ بخلاف اس کے عقلی قانون میں لچک ہوتی ہے۔ اس میں احوال کے لحاظ سے شدّت اور تخفیف کی گنجایش ہوتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اِس کے عام قواعد میں استثنائی صورتیں رکھی جاتی ہیں۔ ایسے قانون کی پیروی اندھوں کی طرح نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے عقل اور تمیز کی ضرورت ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والا پیرو خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کہاں اِس کو عام قاعدے کی پیروی کرنی چاہیے اور کہاں قانون کے نقطۂ نظر سے 'حقیقی ضرورت' درپیش ہے، جس میں استثنائی رخصتوں سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے۔ پھر وہ خود ہی یہ رائے بھی قائم کر سکتا ہے کہ کس محل پر رُخصت سے کس حد تک استفادہ کیا جائے اور استفادے کی صورت میں مقصدِ قانون کو کس طرح ملحوظ رکھا جائے۔ اِن تمام اُمور میں درحقیقت ایک نیک نیت مومن کا قلب ہی سچا مفتی بن سکتا ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اِسۡتَفۡتِ قَلۡبَکَ اور دَعۡ مَا حَاکَ فِیۡ صَدۡرِکَ[1]، اپنے دِل سے فتویٰ طلب کرو اور جو چیز دِل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی صحیح پیروی جہالت اور ناسمجھی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہ عقلی قانون ہے اور اس کی پیروی کے لیے قدم قدم پر شعور اور فہم کی ضرورت ہے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۳-۳۳۰)

کیا بُرقع پردے کی غایت پوری کرتا ہے؟

س غضِ بصر کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے، لیکن برقع کی 'دیوار' کے پیچھے عورتوں کی بہت بڑی اکثریت 'نگاہ کے زنا' کی مرتکب ہوتی رہتی ہے..... علاوہ ازیں بُرقع اوڑھ کر ایک اوسط معاشی وسائل کے کنبہ کی عورتیں اپنے کام کاج بھی کماحقہ انجام نہیں دے سکتیں..... روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

ج پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ کیا غضِ بصر کی تلقین اور اخلاقی تربیت کے بغیر یہ ممکن ہے کہ کوئی عورت کسی غیر مَرد کو گھورنے سے روکی جا سکے؟ آپ بُرقع کی نقاب پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ صرف مَرد کو عورت پر نگاہ ڈالنے سے روکتی ہے، عورت کو اس ناجائز نظر بازی سے نہیں روکتی۔ مگر یہ عیب تو صرف نقاب میں نہیں ہے، چادر میں بھی ہے۔ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ

۱۔ ان الفاظ میں یہ حدیث نہیں ملی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو حدیثوں کے ٹکڑے ہیں۔ (مرتب) البتہ مشکوٰۃ ص ۱۶ پر باب الکبائر میں ہے اِذَا حَاکَ فِیۡ نَفۡسِکَ شَیۡءٌ فَدَعۡہُ (رواہ احمد عن ابی ہریرۃ)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عورت چادر سے منہ ڈھانک کر جب باہر نکلے تو اسے راستہ دیکھنے کے لیے کم از کم اتنی جگہ کھلی رکھنی چاہیے کہ اس کی آنکھ سامنے دیکھ سکے۔ پھر یہ عیب چلمن میں بھی ہے جو آپ دروازوں اور کھڑکیوں پر ڈالتے ہیں، بلکہ یہ عیب ہر اُس چیز میں ہے جس سے کوئی عورت باہر جھانک سکتی ہو۔ آپ خود بتائیں کہ اِن منافذ کو آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ اور کیا فی الواقع شریعت کا بھی یہ مطالبہ ہے کہ ان سب منافذ کو روکا جائے؟ علاوہ بریں اِسی کتاب پردہ میں مَیں نے وہ روایت نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حبشیوں کے کھیل کا تماشا دکھایا تھا، وہاں میں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مَردوں کا عورتوں کو دیکھنا اور عورتوں کا مَردوں کو دیکھنا نہ شرعاً بالکل یکساں ہے اور نہ نفسیات کے اعتبار سے اِن کی حیثیت برابر ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر بُرقع بذاتِ خود بھڑکیلا اور جاذبِ نظر نہ ہو، سادہ اور بے زینت ہو تو شرعاً اس پر کس اعتراض کی گنجایش ہے؟ کیا وہ شریعت کے کسی مطالبے کو پورا نہیں کرتا؟ اگر کرتا ہے تو ہمارے پاس اِس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے نزدیک کوئی دوسری چیز اِس سے بہتر طریقے پر شریعت کے منشا کو پورا کرتی ہو۔ ایسی کوئی چیز آپ کی نگاہ میں ہے تو آپ اِسے تجویز کر سکتے ہیں، مگر بُرقع کو ناجائز کہنا کسی طرح درست نہیں۔

بُرقع اوڑھ کر چلنے پھرنے اور بسوں وغیرہ پر چڑھنے کے سلسلے میں آپ جو مشکلات بیان کرتے ہیں، وہ جواز اور عدمِ جواز کی بحث سے غیر متعلق ہیں۔ آپ کے نزدیک چادر میں اِس سے کم مشکلات ہیں یا کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں تو خواتین کو اس کی طرف توجہ دلائیں۔ وہ تجربہ سے اُسے مناسب پائیں گی تو کیوں نہ اختیار کریں گی۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۳-205)

کیا پردہ محض ایک رواجی چیز ہے؟

س [آپ نے اپنی کتاب رسالہ دینیات کے آخر میں لکھا ہے] کہ "شریعت کے قوانین کسی مخصوص قوم اور مخصوص زمانے کے رسم و رواج پر مبنی نہیں ہیں اور نہ کسی مخصوص قسم اور مخصوص زمانے کے لوگوں کے لیے ہیں"، مگر قرآن کو دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ پردہ محض ایک رواجی چیز ہے اور اِسے اِسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِسلام کی عائد کردہ قیود سے بڑھ کر اپنی طرف سے کچھ قیود عائد کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟

ج عورت کے لیے شریعت کے احکام تین اجزا پر مشتمل ہیں:

چہرے اور ہاتھ کے سوا جسم کے دوسرے حصّوں کو شوہر کے سوا کسی کے سامنے عورت کو نہ کھولنا چاہیے، کیونکہ وہ 'ستر' ہیں اور ستر صرف شوہر ہی کے لیے کھولنا چاہیے۔

چہرہ اور ہاتھ اُن تمام رشتہ داروں کے سامنے کھولے جاسکتے ہیں اور عورت اپنی زینت کے ساتھ اُن تمام رشتہ داروں کے سامنے آسکتی ہے جن کا ذکر سورہ [نور ۲۴ کی] آیت ۳۱ میں کیا گیا ہے۔

اِن رشتہ داروں کے سوا عام اجنبی مَردوں کے سامنے عورت کو اپنی زینت بھی چھپانی چاہیے اور اپنے چہرے کو بھی چھپانا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہیے، جیسا کہ سورہ [احزاب ۳۳ کی] آیات ۵۳-۵۵ اور آیت ۵۹ میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید شوہر، رشتہ داروں اور اجنبی مَردوں کے بارے میں عورتوں کے لیے الگ الگ حدود مقرر کرتا ہے، اور اجنبی مَردوں سے اُن کو پورا پردہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پردہ محض لوگوں کی 'رسم' پر مبنی ہے۔ قرآن کے آنے سے پہلے اہلِ عرب حجاب (پردے) کے تصور سے قطعی نا آشنا تھے۔ یہ قاعدہ سب سے پہلے قرآن ہی نے ان کے لیے مقرر کیا۔ اور بعد میں صِرف مسلمانوں ہی کے اندر پردے کا رواج رہا۔ دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی پابند نہ تھی، نہ ہے۔ آخر آپ کے نزدیک وہ کس کی 'رسم' ہے جو پردے کی صورت میں مسلمانوں کے اندر رائج ہوئی؟

آپ کا یہ خیال ٹھیک ہے اور بے جا قیود کسی کو اپنی طرف سے بڑھانے کا حق نہیں ہے، مگر جو قیود قرآن اور حدیث سے ثابت ہیں، کسی مسلمان کو ماڈرنزم میں مبتلا ہو کر انھیں توڑنے کی فکر بھی نہ کرنی چاہیے......

اگر آپ اردو کتابیں پڑھ سکتی ہوں تو میری کتاب پردہ، تفسیر سورۂ نور اور تفسیر سورۂ احزاب مطالعہ فرمائیں۔ اِن سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پردے کے احکام قرآن کی کن آیات اور رسول اللہ ﷺ کی کن احادیث پر مبنی ہیں اور آپ یہ بھی جان لیں گی کہ قیود آیا بعد کے لوگوں نے بڑھا دی ہیں یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی نے اِن کو عائد کیا ہے۔

(رسائل و مسائل، پنجم، ص ۳۵۲-۳۵۵)

پردہ کے متعلق چند عملی سوالات

س: آپ کی کتاب پردہ کے مطالعے کے بعد میں نے اور میری اہلیہ نے چند ہفتوں سے عائلی زندگی کو قوانینِ الٰہیہ کے مطابق بنانے کی سعی شروع کر رکھی ہے۔ مگر ہمارے اِس جدید رویّے کی وجہ سے پورا خاندان بالخصوص ہمارے والدین سخت برہم ہیں اور پردے کو شرعی حدود و ضوابط کے ساتھ اختیار کرنے پر برافروختہ ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ کہیں ہم ہی بعض مسائل میں غلطی پر نہ ہوں۔ پس تسلّی کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتے ہیں۔

سورۂ احزاب کی یہ آیت کہ "عورتوں پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں کے سامنے پردہ نہ کریں اور نہ اپنے بیٹوں کے سامنے...... اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ آیت میں جن اعزہ کا ذکر ہے، اِن کے سوا عورتوں کا کسی دوسرے کے سامنے کسی بھی شکل اور حالت میں آنا (الا بہ اشد مجبوری) صریحاً گناہ ہے۔ اس معاملہ میں غیر محرم رشتہ دار اور غیر محرم اجانب بالکل برابر ہیں۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟

ج: آپ نے قرآنِ مجید کے اصل الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ آیت جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں، سورۂ احزاب میں نہیں ہے، بلکہ سورۂ نور میں ہے، اور اِس میں الفاظ یہ ہیں کہ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا یعنی بجز ان لوگوں کے اور کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں بناؤ سنگھار اور آرایش کے ساتھ دوسرے لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔ دوسری

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طرف گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ یعنی اپنی چادروں کو اپنے اُوپر گھونگھٹ کے طور پر لٹکا لیا کریں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ بالکل اجنبی لوگوں کے سامنے تو چہرہ کھولنا بھی درست نہیں ہے، رہے اعزّہ واقربا تو اِن میں سے جن لوگوں کا ذِکر سورۂ نور والی آیت میں کیا گیا ہے صِرف اِن کے سامنے عورت پوری آزادی سے اپنی زینت کے ساتھ آسکتی ہے، باقی دوسرے اعزّہ واقربا کے سامنے زینت کے ساتھ آنا جائز نہیں۔

(س) کیا غیر محرم اعزّہ [مثلاً چچازاد بھائی یا خالو جب خالہ زندہ ہوں] کے سامنے ہونا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کن مواقع کے لیے اور کن طریقوں کے ساتھ جائز ہے؟

(ج) سامنے ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اُس طرح کی آزادی اور بناؤ سنگھار کے ساتھ سامنے ہونا جیسے باپ، بھائی وغیرہ کے سامنے ہوا جاتا ہے اور بے تکلف بیٹھ کر بات چیت کرنا، ہنسنا، بولنا حتیٰ کہ تنہائی تک میں ساتھ رہنا۔ یہ چیز کسی قسم کے غیر محرم مَردوں کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار۔ دوسرا مطلب اِس کا یہ ہے کہ عورت اپنی زینت کو چادر وغیرہ سے چھپا کر، نیز سر کو ڈھانک کر صِرف چہرہ اور ہاتھ کھولے ہوئے کسی کے سامنے آئے اور وہ بھی اپنے آپ کو دکھانے کی غرض سے نہیں، بلکہ اُن ناگزیر ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے جو مشترک خاندانی معاشرت میں پیش آتی ہیں۔ مگر آزادی کے ساتھ بیٹھ کر خلا ملا نہ کرے۔ خلوت میں بھی اُس کے ساتھ نہ رہے۔ اور صِرف اس طرح سامنے ہو کہ مثلاً اس کے سامنے سے گذر جائے یا کوئی ضروری بات ہو تو پوچھ لے یا بتا دے۔ اِس حد تک غیر محرم اعزّہ کے سامنے ہونے کی شرعاً اجازت ہے یا کم از کم ممانعت نہیں ہے۔ بہر حال چچازاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق اور انتہائی بے تکلفی آج مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے اور جس طرح مسلمان لڑکیاں اس قسم کے عزیزوں کے سامنے بنی ٹھنی رہتی ہیں، شریعتِ اِسلامیہ میں اِن بے اعتدالیوں کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

(س) اگر کسی غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ ایک ہی مکان میں مجبوراً رہنا ہو یا کوئی غیر محرم عزیز بطورِ مہمان آرہے ہوں تو ایسی حالت میں پردہ کس طرح کیا جاسکے گا؟ اِسی طرح کسی قریبی عزیز کے ہاں جانے پر اگر زنانے سے بلاوا آئے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟

(ج) ایسے حالات میں اگر شریعت کی پابندی کا ارادہ دونوں طرف موجود ہو تو صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ جب کوئی غیر محرم عزیز گھر میں آئے تو شرعی قاعدہ کے مطابق استیذان (طلبِ اجازت) کرے[1]۔ پھر جب ایسی آواز آئے تو عورت کو چاہیے کہ کوئی چیز اوڑھ کر اپنی زینت کو چھپا لے اور ذرا اپنا رُخ بدل لے، یا پیٹھ موڑ لے۔ اگر بالکل ناگزیر ہو تو چہرہ اور ہاتھ غیر محرم عزیز کے سامنے ظاہر ہونے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اِسی طرح بضرورت سادگی کے ساتھ بات کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ البتہ خلا ملا اور

۱۔ افسوس ہے کہ قرآن وسنت کے حکمِ استیذان کو آج مسلمانوں نے اپنی معاشرت سے بالکل ہی خارج کر دیا ہے اور اجازت مانگے بغیر گھر میں گھس آنے کو بے تکلفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ شرعاً خود گھر کے مردوں، حتیٰ کہ باپوں، بیٹوں اور بھائیوں کو بھی لازم ہے کہ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگیں تو کم از کم کھنکار دیں یا اور کوئی ایسی آواز کر دیں جس سے گھر کی عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی مرد آرہا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بے تکلفی اور ہنسی مذاق بالکل جائز نہیں۔

(س) اگر گھروں میں جوان ملازم کام کاج کے لیے آئیں جائیں تو سن رسیدہ عورتوں کے لیے تو جو رخصت ہے وہ مجھے معلوم ہے، مگر جوان عورتیں کیا صرف یہ کہہ کر ان کے سامنے بے پردہ ہو سکتی ہیں کہ ہماری نیت پاک ہے؟

(ج) ملازموں کے معاملے میں میری تحقیق یہ ہے کہ جن ملازموں کے متعلق صاحبِ خانہ کی رائے یہ ہو کہ وہ غَیۡرِ أُولِی الۡإِرۡبَةِ کی تعریف میں آتے ہیں (یعنی اپنے آقا کے گھر کی عورتوں کے متعلق کوئی بُرا خیال اِن کے دِل میں آنے کی توقع نہیں ہے) اِن کو گھروں میں آنے جانے اور کام کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ لیکن جن ملازموں کے متعلق صاحبِ خانہ کی یہ رائے نہ ہو، اُن کا گھروں میں آنا جانا جائز نہیں ہے۔ بہر حال اِس معاملے میں گھر کے قوّام کا اجتہاد معتبر ہے۔ بشرطیکہ وہ شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو، نہ کہ حدودِ شریعت کو بے پروائی کے ساتھ ٹالنے والا ہو۔

(س) اگر خدا اور رسول کے احکام کے تحت پردہ اختیار کرنے میں کسی کی والدہ حائل ہو تو اُس کے حُکم کو رَدّ کیا جا سکتا ہے یا نہیں جب کہ اُس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے؟

(ج) ماں کے پاؤں کے نیچے جنت بے شک ہے، لیکن حُکم صِرف اُسی ماں کا مانا جا سکتا ہے جو جنتیوں کے سے کام کرے۔ یعنی خدا اور رسولؐ کے احکام کے آگے جھکنے والی ہو اور اپنے نفس یا خاندانی رواجوں پر شریعت کو قربان کر دینے والی نہ ہو۔ رہی وہ ماں جو اِس کے برعکس صفات رکھتی ہو تو اِس کی خدمت تو کی جاتی رہے گی، مگر غیر شرعی اُمور میں اُس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ شریعت کی پابندی سے آزاد ہو کر اور اپنے نفس یا برادری کی شریعت کو خدا کی شریعت پر ترجیح دے کر تو اِس نے اپنا قدم خود جہنم کی طرف ڈال دیا ہے۔ پھر آخر اُس کے قدموں کے نیچے جنت کیسے ہو سکتی ہے۔

(س) کیا عورتوں کو مَردوں اور عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب اوڑھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رُو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر محرم مَردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔

(ج) بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پردے کی پوری پابندی کے ساتھ مَردوں کو خطاب کرے، لیکن بالعموم یہ جائز نہیں ہے۔ اِس کا فیصلہ کرنا کہ کن حالات میں یہ جائز ہے اور کن میں جائز نہیں، صرف ایسے شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے منشا کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت بھی اِن میں پائی جاتی ہو۔

(س) کیا عورتیں لیڈی ڈاکٹر، یا نرس یا معلّمہ بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری عورتیں اِن سب کاموں میں حصہ لے کر گذشتہ نقصانات اور پسماندگی کی تلافی کریں۔ اِسلامی نقطۂ نظر سے عورتیں کیا اِن مشاغل کو اختیار کر سکتی ہیں اور آیا انھیں پردہ میں رہ کر ہی انجام دینا ہوگا یا ضرورتاً پردے سے باہر بھی آ سکتی ہیں؟

(ج) لیڈر صاحبان کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے اِس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اِسلامی تہذیب اُسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ حضرات خود اور اِن کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں تو پھر اِسلامی تہذیب اور یورپین تہذیب میں کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرق نہیں ہے۔ پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اسلامی تہذیب اس تہذیب کا نام ہے جو محمد ﷺ نے سکھائی تھی تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت گرلز کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلمات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مختلف نہیں ہے۔ البتہ اگر نظامِ تعلیم و تربیّت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقے پر لڑکیوں کو تیار کر کے ان سے تمدن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فنِ طب، سرجری، قابلہ گری، نرسنگ اور تربیّتِ اطفال کی تعلیم دیں اور ان کو دوسرے علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیّت دے کر معلمات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ضمناً لائق تصریح ہے کہ ہم مسلمان اس مغربی نظریے کے قائل نہیں ہیں کہ تیمارداری [نرسنگ] کا پیشہ عورت کے لیے مخصوص ہے اور یہ کہ زنانہ و مردانہ سب قسم کے ہسپتالوں میں نرس عورت ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس خیال کے لیے کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں ہے، اور اخلاقی حیثیت سے یہ نہایت شرمناک ہے کہ نرس خواتین سے مرد بیماروں کی تیمارداری کے وہ کام لیے جائیں جنہیں مرد تیماردار بھی انجام دیتے ہوئے حجاب محسوس کریں۔ اس بنا پر ہم مسلمان لوگ اگر عورتوں کو طبی خدمات کے لیے تیار کریں گے تو عورتوں کے علاج اور تیمارداری کے لیے کریں گے نہ کہ عام طبی خدمات کے لیے۔ ہمارے نزدیک مردانہ ہسپتالوں کے لیے مرد ہی نرس ہونے چاہییں۔

سوال کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں؟

جواب جنگ کے موقع پر تیمارداری، مرہم پٹی، مجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی، پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لیے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات عورتیں انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ فوج اسلامی ہو، حدود اللہ کی پابند ہو اور ان بدمعاشوں سے پاک ہو جن میں آج کل کی فوجوں نے ناموری حاصل کر رکھی ہے۔ W.A.C. جیسے معصوم نام سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بدمعاش سپاہیوں اور افسروں کے لیے ان سے قحبہ گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لیے کوئی گنجائش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں نکل سکتی۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱، ص ۱۵۷-۱۶۶، بحوالہ ترجمان القرآن، اگست ۱۹۴۶ء)

کیا پردہ مناسب رشتے کی تلاش میں رکاوٹ ہے

سوال اسلامی پردے کی رُو سے جہاں ہمیں بے شُمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں دو ایسے نقصانات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا، بجز اس کے کہ صبر و شکر کر کے بیٹھ جائیں۔

۵- اول یہ کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی جس کا ایک خاص ذوق ہے اور جو اپنے دوست منتخب کرنے میں ان سے ایک خاص اخلاق اور ذوق کی توقع رکھتا ہے، فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ شادی کے لیے ساتھی بھی اپنی مرضی سے منتخب کرے، لیکن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِسلامی پردے کے ہوتے ہوئے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کے لیے اِس بات کی گنجایش نہیں رہتی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا ساتھی چنے، بلکہ اِس کے لیے وہ قطعاً دوسروں یعنی ماں یا خالہ وغیرہ کے دستِ نگر ہوتے ہیں۔ ہماری قوم کی تعلیمی حالت ایسی ہے کہ والدین عموماً اَن پڑھ اور اولاد تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ اِس لیے والدین سے یہ توقع رکھنا کہ موزوں رشتہ ڈھونڈ لیں گے ایک عبث توقع ہے۔ اِس صورتِ حال سے ایک ایسا شخص جو اپنے مسائل خود حل کرنے اور خود سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

۵- دوسری بات یہ ہے کہ ایک لڑکی جو گھر سے باہر نہ نکلنے کی پابند ہو وہ کیوں کر ایسی وسعتِ نظر، فراست اور عقلِ عام کی مالک ہوسکتی ہے کہ بچوں کی بہترین تربیت کر سکے اور اِن کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح سے بیدار کر دے۔ اُس کو تو دنیا کے معاملات کا صحیح علم ہی نہیں ہوسکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی تعلیم بھی حاصل کر لے جتنی ایک بے پردہ لڑکی نے حاصل کی ہوتی ہے تو بھی اس کی ذہنی سطح کم ہوگی کیونکہ اسے اپنے علم کو عملی طور پر پرکھنے کا کوئی موقع ہی حاصل نہیں۔ اُمید ہے آپ اس مسئلے پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔

(ج) آپ نے اِسلامی پردے کی جن خرابیوں کا ذِکر کیا ہے اولاً تو وہ ایسی خرابیاں نہیں ہیں کہ اِن کی بنا پر آدمی لاینحل مشکلات میں مبتلا ہو جائے اور ثانیاً حیاتِ دنیوی میں آخر کون سی ایسی چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن کسی چیز کے مُفید یا مُضر ہونے کا فیصلہ اس کے صِرف ایک یا دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر اس میں مصالح کو غلبہ حاصل ہے یا مفاسد کو۔ یہی اُصول پردے کے بارے میں اختیار کیا جائے گا۔ اسلامی پردہ آپ کی رائے میں بھی بے شُمار فوائد کا حامل ہے۔ لیکن فقط یہ مشکل کہ اِس کی پابندی سے آدمی کو شادی کے لیے اپنی مرضی کے مطابق لڑکی منتخب کرنے کی آزادی نہیں مِل سکتی، پردے کی افادیت کو کم یا اس کی پابندی کو ترک کرنے کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ بلکہ اگر ہر لڑکے کو لڑکی کے انتخاب اور ہر لڑکی کو لڑکے کے انتخاب کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس سے اس قدر قبیح نتائج برآمد ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر خاندانی نظام جو کہ معاشرے کی مضبوطی اور پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ایک موہومہ مشکل کو حل کرتے کرتے بے شُمار حقیقی مشکلات کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا یہ خیال کہ باپردہ لڑکی وسعتِ نظر اور فراست سے بے بہرہ ہوتی ہے درست نہیں ہے۔ اور اگر اسے بالفرض درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں پردے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک لڑکی باپردہ رہ کر بھی علم وفن میں کمال پیدا کر سکتی ہے، اور اس کے مقابلے میں پردے سے باہر ہو کر بھی ایک لڑکی علم وعقل اور فراست وبصیرت سے کوری رہ سکتی ہے۔ البتہ بے پردہ لڑکی کو یہ فوقیت ضرور ہوگی کہ وہ معلومات کے لحاظ سے چاہے وسیع النظر نہ ہو لیکن تعلقات کے لحاظ سے. اس کی نگاہیں ضرور پھیل جائیں گی۔ ایسی حالت میں اگر موزوں ترین رفیقِ حیات کی تلاش میں کامیابی ہو بھی جائے تب بھی جو نگاہیں وسعت کی عادی ہو چکی ہوں، انھیں سمیٹ کر ایک مرکز تک محدود رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۷۴-۷۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پردہ اور پسند کی شادی

سوال: آپ کا جواب ملا، مگر مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ آپ نے اسے بالکل معمولی مسئلہ قرار دیا، کامیاب شادی کی تمنا تو ایک جائز خواہش ہے اور ایسے حالات پیدا کرنا، جن کی وجہ سے ایک شخص کے لیے اپنی پسند کی لڑکی چننے کا راستہ بند ہو جائے، میں انسانی مسرّت اور شخصیت کے ارتقاء کے لیے مُضِر سمجھتا ہوں اور دینِ فطرت کے منافی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ہمارے مروجہ طریقے کے مطابق عورت زیادہ سے زیادہ گھر کی منتظم ہوتی ہے اور خاوند کی اور اپنی جنسی تسکین کا ایک ذریعہ، لیکن دو افراد کے اپنے آپ کو پوری طرح ایک دوسرے کے حوالہ کرنے اور زندگی کے فرائض ایک بار کی بجائے خوشی خوشی پورا کرنے کے جو امکانات اپنی پسند اور ذوق کی شادی کر لینے میں ہوتے ہیں وہ اِس صورت میں قطعاً ممکن نہیں کہ اپنی پسند اور بصیرت استعمال کیے بغیر کسی دوسرے کے انتخاب پر شادی کر لی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ایک نوجوان محض جنسی تسکین کا خواہش مند نہیں ہوتا، وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کے لیے کچھ قربانی کرے، کسی سے محبت کرے، کسی کی خوشی کا خیال رکھے اور کوئی اس کی خوشی پر خوش ہو۔ اس جذبے کے فطری نکاس کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جسے اس نے تعلیم، اطوار، کردار اور دوسری خوبیوں کی بنا پر اپنی طبیعت کے مطابق حاصل کیا ہے (حقیقی محبت کسی کی باطنی خوبیوں کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ شکل دیکھ لینے سے) اور یہ بات ناممکنات میں ہے کہ پہلے تو کسی کی شادی کرادی جائے اور پھر اس سے مطالبہ کیا جائے کہ اب اسے ہی چاہو اور یوں جیسے تم نے اس کو خود پسند کیا ہے۔ اس فطری محبت کا راستہ بند کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ اپنے لیے دوسرے راستے نکال لیتا ہے۔

پردے کی وجہ سے جو حالات پیدا ہیں، اِن میں حقیقتاً کردار دیکھ کر بَر تلاش کرنا ممکن نہیں۔ لڑکے کے باپ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ لڑکی کا پتہ چلا سکے، لڑکی کی والدہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لڑکے کے متعلق براہِ راست کچھ اندازہ لگا سکے، کیونکہ پردے کی وجہ سے اِن افراد میں بھی تعلق اور آزادانہ گفتگو ناممکن ہے (خود لڑکے اور لڑکی کا ملنا تو ایک طرف رہا) بڑی سے بڑی آزادی جو اسلام نے دی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کی شکل دیکھ لے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کی شکل چند سیکنڈ دیکھ لینے سے کیا ہو جاتا ہے۔

اِس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اب تو تمام علما نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ موجودہ تمدّنی ضروریات پوری کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا عورتوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کام کر سکتی ہے۔ یا تو اِسلامی احکام کی پابندی کریں یا علم حاصل کریں۔ پردے کی پابند ہوتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ طبقات الارض، آثارِ قدیمہ، انجینئرنگ اور تمام ایسے علوم جن میں سروے اور دور دراز سفر کی ضرورت ہوتی ہے، اِن علوم کے لیے خواتین کس طرح کام کر سکتی ہیں۔ جب کہ محرم کے بغیر عورت کا تین دِن سے زائد کی مسافت پر نکلنا منع ہے۔ اب کیا ہر جگہ وہ اپنے ساتھ مُحرم کو لیے پھرے گی؟

یہ علوم تو ایک طرف رہے، میں تو ڈاکٹری اور پردے کو بھی ایک دوسرے کی ضد سمجھتا ہوں۔ اول تو ڈاکٹری کی تعلیم ہی جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جسمانیات کی نگاہیں پھیلانے والی معلومات سے پُر ہوتی ہے، حیا کے اِس احساس کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے جس کی مشرقی عورتوں سے توقع کی جاتی ہے، خواہ وہ ڈاکٹری پردے ہی میں سیکھی جائے اور پڑھانے والی تمام خواتین میں کیوں نہ ہوں۔ دوم ڈاکٹر بننے پر ایک خاتون کو مریضوں کے لواحقین سے روابط کی اِس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے غیر مَردوں سے بات چیت پر قدغن لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس کے پیشِ نظر اگر ہم خواتین کو ڈاکٹر بننے سے روکتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے گھروں کی مریض خواتین کے ہر مرض کے علاج کے لیے مَرد ڈاکٹروں کی خدمات کی ضرورت پڑے گی اور رائج الوقت نظریۂ حیا کے مطابق یہ تو اِس سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جائے گا۔

جنابِ عالی! آپ مجھے یہ بتائیں کہ ان معاشرتی اور تمدّنی اُلجھنوں کا اسلامی احکامات کی پابندی کرتے ہوئے کیا حل ہے؟

(ج) شادی کے معاملے میں آپ نے جو اُلجھن بیان کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہی سہی، اس کا حل کورٹ شپ کے سوا اور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس تفصیل کے ساتھ رفیقِ زندگی بنانے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے کے اوصاف، مزاج، عادات، خصائل اور ذوق و ذہن سے واقف ہونے کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہیں، ایسی تفصیلی واقفیت دو چار ملاقاتوں میں اور وہ بھی رشتہ داروں کی موجودگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لیے مہینوں ایک دوسرے کے ساتھ ملنا، تنہائی میں بات چیت کرنا، سیر تفریح، سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف دوستی کی حد تک تعلقات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ کیا واقعی آپ یہی چاہتے ہیں کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اس اختلاط کے مواقع بہم پہنچنے چاہییں۔ آپ کے خیال میں اِن جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اندر اُن معصوم فلسفیوں کا فی صدی تناسب کیا ہوگا جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ صرف رفیقِ زندگی کی تلاش میں یہ مخلصانہ تحقیقاتی روابط قائم کریں گے۔ اور اس دوران میں شادی ہونے تک اس طبعی جذب و انجذاب کو قابو میں رکھیں گے جو خصوصیت کے ساتھ نوجوانی کی حالت میں عورت اور مَرد ایک دوسرے کے لیے اپنے اندر رکھتے ہیں؟ بحث برائے بحث اگر آپ نہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ شاید دو تین فی صدی سے زیادہ ایسے لوگوں کا اوسط ہماری آبادی میں نہ نکلے گا۔ باقی اس امتحانی دور ہی میں فطرت کے تقاضے پورے کر چکے ہوں گے اور وہ دو تین فیصدی جو اس سے بچ نکلیں گے وہ بھی اس شُبہ سے نہ بچ سکیں گے کہ شاید وہ باہم ملوث ہو چکے ہوں۔

پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لڑکا اور لڑکی جو اس تلاش و تحقیق کے لیے باہم خلا ملا کریں گے وہ لازماً ایک دوسرے کو رفاقت کے لیے منتخب ہی کر لیں گے، ہو سکتا ہے کہ ۲۰ فی صدی دوستیوں کا نتیجہ نکاح کی صورت میں برآمد ہو ۸۰ فی صدی یا کم از کم ۵۰ فی صدی کو دوسرے یا تیسرے تجربے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس صورت میں ان 'تعلقات' کی کیا پوزیشن ہوگی جو دورانِ تجربہ میں آئندہ نکاح کی اُمید پر پیدا ہو گئے تھے اور ان شُبہات کے کیا اثرات ہوں گے جو 'تعلقات' نہ ہونے کے باوجود ان کے متعلق معاشرے میں پیدا ہو جائیں گے؟

پھر آپ یہ بھی مانیں گے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ان مواقع کے دروازے کھولنے کے بعد انتخاب کا میدان لامحالہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ ایک لڑکے کے لیے صرف ایک ہی ایک لڑکی مطمحِ نظر نہ ہوگی جس پر وہ اپنی نگاہِ انتخاب مرکوز کر کے تحقیق و

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امتحان کے مراحل طے کرے گا اور علیٰ ہٰذا القیاس لڑکیوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک ہی ایک لڑکا، امکانی شوہر کی حیثیت سے زیر امتحان نہ ہوگا۔ بلکہ شادی کی منڈی میں ہر طرف ایک سے ایک جاذبِ نظر مال موجود ہوگا جو امتحانی مراحل سے گزرتے ہوئے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے سامنے بہتر انتخاب کے امکانات پیش کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے اس امر کے امکانات روز بروز کم ہوتے جائیں گے کہ ابتداً جو دو فرد ایک دوسرے سے آزمایشی ملاقاتیں کریں وہ آخر وقت تک اپنی اس آزمایش کو نباہیں اور بالآخر ان کی آزمایش شادی پر منتج ہو۔

اس کے علاوہ یہ ایک فطری امر ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ جو رومانی طرز کا کورٹ شپ کرتے ہیں اِن میں دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے روشن پہلو ہی دکھاتے ہیں۔ مہینوں کی ملاقاتوں اور گہری دوستی کے باوجود اِن کے کمزور پہلو ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح نہیں آتے۔ اس دوران میں شہوانی کشش اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے شادی کر لینا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لیے دونوں ایک دوسرے سے ایسے ایسے پیمانِ وفا باندھتے ہیں، اتنی محبت اور گرویدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ شادی کے بعد معاملات کی زندگی میں وہ عاشق و معشوق کے اِس پارٹ کو زیادہ دیر تک کسی طرح نہیں نباہ سکتے۔ یہاں تک کہ جلدی ہی ایک دوسرے سے مایوس ہو کر طلاق کی نوبت آجاتی ہے، کیونکہ دونوں اِن توقعات کو پورا نہیں کر سکتے جو عشق و محبت کے دَور میں انھوں نے باہم قائم کی تھیں۔ اور دونوں کے سامنے ایک دوسرے کے وہ کمزور پہلو آجاتے ہیں جو معاملات کی زندگی ہی میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ عشق و محبت کے دَور میں کبھی نہیں کھلتے۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ نے جن مشکلات کا ذِکر کیا ہے، ان کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ اسی بات کو سمجھ لیں کہ فطرت نے عورت اور مَرد کے دائرۂ کار الگ رکھے ہیں۔ اپنے دائرۂ کار کے فرائض انجام دینے کے لیے عورت کو جس بہتر سے بہتر تعلیم کی ضرورت ہے وہ اسے ضرور ملنی چاہیے اور اِسلامی حدود میں وہ پوری طرح دی جاسکتی ہے۔ اِسی طرح عورت کے لیے ایسی علمی و ذہنی ترقی بھی اِن حدود کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جو عورت کو اپنے دائرۂ کار کے فرائض انجام دیتے ہوئے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں کوئی انتظام نہ کرنا مسلمانوں کی کوتاہی ہے نہ کہ اِسلام کی۔ لیکن وہ تعلیم جو مَرد کے دائرۂ کار کے لیے عورت کو تیار کرے عورت ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اور اس کی گنجایش اِسلام میں نہیں ہے۔ (اِس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے آپ میری کتاب پردہ کو بغور ملاحظہ فرمائیں)

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۷۴-۷۷)

پردے کا مسئلہ سمجھنے میں حائل رکاوٹیں

...... دنیا ہزاروں سال سے تمدن میں عورت کا -- یعنی عالمِ انسانی کے پورے نصف حصے کا -- مقام متعین کرنے میں ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ کبھی افراط کی طرف جاتی ہے اور کبھی تفریط کی طرف اور یہ دونوں انتہائیں اس کے لیے نقصان دِہ ثابت ہوئی ہیں۔ تجربات اور مشاہدات اِس نقصان پر شاہد ہیں۔ اِن انتہاؤں کے درمیان عدل و توسُّط کا مقام، جو عقل و فطرت کے عین مطابق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور انسانی ضروریات کے لیے عین مناسب ہے، وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں متعدد ایسے موانع پیدا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لیے اس صراطِ مستقیم کو سمجھنا اور اس کی قدر کرنا مشکل ہوگیا ہے......

یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو ثابت شدہ علمی حقائق کے خلاف ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو کچھ علمی حقیقت ہے وہی عین اسلام ہے۔ مگر اس کو دیکھنے کے لیے بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکے۔ وسیع نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کے تمام پہلوؤں کو دیکھ سکے، کھلے دل اور سلیم فطرت کی ضرورت ہے تاکہ حقائق جیسے کچھ بھی ہوں ان کو ویسا ہی تسلیم کرے اور اپنے رجحانات کے تابع بنانے کے بجائے رجحاناتِ نفس کو ان کے تابع کردے۔ جہاں یہ چیز نہ ہو وہاں اگر علم ہو بھی تو بیکار ہے۔

دنیائے مغرب کے لیے اسلام کو سمجھنا اسی لیے مشکل ہوگیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اُس کے پاس جتنا بھی 'علم'[۱] ہے وہ سب کا سب 'اسلام' ہے۔ مگر خود اس کی اپنی نگاہ رنگین ہے۔ پھر یہی رنگ 'یرقانِ ابیض' بن کر مشرق کے نئے تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہ پر چھا گیا ہے اور یہ بیماری ان کو بھی حقائقِ علمیہ سے صحیح نتائج نکالنے اور مسائلِ حیات کو فطری نگاہ سے دیکھنے میں مانع ہوتی ہے......

دوسری وجہ جو فہمِ صحیح میں مانع ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ جب اسلام کے کسی مسئلے پر غور کرتے ہیں تو اس نظام اور سسٹم پر بہ حیثیتِ مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ نظام سے الگ کر کے مجرد اُس خاص مسئلے کو زیرِ بحث لے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے اور اس میں طرح طرح کے شکوک ہونے لگتے ہیں......

'پردہ' کا مسئلہ بھی اسی کا شکار ہوا ہے۔ اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔ آپ کو اس کا قیام تمام حکمتوں سے خالی نظر آئے گا۔ آپ کبھی نہ سمجھیں گے کہ انجینئر نے عمارت کو سنبھالنے کے لیے کس تناسب اور موزونیت کے ساتھ اس کو لگایا ہے اور اس کو گرا دینے سے پوری عمارت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ بالکل ایسی ہی مثال پردے کی ہے۔ جب وہ اس نظامِ معاشرت سے الگ کر لیا جائے گا جس میں وہ عمارت کے ستون کی طرح ایک ضرورت اور مناسبت کو ملحوظ رکھ کر نصب کیا گیا ہے تو وہ تمام حکمتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی جو اس سے وابستہ ہیں اور یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آسکے گی کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان یہ امتیازی حدود آخر کیوں قائم کیے گئے ہیں۔ پس ستون کی حکمتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پوری عمارت کو دیکھ لیا جائے جس میں وہ نصب کیا گیا ہے۔

اب اسلام کا حقیقی پردہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ نظامِ معاشرت بھی آپ کے سامنے ہے جس کی حفاظت کے لیے پردے کے ضوابط مقرر کیے گئے ہیں۔ اس نظام کے وہ تمام ارکان بھی آپ کے سامنے ہیں جن کے ساتھ ایک خاص توازن کو ملحوظ

۱۔ علم یعنی حقیقت کا علم، نہ کہ نظریات اور حقائق سے اخذ کردہ نتائج۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رکھ کر پردہ کارُکن مربوط کیا گیا ہے۔ وہ تمام ثابت شُدہ علمی حقائق بھی آپ کے سامنے ہیں جن پر اس پورے نظامِ معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے۔ اِن سب کو دیکھ لینے کے بعد فرمایئے کہ اِس میں کہاں آپ کوئی کمزوری پاتے ہیں؟ کس جگہ بے اعتدالی کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ کون سا مقام ایسا ہے جہاں -- کسی خاص گروہ کے رجحان سے قطعِ نظر محض علمی و عقلی بنیادوں پر...... کوئی اصلاح تجویز کی جا سکتی ہو؟ میں علیٰ وجہِ البصیرت کہتا ہوں کہ زمین اور آسمان جس عدل پر قائم ہیں، کائنات کے نظم میں جو کمال درجہ کا تسویہ پایا جاتا ہے، ایک ذرّہ کی ترکیب اور نظامِ شمسی کی بندش میں جیسا مکمل توازن و تناسب آپ دیکھتے ہیں، ویسا ہی عدل و تسویہ اور توازن و تناسب اس نظامِ معاشرت میں بھی موجود ہے۔ افراط اور تفریط اور یک رُخی جو انسانی کاموں کی ناگزیر کمزوری ہے، اُس سے یہ نظام یکسر خالی ہے۔ اِس میں اصلاح تجویز کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ انسان اپنی عقلِ خام کی مداخلت سے اگر اس میں کوئی ادنیٰ ردّ و بدل بھی کرے گا تو اس کی اصلاح نہ کرے گا بلکہ اس کے توازن کو بگاڑ دے گا......

اِسلامی قوانینِ معاشرت میں تخفیف

ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مسلمان بھائی اِن تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جو اُوپر بیان کی گئی ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ اِسلام کے قوانین میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی تو کافی گنجایش ہے جس سے تم خود بھی شاید انکار نہیں کر سکتے۔ پس ہماری خواہش صِرف اس قدر ہے کہ اسی گنجایش سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ موجودہ زمانے کے حالات پردے میں تخفیف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں مدرسوں اور کالجوں میں جائیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ایسی تربیّت حاصل کریں جس سے وہ ملک کے تمدّنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اِس کے بغیر مسلمان زندگی کی دَوڑ میں ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہے جاتے ہیں۔ اور آگے چل کر اندیشہ ہے کہ اور زیادہ نقصان اُٹھائیں گے۔ ملک کی سیاسی زندگی میں عورتوں کو جو حقوق دیے جا رہے ہیں اگر اِن سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت مسلمان عورتوں میں پیدا نہ ہوئی اور پردے کی قیود کے سبب سے وہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں تو ملک کے سیاسی ترازو میں مسلمانوں کا وزن بہت کم رہ جائے گا۔ دیکھو، دنیائے اِسلام کی ترقی یافتہ اقوام، مثلاً ٹرکی اور ایران نے بھی زمانے کے حالات کو دیکھ کر اِسلامی حجاب میں بہت کچھ تخفیف[1] کر دی ہے۔ اور اس سے چند ہی سال کے اندر نمایاں فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اگر ہم بھی اُنھی کے نقشِ قدم پر چلیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے؟

یہ جتنے خطرات بیان کیے جاتے ہیں۔ ہم اُن سب کو جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اگر خطرات کی فہرست میں اِس سے دس گنا اور اضافہ ہو جائے تب بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ بہر حال اس نوعیّت کے کسی خطرے کی بنا پر بھی اِسلام کے قانون میں ترمیم یا تخفیف جائز نہیں ہو سکتی......

۱- تخفیف: یہ لفظ محض بحث کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ دراصل وہاں تخفیف نہیں 'تنسیخ' کی گئی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِس میں شک نہیں کہ ہر قانون کی طرح اِسلامی قانون میں بھی حالات کے لحاظ سے شدّت اور تخفیف کی گنجایش ہے، مگر ہر قانون کی طرح اِسلامی قانون بھی اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ شدت یا تخفیف کا فیصلہ کرنے کے لیے حالات کو اُسی نظر سے اور اُسی اسپرٹ میں دیکھا جائے جو اِسلام کی نظر اور اِسلام کی اسپرٹ ہے۔ کسی مختلف نقطۂ نگاہ سے حالات کو دیکھنا اور پھر تخفیف کی قینچی لے کر دفعاتِ قانون پر حملہ آور ہو جانا تخفیف کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ یہ سادہ اور صریح تحریف ہے۔ جن حالات کو غیر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھ کر قانونِ اِسلامی میں 'تخفیف' کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، ان کو اگر اِسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ایسے حالات میں تخفیف کی نہیں، بلکہ مزید شدت کی ضرورت ہے۔ تخفیف صِرف اس وقت کی جاسکتی ہے جبکہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے بآسانی پورے ہو جاتے ہوں اور تحفظات میں زیادہ سختی کی حاجت نہ ہو۔ مگر جبکہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے نہ پورے ہو رہے ہوں، بلکہ دوسری تمام قوتیں ان کو ضائع کرنے میں لگی ہوئی ہوں اور ان کے مقاصد کے حصول کا تمام تر مدار صِرف تحفظات پر ہی آٹھہرا ہو تو ایسی حالت میں صِرف وہی شخص تخفیف کا خیال کرسکتا ہے جو قانون کی اسپرٹ سے قطعی نابلد ہو۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۵۰-۳۵۸)

اِسلامی نظامِ معاشرت کی حفاظت کا آخری چارۂ کار

پچھلے اوراق میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں کہ اِسلامی قانونِ معاشرت کا مقصد ضابطۂ ازدواج کی حفاظت، صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے۔ اِس غرض کے لیے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک اصلاحِ اخلاق۔ دوسرے تعزیری قوانین۔ تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر وحجاب۔ یہ گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے، جن کے استحکام پر اِس عمارت کا استحکام منحصر ہے اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے۔ آیئے اب اپنے ملک کے موجودہ حالات پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے کہ ان تینوں ستونوں کا آپ کے ہاں کیا حال ہے؟

پہلے اپنے اخلاقی ماحول کو لیجیے۔ آپ اُس ملک میں رہتے ہیں جس پر ایک غیر مسلم تہذیب آندھی اور طوفان کی طرح چھائی چلی جارہی ہے[1]۔ پلیگ اور ہیضہ کے جراثیم کی طرح غیر اسلامی اخلاق کے اُصول اور غیر اِسلامی تہذیب کے تخیلات تمام فضا میں پھیل گئے ہیں۔ آب وہوا ان سے مسموم ہوچکی ہے۔ ان کی سمیّت نے ہر طرف سے آپ کا احاطہ کرلیا ہے۔ فحش اور بے حیائی کی جن باتوں کے خیال سے بھی چند سال پہلے تک آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے وہ اب اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ آپ انھیں روزمرّہ کے معمولات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے بچے تک اخباروں اور رسالوں اور اشتہاروں میں فحش تصویریں روز دیکھتے ہیں اور بے حیائی کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کے بوڑھے اور جوان اور بچے سب کے سب سینما دیکھ رہے ہیں جہاں عُریانی اور بے حیائی اور شہوانی محبت سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ باپ اور بیٹے، بھائی اور بہنیں، مائیں اور بیٹیاں، سب

۱- قیامِ پاکستان سے پہلے کے حالات کی طرف اشارہ ہے۔ [لیکن موجودہ پاکستان کی حالت اُس سے بھی زیادہ بدتر ہے]۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر علانیہ بوس و کنار اور اختلاط و ملاعبت کے مناظر دیکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے[1]۔ انتہا درجہ کے گندے اور ہیجان انگیز گیت گھر گھر اور دکان دکان بج رہے ہیں اور کسی کے کان ان آوازوں سے محفوظ نہیں۔ ہندی اور فرنگی اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین نیم عریاں لباسوں کے ساتھ پھر رہی ہیں اور ننگا ہیں اُن لباسوں کی اس قدر خوگر ہو چکی ہیں کہ کوئی شخص ان میں کسی قسم کی بے حیائی محسوس نہیں کرتا۔ اخلاق کے جو تصورات مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ پھیل رہے ہیں اُن کی بدولت نِکاح کو ایک فرسودہ رسم، زِنا کو ایک تفریح، مَردوں اور عورتوں کے اختلاط کو ایک ناقابلِ اعتراض بلکہ مستحسن چیز، طلاق کو ایک کھیل، ازدواجی فرائض کو ایک ناقابلِ برداشت بندھن، توالد و تناسُل کو ایک حماقت، شوہر کی اطاعت کو ایک نوع کی غلامی، بیوی بننے کو ایک مصیبت اور معشوق بننے کو ایک خیالی جنت سمجھا رہا ہے۔

پھر دیکھیے کہ اس ماحول کے اثرات آپ کی قوم پر کیا پڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کی سوسائٹی میں اب غضِ بصر کا کہیں وجود ہے؟ کیا لاکھوں میں ایک آدمی بھی کہیں ایسا پایا جاتا ہے جو اجنبی عورتوں کے حسن سے آنکھیں سینکنے میں باک کرتا ہو؟ کیا علانیہ آنکھ اور زبان کی زنا نہیں کی جارہی ہے؟ کیا آپ کی عورتیں بھی تبرُّجِ جاہلیہ اور اظہارِ زینت اور نمائشِ حسن سے پرہیز کر رہی ہیں؟ کیا آپ اپنی بہنوں اور بیٹیوں اور ماؤں کو وہ لباس پہنے نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو مسلمان عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں پہن سکتی۔ کیا آپ کی سوسائٹی میں فحش قصے اور عشق و محبت کے گندے واقعات بے تکلفی کے ساتھ کہے اور سنے نہیں جاتے؟ کیا آپ کی محفلوں میں لوگ خود اپنی بدکاری کے حالات بیان کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس کرتے ہیں؟ جب حال یہ ہے تو فرمایئے کہ طہارتِ اخلاق کا وہ پہلا اور سب سے زیادہ مستحکم ستون کہاں باقی رہا جس پر اسلامی معاشرت کا ایوان تعمیر کیا گیا تھا؟ اِسلامی غیرت تو اب اس حد تک مٹ چکی ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمانوں ہی کے نہیں کفّار کے ناجائز تصرّف میں آرہی ہیں۔ انگریزی حکومت میں نہیں، مسلمان ریاستوں تک میں اس قسم کے واقعات علیٰ روس الاشہاد پیش آرہے ہیں۔ مسلمان ان واقعات کو دیکھتے ہیں اور ان کے خون متحرک نہیں ہوتے۔ ایسے بے غیرت مسلمان بھی دیکھے گئے ہیں جن کی اپنی بہنیں کسی غیر مسلم کے تصرّف میں آئیں اور انھوں نے فخریہ اس کا اظہار کیا کہ ہم فلاں بڑے کافر کے برادرِ نسبتی ہیں[2]۔ کیا اس کے بعد بھی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے۔

اب ذرا دوسرے ستون کا حال بھی دیکھیے۔ تمام ہندوستان[3] سے اِسلامی تعزیرات کا پورا قانون مٹ چکا ہے۔ زنا اور قذف کی حد نہ مسلمان ریاستوں میں جاری ہوتی ہے نہ برٹش انڈیا میں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو قانون اس وقت ملک میں نافذ

۱- اور اب تو وی سی آر، ڈش انٹینا، کیبل اور کمپیوٹر نے گھروں کو بھی سینماؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ (مرتب)

۲- یہ واقعہ جنوبی ہند کا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک واقعہ سنایا۔ مشرقی ہند میں ایک نام کی مسلمان عورت ایک بڑے دولت مند غیر مسلم کے ساتھ علانیہ تعلق رکھتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس نے بہت بڑی جایداد حاصل کی ہے۔ میرے دوست کا بیان ہے کہ انھوں نے بارہا مقامی مسلمانوں -- نام نہاد مسلمانوں -- کو اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے دیکھا ہے کہ غیر مسلم کے پاس سے 'مسلمانوں' میں اتنی بڑی دولت آ گئی ہے۔

۳- واضح رہے کہ یہ کتاب تقسیم ہند سے پہلے لکھی گئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد بھی صورتِ واقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی (ناشر)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے وہ سرے سے زنا کو جرم ہی نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شریف بہو بیٹی کو کوئی شخص بہکا کر بدکار بنانا چاہے تو آپ کے پاس کوئی قانونی ذریعہ ایسا نہیں ہے، جس سے اس کی عصمت محفوظ رکھ سکیں۔ اگر کوئی شخص کسی بالغ عورت پر اس کی رضامندی سے ناجائز تصرّف کرے تو آپ کسی قانون کے ذریعے سے اس کو سزا نہیں دلوا سکتے۔ اگر کوئی عورت علانیہ فحش کاری پر اتر آئے تو آپ کے پاس کوئی قوت ایسی نہیں جس سے آپ اس کو روک سکیں۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم ٹھہراتا ہے۔ مگر جو لوگ قانون پیشہ ہیں ان سے پوچھیے کہ زنا بالجبر کا ثبوت کس قدر مشکل ہے۔ منکوحہ عورت کو بھگا لے جانا بھی جرم ہے۔ مگر انگریزی قانون جاننے والوں سے دریافت کیجیے کہ اگر منکوحہ عورت خود اپنی رضامندی سے کسی کے گھر جا پڑے تو اس کے لیے آپ کے فرماں رواؤں کی عدالت میں کیا چارۂ کار ہے؟

غور کیجیے! یہ دونوں ستون منہدم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کے نظامِ معاشرت کی پوری عمارت صرف ایک ستون پر قائم ہے۔ کیا آپ اسے بھی مسمار کر دینا چاہتے ہیں؟ ایک طرف پردے کے وہ نقصانات ہیں جن کو آپ نے اُوپر گنایا ہے۔ دوسری طرف پردہ اُٹھا دینے میں اخلاق اور نظامِ معاشرت کی کامل تباہی ہے۔ دونوں کے درمیان موازنہ کیجیے۔ مصیبتیں دونوں ہیں اور ایک کو بہر حال قبول کرنا ہے۔ اب آپ خود ہی اپنے دِل سے فتویٰ طلب کیجیے کہ ان میں سے کون سی مصیبت کم تر ہے؟

پس اگر احوالِ زمانہ ہی پر فیصلہ کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ یہاں کے احوال پردے کی تخفیف کے نہیں اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں۔ کیونکہ آپ کے نظامِ معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دار و مدار ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھیے، غور کیجیے، اِسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں۔ مگر اس بچے کھچے ستون کو، جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے اور زیادہ کمزور نہ بنایئے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لیے دو آنکھیں موجود ہوں وہیں اُن آنکھوں کو نکال لینے کے لیے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۵۰-۳۶۳)

.........OOO.........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

قانونِ ازدواج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

فصل اوّل

قانونِ ازدواج کے مقاصد

قانون کی تفصیلات سے پہلے مقاصدِ قانون کو سمجھ لینا ضروری ہے، کیونکہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لیے اصول مقرر کیے جاتے ہیں اور اصولوں کے ماتحت احکام دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھے بغیر احکام نافذ کرے گا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزئی مسئلے میں وہ ایسا حکم نافذ کر دے، جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اِسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہوگا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اِس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہٰذا ہم پہلے اُن مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لیے اِسلام میں ازدواج کا قانون مقرر کیا گیا ہے۔

اخلاق وعفت کی حفاظت

اِسلامی قانون ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطے کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدّن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اِسی لیے قرآنِ مجید میں نِکاح کو لفظِ احصان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حِصن قلعے کو کہتے ہیں اور احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مَرد نِکاح کرتا ہے وہ 'مُحصِن' ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نِکاح کیا جاتا ہے وہ 'مُحصَنہ' ہے۔ یعنی اِس قلعہ کی حفاظت میں آ گئی ہے جو نِکاح کی صورت میں اُس کے نفس اور اُس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اِسلام میں نِکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفّظ ہے اور قانونِ ازدواج کا پہلا کام اُس قلعے کو مستحکم کرنا ہے جو نِکاح کی صورت میں اس گراں قدر چیز کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید کہتا ہے:

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ (النسآء ۴:۲۴) (یہ عورتیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں) ان کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئی ہیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لیے نہیں، بلکہ قیدِ نکاح میں لانے کے لیے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

پھر عورتوں کے لیے کہتا ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ (النسآء ۴:۲۵) پس تم اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نِکاح کرو اور مناسب طور پر اُن کے مَہر ادا کرو تا کہ وہ محصنات بنیں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں۔

دُوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ...... وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ (المائدہ ۵:۵) آج تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کی گئیں ...... اور باعفت مومن عورتیں اور باعفت وہ عورتیں جو اہلِ کتاب میں سے ہوں جب کہ تم اُن کے مَہر ادا کر کے قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات پیدا کرنے والے۔

اِن آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِسلام کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اِس چیز کی ہے کہ مَرد اور عورت کے ازدواجی تعلق میں اِحصان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر دوسری غرض کو تو قربان کیا جا سکتا ہے، مگر کسی دُوسری غرض کے لیے اِس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لیے مقید کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطری خواہشات پوری کریں۔ لیکن اگر کسی قیدِ نکاح میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں، جن سے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو بجائے اِس کے کہ نکاح کی ظاہری قید کو برقرار رکھنے کے لیے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر ایسی قیدِ نکاح کو قربان کر دیا جائے۔ اِسی لیے اِیلا کرنے والوں کو حُکم دیا گیا کہ چار مہینے سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں اور اگر وہ چار مہینے کی مدّت گزرنے پر بھی رُجوع نہ کریں تو انھیں ایسی عورت کو نکاح میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس سے وہ ہم بستر نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ عورت اپنے داعیاتِ فطرت کو پورا کرنے کے لیے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو گی، جسے اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں اُن کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ [النسآء ۴:۱۲۹] یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اِس طرح نہ جھک پڑو کہ دُوسری عورت گویا معلّق رہ جائے۔ اِس حُکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ کوئی عورت اَیسی حالت میں مبتلا نہ ہونے پائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو۔ اَیسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رکھنے سے بہتر ہے کہ اِس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو جائے۔ پھر عورت کو خُلع کا حق بھی اِسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ ایک عورت کا کسی اَیسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش نہ ہو، یا جس سے اُس کے نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو، اُس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیتا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے۔ اِس لیے اَیسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اُس کا مال، جو مَہر کی صورت میں اُسے مِلا تھا، یا اِس سے کم زیادہ دے کر قیدِ نکاح سے رہائی حاصل کر لے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مودّت ورحمت

دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازدواج کا تعلق مودّت ورحمت کی بنیاد پر ہو، تا کہ مناکحت سے تمدّن وتہذیب کے جو مقاصد متعلق ہیں اُن کو وہ اپنے اشتراکِ عمل سے بدرجۂ اَتم پورا کر سکیں اور اُن کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت ومسرّت اور سکون وآرام حاصل ہو سکے جس کا حصول انھیں تمدّن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوّت بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ قرآنِ مجید میں اِس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اِس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زوجیت کا تصوّر ہی مودّت ورحمت ہے۔ اور زوجین بنائے ہی اِس لیے گئے ہیں کہ وہ ایک دُوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً[1] (الروم ۳۰:۲۱) اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمھارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے ہیں تا کہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور اُس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا[2] (الاعراف ۷:۱۸۹) وہی ہے جس نے تم کو تنِ واحد سے پیدا کیا اور اِس کے لیے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا بنایا تا کہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

پھر ایک دوسرے پیرایہ میں زوجیت کے اِس تصوّر کو یوں پیش کیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ[3] (البقرۃ ۲:۱۸۷) وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس۔

یہاں زوجین کو ایک دُوسرے کا لباس کہا ہے۔ لباس وہ چیز ہے جو انسان کے جسم سے متصل رہتی ہے اور اس کی پردہ پوشی کرتی ہے اور اِس کو خارجی فضا کے مُضر اثرات سے بچاتی ہے۔ اِس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لیے استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اُن کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ اِن کے دِل اور اِن کی رُوحیں ایک دُوسرے کے ساتھ متصل ہوں، وہ ایک دُوسرے کی ستر پوشی کریں، اور ایک دُوسرے کو اُن اثرات سے بچائیں جو اُن کی عزّت اور اُن کے اخلاق پر حرف لانے والے ہوں۔ یہی مقتضی ہے مودّت ورحمت کا اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصلی روح ہے۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ رُوح نہیں ہے تو گویا وہ ایک بے جان لاش ہے۔ اِسلام میں ازدواجی تعلّقات کے لیے جو قوانین مقرر کیے گئے ہیں، اِن سب میں اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین اگر ایک دُوسرے کے ساتھ رہیں، تو صلح وآشتی، محبت اور دِلی یکجہتی کے ساتھ رہیں۔ ایک دُوسرے کے حقوق ادا کریں اور آپس کے تعلّقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں۔ لیکن وہ اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان کی یک جائی سے جُدائی بہتر ہے۔ کیونکہ مودّت ورحمت کی رُوح نِکل جانے کے بعد ازدواجی تعلّق ایک مُردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفونت پیدا ہو گی اور اِس سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خانگی زندگی کی ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے:

وَ اِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ٥ وَ اِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ‌ؕ (النسآء ۴: ۱۲۹-۱۳۰)

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دُوسرے سے زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر (یہ نہ ہو سکے) اور زوجین ایک دُوسرے سے جُدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانہ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرے گا۔

پھر جگہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ:

فَاِمۡسَاكٌ ۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌ ۢ بِاِحۡسَانٍ‌ؕ (البقرۃ ۲:۲۲۹) یا تو بھلے طریقے سے اِن کو اپنے پاس رکھا جائے یا احسان (خوش اسلوبی) کے ساتھ رُخصت کر دیا جائے۔

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ (الطلاق ۶۵:۲) یا تو بھلے طریقے سے ان کو اپنے پاس رکھو یا بھلے طریقے سے ان سے جُدا ہو جاؤ۔

وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ۚ (النسآء ۴:۱۹) اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح رہو۔

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ‌ وَّلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا‌ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ‌ؕ (البقرۃ ۲:۲۳۱) یا تو بھلے مانسوں کی طرح اِن کو رکھو یا بھلے مانسوں کی طرح رُخصت کر دو۔ محض ستانے کے لیے ان کو نہ روک رکھو کہ اِن کی حق تلفی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر خود ظلم کرے گا (یعنی اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنائے گا)۔

وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ‌ؕ (البقرۃ ۲:۲۳۷) اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو (یعنی فیاضی کا برتاؤ کرو)

طلاقِ رجعی کے احکام جہاں بیان کیے گئے ہیں وہاں رجوع کے لیے نیک نیتی کی شرط لگا دی گئی۔ یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو یہ حق تو ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رُجوع کر لے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی ہو نہ کہ ستانے اور لٹکائے رکھنے کی: وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا‌ؕ (البقرۃ ۲:۲۲۸) [ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران میں اُنھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں]۔

غیر مسلموں سے مناکحت کی قباحت، (مودّت و رحمت کا فقدان): یہی وجہ ہے کہ مسلمان مَردوں اور عورتوں کے لیے تمام اُن غیر مسلموں سے ازدواجی تعلق کو ممنوع کر دیا گیا ہے جو اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مذہب اپنے خیالات، اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے طور طریقوں میں مسلمانوں سے اِتنے مختلف ہیں کہ ایک حقیقی مسلمان کا دِلی محبت اور قلب و رُوح کی یک جہتی کے ساتھ اِن سے میل نہیں ہو سکتا۔ اگر اِس اختلاف کے باوجود وہ ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑے جائیں تو اُن کا ازدواجی رِشتہ کوئی صحیح تمدنی رِشتہ نہ ہو گا بلکہ محض ایک شہوانی رِشتہ بن جائے گا۔ اور اس میں یا تو مودّت و رحمت نہ ہو گی یا اگر ہو گی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے اور خود اِس مسلمان کے لیے مُفید ہونے کے بجائے اُلٹی مُضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ‌ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ‌ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ‌ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ‌ؕ (البقرۃ ۲:۲۲۱) مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند ہو اور مشرک مَردوں سے اپنی عورتوں کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مؤمن غلام ایک مشرک شریف زادے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔

اہلِ کتاب کے معاملے میں اگرچہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کر لیا جائے[1]۔ کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے، لیکن اس کو بھی اسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرما دیا اور ممانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی: اِنَّھَا لَا تُحْصِنُکَ[2]، وہ تجھے محصن نہیں بنا سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں دونوں کے درمیان وہ مودّت و رحمت نہ ہو گی جو احصان کی اصلی رُوح ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودیہ سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ اُسے چھوڑ دو۔ حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کتابیات سے نکاح کو بصراحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کراہیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ ، یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا جو اللہ اور اُس کے رسول کے مخالف ہوں۔ اور جب زوجین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نکاح کس کام کا؟

کفاءت، مودّت و رحمت کے لیے ایک بنیاد: خود مسلمانوں کے درمیان بھی شریعت یہ چاہتی ہے کہ ازدواجی تعلق ایسے مرد و عورت کے درمیان قائم ہو جن کے درمیان، غالب حال کے لحاظ سے، مودّت و رحمت کی توقع ہو اور جہاں یہ توقع نہ ہو وہاں رشتہ کرنا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح سے پہلے عورت کو دیکھ لینے کا حکم (یا کم از کم مشورہ) دیا ہے۔

اِذَا خَطَبَ اَحَدُکُمُ الْمَرْأَۃَ فَاِنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی مَا یَدْعُوْہُ اِلٰی نِکَاحِھَا فَلْیَفْعَلْ (ابوداؤد) جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو حتی الامکان اسے دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو اُس کو اس عورت سے نکاح کی رغبت دلانے والی ہو۔[3]

اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نکاح کے معاملے میں کفاءت (ہمسری) کو ملحوظ رکھنا پسند کرتی ہے اور غیر کُف میں نکاح کو مناسب نہیں سمجھتی۔ جو عورت اور مرد اپنے اخلاق میں، اپنی دین داری میں، اپنے خاندان کے طور طریقوں میں، اپنی معاشرت اور رہن سہن میں، ایک دُوسرے سے مشابہت یا کم از کم قریبی مماثلت رکھتے ہوں، اُن کے درمیان مودّت و رحمت کا رابطہ پیدا ہونا زیادہ متوقع ہے اور ان کے باہمی ازدواج سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں کے خاندان بھی اس رشتے کی وجہ سے

۱- اہلِ کتاب مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح پھر بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ عورت کی فطرت میں اثر پذیری اور قبولیت کا مادّہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی میں غیر مسلم شوہر کے ساتھ اس کے رہنے سے یہ خطرہ زیادہ ہے کہ وہ ان کا رنگ اختیار کر لے گی اور یہ توقع بہت کم ہے کہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ نیز اگر وہ اُن کا اثر قبول نہ کرے تو یہ امر یقینی ہے کہ اس کا یہ رشتہ محض ایک شہوانی رشتہ بن کر رہ جائے گا۔ نہ غیر مسلم شوہر سے وہ مودّت و رحمت کے ساتھ پیوستہ ہو سکے گی اور نہ غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی کے ساتھ اس کا کوئی مفید تمدنی رابطہ قائم ہو سکے گا۔

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۵۵

۳- ایضاً، ج ۵، ص ۲۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو سکیں گے۔ بخلاف اس کے جن کے درمیان یہ مماثلت موجود نہ ہو، اِن کے معاملہ میں زیادہ تر اندیشہ یہی ہے کہ وہ گھر کی زندگی میں اور اپنے قلبی و رُوحی تعلق میں، ایک دوسرے سے متصل نہ ہو سکیں گے اور اگر شخصاً میاں اور بیوی باہم متصل ہو بھی جائیں تو کم ہی یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ دونوں کے خاندان آپس میں مِل سکیں۔ شرعِ اسلامی میں مسئلہ کفاءت کی یہی اَصل ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانتِ اخلاق و عفّت کے بعد دُوسری چیز جو اِسلام کے قانونِ ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زَوجین کے دَرمیان مودّت و رحمت ہے۔ جب تک اُن کے تعلّقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی اُمید ہو، اِسلامی قانون اِن کے رِشتۂ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوّت صَرف کرتا ہے۔ مگر جب یہ مودت و رحمت باقی نہ رہے اور اِس کی جگہ بے دِلی، سرد مہری، نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے تو قانون کا مَیلان رِشتۂ نِکاح کی گرہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اِس قابل ہے کہ اِس کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ کیوں کہ جو لوگ اِس کو نظر انداز کر کے قانونِ اِسلام کے اُصولوں کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں وہ قدم قدم پر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۷-۲۸)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

قانونِ ازدواج کے اُصول

قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اِسلامی قانونِ ازدواج کی تدوین کن اُصولوں پر کی گئی ہے۔ اس لیے کہ جب تک اُصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں۔ جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصلِ اوّل: مَرد کی قوّامیت

اصولِ قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرّع ہوتے ہیں۔ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مَرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ [البقرہ ۲:۲۲۸] اِس درجے کی تشریح ہم کو اِس آیت میں ملتی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ (النسآء ۴:۳۴) مَرد عورتوں پر قوّام ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اِس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور اُن کی غیر موجودگی میں بتوفیقِ الٰہی اُن کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔

یہاں اِس بحث کا موقع نہیں کہ مَرد کو عورت پر فضیلت کِس بنا پر ہے اور اِس کو قوّام[1] کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں، فلسفۂ اجتماع کی بحث ہے۔ اپنے موضوعِ زیرِ بحث کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اِس اَمر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے بہر حال زَوجَین میں سے ایک کا قوّام اور صاحبِ اَمر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی دَرجہ اور مساوی اختیارات رکھنے والے ہوں تو بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ جیسا کہ فی الواقع اُن قوموں میں رونما ہو رہی ہے۔ جنھوں نے عملاً زَوجَین کے دَرمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے، اِس لیے کہ اِس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زَوجَین میں سے ایک کو قوّام اور صاحبِ اَمر اور دُوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا اور قوّامیت کے لیے اُس فریق کا انتخاب کیا جو فطرتاً یہی درجہ لے کر پیدا ہوا ہے[2]۔

۱- قوّام (sustainer, provider) حاکم، محافظ، سربراہ کار، معاملات کا منتظم اور نگران (proteetor)۔

۲- اِس بحث کو اگر کوئی صاحب مفصل دیکھنا چاہیں تو میری کتاب پردہ ملاحظہ فرمائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مَرد کے فرائض

پس اِسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس میں مَرد کی حیثیت قوّام کی ہے، اور اِس حیثیت میں اِس پر حسبِ ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱-مہر: یہ کہ وہ عورت کا مَہر ادا کرے۔ کیونکہ اِس کو عورت پر جو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ مَہر کا معاوضہ ہیں۔ اُوپر جو آیت نقل کی گئی ہے، اِس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مَرد ہی قوّامیت کا مستحق ہے مگر بالفعل یہ مرتبہ اُس کو اِس مال کے معاوضے میں ملتا ہے جو وہ مَہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے۔ اِس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے، مثلاً:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ (النسآء ۴:۴) اورعورتوں کے مَہر خوش دِلی کے ساتھ ادا کرو۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاۗءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْھُنَّ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِيْضَةً ۭ (النسآء ۴:۲۴) اِن محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمھارے لیے حلال کی گئیں تاکہ اپنے اَموال کے بدلے تم اِن کو حاصل کرنے کی خواہش کرو۔ قیدِ نِکاح میں لانے کے لیے نہ کہ آزاد شہوت رانی کے لیے۔ پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اُس کے بدلے میں قرارداد کے مطابق اِن کے مَہر ادا کرو۔

فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِهِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النسآء ۴:۲۵) پس لونڈیوں کے ساتھ اِن کے مالکوں کی اجازت سے نِکاح کرو اور مناسب طور پر اِن کے مَہر ادا کردو۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ (المائدة ۵:۵) اور حلال کی گئیں تمھارے لیے عزّت دار عورتیں مومنوں میں سے اور عزّت دار عورتیں اُن لوگوں میں سے جن کے پاس تم میں سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے، جب کہ تم اِن کے مَہر ادا کرلو۔

پس نِکاح کے وقت عورت اور مَرد کے دَرمیان مَہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اُس کو پورا کرنا مَرد پر لازم ہے۔ اگر وہ اِس قرارداد کو پورا کرنے سے اِنکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے رَوک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبک دوش ہونے کی کوئی صُورت مَرد کے لیے بجز اِس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اِس کو مہلت[1] دے۔ یا اِس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کردے، یا اِس پر احسان کر کے برضا و رغبت اپنے حق سے دَست بردار ہو جائے۔

۱۔ اسی کو مَہر مُؤجّل کہتے ہیں۔ مگر آج کل مَہر مؤجّل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ نِکاح کے وقت ہزاروں لاکھوں کی دستاویز یہ سمجھ کر لکھ دی جاتی ہے کہ ''کون لیتا ہے کون دیتا ہے'' گویا ابتدا ہی سے ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جائے وہ عند اللہ فاسد ہے۔ حقیقی مَہر مؤجّل وہ ہے جس میں واضح طور پر مدّت کا تعین کیا گیا ہو کہ مَرد اتنی مدّت میں اُسے ادا کرے گا۔ اور جس مَہر کی قرارداد میں مدّت کا تعین نہ ہو وہ عند الطلب (on demand) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اِن فقہا سے سخت اختلاف ہے جو ایسے مَہر کو شوہر کی وفات کے بعد واجب الادا بتاتے ہیں۔ گویا نکاح تو شوہر کرے اور مہر اس کے وارثوں پر عائد ہو۔ یہ چیز مذکورہ بالا آیاتِ قرآن کی رُوح کے بالکل خلاف ہے اور اس فتوے کے لیے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ○ (النسآء ۴:۴) پھر اگر وہ خوش دلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اُس کو مزے سے کھاؤ۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (النسآء ۴:۲۴) اور اگر تم قرارداد کے بعد اس میں کم زیادہ پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کرلو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نفقہ: شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے۔ قانونِ اسلام نے زوجین کے حدودِ عمل کی واضح طور پر تقسیم کر دی ہے۔ عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دینا ہے (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ)۔ اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لیے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر شوہر کو اپنی بیوی پر فضیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے اور یہ چیز قوامیت کے عین مفہوم میں داخل ہے۔ قوام کہتے ہی اُس شخص کو ہیں جو کسی شے کی نگہبانی اور خبر گیری کرنے والا ہو اور اس حیثیت سے اس شے پر اقتدار رکھتا ہو۔ قرآنِ مجید کی آیت اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ میں وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اُسی طرح نفقہ کا وُجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر شوہر اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اُس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورتِ انکار یا بصورتِ عدمِ استطاعت، اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقے کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآنِ مجید نے اس بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ، مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق۔ یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو، یا مال دار آدمی وہ نفقہ جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

ظلم سے اجتناب: مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اُس کو عورت پر جو ترجیحی حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں اُن کا ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً

ایلا: عورت کے داعیاتِ نفس کو پورا کرنے سے کسی عذرِ جائز کے بغیر اعراض[1] کرنا جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اِس کے لیے قانونِ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلقِ زن و شوہر قائم کرلے۔ ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ ۲:۲۲۶-۲۲۷) جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کرلیں تو اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

اِس سلسلے میں بعض فقہا نے حلف کی شرط لگائی ہے۔ یعنی اگر شوہر نے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلا

۱- عذرِ جائز سے مراد ہے مرد یا عورت کی بیماری۔ یا مرد کا حالتِ سفر میں ہونا یا کوئی ایسی صورت پیش آجانا جس میں مرد اپنی بیوی کی طرف رغبت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے کا موقع نہ ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا۔ لیکن اگر قسم نہیں کھائی، تو خواہ وہ بیوی سے ناراض ہو کر دس برس بھی اِس سے علیحدہ رہے تو اس پر ایلا کا اطلاق نہ ہوگا، لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے......[1]

ضِرار اور تعدّی: عورت سے رغبت نہ ہو، اُس کو رکھنا نہ چاہے، مگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے اُس کو رکھ چھوڑے۔ بار بار طلاق دے اور دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق سے پہلے رُجوع کر لے۔ قرآنِ مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ یہ بھی ظلم ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا (البقرۃ ۲:۲۳۱)اور ان کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے نہ روک رکھو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اُوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا مذاق نہ بنالو۔[2]

ضِرار اور تعدّی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اِس کو آزار پہنچائے گا۔ رُوحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا۔ ادنیٰ طبقہ کا ہوگا تو مار پیٹ اور گالم گلوچ کرے گا۔ اُونچے طبقے کا ہوگا تو تذلیل اور ایذا رسانی کے دُوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضِرار اور تعدّی کے الفاظ سب پر حاوی ہیں اور قرآنِ مجید کی رُو سے یہ سب افعال ممنوع ہیں۔

جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اِس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائز حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اِس مَرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

ازواج میں عدل نہ کرنا: متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا ظلم ہے۔ جسے قرآنِ مجید صاف الفاظ میں ناجائز ٹھہراتا ہے۔

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النسآء ۴:۱۲۹) کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو۔

قرآنِ مجید میں تعدّد ازواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص عدل نہ کرے تو اُسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں ہے۔ خود اِس آیت میں بھی جہاں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے صاف حکم

۱- دلائل کے لیے دیکھیے حقوق الزوجین، ص ۳۵-۳۸، اور تفہیم احکام القرآن بحث ایلا، جلد ہٰذا۔

۲- قانون کے الفاظ سے ایسا ناجائز فائدہ اُٹھانا جو قانون کے مقصد اور اُس کی رُوح کے خلاف ہو، دراصل قانون سے کھیلنا اور اُس کا مذاق بنانا ہے۔ قرآن میں مَرد کو ایک طلاق یا دو طلاق دے کر رجوع کر لینے کا جو حق دیا گیا ہے وہ صرف اِس غرض کے لیے ہے کہ اگر اس دَوران میں زوجین کے درمیان مصالحت ہو جائے اور ان کے باہم مل جُل کر رہنے کی کوئی صورت نکل آئے تو شریعت کی طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس گنجایش سے فائدہ اُٹھا کر طلاق دے۔ پھر عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لے۔ پھر طلاق دے اور پھر رجوع کر لے اور اس حرکت سے اس کی غرض یہ ہو کہ عورت کو خواہ مخواہ لٹکائے رکھے، نہ اپنے گھر میں بسائے اور نہ اُسے آزاد ہی کرے کہ بے چاری کہیں اور نکاح کر سکے تو یہ خدا کے قانون سے مسخرہ پن اور کھیل ہے، جس کی جرأت کوئی سچا مومن نہیں کر سکتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (النسآء ۴: ۳) پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔ یا لونڈی جو تمھارے قبضے میں ہو یہ زیادہ قرین مصلحت ہے تا کہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اَلَّا تَعُوْلُوْا کے معنی یہ کیے ہیں کہ تمھارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے لیکن یہ اصل لُغت کے خلاف ہے۔ لُغت میں عَول کے معنی مَیل کے ہیں۔ ابو طالب کا شعر ہے ؎

بمیزانِ صِدقٍ لا یَخِسُ شَعِیْرَةً
وَ وَزَّانُ قِسطٍ وَزْنُهٗ غَیْرُ عَائِلٍ

یہاں عائل بمعنی مائل مستعمل ہوا ہے۔ اسی بنا پر عَول کو جور اور طریقِ عدل سے ہٹ جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، حسن، مجاہد، شعبی، عِکرِمہ اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے لَا تَعُوْلُوْا کے معنی لَا تَمِیْلُوْ عَنِ الْحَقِّ کیے ہیں۔ لہٰذا قرآنِ مجید کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا اور ایک کی طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے۔ تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اُٹھانے کا اِس کو کوئی حق نہیں ہے۔ قانون کو ایسی حالت میں اُسے ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیے اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیے۔

عدل کے باب میں قرآنِ کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دِلی محبت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس میں مساوات برتنے پر نہ انسان قادر ہے اور نہ اس کے لیے مکلّف، وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ۔ البتہ اِس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ اور معاشرت اور تعلّقات زَن وشَو میں اُن کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔

مَرد کے ظلم کی یہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ اِن کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلّقات میں بہت سے اَیسے معاملات بھی پیش آ سکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو مودّت و رحمت کے منافی ہیں۔ مگر ان میں قانون کے لیے مداخلت کی گنجایش نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے اَیسے معاملات کے لیے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دِی ہیں جن کا خُلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مَرد کا برتاؤ فیاضانہ اور محبت آمیز ہونا چاہیے۔ رات دِن کی تھکّا فضیحتی کے ساتھ زندگی گزارنا حماقت ہے۔ اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو۔ نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی اِن ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ ممکن ہی ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے۔ لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عدل و انصاف اور رحمت و مودّت کے برتاؤ کی ذِمہ داری زیادہ تر مَرد پر عائد کرتا ہے۔

مَرد کے حقوق

مَرد کو قوّامیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دِیا گیا ہے وہ اُوپر بیان ہوئیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ قوّام ہونے کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حیثیت سے مَرد کے حقوق کیا ہیں۔

۱- حفظ للغیب: عورت پر مَرد کا پہلا حق قرآنِ مجید نے اَیسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دُوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النسآء ۴: ۳۴) جو نیک عورتیں ہیں وہ اطاعت کرنے والی اور غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ماتحت۔

یہاں حفظ للغیب سے مُراد ہر اُس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اُس کی غیر موجودگی میں بطورِ امانت عورت کے پاس رہے۔ اُس میں اِس کے نسب کی حفاظت، اِس کے نطفے کی حفاظت، اُس کی آبرو کی حفاظت، اِس کے مال کی حفاظت، اُس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آ جاتا ہے۔ اگر عورت اِن حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مَرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کا ذِکر آگے آتا ہے۔

۲- شوہر کی اطاعت: مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (النسآء ۴: ۳۴) جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔

یہ ایک عام حُکم ہے جس کی تشریح میں نبی ﷺ نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً:

اِنَّ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهٗ[۱]، تمھارا اُن پر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔

لَا تَصَدَّقُ بِشَيْءٍ مِّنْ بَيْتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَاِنْ فَعَلَتْ كَانَ لَهُ الْاَجْرُ وَ عَلَيْهَا الْوِزْرُ وَلَا تَخْرُجُ مِنْ بَيْتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ[۲] وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے، اگر ایسا کرے گی تو اجر شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہوگا۔ نیز وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لَا تَصُوْمُ الْمَرْاَةُ يَوْمًا وَ زَوْجُهَا شَاهِدٌ مِنْ غَيْرِ رَمَضَانَ اِلَّا بِاِذْنِهٖ[۳] (احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابنِ ماجہ) عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان کے سوا نفل روزے اس کی اجازت کے بغیر ایک دِن بھی نہ رکھے۔

خَيْرُ النِّسَآءِ اِمْرَاَةٌ اِذَا نَظَرْتَ اِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَ اِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ وَ اِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ مَالِكَ وَ نَفْسِهَا[۴]، بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اُس کو دیکھے تو تیرا دِل خوش ہو جائے اور جب تو اُس کو حُکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اُس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی حفاظت کرے۔

اِس عام حُکمِ اطاعت میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت سے اُس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اُس کا حُکم ماننے سے انکار کر سکتی ہے بلکہ اسے انکار کر دینا چاہیے۔ مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے منع کرے یا شراب پینے کا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۲۳۱
۲- ایضاً، ج ۵ ص ۲۳۱
۳- ایضاً، ج ۵ ص ۲۳۲
۴- ایضاً، ج ۵ ص ۲۳۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حُکم دے یا پردۂ شرعی ترک کرائے یا فواحش کا ارتکاب اُس سے کرانا چاہے تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اُس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حُکم کو ٹھکرا دے۔ اِس لیے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ[1]۔ اِس صورتِ خاص کے سوا باقی تمام صُورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے۔ اگر نہ کرے گی تو نافرمان ہوگی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مَرد کے اختیارات

قانونِ اسلام نے چونکہ مَرد کو قوّام بنایا ہے اور اس پر عورت کے مہر، نفقے اور نگہبانی وخبر گیری کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ اِس لیے وہ مَرد کو عورت پر چند ایسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے اور اپنے گھر کے اخلاق اور حسنِ معاشرت کی حفاظت کرنے اور خود اپنے حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے اِس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانونِ اسلام میں ان اختیارات کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے اور اِس کے ساتھ وہ حدود بھی متعیّن کر دیے گئے ہیں جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ نصیحت، تادیب اور تعزیر: اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مَرد پر لازم ہے کہ پہلے اِس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اُس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسبِ ضرورت اِس کے ساتھ سختی کرے اور اگر اِس پر بھی نہ مانے تو وہ اُس کو مار سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اِس کی اطاعت کرنے لگے۔

وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۔ (النسآء ۴: ۳۴) اور جن عورتوں سے تم نشوز[2] دیکھو اُن کو نصیحت کرو۔ اور بستروں پر اُن کو چھوڑ دو اور اُن کو مارو۔ اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو پھر اُن پر سختی کرنے کا کوئی طریقہ نہ ڈھونڈو۔

اِس آیت میں وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر اُن کو چھوڑ دو) فرما کر سزا کے طور پر ترکِ مباشرت کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر آیتِ ایلائ نے، جس کا ذِکر پہلے گزر چکا ہے، اِس کے لیے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے کہ یہ بستر کی علیحدگی چار مہینے سے زیادہ نہ ہو۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکامِ الٰہی اس کو طلاق دے دے گا اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اِسی قابل ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ چار مہینے کی مدّت ادب سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اِس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہوگا۔ کیونکہ اتنے دن تک اُس کا نشوز پر قائم رہنا، یہ جانتے ہوئے کہ اِس کا نتیجہ طلاق ہے، اِس بات کی دلیل ہے کہ اِس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یا وہ حسنِ معاشرت کے ساتھ کم از کم اِس شوہر سے نباہ نہیں کر سکتی۔ نیز اِس سے وہ

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۶، ص ۴۳۸

۲۔ نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح میں اِس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے۔ خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لیے ایک مَرد کو ایک عورت کے ساتھ رِشتۂ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرنے کے لیے کسی ناجائز طریقے کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں میاں بیوی میں سے ایک اِس قدر ضدّی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں مودّت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سُفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ کے معنی میں ایک دُوسرا قول منقول ہے۔ وہ کلامِ عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ھجر کے معنی باندھنے کے ہیں، هَجَرَ الْبَعِيرَ اِذَا رَبَطَهُ بِالْهِجَارِ۔ ہجار اُس رسّی کو کہتے ہیں اُونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں اُن کو باندھ کر ڈال دو۔ لیکن یہ معنی قرآنِ مجید کے منشا سے بعید ہیں۔ فِي الْمَضَاجِعِ کے الفاظ میں قرآن نے اپنے منشا کی طرف صاف اشارہ کر دیا ہے۔ مضجع سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور سونے کی جگہ میں باندھنا بالکل بے معنی بات ہے۔

دُوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے۔ مگر اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید لگا دی ہے کہ ضربِ شدید نہ ہونی چاہیے۔

اِضْرِبُوهُنَّ اِذَا عَصَيْنَكُمْ فِي الْمَعْرُوفِ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَّلَا يَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا يُقَبِّحْ[1] "اگر وہ تمھارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں تو اُن کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دِہ نہ ہو۔ منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔"

یہ دو سزائیں دینے کا مَرد کو اختیار دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اُس نافرمانی پر دی جا سکتی ہے جو مَرد کے جائز حقوق سے متعلق ہو۔ نہ یہ کہ ہر جا بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور بات نہ ماننے تو اُس کی سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اِسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ [البقرۃ ۲: ۱۹۴] جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اُس پر ترکِ کلام اور جس پر ترکِ کلام کافی ہے اُس پر هَجْر فِي الْمَضَاجِعِ اور جس پر هَجْر فِي الْمَضَاجِعِ کافی ہے اُس پر مارنا ظلم میں شُمار ہوگا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صِرف شدید اور ناقابلِ برداشت قصور پر ہی دی جا سکتی ہے۔ اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اِس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مَرد کی زیادتی ہوگی اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اُس کے خلاف قانون سے امداد طلب کرے۔

۲- طلاق: دوسرا اختیار مَرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اُس کو طلاق دے دے۔ چونکہ مَرد اپنا مال خرچ کر کے حقوقِ زوجیت حاصل کرتا ہے، اِس لیے اِن حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اُسی کو

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۷۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دیا گیا ہے[1]۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہو جائے تو مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور صرف اُس وقت اسے چھوڑے گا، جب اُس کے لیے چھوڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ لیکن اگر مال صَرف کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے فریق کو مل جائے تو اس دوسرے فریق سے یہ اُمید کم کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اِس فریق کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صَرف کیا ہے۔ پس مَرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صِرف اِس کے جائز حق کی حفاظت ہے، بلکہ اِس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۲۹-۴۹)

اصلِ دوم: رِشتۂ ازدواج کا استحکام

اِسلامی قانونِ ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلّق کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے اور جو مَرد و زَن ایک مرتبہ اس رِشتے میں بندھ چکے ہوں، اُن کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے۔ مگر جب اِن کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور رِشتۂ مناکحت میں اِن کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اِن کو نفرت و کراہت اور طبائع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے پر اصرار نہ کیا جائے۔ اِس صورت میں اِن کے لیے اور سوسائٹی کے لیے بہتر یہی ہے کہ اُن کی علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے۔ اِس معاملے میں اِسلامی قانون نے فطرتِ اِنسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف وہ رِشتۂ نِکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے، مگر نہ اِتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں ہے کہ زَوجَین

۱۔ بعض لوگ اہلِ مغرب کی تقلید میں یہ چاہتے ہیں کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر سے چھین کر عدالت کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ٹرکی میں ایسا کر بھی دیا گیا ہے۔ لیکن یہ چیز قطعی طور پر قرآن و سنّت کے خلاف ہے۔ قرآن نے طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے ہر جگہ فعلِ طلاق کو شوہر کی طرف منسوب کیا ہے۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ، فَإِنْ طَلَّقَهَا، وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ وغیرہ۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر کو دیا گیا ہے۔ پھر قرآن صاف الفاظ میں شوہر کے متعلق کہتا ہے کہ بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرۃ ۲: ۲۳۷) نکاح کی گرہ اِس کے ہاتھ میں ہے۔ اب کون یہ حق رکھتا ہے کہ اس گرہ کو اس کے ہاتھ سے چھین کر قاضی کے ہاتھ میں دے دے۔ ابنِ ماجہ میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرے آقا نے اپنی لونڈی کا نکاح مجھ سے کیا تھا۔ اب وہ اسے مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اس پر آپؐ نے اپنے خطبے میں فرمایا: يا ايها الناس ما بال احد كم يزوج عبده امته ثم يريد ان يفرق بينهما، انما الطلاق لمن اخذ بالساق ☆ لوگو! یہ کیا ماجرا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام سے اپنی لونڈی بیاہ دیتا ہے اور پھر دونوں کو جدا کرنا چاہتا ہے۔ طلاق کا اختیار تو شوہر کو ہے۔ یہ حدیث اگرچہ سنداً قوی نہیں ہے، مگر قرآن کی مطابقت اس کو قوت بخشتی ہے۔ پس قولِ خدا اور رسولؐ کی بنا پر یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ طلاق دینے کے اختیارات شوہروں سے چھین کر عدالتوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ اور عقلاً بھی یہ بالکل ایک غلط حرکت ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی طرح ہمارے ہاں بھی خانگی زندگیوں کے شرمناک جھگڑوں اور بدنما واقعات کی برسرِ عدالت تشہیر ہونے لگے۔

☆ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۰۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے بہرحال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوسکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے، مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پائیداری ہی باقی نہ رہی اور رشتۂ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہونے لگا۔

اِس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں۔ طلاق، خُلع اور قضائے قاضی۔

طلاق کی شرائط

اصطلاحِ شرع میں طلاق سے مُراد وہ علیحدگی ہے جس کا حق مَرد کو دِیا گیا ہے۔ مَرد اپنے اِس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے اُن حقوقِ زوجیت سے دست بردار ہوسکتا ہے جن کو اِس نے مَہر کے معاوضے میں حاصل کیا تھا۔ مگر شریعت طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلطَّلَاقُ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ اور تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الذَّوَّاقِیْنَ وَ الذَّوَّاقَاتِ، شادیاں کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اِسی لیے مَرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے جن کے ماتحت وہ اِس اختیار کو محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کرسکتا ہے۔[1]

خُلع

شرعِ اِسلامی نے جس طرح مَرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں کرسکتا اسے طلاق دے دے، اِس طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مَرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اِس کے ساتھ گزر بسر نہ کرسکتی ہو اِس سے خُلع حاصل کرلے۔[2]

قضائے شرعی

قضائے شرعی سے مُراد یہ ہے کہ جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظُلم وضَرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ [النساء ۴:۵۹] اگر اِس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں، یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اُس کے اختیارات سے محروم کر کے بطورِ خود اِس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیے گئے ہیں، وہ اِسی اصل پر مبنی ہیں۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۵۲-۱۰۷ ملخصا)

............OOO............

---

1. مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حقوق الزوجین، ص ۵۲-۶۰ اور تفہیم احکام القرآن، جلد ہٰذا، بحث طلاق۔
2. مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حقوق الزَّوجَین، ص ۶۰-۸۲، تفہیم احکام القرآن، جلد ہٰذا، بحث خُلع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

ازدواجی معاملات کے بارے میں اُصولی ہدایات

قرآنِ مجید چونکہ ایک اُصولی کتاب ہے۔ اِس لیے اِن جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں، اِس میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن چند ایسے وسیع اُصول بیان کر دیے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور جزئیات کے استنباط میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اُصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

مشرکوں سے نِکاح کی ممانعت

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ط (البقرۃ ۲:۲۲۱) مشرکہ عورتوں سے نِکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ط (البقرۃ ۲:۲۲۱) مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کے نِکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ ۵:۵) اور حلال کی گئیں تمھارے لیے اہلِ کتاب میں سے وہ عورتیں جو محفوظ ہوں۔

اِن آیات میں یہ قاعدہ مقرّر کیا گیا ہے کہ مسلمان مَرد کا نِکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا۔ البتہ اہلِ کتاب کی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نِکاح میں آ سکتی ہے نہ اہلِ کتاب کے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ...... وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ (البقرۃ ۲:۲۲۱) مشرک عورتوں سے نِکاح نہ کرو......... مشرک مَردوں سے اپنی عورتوں کے نِکاح نہ کرو۔

اس سے یہ قاعدہ بھی معلوم ہوا کہ مَرد تو اپنا نِکاح خود کر لینے کا مختار ہے۔ لیکن عورت اس معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اِسے کسی کے نِکاح میں دینا اِس کے اولیا کا کام ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ حدیث اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَّلِيِّهَا اور لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاذَنَ کی رُو سے نِکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے اور کسی کو اِس کی مرضی کے خلاف اس کا نِکاح کر دینے کا حق حاصل نہیں۔ مگر چونکہ عورت کے نِکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے، اس لیے قرآنِ مجید یہ چاہتا ہے کہ شادی کے معاملے میں تنہا عورت کی پسند اور خواہش کافی نہ ہو، بلکہ ساتھ ساتھ اِس کے رِشتہ دار مردوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی رائے کو بھی اِس میں دخل ہے۔

مہر کی ادائیگی

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النسآء ۴: ۲۴) پس جو فائدہ تم نے اُن سے اُٹھایا ہے اُس کے بدلے اِن کے مہر ادا کرو۔ایک فریضے کے طور پر۔

وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (النسآء ۴: ۲۱) اور تم اپنا دیا ہوا مہر اُن سے کیسے چھین لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرۃ ۲: ۲۳۷) اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے اور مہر مقرر ہو چکنے کے بعد اُن کو طلاق دی ہو تو اِس صورت میں مقرر شدہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اُس فائدے کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت سے حاصل کرتا ہے۔لہٰذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا۔ اِلّا یہ کہ عورت یا تو اپنی خوشی سے پورا مہر یا اِس کا کوئی حصہ معاف کر دے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (النسآء ۴: ۴) یا خُلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (البقرۃ ۲: ۲۲۹)۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا (النسآء ۴: ۲۰) اور اگر تم نے اُن کو مہر میں ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اُس میں کچھ بھی واپس نہ لو۔

یہ آیت اِس اَمر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔لہٰذا قانون کے ذریعہ سے اِس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

مرد کی بالادستی

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النسآء ۴: ۳۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں۔اِس وجہ سے کہ اِن میں سے ایک کو دوسرے پر اللہ نے فضیلت دی ہے اور اِس لیے کہ وہ اُن پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

اِس آیت کی رُو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجبی حق ہے اور یہ اُن حقوقِ زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتۂ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔عورت کا یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اِس سے دست بردار ہو جائے یا نشوز (سرکشی) کی مرتکب ہو۔

مناسب نفقہ

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ (الطلاق ۶۵: ۷) خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مطابق نفقہ دے اور جس کا رزق نپا تُلا ہوا سے اللہ نے جتنا کچھ دیا ہو اُسی میں سے وہ خرچ کرے۔

یہاں نفقہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اِس کے تعین میں مَرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائے گا۔ مالدار مَرد پر اِس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے۔ اور غریب مَرد پر اِس کی استطاعت کے مطابق ہے۔

سرکشی پر تادیب

وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ (النسآء ۴: ۳۴) اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو اُن کو نصیحت کرو اور خواب گاہوں میں اِن سے الگ رہو اور اِن کو مارو پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو زیادتی کرنے کے لیے بہانے نہ ڈھونڈو۔

اس آیت کی رُو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اِس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدمِ اطاعت کی روش اختیار کرے اور اِس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک هجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت دُوسرے ضربِ غیر مبرح، یعنی ہلکی مار جو صرف انتہا درجہ کے نشوز میں جائز ہے۔ اِس حد سے تجاوز کرنا، یعنی بغیر سرکشی کے سزا دینا، یا کم درجہ کی سرکشی پر انتہائی سزا دینا، یا انتہائی سرکشی پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

حَکَمین کا تقرّر

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ (النسآء ۴: ۳۵) اور اگر تم لوگوں کو اندیشہ ہو میاں اور بیوی کے درمیان ناچاقی کا تو ایک پنچ مَرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بھیجو۔ اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان موافقت کر دے گا۔

اِس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو تو برسرِ عدالت ان کے جھگڑے نمٹائے جانے سے پہلے یہ تدبیر کر لینی چاہیے کہ ایک شخص مَرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بطورِ حَکَم مقرر کیا جائے اور دونوں مل کر ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوْا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں۔ اِس لیے حَکَم مقرر کرنا اُنھی کا کام ہے اور اگر حَکَمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار بھی اولی الامر ہی کو حاصل ہے۔

خُلع کا راستہ

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ (البقرۃ ۲: ۲۲۹) پھر اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں میاں بیوی حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اُن دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت فدیہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں۔ اگر ظنِ غالب اِس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اِس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے اور اِس کے لیے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کردی جاسکتی ہے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرة ۲۲۹:۲)

تعدّی سے اجتناب

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (البقرة ۲۳۱:۲) اور اُن کو ضرار کی خاطر نہ روک رکھو تا کہ اُن پر زیادتی کرو۔

اِس آیت میں قانونِ اسلامی کے ایک دُوسرے اہم قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مَرد کے بندِ نکاح میں اِس طرح نہ روکی جائے کہ اُس کے لیے موجبِ ضرر اور وجہِ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ)۔ اگر روکا جائے تو معروف کے ساتھ روکا جائے (فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ)، مگر جہاں اِس کی کوئی اُمید نہ ہو اور اِس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ حسبِ ارشادِ نبوی، اِسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اِس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے (لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْاِسْلَامِ)[1]

بیویوں میں عدل

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النسآء ۱۲۹:۴) بس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جھک پڑو کہ دُوسری کو گویا لٹکتا چھوڑ دو۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لیے نازل ہوئی ہے مگر اِس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدے کی تعلیم دِی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رِشتۂ نِکاح میں بندھ کر معلّق ہوجائے۔ یعنی نہ تو اُس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نِکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

ایلا کا حکم

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ (البقرة ۲۲۶:۲) جو لوگ اپنی بیویوں سے اجتناب کی قسم کھا بیٹھیں اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔

اِس آیت میں عورت کی اَوسط قوّتِ برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی چار مہینے تک وہ ضرار اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جاسکتی ہے۔[1] اِس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے۔ اِس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دُوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

۱۔ تفہیم الاحادیث، ج ۸، ص ۳۰۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لعان

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ ...... (النور ۲۴:۶)

اِس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہی نہ پیش کر سکے تو اِس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اُس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائے گا کہ وہ جھوٹا ہوا تو اُس پر اللہ کی لعنت۔ اِس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اِس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اُس کے شوہر کا الزام جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اُس کے شوہر کی بات سچی ہو تو اُس پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اِس طرح جب ملاعنت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔

طلاق کا اختیار

...... اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ[۱] (البقرة ۲:۲۳۷) اِلّا یہ کہ بیویاں مہر معاف کر دیں، یا عفو سے کام لے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔

اِس آیت کے آخری فقرے میں اِس قاعدے کی تصریح کی گئی ہے کہ عُقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے اور وہی باندھے رکھنے یا کھول دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکر کے صیغوں میں آیا ہے اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ مثلاً وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ، فَاِنْ طَلَّقَهَا، وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ، فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ یہ اِس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا کلّی اختیار رکھتا ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو اُس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اِسلام میں تمام حقوق اِس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ اُن کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (الطلاق ۶۵:۱) جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اِس کا مستحق بناتا ہے کہ اُس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (البقرة ۲:۲۷۹) نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمھارا نقصان کیا جائے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اِسلامی قانون کے ہر شعبے میں، ہر معاملے میں جاری ہوتا ہے اور مرد کا حقِ طلاق بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں۔

فقہا کی ایک جماعت نے بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں اور اِس قاعدے میں کوئی استثنا نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں ہے کہ اِس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآنِ مجید اِس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔ قرآنِ مجید میں تو

۱۔ اسی قاعدہ کی بنا پر حضرت عمرؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شادی شدہ شخص مسلسل چار مہینے سے زیادہ مدت تک فوجی خدمت پر گھر سے دور نہ رکھا جائے۔ (ابن کثیر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آدمی کا حق حیات تک الا بالحق کے ساتھ مشروط ہے، گُجا کہ اس کے حق طلاق کو ایسا مطلق مانا جائے کہ خواہ وہ ظلم کرے، اللہ کی ساری حدیں توڑ دے۔ اور دُوسرے فریق کے سارے حقوق ضائع کردے، پھر بھی اِس کا یہ حق بلا قید و شرط ہی برقرار رہے۔

طلاق کا نصاب

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۖ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ (البقرۃ ۲:۲۲۹) طلاق دو بار ہے۔ پھر یا روک رکھا جائے بھلے طریقے سے یا رخصت کردیا جائے احسان کے ساتھ۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ (البقرۃ ۲:۲۳۰) پھر اگر مرد اُس کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ جب تک کہ اُس کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو۔

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی مغلّظہ۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۹۷-۱۰۶)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

نکاح کے احکام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

نِکاح کا مفہوم اور اہمیت

لفظِ نِکاح کا اصل معنی و مفہوم

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ (الاحزاب ۴۹:۳۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نِکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھاری طرف سے اُن پر کوئی عدت لازم نہیں ہے، جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔

یہ عبارت اِس باب میں صریح ہے کہ یہاں لفظِ نِکاح کا اطلاق صِرف عقد پر کیا گیا ہے۔ علمائے لُغت میں اِس اَمر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عربی زبان میں نِکاح کے اصل معنی کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عَقد کے دَرمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ اِن دونوں میں معنیً مشترک ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی عَقد تزویج کے ہیں اور وطی کے لیے اس کو مجازاً استعمال کیا جاتا ہے اور چوتھا کہتا ہے کہ اِس کے اصل معنی وطی کے ہیں اور عَقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس کے ثبوت میں ہر گروہ نے کلام عرب سے شواہد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن [امام] راغب اصفہانی نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ اَصْلُ النِّكَاحِ الْعَقْدُ ثُمَّ اُسْتُعِيْرَ لِلْجِمَاعِ وَ مُحَالٌ اَنْ يَّكُوْنَ فِي الْاَصْلِ لِلْجِمَاعِ ثُمَّ اُسْتُعِيْرَ لِلْعَقْدِ، لفظِ نِکاح کے اصل معنی عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارۃً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنی جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اِس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عربی زبان یا دُنیا کے کسی دوسری زبان میں حقیقتاً وضع کیے گئے ہیں وہ سب فحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں اِن کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقتاً اِس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اُسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کرے۔ اِس معنی کو ادا کرنے کے لیے تو دُنیا کی ہر زبان میں مہذّب الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

جہاں تک قرآن و سنّت کا تعلق ہے ان میں نِکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مُراد یا تو مجرّد عقد ہے، یا پھر وطی بعد عقد۔ لیکن وطی بلا عَقد کے لیے اِس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اِس طرح کی وطی کو تو قرآن اور سنت زنا اور سفاح کہتے ہیں نہ کہ نِکاح۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۰۹، الاحزاب، حاشیہ ۸۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک سوال کا جواب

س [تفہیم القرآن] میں آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ''قرآن نکاح کا لفظ بول کر صرف عقد مراد لیتا ہے یا قرآن اُسے اصطلاحاً صرف عقد کے لیے استعمال کرتا ہے''۔ یہ قاعدہ کلیہ نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں کے غالب فقہی مسلک یعنی حنفیہ کے نزدیک ناقابلِ تسلیم ہے، بلکہ جمہور اہلِ تفسیر کی تصریحات کے بھی منافی ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسی بات جس کے حق میں شاید ہی کسی نے رائے دی ہو آپ نے قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان فرمادی ہے......

ج [اس مسئلے میں] علمائے احناف بالعموم یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لفظ حقیقتاً وطی کے لیے اور مجازاً عقد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ احناف کی متفق علیہ رائے نہیں ہے۔ بعض مشائخ حنفیہ اس لفظ کو وطی اور عقد کے درمیان مشترکِ معنوی بھی قرار دیتے ہیں۔ پھر نکاح کی شرعی تعریف تو اُن کے ہاں یہی ہے کہ هُوَ عَقْدٌ يُفِيدُ مِلْكَ الْمُتْعَةِ قَصْدًا یا عَقْدٌ وُضِعَ لِتَمْلِيكِ مَنَافِعِ الْبُضْعِ

میرے نزدیک قرآن وسنّت میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد لازماً عقدِ تزویج ہی ہے اور جب یہ لفظ مطلقاً استعمال ہوگا تو اس سے مراد عقد ہی لیا جائے گا الا یہ کہ کوئی قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ یہاں مراد محض وطی یا عقد مع الوطی ہے۔ رہی وطی بلا عقد تو اس کے لیے لفظ نکاح کے استعمال کا جواز لغت میں تو ہوسکتا ہے لیکن قرآن وسنّت میں اس کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں ہے۔ آپ کے علم میں ہو تو پیش فرمائیں۔

[اس کے جواب میں سائل نے فقہ کی بعض کتابوں سے مفصل عبارتیں نقل کر کے بھیجیں۔ اس پر اُن کو حسبِ ذیل جواب دیا گیا]

افسوس ہے کہ کسی مسئلے پر زیادہ طویل بحث کی فرصت مجھے میسر نہیں، تاہم میں اجمالاً ایک بار پھر اپنے مدعا کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اطمینان نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں اور میں اپنی رائے پر۔

نکاح سے مراد عقد اور وطی بعد عقد لینے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے مراد وطی بغیر عقد بھی لی جاسکتی ہے؟ اس چیز کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔ کیونکہ شرعاً اس کے لیے زنا اور سفاح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اس قبیح فعل پر لفظ نکاح کا اطلاق جائز تسلیم کرنے کے لیے اِن دلائل سے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت ہے جو آپ نے نقل فرمائے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ نکاح کا لفظ اصلاً فعل مباشرت کے لیے وضع ہوا تھا اور پھر مجازاً عقد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ فعل مباشرت کے لیے دُنیا کی جس زبان میں بھی کوئی لفظ وضع ہوا ہے (یعنی جو استعارہ و کنایہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ صراحتاً اس فعل کے لیے موضوع ہے) وہ قبیح و شنیع ہے اور کسی زبان میں بھی اس کو عقد کے لیے مجازاً استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس فعل کے لیے جو لفظ مستعمل ہے اسے آخر کون شخص بیاہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خود آپ کے پیش کردہ حوالوں سے بھی یہ ثابت ہے کہ لفظ نکاح کے اصل معنی ضم کے ہیں۔ اب کیا یہ بات ماننے کے لائق ہے کہ لفظ اصلاً مجرد فعلِ مباشرت کے لیے [بلالحاظ اِس کے کہ عقد ہو یا نہ ہو] وضع ہوا تھا؟

بلاشبہ ایسی مثالیں لغت میں ملتی ہیں جن میں یہ لفظ محض مباشرت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس لفظ کا اصل مفہوم مباشرت ہے اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن اور حدیث سے جو مثالیں آپ نے دِی ہیں اِن پر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اِن میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کی دُوسری تاویل ممکن نہ ہو۔ مثلاً میں زنا سے حرمت مصاہرت کا قائل ہوں۔ مگر میرے نزدیک قرآن کی آیت وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "جن عورتوں سے تمھارا باپ زنا کر چکا ہو ان سے تم نہ زنا کرو اور نہ عقد" بلکہ میں اِس کا مطلب یہی لیتا ہوں کہ جن عورتوں سے باپ کا نِکاح ہو چکا ہو اُن سے اولاد کا نِکاح نہیں ہو سکتا۔ البتہ اِس سے بالتبع یہ حُکم بھی نکلتا ہے کہ باپ سے جس عورت کا بھی شہوانی تعلق کسی طرح ہو گیا ہے وہ بیٹے پر حرام ہے اور بیٹے کا تعلق جس عورت سے ہو گیا ہے وہ باپ پر حرام ہے۔ نَاكِحُ الْيَدِ مَلْعُوْنٌ میں بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ نے استعارہ کی زبان میں استمنا بالید کرنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو اپنے ہی ہاتھ سے بیاہ کر رہا ہے۔ ایسی ہی تاویل دوسرے نظائر کی بھی کی جا سکتی ہے۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۸-۱۱۲)

نِکاح کی ضرورت

قوانین فطرت اور ازدواجی زندگی: فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی زوجین یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں۔ مگر دوسری انواعِ حیوانی کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں اِس صنفی تقسیم اور اِس طبعی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے۔ اِسی لیے اُن میں یہ میلان صِرف اِس حد تک رکھا گیا ہے جو ہر نوع کے بقا کے لیے ضروری ہے۔ اور اُن کی جبلّت میں ایسی قوّتِ ضابطہ رکھ دی گئی ہے جو انھیں صنفی تعلق میں اِس حدِ مقرّر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اِس کے برعکس انسان میں یہ میلان غیر محدود، غیر منضبط اور تمام دُوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اِس کے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں ہے۔ اِس کی جبلّت میں کوئی ایسی قوّتِ ضابطہ بھی نہیں ہے جو اُسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دُوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ اِن کے اندر ایک دُوسرے کی طرف جذب و انجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ اِن کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ اُن کے جسم کی ساخت اور اِس کے تناسب اور اُس کے رنگ و رُوپ اور اُس کے لمس اور اُس کے ایک ایک جزو میں صنف مقابل کے لیے کشش پیدا کر دی گئی ہے۔ اُن کی آواز، رفتار، انداز و ادا، ہر ایک چیز میں کھینچ لینے کی قوّت بھر دی گئی ہے۔ اور گردوپیش کی دُنیا میں بھی بے شُمار ایسے اسباب پھیلا دیے گئے ہیں جو دونوں کے داعیاتِ صنفی کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حرکت میں لاتے اور انھیں ایک دُوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ، پانی کی روانی، سبزہ کا رنگ، پھولوں کی خوشبو، پرندوں کے چہچہے، فضا کی گھٹائیں، شب ماہ کی لطافتیں، غرض جمالِ فطرت کا کوئی مظہر اور حسنِ کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اِس تحریک کا سبب نہ بنتا ہو۔ پھر انسان کے نظامِ جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اِس میں طاقت کا جوزبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوتِ حیات اور قوتِ عمل بھی ہے اور صنفی تعلق کی قوت بھی۔

قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے۔ اِس کے نفس میں جتنی محرّک قوتیں پائی جاتی ہیں اُن سب کا رِشتہ زبردست داعیوں سے مِلتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اُسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر اُبھارتا ہے۔ دوسرا وہ داعیہ جو اُس کو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ شباب کے زمانے میں جب انسان کی عملی قوتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ بعض اَوقات پہلے داعیہ کو بھی دَبا لیتا ہے۔ اور اِس کے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنی جان تک دے دینے اور اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں بھی تامّل نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں۔ کیونکہ نوعِ انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اِس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں ہے جس قدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دُوسری انواع کے لیے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے اِن سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اِس کے لیے سب سے زیادہ اسبابِ تحریک فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف ولذّت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف ولذّت کو مقصود بالذّات نہیں بنایا ہے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۴-۱۳۶)

مدنیت صالحہ کا قیام

انسان سے فطرت کا مطالبہ صِرف اِتنا ہی نہیں ہے [کہ وہ اپنی نوع کو باقی رکھے] بلکہ وہ اِس سے بڑھ کر کچھ دُوسرے مطالبات بھی اِس سے کرتی ہے اور بادنیٰ تامّل ہمیں معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ مطالبات کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام حیوانات کے برعکس انسان کا بچّہ نگہداشت اور پرورش کے لیے بہت زیادہ وقت، محبت اور توجّہ مانگتا ہے۔ اگر اِس کو مجرّد ایک حیوانی وجود ہی کی حیثیت سے لے لیا جائے تب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے ...... یعنی غذا حاصل کرنے اور اپنے نفس کی مدافعت کرنے ...... کے قابل ہوتے ہوتے وہ کئی سال لے لیتا ہے اور ابتدائی دو تین سال تک تو وہ اتنا بے بس ہوتا ہے کہ ماں کے پیہم توجّہ کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان خواہ وحشت کے کتنے ہی ابتدائی درجے میں ہو، بہر حال نرا حیوان نہیں ہے، کسی نہ کسی مرتبے کی مدنیت بہر حال اُس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اور اُس مدنیت کی وجہ سے پرورشِ اولاد کے فطری تقاضے پر لامحالہ دو اور تقاضوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بچے کی پرورش میں اِن تمام تمدنی وسائل سے کام لیا جائے جو اُس کی پرورش کرنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والے کو بہم پہنچ سکیں۔ دُوسرے یہ کہ بچے کو اَیسی تربیت دِی جائے کہ جس تمدّنی ماحول میں وہ پیدا ہوا ہے وہاں تمدّن کے کارخانے کو چلانے اور سابق کارکنوں کی جگہ لینے کے لیے وہ تیار ہو سکے۔

پھر تمدّن جتنا زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ دَرجہ کا ہوتا جاتا ہے، یہ دونوں تقاضے بھی اُتنے ہی زیادہ بھاری اور بوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف پرورشِ اولاد کے ضروری وسائل ولوازم بڑھتے جاتے ہیں اور دُوسری طرف تمدّن نہ صرف اپنے قیام وبقا کے لیے اپنے مرتبے کے مطابق اچھے تعلیم وتربیت یافتہ کارکن مانگتا ہے، بلکہ اپنے نشوو ارتقا کے لیے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نسل پہلی نسل سے بہتر اُٹھے، یعنی دُوسرے الفاظ میں ہر بچے کا نگہبان اُس کو خود اپنے آپ سے بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ انتہادرجے کا ایثار جو انسان سے جذبۂ خود پسندی تک کی قربانی مانگتا ہے۔

یہ ہیں فطرتِ انسانی کے مطالبات اور اِن مطالبات کی اوّلین مخاطب ہے عورت۔ مَرد ایک ساعت کے لیے عورت سے مِل کر ہمیشہ کے لیے اس سے اور اس ملاقات کی ذِمہ داری سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت کو تو اس ملاقات کا قدرتی نتیجہ برسوں کے لیے بلکہ عمر بھر کے لیے پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حمل قرار پاجانے کے بعد سے کم از کم پانچ برس تک تو یہ نتیجہ اُس کا پیچھا کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں اور اگر تمدّن کے پورے مطالبات ادا کرنے ہوں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ مزید پندرہ سال تک وہ عورت جس نے ایک ساعت کے لیے مرد کی معیت کا لُطف اُٹھایا تھا، اِس کی ذمہ داریوں کا بار سنبھالتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مشترک فعل کی ذِمہ داری قبول کرنے کے لیے تنہا ایک فریق کِس طرح آمادہ ہو سکتا ہے؟ جب تک عورت کو اپنے شریکِ کار کی بے وفائی کے خوف سے نجات نہ ملے، جب تک اُسے اپنے بچے کی پرورش کا پورا اطمینان نہ ہو جائے، جب تک اُسے خود اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے کام سے بھی ایک بڑی حد تک سبکدوش نہ کر دیا جائے، وہ اِتنے بھاری کام کا بوجھ اُٹھانے پر کیسے آمادہ ہو جائے گی؟ جس عورت کا کوئی قوّام (protector, provider) نہ ہو اُس کے لیے تو حمل یقیناً ایک حادثہ، ایک مصیبت، بلکہ ایک خطرناک بلا ہے جس سے چھٹکارا پانے کی خواہش اس میں طبعی طور پر پیدا ہونی چاہیے۔ آخر وہ اِسے خوش آمدید کس طرح کہہ سکتی ہے؟

لامحالہ یہ ضروری ہے۔ اگر نوع کا بقا اور تمدّن کا قیام وارتقا ضروری ہے کہ مَرد جس عورت کو بار آور کرے وہی اس بار کو سنبھالنے میں اس کا شریک بھی ہو۔ مگر اِس شرکت پر اِس کو راضی کیسے کیا جائے؟ وہ تو فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ جہاں تک بقائے نوع کے طبعی فریضے کا تعلّق ہے، اس کے حصّے کا کام تو اسی ساعت پورا ہو جاتا ہے جبکہ وہ عورت کو بار آور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ بار تنہا عورت کے ساتھ لگا رہتا ہے اور مَرد سے وہ کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتا۔ جہاں تک صنفی کشش کا تعلق ہے وہ بھی اُسے مجبور نہیں کرتی کہ اس عورت کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ چاہے تو اُسے چھوڑ کر دُوسری اور دُوسری کو چھوڑ کر تیسری سے تعلق پیدا کر سکتا ہے اور ہر زمین میں بیج پھینکتا پھر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ محض اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بخوشی اس بار کو سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ آخر کون سی چیز اُسے مجبور کرنے والی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کا پھل اس عورت اور اس بچے پر صرف کرے؟ کیوں وہ ایک دُوسری حسین دوشیزہ کو چھوڑ کر اس پیٹ پھولی عورت سے اپنا دِل لگائے رکھے؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیوں وہ گوشت پوست کے ایک بے کار لوتھڑے کو خواہ مخواہ اپنے خرچ پر پالے؟ کیوں اس کی چیخوں سے اپنی نیند حرام کرے؟ کیوں اس چھوٹے سے شیطان کے ہاتھوں اپنا نقصان کرائے جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا اور گھر بھر میں گندگی پھیلاتا پھرتا ہے اور کسی کی سُن کر نہیں دیتا؟

فطرت نے کسی حد تک اس مسئلے کے حل کا خود بھی اہتمام کیا ہے۔ اُس نے عورت میں حسن، شیرینی، دِل لُبھانے کی طاقت، اور محبت کے لیے ایثار و قربانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تاکہ ان ہتھیاروں سے مرد کی خود غرضانہ انفرادیت پر فتح پائے اور اُسے اپنا اسیر بنالے۔ اُس نے بچّے کے اندر بھی ایک عجیب قوّتِ تسخیر بھر دی ہے تاکہ وہ اپنی تکلیف دِہ، برباد کن، پاجیانہ خصوصیات کے باوجود ماں باپ کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار رکھے۔ مگر صرف یہی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ بجائے خود اُن کا زور انسان کو اپنے اخلاقی، فطری، تمدّنی فرائض ادا کرنے کے لیے برسوں نقصان، اذیت، قربانی کرنے پر مجبور کر سکے۔ آخر انسان کے ساتھ اُس کا وہ ازلی دُشمن بھی تو لگا ہوا ہے جو اُسے فطرت کے راستے سے منحرف کرنے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے۔ جس کی زنبیلِ عیاری میں ہر زمانے اور ہر نسل کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طرح طرح کی دلیلوں اور ترغیبات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ بھرا ہوا ہے۔

یہ مذہب کا معجزہ ہے کہ وہ انسان کو...... مرد اور عورت دونوں کو...... نوع اور تمدّن کے لیے قربانی پر آمادہ کرتا ہے اور اس خود غرض جانور کو آدمی بنا کر ایثار کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ وہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیا ہی تھے جنھوں نے فطرت کے منشا کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر عورت اور مرد کے درمیان صنفی تعلّق اور تمدّنی تعاون کی صحیح صورت، نکاح تجویز کی۔ انھی کی تعلیم و ہدایت سے دُنیا کی ہر قوم اور روئے زمین کے ہر گوشے میں نکاح کا طریقہ جاری ہوا۔ انھی کے پھیلائے ہوئے اخلاقی اُصولوں سے انسان کے اندر اتنی رُوحانی صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اس خدمت کی تکلیفیں اور نقصانات برداشت کرے۔ ورنہ حق یہ ہے کہ ماں اور باپ سے زیادہ بچّے کا دُشمن اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ انھی کے قائم کیے ہوئے ضوابطِ معاشرت سے خاندانی نظام کی بنا پڑی جس کی مضبوط گرفت لڑکیوں اور لڑکوں کو اس ذمہ دارانہ تعلّق اور اس اشتراکِ عمل پر مجبور کرتی ہے، ورنہ شباب کے حیوانی تقاضوں کا زور اتنا سخت ہوتا ہے کہ محض اخلاقی ذِمّہ داری کا احساس کسی خارجی ڈسپلن کے بغیر ان کو آزاد شہوت رانی سے نہ روک سکتا تھا۔ شہوت کا جذبہ بجائے خود اجتماعیت کا دُشمن (anti-social) ہے۔ یہ خود غرض، انفرادیت اور انار کی کا میلان رکھنے والا جذبہ ہے۔ اس میں پائیداری نہیں۔ اس میں احساسِ ذِمّہ داری نہیں۔ یہ محض وقتی لُطف اندوزی کے لیے تحریک کرتا ہے۔ اس دیو کو مسخر کر کے اس سے اجتماعی زندگی کی خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ نکاح کا قانون اور خاندان کا نظام ہی ہے جو اس دیو کو شیشے میں اُتار کر اس سے شرارت اور بدنظمی کی ایجنسی چھین لیتا ہے اور اسے مرد و عورت کے اس لگاتار تعاون و اشتراکِ عمل کا ایجنٹ بنا دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی تمدّنی زندگی ختم ہو جائے، انسان حیوان کی طرح رہنے لگیں اور بالآخر نوعِ انسانی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۵-۱۵۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعلق زَوجین کی صحیح صورت

مَرد اور عورت کے درمیان خصوصیت کے لحاظ سے: فطرت کی اِس تقسیم[1] کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاندان کی جو تنظیم اور معاشرت میں مرد وعورت کے وظائف کی جو تعیین کی جائے گی اِس کے ضروری ارکان لامحالہ حسبِ ذیل ہوں گے۔

۱- خاندان کے لیے روزی کمانا، اِس کی حمایت وحفاظت کرنا اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مَرد کا کام ہو اور اِس کی تعلیم وتربیت اَیسی ہو کہ وہ اِن اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مُفید بن سکے۔

۲- بچّوں کی پرورش، خانہ داری کے فرائض اور گھر کی زندگی کو سکون وراحت کی جنّت بنانا عورت کا کام ہو اور اِس کو بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت دَے کر انھی اغراض کے لیے تیار کیا جائے۔

۳- خاندان کے نظم کو برقرار رَکھنے اور اِس کو طوائف الملوکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو قانونی حدود کے اندر ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تا کہ خاندان ایک بن سری فوج بن کر نہ رِہ جائے۔ اَیسا فرد صرف مَرد ہی ہوسکتا ہے کیونکہ جس رُکن خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایّام ماہواری اور حمل کے زمانے میں بگڑتی ہو وہ بہرحال اِن اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔

۴- تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور تربیت وتنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تحفظات رکھے جائیں تا کہ بے عقل افراد اپنی حماقت سے مَردوں اور عورتوں کے حلقہ ہائے عمل مخلوط کر کے اِس صالح تمدّنی نظام کو درہم برہم نہ کرسکیں۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۴-۱۹۵)

نِکاح کے متعلق اِسلامی نقطۂ نظر

شریعتِ اِسلامیہ میں نِکاح کی حیثیت محض ایک عمرانی معاہدہ (social contract) ہی کی نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ آج کل تعبیر کر رہے ہیں بلکہ اِس میں ایک مذہبی تقدس کی شان بھی ہے۔ یہ تقدس ہندوؤں اور عیسائیوں کے نِکاح کی طرح (sacrament) کی حَد تک تو نہیں پہنچتا، مگر عبادت کی حَد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ شارع اِس سے نہ صرف تمدّنی وعمرانی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ دِینی ورُوحانی فوائد بھی چاہتا ہے۔ اس سے اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔ سوسائٹی کی پاکیزگی مقصود ہے۔ ایک خالص اِسلامی نظامِ معاشرت کا بقا ودوام اور نشو وارتقا مقصود ہے۔ دُنیا میں خدا کا نام لینے والی اور کلمۃ اللّٰہ کو بلند کرنے والی نسلیں پیدا کرنا مقصود ہے۔ اِن مقاصد میں مددگار ہونے ہی کی وجہ سے نِکاح کو عبادات کے قریب جگہ دِی گئی ہے۔ بعض فقہائے اسلام نے تو یہاں تک کہہ دِیا کہ بعض حیثیات سے نِکاح کو جہاد پر بھی فضیلت ہے۔ کیونکہ نِکاح اور جہاد دونوں وجودِ مسلم اور وجودِ اسلام کے اسباب ہیں، مگر جو کچھ افرادِ مسلمین کی مناکحت سے حاصل ہوتا ہے وہ اِس سے بدر جہا زیادہ ہے جو جہاد

۱- ملاحظہ ہو پردہ، ص ۱۷۷-۱۹۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاد میں تو زیادہ تر امکان اس کا ہے کہ کفار قتل ہوں گے یا ذِمّی بن کر حالتِ کفر ہی میں رہیں گے۔ بخلاف اس کے اہلِ اسلام کی شادیوں کا خالص نتیجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی ایک نسل کے اخلاق محفوظ ہوں گے اور دُوسری نسل متبعینِ اسلام کی وجود میں آئے گی۔

اِس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اُن احادیث پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جو نبی ﷺ سے نکاح کے متعلق مروی ہیں۔ ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ عکّاف بن وداعۃ الہلالی سے پوچھا: کیا تمھاری شادی ہو چکی ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے پوچھا: لونڈی بھی نہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تم تندرست اور خوشحال ہو؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا تب تو تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو یا عیسائیوں میں سے۔ اگر تم ہماری جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہو تو وہی کرو جو ہم کرتے ہیں اور ہمارے طریقوں میں سے ایک نکاح بھی ہے۔ تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو مجرّد رہتے ہیں اور تمھارے مرنے والوں میں بدترین وہ ہیں جو مجرّد مرتے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ تَنَاكَحُوْ تَنَاسَلُوْا تَكَاثَرُوْا فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[2]، نکاح کرو، نسلیں بڑھاؤ، اپنی تعداد میں اضافہ کرو، کیونکہ میں قیامت کے روز تمام اُمتوں کے مقابلے میں تمھاری تعداد زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایک موقع پر فرمایا: اَرْبَعٌ مَّنْ اُعْطِيَهُنَّ فَقَدْ اُعْطِيَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ قَلْبًا شَاكِرًا وَّ لِسَانًا ذَاكِرًا وَّ بَدَنًا عَلَى الْبَلَآءِ صَابِرًا وَ زَوْجَةً لَّا تَبْغِيْهِ حُوْبًا فِيْ نَفْسِهَا وَمَالِهٖ[3] (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط) چار چیزیں ہیں کہ جس کو وہ دی گئیں اُسے دُنیا اور آخرت کی ساری بھلائی دے دی گئی۔ ایک وہ دِل کہ خدا جو کچھ دے اُس پر وہ شکر ادا کرے۔ دُوسرے وہ زبان جو خدا کا ذِکر کرنے والی ہو۔ تیسرے وہ بدن جو مصیبتوں کے مقابلے میں ٹھیرنے کی قوت رکھتا ہو۔ چوتھے وہ بیوی جو شوہر کے مال اور اپنی عصمت میں کسی خیانت کی طرف مائل نہ ہو۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: مَنْ اَرَادَ اَنْ يَلْقَى اللّٰهَ طَاهِرًا مُّطَهَّرًا فَلْيَتَزَوَّجِ الْحَرَائِرَ[4] (ابنِ ماجہ) جو کوئی اللہ سے پاک صاف ملنا چاہتا ہو اُسے شریف عورتوں سے شادی کرنی چاہیے۔

ایک دُوسری حدیث میں ہے: لَا تَزَوَّجُو النِّسَآءَ لِحُسْنِهِنَّ فَعَسٰى حُسْنُهُنَّ اَنْ يُّرْدِيَهُنَّ وَ لَا تَزَوَّجُوْهُنَّ لِاَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰى اَمْوَالُهُنَّ اَنْ تُطْغِيَهُنَّ وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوْهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ مَلَامَةٌ خَرْقَاءُ سَوْدَاءُ ذَاتُ دِيْنٍ اَفْضَلُ[5] (ابنِ ماجہ) عورتوں سے اُن کے حسن کی خاطر شادیاں نہ کرو، ممکن ہے کہ اُن کا حسن اُن کو بگاڑ دے۔ اور تم اُن کے مال و دولت کی خاطر بھی شادیاں نہ کرو۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کے اموال اُن کو سرکش بنا دیں۔ تم کو اُن میں جو چیز دیکھنی چاہیے وہ دین ہے۔ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دین دار ہو تو وہ دُوسری عورتوں سے افضل ہے۔

اس قسم کی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کی اہمیت صرف ایک تمدّنی ضرورت کو پورا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۴ ۲- ایضاً

۳- ایضاً، ج ۵، ص ۲۳ ۴- ایضاً، ج ۵، ص ۲۳ ۵- ایضاً، ج ۵، ص ۲۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرنے ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مقصد تحصین نفس اور طہارتِ اخلاق، اور تہذیب اسلامی کا فروغ اور خالص مسلمان نسلیں پیدا کرنا ہے۔ اور ان اغراض کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ مسلمان نکاح کریں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کے نکاح ایسی عورتوں سے ہوں جو مسلمان ہوں، دِین دار ہوں، شریف اور باعصمت ہوں۔ کیونکہ ایک صالح اسلامی سوسائٹی ایسے ہی مردوں اور عورتوں کے ازدواج سے وجود میں آسکتی ہے اور ایک صالح مسلمان نسل ایسی ہی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوسکتی ہے۔

(تفہیمات، اپریل ۱۹۸۰ء، دوم، ص ۳۲۴-۳۲۷)

نِکاح کی اہمیت

ایک مرتبہ نبی ﷺ کو معلوم ہوا کہ بعض صحابیوں نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دِن کو روزہ رکھیں گے، راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے، بلکہ جاگ جاگ کر عبادت کرتے رہیں گے، گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے، عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دِیا جس میں فرمایا مجھے: ایسی باتوں کو حکم نہیں دِیا گیا ہے۔ تمھارے نفس کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔ مجھے دیکھو میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی۔ پس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ فرمایا: یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانوں کو اور خوشبو اور نیند اور دُنیا کی لذتوں کو اپنے اُوپر حرام کر لیا ہے۔ میں نے تمھیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دِین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری اور عزلت نشینی ہے۔ ضبطِ نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے۔ رہبانیت کے سارے فوائد یہاں جہاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اِس لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اپنے اُوپر سختی کی اور جب انھوں نے خود اپنے اُوپر سختی کی تو اللہ نے بھی اِن پر سختی کی۔ یہ انہی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔

یہاں دو باتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ خود حلال و حرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام کرو گے تو قانونِ الٰہی کے بجائے قانونِ نفس کے پیرو قرار پاؤ گے۔ دُوسری بات یہ کہ عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں، بدھ مذہب کے بھکشوؤں اور اشراقی متصوفین کی طرح رہبانیت اور قطع لذات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذتوں سے محروم کرنا اور دُنیا کے سامان زِیست سے تعلق توڑنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جن کے اندر یہ ذہنیت پائی جاتی تھی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِسی سلسلے میں بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابی کے متعلق نبی ﷺ نے سُنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ تو آپؐ نے بلا کر اُن کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ اُنھوں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دِن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ کعب بن سور الازدی کو اُن کے مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا اور اُنھوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے اختیار ہے کہ جتنی چاہیں عبادت کریں مگر چوتھی رات لازماً اُن کی بیوی کا حق ہے۔[1]

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۹۹، المائدہ حاشیہ ۱۰۴)

نکاح کرنے والے کے لیے اللہ کی مدد: ثَلٰثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمْ۔ اَلنَّاكِحُ يُرِيْدُ الْعَفَافَ، وَالْمُكَاتَبُ يُرِيْدُ الْاَدَاءَ، وَالْغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[2] (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد) (حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا) تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذِمّے ہے۔ ایک وہ شخص جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے، دُوسرے وہ مکاتب جو مال کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے، تیسرے وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے۔

اعلانِ نکاح کا مقصد: نکاح کا مقصد انسان کے جذبۂ شہوت رانی کو ایک حد کے اندر محدود کرنا، اور ایک ضابطہ سے منضبط کرنا اور مرد و زن کے تعلق کو ایک باقاعدہ تمدنی تعلق کی صورت میں قائم کرنا ہے۔ اِسی لیے اعلان کی شرط لگائی گئی ہے کہ سوسائٹی میں یہ اَمر معلوم و مشتہر ہو جائے کہ فلاں عورت فلاں مَرد کے لیے مختص ہو چکی ہے، اس کے بطن سے جو اُولاد پیدا ہو گی وہ فلاں شخص کی ہوگی۔ اور اِس عورت کے ساتھ کسی دُوسرے شخص کا زوجی تعلق نہ ہوگا۔ یہ سب اغراض ملکِ یمین سے بھی پوری ہو سکتی ہیں۔ سوسائٹی میں یہ اَمر معلوم و مشتہر ہوتا ہے کہ فلاں لونڈی فلاں شخص کی مملوکہ ہے۔ کسی دُوسرے شخص کے لیے اس لونڈی سے زوجی تعلق پیدا کرنا جائز نہیں ہوتا جب تک کہ مالک اپنی رضامندی سے اِس کو کسی اور کے نکاح میں نہ دے دے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۳۷۵)

انسان پر اُس کے نفس کا حق: لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ[3] تیرے اُوپر خود تیرے اپنے بھی حقوق ہیں۔

اِسلامی شریعت چونکہ انسان کی فلاح و بہبود چاہتی ہے۔ اِس لیے وہ اِس کو خبر دار کرتی ہے کہ تیرے اُوپر خود تیرے اپنے بھی حقوق ہیں۔ وہ اِن تمام چیزوں سے اِس کو روکتی ہے جو اُس کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ مثلاً شراب، تاڑی، افیون اور دُوسری نشہ آور چیزیں، سؤر کا گوشت، درندے اور زہریلے جانور، ناپاک حیوانات، خون اور مُردار جانور وغیرہ۔ کیونکہ انسان کی صحت اور اخلاق اور عقلی و رُوحانی قوتوں پر اِن چیزوں کا بہت بُرا اثر ہوتا ہے۔ اِن کے مقابلے میں وہ پاک اور مفید چیزوں کو اُس کے لیے حلال کرتی ہے اور اُس سے کہتی ہے کہ تو اپنے جسم کو پاک غذاؤں سے محروم نہ کر کیونکہ تیرے جسم کا تیرے اُوپر حق ہے۔ وہ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، اشاعتِ اوّل، ج ۵ ص ۲۰ ۲- ایضاً، ج ۵ ص ۲۲ ۳- ایضاً، ج ۵ ص ۲۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کو ننگا رہنے سے روکتی ہے اور اُسے حکم دیتی ہے کہ خدا نے تیرے جسم کے لیے جو زینتِ لباس اتاری ہے اس سے فائدہ اُٹھا اور اپنے جسم کے اُن حصّوں کو ڈھانک رکھ جنھیں کھولنا بے شرمی ہے۔

وہ اُس کو روزی کمانے کا حکم دیتی ہے اور اُس سے کہتی ہے کہ بیکار نہ بیٹھ، بھیک نہ مانگ، بھوکا نہ مر، خدا نے جو قوتیں تجھے دی ہیں اُن سے کام لے اور جس قدر ذرائع زمین و آسمان میں تیری پرورش اور آسایش کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اُن کو جائز طریقوں سے حاصل کر۔ وہ اُس کو نفسانی خواہشات کے دبانے سے روکتی ہے اور اُسے حکم دیتی ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نکاح کر۔ وہ اُس کو نفس کُشی سے منع کرتی ہے اور اُس سے کہتی ہے کہ تو آرام و آسائش اور زندگی کے لطف کو اپنے اُوپر حرام نہ کرلے۔ اگر تو رُوحانی ترقی اور خدا سے قُرب اور آخرت کی نجات چاہتا ہے تو اس کے لیے دُنیا چھوڑنے کی ضرورت نہیں، اِسی دُنیا میں پوری اور پکّی دینداری کرتے ہوئے خدا کو یاد کرنا اور اُس کی نافرمانی سے ڈرنا اور اُس کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرنا دُنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کا ذریعہ ہے۔

وہ خودکُشی کو حرام کرتی ہے اور اُس سے کہتی ہے کہ تیری جان دراصل خدا کی ملکیت ہے اور یہ امانت تجھے اس لیے دی گئی ہے کہ تو خدا کی مقرر کی ہوئی مدت تک اِس سے کام لے نہ اس لیے کہ اس کو ضائع کردے۔

(دینیات، تیسواں ایڈیشن، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۱-۱۶۲)

غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے حکم: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ (النور ۲۴: ۳۲) تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں اور تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں اُن کے نکاح کردو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کردے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔

اصل میں لفظ اَیَامٰی استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ اَیامیٰ جمع ہے اَیِّم کی، اور اَیِّم ہر اُس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو اور ہر اُس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اِسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مجرّد کیا ہے۔

لونڈی و غلام کی صالحیت: [فرمایا: تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں، اُن کے نکاح کردو، یعنی] جن کا رویہ تمھارے ساتھ بھی اچھا ہو اور جن میں تم یہ صلاحیت بھی پاؤ کہ وہ ازدواجی زندگی نباہ لیں گے۔ مالک کے ساتھ جس غلام یا لونڈی کا رویہ ٹھیک نہ ہو اور جس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بھی نہ ہو کہ شادی ہونے کے بعد اپنے شریک زندگی کے ساتھ اُس کا نباہ ہو سکے گا اُس کا نکاح کر دینے کی ذِمّہ داری مالک پر نہیں ڈالی گئی ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دُوسرے فرد کی زندگی کو خراب کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ شرط آزاد آدمیوں کے معاملے میں نہیں لگائی گئی، کیونکہ آزاد آدمی کے نکاح میں حصہ لینے والے کی ذِمّہ داری درحقیقت ایک مشیر، ایک معاون اور ایک ذریعۂ تعارف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل رشتہ ناکح اور منکوح کی اپنی ہی رضامندی سے ہوتا ہے، لیکن غلام یا لونڈی کا رشتہ کرنے کی پوری ذِمّہ داری اُس کے مالک پر ہوتی ہے۔ وہ اگر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جان بوجھ کر کسی غریب کو ایک بدمزاج اور بدسرشت آدمی کے ساتھ بندھوا دے تو اُس کا سارا وبال اُسی کے سر ہوگا۔

کیا مالک پر اپنے غلام کا نِکاح کرنا واجب ہے: بظاہر یہاں صیغۂ اَمر دیکھ کر علما کے ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ حالانکہ معاملے کی نوعیت خود بتا رہی ہے کہ یہ حکم وُجوب کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نِکاح کر دینا دُوسروں پر واجب کیسے ہوسکتا ہے؟ آخر کس کا کس سے نِکاح کر دینا واجب ہو؟ اور بالفرض اگر واجب ہو بھی تو خود اُس شخص کی کیا حیثیت رہی جس کا نِکاح پیشِ نظر ہے؟ کیا دُوسرے لوگ جہاں بھی اُس کا نِکاح کرنا چاہیں اُسے قبول کر لینا چاہیے؟ اگر یہ اُس پر فرض ہے تو گویا اُس کے نِکاح میں اُس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں اور اگر اُسے انکار کا حق ہے تو جن پر یہ کام واجب ہے وہ آخر اپنے فرض سے کس طرح سبکدوش ہوں؟ انھی پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جمہور فقہا نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اِس کام کو واجب نہیں، بلکہ مندوب قرار دیتا ہے۔ یعنی اِس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بن بیاہے نہ بیٹھے رہیں۔ خاندان والے، دوست، ہمسائے، سب اِس معاملے میں دلچسپی لیں اور جس کا کوئی نہ ہو اُس کو حکومت اِس کام میں مدد دے۔

غنی کرنے کا مطلب؟: اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کا بھی نِکاح ہو جائے گا اللہ اُس کو مال دار بنا دے گا، بلکہ مدعا یہ ہے کہ لوگ اِس معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اِس میں لڑکی والوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ نیک اور شریف آدمی اگر اُن کے ہاں پیغام دے تو محض اِس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کر دیں۔ لڑکے والوں کو بھی تلقین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اِس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے۔ اور نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ کشایش کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ تھوڑی آمدنی ہو تو اللہ کے بھروسے پر شادی کر ڈالنی چاہیے۔ بسا اَوقات خود شادی ہی آدمی کے حالات درست ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آ جاتے ہیں۔ ذِمّہ داریاں سر پر آ جانے کے بعد آدمی خود بھی پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے لگتا ہے۔ بیوی معاش کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا لکھا ہے، اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اچھے حالات بُرے حالات میں بھی بدل سکتے ہیں اور بُرے حالات اچھے حالات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو ضرورت سے زیادہ حساب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۷-۳۹۸، النور حواشی ۵۰-۵۳)

نِکاح کے متفرق مسائل

نِکاح کا موقع نہ پانے والوں کے لیے حکم: وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ (النور ۲۴:۳۳) اور جو نِکاح کا موقع نہ پائیں اُنھیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

[اس] کی بہترین تفسیر وہ احادیث ہیں جو اس سلسلے میں نبی ﷺ سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ أَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ[1] (بخاری و مسلم) نوجوانو! تم میں سے جو شخص شادی کر سکتا ہو اُسے کر لینی چاہیے کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے، کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ثَلٰثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمْ. اَلنَّاكِحُ يُرِيْدُ الْعَفَافَ، وَالْمُكَاتَبُ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ، وَالْغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[2] (ترمذی، نسائی، ابن ماجه، احمد) تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذِمّے ہے۔ ایک وہ شخص جو پاکدامن رہنے کے لیے نِکاح کرے، دُوسرے وہ مکاتب جو مال کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے، تیسرے وہ شخص جو اللہ کی رہ میں جہاد کے لیے نکلے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص۳۹۹، النور حاشیہ ۵۴)

نِکاح سے پہلے عورت کو دیکھنا: اجنبی عورت کو نِکاح کے لیے دیکھنا اور تفصیلی نظر کے ساتھ دیکھنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ احادیث میں اِس کا حُکم وارد ہوا ہے اور خود نبی ﷺ نے اِس غرض کے لیے عورت کو دیکھا ہے۔

عَنِ الْمُغِيْرَةِ ابْنِ شُعْبَةَ اَنَّهُ خَطَبَ امْرَأَةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اُنْظُرْ اِلَيْهَا فَإِنَّهُ اَحْرٰى اَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا[3] (ترمذی، باب ما جاء فی النظر الی المخطوبة) مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ انھوں ایک عورت کو نِکاح کا پیغام دیا۔ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اُس کو دیکھ لو، کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت و اتفاق پیدا کرنے کے لیے مناسب تر ہوگا۔

عَنْ سَهْلِ ابْنِ سَعْدٍ اَنَّ امْرَأَةً جَاءَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! جِئْتُ لِاَهَبَ لَكَ نَفْسِيْ، فَنَظَرَ اِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَصَعَّدَ النَّظَرَ اِلَيْهَا[4] (بخاری، باب النظر الی المرأة قبل التزویج) سہل ابن سعدؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور بولی کہ میں اپنے آپ کو حضور ﷺ کے نِکاح میں دینے کے لیے آئی ہوں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے نظر اُٹھائی اور اس کو دیکھا۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: كُنْتُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَاَخْبَرَهُ اَنَّهُ تَزَوَّجَ امْرَأَةً مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اَنَظَرْتَ اِلَيْهَا؟ قَالَ: لَا قَالَ: فَاذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّ فِيْ اَعْيُنِ الْاَنْصَارِ شَيْئًا[5] (مسلم، باب ندب من اراد نِكاح امرأة الی ان ینظر الی وجهها) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے انصار میں سے ایک عورت کے ساتھ نِکاح کا ارادہ کیا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تو نے اُسے دیکھا ہے؟ اُس نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: جا اور اُس کو دیکھ لے۔ کیونکہ انصار کی آنکھوں میں عموماً کچھ عیب ہوتا ہے۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵ ص۱۷
۲- ایضاً، ج۵، ص ۲۲
۳- ایضاً، ج۵ ص۳۰۹
۴- ایضاً، ج۵ ص۳۱۰
۵- ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عَنْ جَابِرِبْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ: اِذَا خَطَبَ اَحَدُکُمُ الْمَرْأَۃَ فَاِنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی مَا یَدْعُوْہُ اِلٰی نِکَاحِھَا فَلْیَفْعَلْ[1] (ابوداؤد، باب فی الرجل ینظر الی المرأۃ وھو یرید تزویجھا)

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو حتی الامکان اسے دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اس میں کوئی چیز ہے جو اس کو اس عورت کے ساتھ نکاح کی رغبت دلانے والی ہو۔

(پردہ، جون ۱۹۶۷ء، ۲۹۹-۳۰۱)

مروّجہ رسوم اور اُن کی اصلاح:

سوال: ہمارے اطراف میں کچھ اس قسم کے اُصول و مراسم شائع ہیں جن کے بارے میں اگر فقہی موشگافیوں سے کام لینا شروع کر دیا جائے تو اُن کو ناجائز اور غیر شرعی رسم کہنا مشکل ہوگا..... لیکن اگر ان مراسم کے اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ اُن کی پابندی اور التزام اس حد تک ہے کہ اس کے بغیر کامیابی ہی نہیں ہوتی اور کوئی کس درجے کا آدمی کیوں نہ ہو، ان کی پابندی قبول کیے بغیر ازدواجی زندگی کا آغاز کر ہی نہیں سکتا تو بالکل صفائی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیزیں اب صرف مباح کے درجے پر باقی نہیں رہی ہیں، بلکہ یہ سب برادری کا ایک قانون بن گئی ہیں اور ایسا قانون کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا گویا مجرم متصور رہوتا ہے..... کیا جماعت اسلامی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے اراکین کو "غیر شرعی رسوم" کی وضاحت اس طرح کر کے بتلائے کہ یہ "اباحت" کی قبا چاک ہو جائے اور وہ اپنی تقریبات کو بالکل مسنون طریقے پر منائیں؟

جواب: شادی بیاہ وغیرہ تقریبات کی رسوم کی پوری پوری اصلاح اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دینی زندگی اپنی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہوئی اس مرحلے پر نہ پہنچ جائے جہاں اُن چیزوں کی اصلاح ممکن ہو۔ اس وقت تک ہمارے ارکان کو زیادہ تر صرف ان چیزوں سے اجتناب پر اصرار کرنا چاہیے جن کو صریحاً خلافِ شریعت کہا جا سکتا ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو معاشرتِ اسلامی کی رُوح کے تو خلاف ہیں مگر مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں قانون و شریعت بنی ہوئی ہیں تو وہ ہمارے ذوقِ اسلامی پر خواہ کتنی ہی گراں ہوں، لیکن سرِدست ہمیں اُن کو اس اُمید پر گوارا کر لینا چاہیے کہ بتدریج اِن کی اصلاح ہو سکے گی۔ مگر یہ گوارا کرنا رضامندی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ احتجاج اور فہمائش کے ساتھ ہو۔ یعنی ہر ایسے موقع پر یہ واضح کر دیا جائے کہ شریعت تو اس طرح کے نکاح چاہتی ہے، جیسے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اور دُوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہوتے تھے، لیکن اگر تم لوگ یہ تکلّفات کیے بغیر نہیں مانتے تو مجبوراً ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ وقت آئے کہ جب تم نبی ﷺ اور اصحابِ نبی رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح سادہ نکاح کرنے کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھو۔

ہمارا یہ رویّہ تو عام لوگوں کے لیے ہے جن سے ہم مختلف قسم کے روابط پیدا کرنے اور جن کے ساتھ کئی طرح کے دنیوی اُمور میں معاملہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن خود ارکانِ جماعت کے درمیان ایسے جتنے روابط اور معاملات بھی ہوں اُنھیں رسوم کی

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۱۰ ۲- ایضاً، ج ۵ ص ۳۱۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آلودگیوں سے پاک کر کے سادگی کی اُس سطح پر لے آنا چاہیے جس تک نبیؐ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے انھیں پہنچایا تھا۔ ہمارے معاملات میں مباحات کو مباحات ہی کی حد تک رہنا چاہیے۔ رواج کی رَو میں بہنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو بغاوت کرنا بھی چاہتے ہیں مگر پہل کی جسارت نہیں کر سکتے۔ رسموں کی بیڑیوں سے نجات حاصل تو کرنا چاہتے ہیں مگر دوسروں سے پہلے انھیں کاٹنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اپنی پیٹھوں پر لدے ہوئے رواجوں کے بوجھوں سے ان کی کمریں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں، مگران کو پٹخ دینے میں پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ پہل اور پیش قدمی اب ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ ہمارے ہر ساتھی کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے معاملات اور تقریبات کو گوناگوں پابندیوں سے آزاد کرنے میں پوری بے باکی سے پہل کرے اور لوگوں کی ''ناک'' بچانے کے لیے خود نکو بن کر معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرے۔ خالص اسلامی انداز میں تقریبات اور معاملات کو سرانجام دینے کی مثالیں اگر جگہ جگہ ایک دفعہ قائم کر دی جائیں گی تو سوسائٹی کا کچھ نہ کچھ عنصر ان کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور اس طرح رفتہ رفتہ احوال بدل سکیں گے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ص ۱۷۲-۱۷۴، اشاعتِ اوّل ستمبر ۵۱ء، بحوالہ ترجمان القرآن، اکتوبر ۴۶ء)

مفلس اور مقروض کے لیے شادی کی رسوم:

سوال: ایک مفلس مسلمان اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ افلاس کے باوجود دنیا والوں کا ساتھ دینے کا بھی خواہشمند ہے۔ یعنی شادی ذرا تزک و احتشام سے کر کے وقتی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رہنمائی کیسے کی جائے؟

جواب: ایسا شخص جو خود جانتا ہے کہ وہ اتنا خرچ کرنے کے قابل نہیں ہے اور پھر محض دُنیا کے دکھاوے اور اپنی غلط خواہشات کی تسکین کی خاطر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہتا ہے وہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو معصیت کے گڑھے میں پھینک رہا ہے۔ اپنی غلط خواہش کی وجہ سے یا تو وہ سودی قرض لے گا یا کسی ہمدرد کی جیب پر ڈاکہ ڈالے گا اور اگر اُسے قرضِ حسن مل گیا، جس کی اُمید نہیں ہے تو اُسے مار کھائے گا اور اس سلسلے میں خدا جانے کتنے جھوٹ اور کتنی بے ایمانیاں اُس سے سرزد ہوں گی۔ آخر ایسے شخص کو کیا سمجھایا جا سکتا ہے جو شخص اپنے نفس کی ایک غلط خواہش کی خاطر اتنے بڑے بڑے گناہ جانتے بوجھتے اپنے سر لینے پر آمادہ ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ص ۱۶۶-۱۶۷)

سوال: ایک مقروض مسلمان جو تمام اثاثہ بیچ کر بھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ بیٹے بیٹیوں کی شادی کرنا چاہے تو فریق ثانی کی طرف سے ایسی شرائط سامنے آتی ہیں جو بہر حال صَرفِ کثیر چاہتی ہیں۔ اس کے لیے کیا راہِ عمل ہے؟

جواب: ایسے شخص کو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں اِن لوگوں میں کرنی چاہییں جو مالی حیثیت سے اسی جیسے ہوں اور جو اُس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چادر سے نہ وہ خود زیادہ پاؤں پھیلائیں اور نہ دُوسرے کو زیادہ پاؤں پھیلانے پر مجبور کریں۔ اپنے سے بہتر مالی حالات رکھنے والوں میں شادی بیاہ کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشکلات میں مبتلا کرنا ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۶۶-۱۶۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رشتے میں لڑکے کی طرف سے پہل کا انتظار

(س) عموماً لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ دوسری طرف سے نسبت کے پیغام میں پہل ہو۔ چنانچہ اِسی انتظار میں بعض اوقات لڑکیاں جوانی کو طے کر کے بڑھاپے کی سرحد میں جا داخل ہوتی ہیں اور کنواری رہ جاتی ہیں۔ اِس معاملے میں اِسلام کیا کہتا ہے؟

(ج) یہ صورت تو کچھ فطری سی ہے، لیکن اس کو حد سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی لڑکی جوان اور شادی کے قابل ہو چکی ہو اور اُسے کوئی مناسب لڑکا نظر آئے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے پیغام دینے میں ابتدا کرے۔ اس کی مثالیں خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ملتی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت میں کوئی ذلت کی بات ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو منع فرما دیتے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۶۶-۱۶۸)

منگنی اور جہیز وغیرہ کی شرعی حیثیت

(س) موجودہ مسلمان شادی بیاہ، پیدایش اور موت کی تقریبات پر چھٹی، چلّہ، باجہ، منگنی، جہیز اور اس طرح چالیسواں، قُل وغیرہ کی جو رسوم انجام دیتے ہیں اِن کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟

(ج) یہ سب چیزیں وہ پھندے ہیں جو لوگوں نے اپنے گلے میں خود ڈال لیے ہیں۔ اِن میں پھنس کر اِن کی زندگی آپ تنگ ہوئی جا رہی ہے، لیکن لوگ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اِن کو کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اِس کا علاج یہ نہیں ہے کہ براہِ راست اِن رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے، بلکہ صِرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن اور سنّت کی طرف دعوت دی جائے۔ خدا اور رسول کے طریقے پر لوگ آ جائیں تو بڑی خرابیاں بھی دُور ہوں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی نہ رہیں گی۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۶۷-۱۶۹)

جہیز کی موجودہ صورت: جہیز کا دینا ناجائز نہیں مگر آج کل اِس کو جو شکل دے دی گئی ہے وہ بُری ہے۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جہیز کے بارے میں مجبور نہیں کیا۔ اگر کوئی جہیز نہ بھی ہو تو بھی نِکاح ہو جاتا ہے۔ دراصل ایک مسلمان معاشرے میں عدمِ توازن اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کا حُکم نہیں دیا لوگ وہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ''کرنا پڑتا ہے''۔ لیکن جن چیزوں کا حُکم دیا گیا ہے اُنھیں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً میراث کے جو حصے اللہ نے مقرر کیے ہیں اُنھیں ادا نہیں کرتے۔ اَیسا طرزِ عمل کبھی مُفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

منگنی کا شرعی حکم

(س) کیا شرعی لحاظ سے خطبہ نکاح کا حکم رکھتا ہے؟ عوام اس کو ایجاب وقبول کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر لڑکی کے والدین ٹھیری ہوئی بات کو رد کر دیں تو برادری میں ان کا مقاطعہ تک ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر والدین اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کر دیں تو کیا یہ فعل درست ہوگا؟

(ج) منگنی محض ایک قول وقرار ہے اس بات کا کہ آئندہ اس لڑکی کا نکاح فلاں شخص سے کیا جائے گا۔ یہ بجائے خود نکاح نہیں ہے۔ البتہ فریقین کے درمیان ایک طرح کا عہد و پیمان ضرور ہے جس سے پھر جانا درست نہیں۔ الا یہ کہ اس کے لیے کوئی معقول وجہ موجود ہو۔ اگر منگنی کے بعد فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کا کوئی ایسا عیب ظاہر ہو جو پہلے معلوم نہ تھا یا چھپایا گیا تھا، تو بلاشبہ اس قول وقرار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کی کسی معقول وجہ کے بغیر یوں ہی اُسے ختم کر دینا یا کسی غیر معقول وجہ کی بنا پر اس سے پھر جانا ہرگز جائز نہیں۔ دوسری بدعہدیوں کی طرح یہ بھی ایک بدعہدی ہے جس پر انسان خدا کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ص ۱۶۶-۱۶۸، اشاعتِ تیرھویں مارچ ۱۹۸۲ء بحوالہ ترجمان القرآن، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

ٹیلی فون پر نکاح

(س) کیا ٹیلی فون پر نکاح جائز ہے؟

(ج) کسی عدالت میں ٹیلی فون پر گواہی دے کر دیکھیے کہ قبول ہوتی ہے یا نہیں؟

(س) اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلی فون پر نکاح جائز نہیں، لیکن جن لوگوں نے اس طرح نکاح کر لیے ہیں کیا انھیں تجدیدِ نکاح کرانی چاہیے یا اور کیا صورت ہو؟

(ج) میں اس بارے میں کیا کہوں، ٹیلی فون پر نکاح کی قانونی اور شرعی حیثیت تو کچھ نہیں۔ یہ ایک باقاعدہ حرکت ہے اور عام لوگوں کی جہالت اور دینی معاملات میں بے حسی کا مظہر ہے۔ بلکہ اس سے غیرت وحمیت کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ایک شخص جو نکاح کے وقت حاضر ہونے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا۔ کیا اس قابل ہے کہ بیٹی اس کے نکاح میں دے دی جائے۔

(س) رشتوں کی کم یابی بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے......!

(ج) ایسی بھی کم یابی نہیں ہے۔ جو لوگ اپنی بیٹیوں کو اس طرح نکاح میں دے دیتے ہیں، وہ دراصل رشتوں کی کم یابی کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنی حماقت اور جاہ پرستی کے سبب ایسا کرتے ہیں۔[1]

۱- اس بات کی تائید کرتے ہوئے ایک آدمی نے کہا: ''اس سلسلے میں ہماری مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ لڑکیوں کو انگلستان میں مقیم لڑکوں کے نکاح میں دے دیتے ہیں، محض اس وجہ سے کہ وہ انگلستان میں رہتے ہیں۔ ایک بار ایک لڑکی کا نکاح ٹیلی فون پر انگلستان میں مقیم ایک نوجوان سے کر دیا گیا اور لڑکی کو یہاں سے لندن روانہ کیا گیا۔ جب لڑکی وہاں پہنچی تو لڑکے نے اُسے دیکھ کر ناپسندیدگی ظاہر کی اور لڑکی کو فوراً ہی واپس پاکستان بھیج دیا''۔
(۵- اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مغربی ملکوں میں جو لوگ سول میرج کرتے ہیں وہ بھی عدالت میں جا کر حاضر ہوتے ہیں، لیکن یہ لوگ ٹیلی فون پر ہی نکاح کر لیتے ہیں، جبکہ اسلام کے قوانینِ نکاح کے مطابق ایجاب وقبول انتہائی ضروری ہے اور ایجاب وقبول کے لیے گواہوں کی موجودگی لازمی ہے۔ سوال یہ ہے کہ (ٹیلی فون پر نکاح کی صورت میں) یہ گواہی کس طرح ہوگی؟

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ۱۹۰-۱۹۱)

خطبہ کے بغیر نکاح: جس نکاح میں ایجاب وقبول ہو گیا ہو وہ نکاح ہو جاتا ہے، خطبہ پڑھنے پر نکاح کی صحت موقوف نہیں ہے۔ خطبہ تو ایک سنت ہے جس سے مقصود برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت طلب کرنا ہے۔ اس کو جان بوجھ کر ترک کرنا بہت بُرا ہے اور اس کے ترک کو رواج بنا لینا اور بھی زیادہ سخت قابلِ ملامت فعل ہے۔ لیکن نکاح شرعاً جس چیز سے منعقد ہوتا ہے وہ دو گواہوں کے سامنے محض ایجاب وقبول ہے۔

(مکتوباتِ سیّد مودودی، بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء: ص ۱۰۶ مکتوب نمبر ۳۹)

نکاحِ شِغار (اَدلے بدلے کا نکاح):

سوال: مسلمانوں میں عموماً رواج ہو گیا ہے کہ دو شخص باہم لڑکوں لڑکیوں کی شادی ادل بدل کے اُصول پر کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی اشخاص مل کر اس طرح کا ادل بدل کرتے ہیں۔ مثلاً زید بکر کے لڑکے کے ساتھ، بکر عمر کے لڑکے کے ساتھ اور عمر زید کے لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں عموماً مہر کی ایک ہی مقدار ہوتی ہے۔ بعض علمائے دین اس طریقے کو شِغار کہتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شِغار کو نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

بحالاتِ موجودہ ایک غریب آدمی یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور بھی ہوتا ہے، کیونکہ جس آسانی سے دُوسرے لوگ اس کی لڑکی کو قبول کرنے پر تیار ہوتے ہیں اس آسانی سے اس کے لڑکے کو رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ براہِ کرم اس مسئلے کی حقیقت واضح فرما دیں۔

جواب: عام طور پر ادلے بدلے کے نکاح کا جو طریقہ ہمارے ملک میں رائج ہے وہ دراصل اسی شِغار کی تعریف میں آتا ہے جس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ شِغار کی تین صورتیں ہیں اور وہ سب ناجائز ہیں۔

ایک یہ کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس شرط پر اپنی لڑکی دے کہ وہ اس کو بدلے میں اپنی لڑکی دے اور اُن میں ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ شرط تو وہی ادلے بدلے کی ہو مگر دونوں کے برابر برابر مہر (مثلاً ۵۰،۵۰ ہزار روپیہ) مقرر کیے جائیں اور محض فرضی طور پر فریقین میں ان مساوی رقموں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ دونوں لڑکیوں کو عملاً ایک پیسہ بھی نہ ملے۔

تیسرے یہ کہ ادلے بدلے کا معاملہ فریقین میں صرف زبانی طور پر ہی طے نہ ہو، بلکہ ایک لڑکی کے نکاح میں دوسری

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لڑکی کا نکاح شرط کے طور پر شامل ہو۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے گی، شریعت کے خلاف ہو گی۔ پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تو تمام فقہا کا اتفاق ہے۔ البتہ باقی دو صورتوں کے معاملے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن مجھے دلائل شرعیہ کی بنا پر یہ اطمینان حاصل ہے کہ یہ تینوں صورتیں شغارِ ممنوع کی تعریف میں آتی ہیں اور تینوں صورتوں میں اُس معاشرتی فساد کے اسباب یکساں طور پر موجود ہیں جن کی وجہ سے شغار کو منع کیا گیا ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، ص ۱۹۴-۱۹۶، اشاعت تیرہویں مارچ ۱۹۸۲ء بحوالہ ترجمان القرآن، اپریل، مئی، ۱۹۵۲ء)

کم سنی میں نکاح: وَ الّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ (الطلاق ۶۵: ۴) اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اُن کے معاملے میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمھیں معلوم ہو کہ) اِن کی عدت تین مہینے ہے اور یہی حکم اُن کا ہے جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔

اِس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اِس عورت کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کر چکا ہو، کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں[1]۔ اس لیے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنھیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو اُسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا[2]۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۷۰، الطلاق حاشیہ ۱۳)

شادی بیاہ اور موسیقی

سوال (۱) کیا آلاتِ موسیقی بنانا اور اُن کی تجارت کرنا ناجائز ہے؟ (۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا ناجائز ہے؟ نیز تفریحاً اِن کا استعمال کیسا ہے؟ (۳) اگر جواب نفی میں ہو تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود تو ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن ایسے تعلق داروں کے یہاں بخوفِ کشیدگی چلے جاتے ہیں جو آلات موسیقی کا استعمال کرتے ہیں۔ (۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں آلاتِ موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو؟ (۵) آلاتِ لہو کے

۱- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ (الاحزاب ۳۳: ۴۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھاری طرف سے اِن پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔

۲- **سوال** میرے خیال میں نابالغ لڑکی یا لڑکے کا نکاح ناجائز ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب اگر کوئی شخص اپنی شریعت الگ رکھتا ہو تو اور بات ہے، لیکن اسلامی شریعت میں یہ جائز ہے۔ قرآنِ حکیم میں صاف حکم ہے کہ جب عورتوں کو ابھی حیض نہیں آیا ہے، ان کی عدت تین ماہ ہے اور اس میں نابالغ لڑکیاں بھی شامل ہیں اور نکاح کے بغیر طلاق اور اُس کی عدت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی شخص اگر یہ کہے کہ میرا خیال ایسا ہے تو یہ کسی مسلمان کا کام نہیں (استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۳-۳۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں دَف ہی ایک موسیقی کا آلہ عرب میں رائج تھا اور آپ نے اُس کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا ہمارے زمانے میں دَف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہوگئی ہیں تو اُن کا استعمال کیوں ناروا ہو؟ (۶) کیا دَف آلاتِ لہو میں شامل ہے؟

ج (۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں آلاتِ موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں''۔ اب یہ کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ جو نبی اِس کام کے لیے بھیجا گیا ہو، اس کے پیرو انھی آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوّتیں استعمال کریں۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور، باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں۔ حدیث میں جس حد تک اجازت پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شادی اور عید کے مواقع پر دَف کے ساتھ کچھ گا بجالیا جائے۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے۔ جو رسول اور اصحابِ رسول کے ساتھ اپنا حشر چاہتے ہوں، اُن کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں جنھیں احکامِ شریعت کی پروا نہیں۔ ورنہ جن کو اُن لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں، اُنھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ جب تمھاری دُنیا فاجروں کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی اُنھیں کا ساتھ نصیب ہوگا۔

(۴) جواب ۳ ملاحظہ ہو۔ مگر یہ خیال رہے کہ مجلس نِکاح میں جبکہ ایجاب وقبول ہو رہا ہو اور منکرات وفواحش کی نمایش نہ ہو رہی ہو، شرکت کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی، شرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمھارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمھاری مسرّت میں دِل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم اُن میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم اِن خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دَف کے سوا اُس زمانے میں اور کوئی دوسرا آلہ موسیقی نہ تھا۔ ایران اور رُوم اور مصر کی تمدّنی تاریخ اور خود عرب جاہلیت کی تمدّنی تاریخ سے جو شخص جاہل محض ہو وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعارِ جاہلیت میں ملتے ہیں۔

(۶) دَف کا نام اگر آلاتِ موسیقی میں شامل ہو بھی تو اُس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبی ﷺ نے اُس کی اجازت دی ہے، اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آدمی جا سکتا ہے۔ اِس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو اُس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اِس نبی کے پیروؤں میں اپنا نام لکھوائے جو آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۲۰۴-۲۰۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سول میرج

س [کیا اِسلامی حکومت میں ایک مَرد اور عورت کو اپنی پسند سے civil marriage کرنے کا حق حاصل ہے؟]

ج سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملے میں، یا کسی اَیسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرنے کے معاملے میں جو اِسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نِکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور مسلمان مَرد اُس کے عشق میں مبتلا ہو کر اِس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہوگا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اُسے اِسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اِسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اِس کی اجازت دے؟ اور اِسلامی عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اِس طریقے پر شادیاں کروائے؟

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۶۷-۲۶۸)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

www.kitabosunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

مَہر

قرآن وحدیث میں مَہر کا ذِکر

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝ (النسآء ۴:۲۴) اِن عورتوں کے سوا جتنی عورتیں ہیں اُنھیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمھارے لیے حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ حصارِ نکاح میں اُن کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو ازدواجی زندگی کا لُطف تم اُن سے اُٹھاؤ اِس کے بدلے اُن کے مَہر بطورِ فرض کے ادا کرو۔ البتہ مَہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمھارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ علیم و دانا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا۝ (النسآء ۴:۴) اور عورتوں کے مہر خوش دِلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مَہر کا کوئی حصّہ تمھیں معاف کر دیں تو اُسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النسآء ۴:۲۵) پس لونڈیوں کے ساتھ اُن کے مالکوں کی اجازت سے نِکاح کرو اور مناسب طور پر اُن کے مَہر ادا کر دو۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (المائدہ ۵:۵) اور حلال کی گئیں تمھارے لیے عزّت دار عورتیں مومنوں میں سے اور عزّت دار عورتیں اُن لوگوں میں سے جن کے پاس تم سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے جب کہ تم اُن کے مَہر ادا کر دو۔

وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (النسآء ۴:۲۱) اور تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم میں سے ایک دُوسرے سے اختلاط کر چکا ہے۔

اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مَہر ہی وہ چیز ہے جس کے عوض مَرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اِس کی مزید تصریح وہ احادیث کرتی ہیں جو اِس معنی میں نبی ﷺ سے مروی ہیں۔ صحاحِ ستّہ اور دارمی اور مسند احمد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے اَحَقُّ الشُّرُوْطِ اَنْ تُوْفُوْا بِہٖ مَاسْتَحْلَلْتُمْ بِہِ الْفُرُوْجَ[1]۔ تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اِس کی مستحق ہے کہ تم اُسے پورا کرو وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔

لِعان کا وہ مشہور مقدمہ، جس میں نبی ﷺ نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اُس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہو چکی تو شوہر نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرا مال مجھے واپس دلوایا جائے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا:

لَا مَالَ لَکَ، اِنْ کُنْتَ صَدَقْتَ عَلَیْھَا فَھُوَ بِمَااسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِھَا وَ اِنْ کُنْتَ کَذِبْتَ عَلَیْھَا فَذَالِکَ اَبْعَدُلَکَ مِنْھَا[2] (مسلم، کتاب اللعان) مال لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تو نے اِس پر سچا الزام لگایا ہے تو اس کی شرمگاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی اُس کے معاوضے میں وہ مال ادا ہو چکا اور اگر تو نے اُس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھ سے اور بھی زیادہ دُور ہو گا۔

اِس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں لائے ہیں کہ مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَۃً بِصِدَاقٍ وَّ نَوٰی اَنْ لَّا یُؤَدِّیَہٗ فَھُوَ زَانٍ[3]۔ جس نے کسی عورت سے نِکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ یہ مَہر دینا نہیں ہے وہ زانی ہے۔

اِسلامی قانون میں مَہر کی حیثیت

اِسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرّر کیا گیا ہے اُس میں مَرد کی حیثیت قوّام کی ہے اور اِس حیثیت میں اُس پر حسبِ ذیل فرض عائد ہوتا ہے:

یہ کہ وہ عورت کا مَہر ادا کرے، کیونکہ اُس کو عورت پر جو حقوقِ زوجیت حاصل ہوئے ہیں وہ مَہر کا معاوضہ ہیں...... اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مَرد ہی قوامیت کا مستحق ہے، مگر بالفعل یہ مرتبہ اُس کو اِس مال کے معاوضے میں ملتا ہے جو وہ مَہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے[4]۔ اِس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے۔

پس نِکاح کے وقت عورت اور مَرد کے درمیان مَہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اُس کو پورا کرنا مَرد پر لازم ہے۔ اگر وہ اس قرار

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵، ص۹۵

۲- ایضاً، ج۵، ص۱۰۰

۳- ایضاً، ج۵، ص۹۸-۹۹

۴- س: کیا بغیر مہر کے نکاح جائز ہے؟

ج: نکاح بلا مَہر ہو سکتا ہے، لیکن اسلامی فقہ کی رُو سے اِس طرح کے نکاح میں مَہرِ مثل آپ سے آپ لازم آجاتا ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص۱۲۳۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

داد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبک دوش ہونے کی کوئی صورت مرد کے لیے بجز اس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اس کو مہلت[1] دے یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کر دے۔ یا اس پر احسان کر کے برضا و رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے..... فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (النسآء ۴:۴) پھر اگر وہ خوشدلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اُس کو مزے سے کھاؤ۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ (النسآء ۴:۴) اور اگر تم قرارداد کے بعد اُس میں کم زیادہ پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۳۱-۳۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ معاف کر دیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر کو اُس کو ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ اُس کا مطالبہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے مہر یا اس کا کوئی حصہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۲، النساء حاشیہ ۷)

مہر کی ادائیگی مؤجل یا معجل

اِن تمام نصوص سے مہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی و نمایشی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ چیز ہے جس کے معاوضے میں ایک عورت ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ اور ان نصوص کا اقتضا یہ ہے کہ استحلالِ فرج کے ساتھ ہی پورا مہر فوراً واجب الادا ہو جائے، الا یہ کہ زوجین کے درمیان اِس کو مؤخر کر دینے کے لیے کوئی قرارداد ہو چکی ہو۔

پس زرِ مہر کی ادائیگی کے معاملے میں اصل تعجیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ استحلالِ فرج کے ساتھ بروقت ادا ہو اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے زوجین کے درمیان کوئی قرارداد نہ ہوئی ہو تو اعتبار اصل (یعنی تعجیل) کا کیا جائے گا، نہ کہ رعایت (تاجیل اور مہلت) کا۔ یہ بات شارع کے منشا کے بالکل خلاف معلوم ہوتی

۱۔ اِسی کو مہر مؤجل کہتے ہیں۔ مگر آج کل مہر مؤجل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ نکاح کے وقت ہزاروں لاکھوں کی دستاویز یہ سمجھ کر لکھ دی جاتی ہے کہ ''کون لیتا ہے کون دیتا ہے'' گویا ابتدا ہی سے ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جائے وہ عند اللہ فاسد ہے۔ حقیقی مہر مؤجل وہ ہے جس میں واضح طور پر مدت کا تعین کیا گیا ہو کہ مرد اتنی مدت میں اُسے ادا کر دے گا۔ اور جس مہر کی قرارداد میں مدت کا تعین نہ ہو وہ عند الطلب (on demand) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اِن فقہا سے سخت اختلاف ہے جو ایسے مہر کو شوہر کی وفات کے بعد واجب الادا بتاتے ہیں۔ گویا نکاح تو شوہر کرے اور مہر اُس کے وارثوں پر عائد ہو۔ یہ چیز مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی کی رُوح کے بالکل خلاف ہے اور اس فتوے کے لیے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ تاجیل کو اصل قرار دیا جائے اور تاجیل و تعجیل کے غیر مصرح ہونے کی صورت میں زرِ مہر کو آپ سے آپ مؤجّل ٹھیرایا جائے۔

فقہائے احناف کے اقوال: فقہائے حنفیہؒ کے درمیان اِس مسئلے میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کی۔ غایة البیان میں ہے:

فان کان بشرط التعجیل او مسکوتا عنه یجب حالا ولها ان تمنع نفسها حتی یعطیها المَهر، اگر مہر بشرطِ تعجیل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجّل ہے یا مؤجّل) تو وہ فوراً واجب ہوگا اور عورت کو حق ہوگا کہ اپنے آپ کو شوہر سے روک دے جب تک کہ وہ مُہر ادا نہ کرے۔

اور شرح العنایه علی الهدایه میں ہے:

فان سموا المَهر ساکتین عن التعجیل و التاجیل ماذا یکون حُکمه؟ قلت یجب حالا لیکون حُکمه حُکم ما شرط تعجیله، پھر اگر مُہر مقرّر کر دیا گیا اور معجّل یا مؤجل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو اس کا کیا حُکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا، اس کا حُکم اُس مَہر کا سا حُکم ہے جس کے لیے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔

اور اسبیجابی میں ہے:

ان کان المَهر معجلا او مسکوتاً عنه فانه یجب حالا لان النِکاح عقد معاوضة و قد تعین حقه فی الزوجة۔ فوجب ان یتعین حقها و ذلک بالتسلیم، اگر مُہر معجّل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو وہ فوراً واجب ہوگا کیونکہ نِکاح ایک عقدِ معاوضہ ہے، جب زوجہ میں شوہر کا حق متعین ہو گیا تو واجب آیا کہ عورت کا حق بھی متعین ہو جائے اور وہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ مُہر ادا کر دیا جائے۔

رہا دوسرا گروہ تو وہ کہتا ہے کہ اِس معاملے میں عُرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

فان لم یبینوا قدر المعجل ینظر الی المرأة و الی المَهر انه کم یکون المعجل لمثل هذه المرأة من مثل هذا المَهر۔ فیعجل ذلک ولا یتقدر بالربع والخمس بل یعتبر المتعارف، اگر معجّل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ عورت کس طبقے کی ہے اور مُہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی عورت کے لیے ایسے مُہر میں سے کس قدر معجّل قرار دیا جاتا ہے۔ پس اتنی ہی مقدار معجّل قرار دی جائے۔ ایک چوتھائی یا پانچویں حصے کی تعین نہ کر دینی چاہیے بلکہ جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا چاہیے۔

اسی رائے کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

و ان لم یشترط تعجیل شیء بل سکتوا عن تاجیله و تعجیله فان کان عرف فی تعجیل بعضه و تاخیر باقیه الی الموت او المیسرة او الطلاق فلیس لها ان تحتبس الا الی تسلیم ذلک القدر، اور اگر کسی حصّہ مُہر کی تعجیل کی شرط نہ کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاجیل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج کو دیکھا جائے گا۔ اگر رواج یہ ہے کہ ایک حصّہ معجّل قرار دیا جاتا ہے اور باقی حصّہ موت تک یا خوشحالی تک یا طلاق تک مؤخر رکھا جاتا ہے تو عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قولِ راجح: اُصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن وحدیث کے منشا سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن دُوسرے گروہ کی رائے بھی بے وزن نہیں ہے۔ اِن کے قول کا مُدعا یہ نہیں ہے کہ مَہر کے باب میں تاجیل اُصل ہے اور جب تاجیل وتعجیل کی صراحت نہ ہو تو معاملہ اصل تاجیل کی طرف راجع ہونا چاہیے، بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام طور پر مروج ہو اُس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک بے لکھے معاہدے کی سی ہوتی ہے، اگر اُس سوسائٹی کے دوفریق باہم معاملہ طے کرلیں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں بصراحت کوئی قرارداد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اُس پہلو میں وہ مروّجہ طریقے پر راضی ہیں۔

عُرف ورواج کی قانونی حیثیت

بلاشُبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلّم ہے اور اس لحاظ سے فقہا کے دُوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے، لیکن قبل اِس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اِس قاعدے کو جاری کریں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج کو بطورِ ایک ماخذِ قانون (source of law) کے تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو کچھ رواج ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو، بلکہ اِس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور اِس کے غیر منصفانہ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف اُن رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شُدہ سوسائٹی میں شریعت کی روح اور اِس کے اُصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا رواج کو بے لکھا معاہدہ مان کر مثلِ قانون نافذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا اِس کے رواج شریعت کی رُوح اور اُس کے اصولوں کی پیروی میں پیدا ہوئے ہیں؟ اگر تحقیق سے اِس کا جواب نفی میں ملے تو اِس قاعدے کو مثلِ قانون جاری کرنا عدل نہیں، بلکہ قطعاً ایک ظُلم ہوگا۔

موجودہ معاشرے کی حالت: اِس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے ملک کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقاتِ زَن وشَوہر کے معاملہ میں اِس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی اختیار کرکے اِس توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا اور بالعموم اِس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی روح اور اس کے احکام سے صریحاً منحرف ہیں۔ اسی مَہر کے معاملے کو لے لیجیے جس پر ہم یہاں گفتگو کررہے ہیں۔ اِس ملک کے مسلمان بالعموم مَہر کو محض ایک رَسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اِس کی وہ اہمیت قطعاً نہیں ہے جو قرآن وحدیث میں اِس کو دی گئی ہے۔ نِکاح کے وقت بالکل ایک نمائشی طور پر مَہر کی قرارداد ہوجاتی ہے مگر اِس اَمر کا کوئی تصوّر ذہنوں میں نہیں ہوتا کہ اِس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مَہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ ''میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے''۔ گویا یہ فعل محض ضابطے کی خانہ پُری کے لیے کیا جارہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ رفی صدی نِکاح اَیسے ہوتے ہیں جن میں مَہر سرے سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زَرِمَہر کی مقدار مقرّر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے پیشِ نظر ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ اِسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے۔ اِس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کو کالعدم کردیا گیا ہے اور اِس بات کی کوئی پروا نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رُو سے یہ لوگ عورتوں کو مَردوں پر حلال کرتے ہیں وہ مُہر کو استحلالِ فرج کا معاوضہ قرار دیتی ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مَرد پر حلال ہی نہیں ہوتی[1]۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائٹی کا عُرف اتنا بگڑ چکا ہو اور جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اُس کی رُوح کے بالکل خلاف صورتیں اختیار کر لی ہوں، اُس کے عُرف و رواج کو از روئے شریعت جائز قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ جن فقہا کی عبارتیں اعتبارِ عرف کی تائید میں نقل کی جاتی ہیں اُن کے پیشِ نظر نہ یہ بگڑی ہوئی سوسائٹی تھی اور نہ اُس کے خلافِ شریعت رواج۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ایک اصلاح شُدہ سوسائٹی اور اُس کے عرف کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرّد اِن کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ اِس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصولِ شریعت کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کرلے کہ جن حالات میں انھوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں اُن سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر آج اُنھیں چسپاں کیا جا رہا ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۸۴-۹۰)

لونڈی کے ساتھ نِکاح کی صورت میں مَہر

مِلکِ یمین سے مالک کے تمتع کرنے کی تین شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ محض ملکِ یمین ہی کو قیدِ نِکاح سمجھ کر تمتع کیا جائے۔ دُوسری یہ کہ لونڈی کو آزاد کر کے اِس سے نِکاح کیا جائے اور اِس آزادی ہی کو اس کا مُہر قرار دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اس کو آزاد کر کے جدید مُہر کے ساتھ نِکاح ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اور تیسری شکل کو ترجیح دی ہے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ اِسی طرح نِکاح کیا ہے کہ پہلے اُن کو آزاد کیا پھر قیدِ نِکاح میں لائے۔ اِس باب میں روایات مختلف ہیں کہ آپؐ نے جدید مُہر ادا کیا تھا یا آزادی ہی کو مُہر قرار دیا؟ لیکن اغلب یہ ہے کہ آپؐ نے جواز کی دونوں صورتیں ظاہر کرنے کے لیے دونوں طریقوں پر عمل فرمالیا ہے، کسی کو جدید مُہر دیا ہے اور کسی کی آزادی ہی کو مُہر قرار دیا ہے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۳۷۳-۳۷۴)

مُہر کی مقدار

مُہر کے مسئلے میں یہ اَمر مسلّم ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون میں اس کے لیے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی

۱- حق مُہر اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا ہے کہ جو عورت کسی شخص کے لیے اپنے آپ کو حلال کرے اور اُس کی زوجیت کی پابندی قبول کرے اُسے اپنے شوہر سے ایک مالی معاوضہ ملنا چاہیے۔ اس معاوضے کی کوئی حد شریعت میں مقرر نہیں کی گئی ہے۔ جس معاوضے پر بھی فریقین کے درمیان اتفاق ہو جائے وہی مُہر ہو گا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یا تو مُہر بروقت ادا کیا جائے یا اگر عورت مہلت دینے پر راضی ہو تو مہلت کی مدت کا تعین ہو، یا بلا تعین مدت دی گئی ہو تب بھی کم از کم اُسے ادا کرنے کی نیت ہو۔ محض رسماً کوئی مُہر مقرر کر دینا اور یہ خیال کرنا کہ اُسے ادا کرنا نہیں ہے، شرعاً نادرست ہے۔ (مکتوبات سید ابوالاعلیٰ مودودی، بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۶، مکتوب نمبر ۳۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گئی۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لیے چالیس اُوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی مگر ایک عورت نے اُن کو ٹوک کر کہا کہ آیت وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا[1] کی رُو سے آپ کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔ اِس دلیل کو سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امرأۃ اصابت و رجل اخطأ، ایک عورت نے صحیح بات کہی اور مرد غلطی کر گیا۔ پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے قانون میں اس کے لیے کوئی گنجایش نہیں، لیکن احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الزموا النسآء الرجال ولا تغالوا فی المھور[2] عورتوں کو مردوں کے پلّے باندھنے کی کوشش کرو اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابوعمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دوسو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپؐ نے فرمایا لو کنتم تغرفون الدراھم من اودیتکم مازدتم، اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے ملتے تب بھی شاید تم اِس سے زیادہ مہر نہ باندھتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے چار اُوقیہ (۱۶۰) درہم پر نکاح کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تنحتون الفضة من عرض هذا الجبل، گویا کہ تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو[3]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دُنیا میں کوئی قابلِ عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے۔ مگر آپؐ کی ازواج اور صاحبزادیوں رضی اللہ عنہن میں سے تو کسی کا مہر بھی بارہ اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اِس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر مؤجل کے طور پر لکھ دی جاتی ہیں۔ مگر نہ اِتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے وقت وہ اِس نیت سے لکھتے ہیں کہ کبھی ان کو یہ مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گزر کر نکاح کے لیے موجبِ فساد ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ تصریح فرمایا ہے کہ:

مَنْ تَزَوَّجَ امْرَاَةً بِصَدَاقٍ يَنْوِىْ اَنْ لَّا يُؤَدِّيَهٗ فَهُوَ زَانٍ وَ مَنْ اَدَانَ دَيْنًا يَنْوِىْ اَنْ لَّا يَقْضِيَهٗ فَهُوَ سَارِقٌ[4] جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اِس مہر کو ادا نہ کرے گا وہ دراصل زانی ہے اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے[5]۔

۱- [النسآء۴: ۲۰] اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اس میں سے تم کچھ واپس نہ لو۔

۲- تفہیم الاحادیث، ج۵، ص۹۷ ۳- ایضاً، ج۵، ص۹۶ ۴- ایضاً، ج۵، ص۹۸

۵- اس حدیث سے مہر کے معاملے کی جس اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے، ظاہر ہے اس بنا پر میں ایسے تمام لوگوں کو جن کے مہر عام رسم کے مطابق ان کی مالی استطاعت سے بہت زیادہ باندھے گئے ہوں، یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی بیویوں کو مہر میں اِس حد تک کمی قبول کرنے پر راضی کریں جسے وہ یک مشت یا بااقساط ادا کر سکتے ہوں اور نیک بیویوں کو بھی میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کمی پر راضی ہو جائیں۔ نیز ہر خدا ترس مسلمان کو بارِ مہر سے سبک دوش ہونے میں حتی الامکان جلدی کرنی چاہیے۔ مہر ایک قسم کا قرض ہے اور اپنے ذِمے جان بوجھ کر یا بے پروائی کے ساتھ قرض چھوڑ کر مر جانا اتنی بری بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ اِس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں۔ اِس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے۔ لیکن اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مِل کر نہ رِہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لیے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لیے وہ غریب معلّق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے، اِن میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اِس میں اعتدال برتا جائے تو قریب قریب ۷۵ فی صدی مشکلات رُونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اِس کی اصلاح کے لیے اُصولِ شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ مہر اگر معجّل[1] ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کرلیں، لیکن اگر وہ موّجل[2] ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اِس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے اور زرِ مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویزِ مہر قابل ادخال دعویٰ نہ ہو۔ اِس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہر موجل کا یہ سرتاپا عیب طریقہ بآسانی مسدود ہو جائے گا۔ اِس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائیداد کی صورت میں نِکاح کے وقت ہی مہر ادا کردیں۔ حالات کے رُو باصلاح ہو جانے پر یہ شرط اُڑائی جاسکتی ہے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء ص ۱۱۹-۱۲۴)

مہاجر مومن عورتوں کے مہر کا مسئلہ

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○ (الممتحنہ ۶۰:۱۱) اور اگر تمھاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمھیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمھاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں اُدھر رِہ گئی ہیں اُن کو اِتنی رقم ادا کر دو جو اُن کے دیے ہوئے مہروں کے برابر ہو اور اُس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

اِس معاملے کی دَو صورتیں تھیں اور اِس آیت کا انطباق دونوں صورتوں پر ہوتا ہے۔

ایک صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے مُعاہدانہ تعلّقات تھے اُن سے مسلمانوں نے یہ معاملہ طے کرنا چاہا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے ہماری طرف آ گئی ہیں اُن کے مہر ہم واپس کر دیں گے اور ہمارے آدمیوں کی جو کافر بیویاں اُدھر رِہ گئی ہیں اُن کے مہر تم واپس کر دو۔ لیکن اُنھوں نے اِس بات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ امام زُہری بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حُکم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان اُن عورتوں کے مہر واپس دینے کے لیے تیار ہوگئے جو مشرکین کے پاس مکّہ میں رِہ گئی تھیں مگر مشرکوں نے

۱- جو فوراً ادا کیا جائے۔

۲- جو ایک مدّت کے بعد ادا کیا جاتا ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اُن عورتوں کے مَہر واپس دینے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے پاس ہجرت کر کے آ گئی تھیں۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے حُکم دیا کہ مہاجر عورتوں کے جو مَہر تمھیں مشرکین کو واپس کرنے ہیں وہ ان کو بھیجنے کے بجائے مدینے ہی میں جمع کر لیے جائیں اور جن لوگوں کو مشرکین سے اپنے دیے ہوئے مَہر واپس لینے ہیں، اُن میں سے ہر ایک کو اُتنی رقم دے دی جائے جو اُسے کفار سے وصول ہونی چاہیے تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدانہ تعلقات نہ تھے اُن کے علاقوں سے بھی متعدد آدمی اِسلام قبول کر کے دارالاسلام میں آ گئے تھے اور اُن کی کافر بیویاں وہاں رہ گئی تھیں۔ اِس طرح بعض عورتیں بھی مسلمان ہو کر ہجرت کر آئی تھیں اور اُن کے کافر شوہر وہاں رہ گئے تھے۔ اِن کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ دارالاسلام ہی میں ادلے کا بدلہ چُکا دیا جائے۔ جب کفار سے کوئی مَہر واپس نہیں ملنا ہے تو اُنھیں بھی کوئی مَہر واپس نہ کیا جائے۔ اِس کے بجائے جو عورت اِدھر آ گئی ہے اُس کے بدلے کا مَہر اُس شخص کو ادا کر دیا جائے جس کی بیوی اُدھر رہ گئی ہے۔

لیکن اگر اِس طرح حساب برابر نہ ہو سکے اور جن مسلمانوں کی بیویاں اُدھر رہ گئی ہیں اُن کے وصول طلب مَہر ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورتوں کے مَہروں سے زیادہ ہوں تو حُکم دیا گیا کہ اُس مالِ غنیمت سے باقی رقمیں ادا کر دی جائیں جو کفار سے لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے ہوں۔ ابنِ عبّاس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جس شخص کے حصے کا مَہر وصول طلب رہ جاتا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حُکم دیتے تھے کہ اِس کے نقصان کی تلافی مالِ غنیمت سے کر دی جائے (ابن جریر)۔ اِسی مسلک کو عطاء، مُجاہد، زُہری، مسروق، ابراہیم نخعی، قتادہ، مُقاتل، اور ضحاک نے اختیار کیا ہے۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے مَہر کفار کی طرف رِہ گئے ہوں اُن کا بدلہ کفار سے ہاتھ آئے ہوئے مجموعی مالِ غنیمت میں سے ادا کیا جائے، یعنی تقسیم غنائم سے پہلے اُن لوگوں کے فوت شُدہ مَہر ادا کر دیے جائیں اور اِس کے بعد تقسیم ہو جس میں وہ لوگ بھی دُوسرے سب مجاہدین کے ساتھ برابر کا حصہ پائیں۔ بعض فقہا یہ بھی کہتے ہیں کہ صِرف اموالِ غنیمت ہی نہیں اموالِ فَے میں سے بھی اَیسے لوگوں کے نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اہلِ علم کے ایک بڑے گروہ نے اِس مسلک کو قبول نہیں کیا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۴۴، الممتحنہ حاشیہ ۱۷)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

مسئلہ کفاءت

نِکاح میں کفاءت کا اعتبار عقل و نقل کے لحاظ سے

خاندانی زندگی کی کامیابی اور نظامِ تمدن کی بہتری کے لیے ایسی شادیاں مُفِید نہیں ہوتیں جن کے دونوں فریق، سوسائٹی کے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہوں۔ شہری اور دیہاتی کا فرق بارہا ناموافقت کا موجب بن جاتا ہے۔ نباہ کے لیے ضروری ہے کہ زَوجَین اور اُن کے خاندانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اُمور میں اتحاد ہو۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اُن کا دِین ایک ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کا طرزِ معاشرت ایک ہو...... اُن کے معاشی اور معاشرتی مرتبے میں ہمواری ہو، اور اُن کی خاندانی روایات ایک دُوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو اصطلاح میں 'کفاءت' کہتے ہیں۔ شارع نے مناکحت میں کفو کو جو اہمیت دی ہے وہ اِس لیے ہے کہ زَوجَین میں زیادہ سے زیادہ مماثلت ہو، کیونکہ مماثلت صرف زَوجَین ہی کے لیے مودّت و رحمت کی موجب نہیں ہے، بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے مُفِید ہے اور آیندہ نسلوں کی بہتری بھی اِسی پر موقوف ہے۔ جن زَوجَین میں مماثلت نہیں ہوتی اُن کی مواصلت محض ایک جسمانی مواصلت ہے جو تمدن و تہذیب کے نقطۂ نظر سے قطعی بانجھ یا قریب بانجھ ہوتی ہے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۳۲۷-۳۲۸)

مسئلہ کفاءت عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہے۔ [یہی وجہ ہے کہ] نکاح میں اُس کے مُعتبر ہونے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

اس مسئلے کا مآخذ متعدد احادیث ہیں۔ مثلاً:

لَا تُنْكِحُوا النِّسَآءَ اِلَّا الْاَكْفَآءَ[1] (دار قطنی، بیهقی) عورتوں کی شادیاں نہ کرو مگر اُن لوگوں کے ساتھ جو کفو ہوں۔

يَا عَلِیّ ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْ هَا، اَلصَّلٰوةُ اِذَآ اٰتَتْ وَالْجَنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ، وَالْاَيِّمُ اِذَا وَجَدْتَّ لَهَا كُفُئًا[2] (ترمذی، حاکم) اے علی! تین کام ہیں جن کو ٹالنا نہ چاہیے۔ ایک نماز جب کہ اُس کا وقت آ جائے۔ دوسرے جنازہ جبکہ تیار ہو جائے۔ تیسرے

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۳۳ ۲- ایضاً، ج ۵، ص ۳۳ ۳- ایضاً، ج ۵، ص ۳۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بن بیاہی عورت کا نکاح جب کہ اُس کے لیے کفو مل جائے۔

تَخَيَّرُوا لِنُطَفِكُمْ وَانْكِحُوا الْاَكْفَاءَ[۳] اپنی نسل پیدا کرنے کے لیے اچھی عورتیں تلاش کرو اور اپنی عورتوں کے نکاح ایسے لوگوں سے کرو جو اِن کے کفو ہوں۔ (یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، انس رضی اللہ عنہ، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے متعدد طریقوں سے مروی ہے)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لَامْنَعَنَّ فُرُوْجَ ذَوَاتِ الْاَحْسَابِ اِلَّا مِنَ الْاَكْفَاءِ، میں شریف گھرانوں کی عورتوں کے نکاح کفو کے سوا کہیں اور نہ کرنے دوں گا[۱]۔

یہ تو ہے اِس مسئلے کی نقلی دلیل۔ رہی عقلی دلیل تو عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ کسی لڑکی کو کسی شخص کے نکاح میں دیتے وقت یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص اِس کے جوڑ کا ہے یا نہیں۔ اگر جوڑ کا نہ ہو تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُن دونوں کا نباہ ہو سکے گا۔ نکاح سے مقصود تو عقلاً بھی اور نقلاً بھی یہی ہے کہ زوجین کے درمیان مودّت و رحمت ہو۔ اور وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کر سکیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ بے جوڑ نکاحوں سے اِس مقصود کے حاصل ہونے کی کہاں تک توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کون سا معقول انسان ایسا ہے جو اپنے لڑکے یا لڑکی کا بیاہ کرنے میں جوڑ کا لحاظ نہ کرتا ہو؟

فقہا نے اِس جوڑ کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے طریقے پر یہ بتایا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے درمیان کِن کِن اُمور میں مماثلت ہونی چاہیے۔ ہم ان تفصیلات میں بعض فقہا سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ مگر فی الجملہ عقل عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ زندگی بھر کی شرکت و رفاقت کے لیے جن دو ہستیوں کا ایک دوسرے سے جوڑ ملایا جائے اُن کے درمیان اخلاق، دین، خاندان، معاشرتی طور طریق، معاشرتی عزّت و حیثیت، مالی معاملات، ساری ہی چیزوں کی مماثلت دیکھی جانی چاہیے۔ اِن اُمور میں اگر پوری یکسانی نہ ہو تو کم از کم اتنا تفاوت بھی نہ ہو کہ زوجین اُس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رفاقت نہ کر سکیں۔ یہ انسانی معاشرت کا ایک عملی مسئلہ ہے جس میں حکمت عملی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۱-۱۹۴، بحوالہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء)

کفاءت میں اصل اعتبار

[قرآن و حدیث میں] صاف طور پر بتا دیا گیا کہ کفاءت میں سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز دِین ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ (التوبۃ ۹:۷۱) مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے وَلی ہیں (اِس لیے کہ) وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، بدی سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶) اے اہلِ ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۵

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

بِاِیْمَانِکُمْ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ؕ (النسآء ۴:۲۵) اور تم میں سے جو کوئی پاک دامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ اُن مومن لڑکیوں میں سے اپنے لیے جوڑ منتخب کرے جو تمھاری مملوک ہیں۔ اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔

تَزَوَّجُوْهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ فَلَاَمَةٌ خَرْقَاءُ سَوْدَآءُ ذَاتُ دِيْنٍ اَفْضَلُ[1] تم اُن سے دین کی بنا پر شادیاں کرو کیونکہ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دین دار ہو تو وہ دُوسری عورتوں سے افضل ہے۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۳۳۰-۳۳۱)

ایک غلط فہمی اور اُس کا ازالہ

اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا بھی ضروری ہے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں اسلامی قانون کفو کو جو اہمیت دیتا ہے اُس کو بعض لوگ اِس معنی میں لیتے ہیں کہ کچھ برادریاں شریف اور کچھ کمین ہیں اور اُن کے درمیان مناکحت قابل اعتراض ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک غلط خیال ہے۔ اسلامی قانون کی رُو سے ہر مسلمان مَرد کا ہر مسلمان عورت سے نکاح ہوسکتا ہے، مگر ازدواجی زندگی کی کامیابی کا انحصار اُس پر ہے کہ زوجین کے درمیان عادات، خصائل، طرزِ زندگی، خاندانی روایات اور معاشی و معاشرتی حالات میں زیادہ سے زیادہ مطابقت ہو، تاکہ وہ ایک دُوسرے کے ساتھ اچھی طرح نباہ کر سکیں۔ یہی کفاءت کا اصل مقصد ہے۔ جہاں مَرد اور عورت کے درمیان اِس لحاظ سے بہت زیادہ بُعد ہو وہاں عمر بھر کی رفاقت نبھ جانے کی کم ہی توقع ہوسکتی ہے۔ اِس لیے اسلامی قانون ایسے جوڑ لگانے کو ناپسند کرتا ہے، نہ اِس بنا پر کہ فریقین میں سے ایک شریف اور دوسرا کمین ہے، بلکہ اِس بنا پر کہ حالات میں زیادہ بیّن فرق و اختلاف ہو تو شادی بیاہ کا تعلق قائم کرنے میں ازدواجی زندگیوں کے ناکام ہو جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۹۹، الحجرات حاشیہ ۲۸)

دوسری غلط فہمی

س کیا حدیث یا قرآن میں کوئی اُصولی ہدایت اِس اَمر کی موجود ہے کہ ہر شخص اپنی قوم (ذات) میں ہی شادی کرے۔ واضح رہے کہ میں کفاءت کا اِس معنی میں تو قائل ہوں کہ فریقین میں مناسبت ہونی چاہیے غیر ضروری معیار کا فرق نہیں ہونا چاہیے۔

ج قرآن یا حدیث میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی قوم میں ہی شادی کرے۔ بلکہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا عمل اِس کے خلاف پایا جاتا ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۹۵-۲۹۶)

.........OOO.........

۱۔ تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

مسئلۂ ولایت

بالغ عورت اور نکاح کا اختیار

سوال: کیا بالغ عورت خود اپنا نکاح کر لینے کی مجاز ہے؟

علمائے احناف اور علمائے اہلِ حدیث کے درمیان نکاحِ بالغہ بلا ولی کے مسئلے میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ احناف اس کے قائل ہیں کہ بالغہ عورت اپنا نکاح اولیا کے اذن کے بغیر یا اُن کی خواہش کے علی الرغم جہاں چاہے کر سکتی ہے اور اس نکاح پر اولیا کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہلِ حدیث حضرات ایسے نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نکاح بلا ولی کی صورت میں بلا تامل دوسرا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ فریقین کے دلائل، جہاں تک میرے سامنے ہیں، مختصراً پیش کرتا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ آپ اس بارے میں اپنی تحقیق واضح فرمائیں۔

جواب: اس سوال کے ساتھ سائل نے پوری تفصیل کے ساتھ فریقین کے دلائل جمع کر دیے ہیں۔ لہٰذا پہلے ہم ان دلائل کو یہاں نقل کر دیتے ہیں۔

۱۔ حنفیہ کا استدلال حسبِ ذیل آیات اور احادیث سے ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ (البقرۃ ۲:۲۳۴) تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے کریں، اس کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ (البقرۃ ۲:۲۳۰) پھر اگر (تیسری بار شوہر نے بیوی کو) طلاق دے دی تو وہ عورت اُس کے لیے حلال نہ ہوگی الا یہ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ (البقرۃ ۲:۲۳۲) پھر تم اُن عورتوں کو اس سے مت روکو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ وہ بھلے طریقے سے باہم رضامند ہو جائیں۔

عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَالْبِكْرُ تُسْتَأْمَرُ وَاِذْ نُهَا سُكُوْتُهَا. وَ فِي رِوَايَةٍ: اَلثَّيِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا[1] (نصب الرایہ، ج ۳، ص ۱۸۲) نافع بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیوہ عورت اپنے ولی سے زیادہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی حقدار ہے، اور کنواری کا مشورہ لیا جانا چاہیے اور اس کی اجازت اِس کی خاموشی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے نکاح کی معاملے میں حقدار ہے۔

عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ: جَاءَتِ امْرَأَةٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتْ: اِنَّ اَبِيْ اَنْكَحَنِيْ رَجُلاً وَ اَنَا كَارِهَةٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لِاَبِيْهَا: لَا نِكَاحَ لَكَ، اِذْهَبِيْ، فَانْكِحِيْ مَنْ شِئْتِ[2] (نصب الرایہ، ج ۳، ص ۱۸۲) ابو سلمہ ابن عبدالرحمان سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: میرے باپ نے میرا نکاح ایک مرد سے کر دیا ہے اور مَیں اُسے ناپسند کرتی ہوں۔ آپؐ نے باپ سے فرمایا کہ نکاح کا اختیار تمھیں نہیں ہے اور لڑکی سے فرمایا: جاؤ جس سے تمھارا جی چاہے نکاح کر لو۔

رُوِيَ مِنْ طَرِيْقِ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا زَوَّجَتْ حَفْصَةَ بِنْتَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ مِنَ الْمُنْذِرِ بْنِ الزُّبَيْرِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ غَائِبٌ بِالشَّامِ. فَلَمَّا قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ قَالَ: وَ مِثْلِيْ يُفْتَاتُ عَلَيْهِ؟ فَكَلَّمَتْ عَائِشَةُ الْمُنْذِرَ بْنَ الزُّبَيْرِ، فَقَالَ: اِنَّ ذٰلِكَ بِيَدِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ. فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: مَا كُنْتُ لِاَرُدَّ اَمْرًا قَضَيْتِهِ، فَاسْتَقَرَّتْ حَفْصَةُ عِنْدَ الْمُنْذِرِ وَلَمْ يَكُنْ ذَالِكَ طَلَاقٌ[3] مالک نے عبدالرحمٰن سے، انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ کا منذر ابن زبیرؓ سے نکاح کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمٰنؓ شام میں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ کیا میری رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ تب حضرت عائشہؓ نے منذر ابن زبیرؓ سے بات کی۔ انھوں نے کہا فیصلہ عبدالرحمٰنؓ کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر عبدالرحمٰنؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ جس معاملے کو آپ نے طے کر دیا ہے میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ حفصہؓ منذرؓ کے پاس ہی رہیں اور یہ طلاق نہ تھی۔

اَخْرَجَهُ ابوداؤد و النَّسَائِيُّ — عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيِّبِ اَمْرٌ[4] ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شوہر دیدہ عورت پر ولی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔

اَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَ اَحْمَدُ — عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: جَاءَتْ فَتَاةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ اَبِيْ زَوَّجَنِيْ اِبْنَ اَخِيْهِ لِيَرْفَعَ بِيْ مِنْ خَسِيْسَتِهِ، قَالَ: فَجَعَلَ الْاَمْرَ اِلَيْهَا فَقَالَتْ: اِنِّيْ قَدْ اَجَزْتُ مَا صَنَعَ اَبِيْ، وَلٰكِنْ اَرَدْتُ اَنْ تَعْلَمَ النِّسَاءُ اَنْ لَيْسَ اِلَى الْاٰبَاءِ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ[5] نسائی اور احمد نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ ایک لڑکی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! میرے باپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ میرا بیاہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ میرے ذریعے اُسے ذلت سے نکالے۔ آپؐ نے نکاح (کی تنسیخ و استقرار) کا حق لڑکی کو دے دیا۔ لڑکی نے کہا: میرے والد نے جو کچھ کیا ہے میں اسے جائز قرار دیتی ہوں۔ میری خواہش صرف یہ تھی کہ عورتیں جان لیں کہ باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۴۲ ۲- ایضاً، ج ۵ ص ۴۴

۳- ایضاً، ج ۵ ص ۴۳ ۴- ایضاً، ج ۵ ص ۴۳ ۵- ایضاً ص ۴۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۲- اہلِ حدیث حضرات اپنی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث پیش کرتے ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ،قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ :اَيَّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهَا۔ (بلوغ المرام) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اُس کا نِکاح باطل ہے..... پس اگر جھگڑا ہو تو جس عورت کا ولی نہ ہو تو سلطان اُس کا ولی ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ولی کے بغیر کوئی نِکاح جائز نہیں ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ وَلَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا۔ (سنن کبریٰ للبیهقی) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دُوسری عورت کی ولی بن کر) نِکاح نہ کرے اور نہ کوئی عورت خود اپنا نِکاح کرے۔

قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: اَيَّمَا امْرَأَةٍ لَمْ يُنْكِحْهَا الْوَلِيُّ اَوِ الْوُلَاةُ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ حضرت عمرؓ نے فرمایا: جس عورت کا نِکاح ولی یا حکام نہ کریں، اُس کا نِکاح باطل ہے۔

عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ قَالَ: جَعَلَتِ امْرَأَةٌ ثَيِّبٌ اَمْرَهَا بِيَدِ رَجُلٍ غَيْرِ وَلِيٍّ فَاَنْكَحَهَا فَبَلَغَ ذَالِكَ عُمَرَ فَجَلَّدَ النَّاكِحَ وَ الْمُنْكِحَ وَ رَدَّ نِكَاحَهَا (ایضاً) حضرت عکرمہ بن خالد سے روایت ہے کہ ایک شوہر دیدہ عورت نے اپنا معاملہ ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جو اُس کا ولی نہ تھا۔ اور اُس شخص نے عورت کا نِکاح کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اِس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے نِکاح کرنے اور کرانے والوں کو کوڑوں کی سزا دی اور نِکاح منسوخ کر دیا۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَيَّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِاِذْنِ وَلِيٍّ (ایضاً) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت نے بھی اپنے ولی کے اذن کے بغیر نکاح کیا اُس کا نِکاح باطل ہے۔ بلا اجازت ولی کوئی نِکاح نہیں۔

عَنِ الشَّعْبِيِّ اَنَّ عُمَرَ وَ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَ شُرَيْحًا وَّ مَسْرُوْقًا رَحِمَهُمَا اللّٰهُ قَالُوْا: لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ (ایضاً) امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، شریحؒ اور مسروقؒ نے فرمایا کہ ولی کے بغیر کوئی نِکاح نہیں ہے۔

اِن دلائل پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف کافی وزن ہے اور یہ کہنے کی گنجایش نہیں ہے کہ فریقین میں سے کسی کا مسلک بالکل غلط ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شارع نے فی الواقع دو متضاد حُکم دیے ہیں؟ یا ایک حُکم کو دوسرا حُکم منسوخ کرتا ہے؟ یا دونوں حُکموں کو ملا کر شارع کا منشا ٹھیک طور پر متحقق ہو سکتا ہے؟ پہلی شق تو صریحاً باطل ہے کیونکہ شریعت کا پورا نظام شارع کی حِکمتِ کاملہ پر دلالت کر رہا ہے اور حکیم سے متضاد احکام کا صدور ممکن نہیں ہے۔ دُوسری شق بھی باطل ہے کیونکہ نسخ کا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں ہے۔ اب صِرف تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور ہمیں اسی کی تحقیق کرنی چاہیے۔ میں دونوں طرف کے دلائل جمع کر کے شارع کا جو منشا سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے:

۱- نِکاح کے معاملے میں اصل فریقین مَرد اور عورت ہیں نہ کہ مَرد اور اولیائے عورت۔ اِسی بنا پر ایجاب وقبول ناکح اور منکوحہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے درمیان ہوتا ہے۔

۲۔ بالغہ عورت (باکرہ ہو یا ثیبہ) کا نکاح اُس کی رضامندی کے بغیر یا اُس کی مرضی کے خلاف منعقد نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ نکاح کرنے والا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ جس نکاح میں عورت کی طرف سے رضا نہ ہو، اُس میں سرے سے ایجاب ہی موجود نہیں ہوتا کہ ایسا نکاح منعقد ہو سکے۔

۳۔ مگر شارع اس کو بھی جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنے نکاح کے معاملے میں بالکل ہی خود مختار ہو جائیں اور جس قسم کے مرد کو چاہیں اپنے اولیا کی مرضی کے خلاف اپنے خاندان میں داماد کی حیثیت سے گھسا لائیں۔ اس لیے جہاں تک عورت کا تعلق ہے شارع نے اُس کے نکاح کے لیے اُس کی اپنی مرضی کے ساتھ اُس کے ولی کی مرضی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نہ عورت کے لیے جائز ہے کہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے اپنا نکاح خود کر لے اور نہ ولی کے لیے جائز ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح جہاں چاہے کر دے۔

۴۔ اگر کوئی ولی کسی عورت کا نکاح بطورِ خود کر دے تو وہ عورت کی مرضی پر معلّق ہوگا اور منظور کرے تو نکاح قائم رہے گا نامنظور کرے تو معاملہ عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ یہ نکاح عورت کو منظور ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عورت کو نکاح نامنظور ہے تو عدالت اُسے باطل قرار دے گی۔

۵۔ اگر کوئی عورت اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کر لے تو اُس کا نکاح ولی کی اجازت پر معلّق ہوگا۔ ولی منظور کر لے تو نکاح برقرار رہے گا، نامنظور کرے تو یہ معاملہ بھی عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ ولی کے اعتراض وانکار کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ فی الواقع معقول وجوہ کی بنا پر اُس مرد کے ساتھ اپنے گھر کی لڑکی کا جوڑ پسند نہیں کرتا تو یہ نکاح فسخ کیا جائے گا اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اِس عورت کا نکاح کرنے میں اُس کا ولی دانستہ تساہل کرتا رہا، یا کسی ناجائز غرض سے اُس کو ٹالتا رہا اور عورت نے تنگ آ کر اپنا نکاح خود کر لیا تو پھر ایسے ولی کو سیٔ الاختیار ٹھیرا دیا جائے گا اور نکاح کو عدالت کی طرف سے سندِ جواز دے دی جائے گی۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

(رسائل و مسائل دوم، مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۴-۱۹۱)

ولایتِ اجبار اور خیارِ بلوغ

قرآنِ مجید میں اگرچہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اُس کے اولیا کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے لیکن نبی ﷺ نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدے کی جو تعبیر فرمائی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیا کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اِس اہم معاملے میں بالکل ہی بے اختیار ہے، بخلاف اس کے حضور ﷺ نے ایجاباً عورت کو یہ حق دیا ہے کہ نکاح کے معاملے میں اُس کی رضامندی حاصل کی جائے۔ چنانچہ ابو داؤد، نسائی، ابنِ ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ میرے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنساء بنت خذام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا۔ حضور ﷺ نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارِ قطنی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمے میں حضور ﷺ نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرا دی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ اُس کے باپ نے اُس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اُس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے اُس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کر لے چاہے رد کر دے۔ اس پر اس نے عرض کیا:

یا رسُولَ اللّٰہِ اَجزتُ مَا صَنَعَ اَبِیْ وَ اِنَّمَا اَرَدتُّ اَنْ اُعْلِمَ النِّسَآءَ اَنْ لَّیسَ اِلَی الْاٰبَآءِ مِنَ الْاَمرِ شَیْءٌ، یارسول اللہ! میرے باپ نے جو کچھ کیا ہے اُسے میں نے منظور کیا۔ میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا کہ اِن کے باپ اِس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور مؤطا میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْاَیِّمُ[1] اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِیِّهَا وَ الْبِكْرُ تُسْتَاْذَنُ فِیْ نَفْسِهَا، شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے بڑھ کر اپنے نفس کے معاملے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے معاملے میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لَا تُنْكَحُ الْاَیِّمُ حَتّٰى تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاْذَنَ، شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اُس سے اجازت نہ لے لی جائے اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اُس کا اِذن نہ لے لیا جائے۔

(حقوق الزّوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۰-۱۱۲)

ولایتِ اِجبار: اُوپر جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ سب اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اُصولِ شرع میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اُس کا باپ یا کوئی ولی کر دے تو کیا اُس صورت میں اُس کا یہ حق کہ اُس کے نفس کے معاملے میں اُس کی مرضی کا دخل ہو۔ ساقط ہو جائے گا؟ اس مسئلے میں ہمارے فقہا نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر نابالغہ کا نکاح اُس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا کہ بالغ ہونے پر اُسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اُسے یہ حق نہ ہوگا۔ اِلّا یہ کہ باپ دادا کا سیئ الاختیار ہونا ثابت ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ وہ فاسق یا بے حیا ہے۔ یا اپنے معاملات میں سوئے تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کے لیے مشہور ہے۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر جابرانہ حق حاصل ہے اور اُن کے کیے ہوئے نکاح کو لڑکی بالغ ہونے پر نامنظور نہیں

۱۔ لُغت میں اَیِّم ہر اُس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ، مگر یہاں اس سے ثیبہ مراد لی گئی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرسکتی، قرآنِ مجید کی کسی آیت یا نبی ﷺ کی کسی حدیث سے ثابت نہیں[1] بلکہ محض فقہا کے اِس قیاس پر مبنی ہے کہ باپ دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہوسکتے، اس لیے لڑکی پر اُن کا کیا ہوا نِکاح لازم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ھدایہ میں ہے:

فَلَا خِیَارَ لَهُمَا بَعْدَ بَلُوْغِهِمَا لِاَنَّهُمَا کَامِلَا الرَّأْيِ وَافِرَ الشَّفْقَةِ فَيَلْزَمُ الْعَقْدُ بِمُبَاشَرَتِهِمَا کَمَا اِذَا بَاشَرَاهُ بِرَضَاهُمَا بَعْدَ الْبُلُوْغِ [بلوغ کے بعد ان دونوں کو اختیار نہیں ہے، کیونکہ باپ اور دادا کامل الرائے بھی ہوتے ہیں اور انتہائی شفیق بھی۔ اس لیے

۱- مبسوط میں امام سرخسی رحمہ اللہ نے لے دے کر صرف ایک حجت پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بحالت نابالغی کیا تھا۔ پھر جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بالغ ہوئیں تو حضور ﷺ نے اُن سے یہ نہیں فرمایا کہ تمھیں اس نکاح کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے، حالانکہ اگر نابالغہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا تو جس طرح قرآنِ مجید کی آیت تخییر نازل ہونے پر آپؐ نے ان کو اختیار دیا تھا اسی طرح اِس معاملے میں بھی ضرور اختیار دیتے۔ (المبسوط، ج ۴، ص ۲۱۳)

اِس سے معلوم ہوا کہ ولایتِ اجبار کے حق میں بڑی تلاش کے بعد بھی اِس کمزور دلیل کے سوا کوئی دلیل کتاب وسنت سے نہیں لائی جاسکی ہے۔ اور یہ دلیل اتنی کمزور ہے کہ ہمیں شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ جیسے شخص پر حیرت ہے کہ انھوں نے کس طرح اتنے بڑے ایک اہم مسئلے کی، جس کا اثر بے شمار عورتوں سے ہمیشہ کے لیے ایک حق مسلوب ہوجانے کی شکل میں مترتب ہوتا ہے، اِس دلیل پر بنا رکھنے کو درست سمجھا۔ یہ کہنا کہ اِس حدیث کی رُو سے باپ کے کیے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیارِ بلوغ حاصل نہیں ہے، اگر صحیح ہوسکتا تھا تو اُس صورت میں ہوسکتا تھا جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالغ ہوکر اپنے والد کے کیے ہوئے نکاح کو نامنظور کیا ہوتا۔ یا اِس کے مقابلے میں خیارِ بلوغ استعمال کرنے کا حق مانگا ہوتا اور نبی ﷺ نے انھیں یہ جواب دیا ہوتا کہ نہیں، اب تمھیں یہ حق نہیں رہا، کیونکہ تمھارا نکاح نابالغی کے زمانے میں تمھارے والد نے کیا تھا۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے، بلکہ کسی روایت میں یہ تک مذکور نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالفاظِ صریح یہ کہا ہو کہ نبی ﷺ نے مجھے اِس معاملے میں کوئی اختیار نہیں دیا۔ سارے استدلال کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر رکھی گئی ہے کہ نبی ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خیار دینا چونکہ کسی روایت میں نہیں بیان ہوا ہے لہٰذا یہ فرض کیا جائے گا کہ آپؐ نے اُن کو خیار نہیں دیا اور چونکہ آپؐ نے اُن کو خیار نہیں دیا لہٰذا ہم اِس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسی لڑکی کو خیار کا حق حاصل ہی نہیں ہے۔

اِس بودی دلیل کو پیش کرتے وقت شمس الائمہ کو نہ تو یہ یاد رہا کہ کسی واقعے کا روایات میں مذکور نہ ہونا اِس واقعے کے پیش نہ آنے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اور نہ انھیں یہی خیال آیا کہ جو لڑکی بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ کے فعل پر راضی تھی، جس نے اِس پر کسی نارضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا، جس نے باپ کے مقابلے میں خیارِ بلوغ استعمال کرنے کا سرے سے مطالبہ ہی نہیں کیا تھا، اگر اُسے خیار نہیں دیا گیا تو آخر یہ اِس بات کی دلیل کب بن سکتا ہے کہ باپ کے مقابلہ میں لڑکی کو خیارِ بلوغ سرے سے حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسی دلیلوں سے اگر حقوق سلب ہونے لگیں تو ایک شخص یوں بھی استدلال کرسکتا ہے کہ چونکہ فلاں موقع پر فلاں شخص کو (جس نے پانی سرے سے مانگا ہی نہ تھا) پانی نہیں دیا گیا۔ اس لیے کسی کو پانی نہیں دیا جانا چاہیے۔

اِس سے بھی عجیب تر شمس الائمہ کا یہ استدلال ہے کہ اگر لڑکی کو باپ کے مقابلے میں خیارِ بلوغ حاصل ہوتا تو نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طلب کے بغیر بھی ان کو یہ خیار ضرور دیتے۔ کیونکہ آیت تخییر کے نزول کے بعد آپؐ نے اُن کو خیار عطا کیا۔ دوسرے الفاظ میں شمس الائمہ کا استدلال یہ ہے کہ جو کام ایک معاملے میں اللہ تعالیٰ کا صریح حکم آنے پر نبی ﷺ نے کیا وہی کام ایک دوسرے معاملے میں بھی آپؐ ضرور کرتے درآنحالیکہ اِس معاملے میں اللہ نے آپؐ کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔

علمائے کرام چاہتے ہیں کہ ایسی کمزور باتیں محض اِس دھونس کی وجہ سے آنکھیں بند کرکے مان لی جائیں کہ جو انھیں نہ مانے گا اس پر غیر مقلدیت کا ٹھپا لگادیا جائے گا۔ [مؤلف]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ لازم ہوگا جیسے ان دونوں نے بلوغ کے بعد (بچے یا بچی) دونوں کی رضامندی سے عقد کیا ہو]۔

لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ نقلاً وعقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔

اولاً حدیث صحیح ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا نکاح کم سنی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اُسے رد یا قبول کرنے کا اختیار ہے۔ اس حدیث سے نابالغہ کے لیے خیارِ بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ میں چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں، اس لیے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لیے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلے میں اُسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو۔ لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا حق کلیۃً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملۂ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھ کر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے، اگر کسی کے ''کامل الرائے اور وافر الشفقت'' ہونے کی بنا پر اُس کو ولایتِ اجبار حاصل ہوسکتی ہے تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اُسی طرح حاصل ہونی چاہیے جس طرح عدمِ بلوغ کی حالت میں اُس کے لیے ثابت کی جاتی ہے۔ لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایتِ اجبار حاصل نہیں ہے تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو۔

ثالثاً باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے۔ محض کثرت کو دیکھ کر ایک قیاس قائم کر دیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں، جن سے وفورِ شفقت کا ثبوت کم اور کمالِ رائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے۔

رابعاً اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اِس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وفورِ شفقت اور کمالِ رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کر دیں اور لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کے خلاف نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں جب کہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، تعلیم وتربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کے گرد وپیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق وعادات پر مترتب ہو رہے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بُری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس وقت باپ دادا کی ولایتِ اجبار خود اُن کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سیئ الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ اُن کے مقابلے میں خیارِ بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو برسرِ عدالت اپنے باپ دادا کے خلاف بدنیتی، فسق، فجور، بے حیائی، سوئے تدبیر اور حماقت وبلادت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا اور یہ اُس کے لیے نہ صرف مشکل ہے بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِن وجوہ سے فقہ کے اِس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ اِس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیارِ بلوغ دیا جائے[1]۔

(حقوق الزّوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۲-۱۱۷)

خیارِ بلوغ کی شرائط: اِس سلسلے میں فقہا کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محلِ نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیا کے باب میں ان کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر انھوں نے صغیرۂ باکرہ کا نِکاح کر دیا ہو تو وہ خیارِ بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کر دے۔ اگر پہلے حیض کا خون نمودار ہوتے ہی اُس نے فوراً اِس کا اعلان نہ کیا تو اُس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ شرط صرف باکرہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ[2] اور نابالغ لڑکے کے لیے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں ان کو خیارِ فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط جو صغیرۂ نابالغہ کے لیے رکھی گئی ہے، اُس کا ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اِس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیارِ فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سنِ بلوغ کو پہنچ کر انسان میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عقلِ رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذِمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اِس کے اندر کوئی بڑا انقلاب رُونما ہو جاتا ہو اور آناً فاناً اُس میں رائے قائم کرنے کی صلاحیتیں اُبھر آتی ہوں۔ تاہم مان لیا جائے کہ ایسا ہوتا ہے تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ جب اِن دونوں کے خیارِ بلوغ کو اُس وقت تک کے لیے ممتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آخر باکرہ ہی کو کیوں سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے کافی وقت نہ دیا جائے؟ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مَرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے۔ کیونکہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ ناتجربہ کار ہوتی ہے۔

(حقوق الزّوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۸-۱۱۹)

............OOO............

۱۔ ہم نے نابالغ لڑکے کا مسئلہ یہاں اِس لیے نہیں چھیڑا کہ اُسے پھر بھی طلاق کا چارۂ کار حاصل ہے۔

۲۔ شوہر دیدہ عورت۔ اگر کوئی لڑکی بالغ ہونے سے پہلے مَرد کی صحبت سے آشنا ہو چکی ہو، خواہ بصورتِ نکاح یا بصورتِ زنا تو وہ بھی ثیبہ ہی کہی جائے گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

محرمات

(وہ عورتیں جن سے نکاح جائز نہیں)

قرآن میں مذکور فہرست

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۡ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النسآء ۴: ۲۳) تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں، جنھوں نے تمھاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمھارا تعلق زن وشو ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر (صرف نکاح ہوا ہو اور) تعلق زن وشو نہ ہوا ہو تو (انھیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور تمھارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری صُلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو، مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے۔ اِس لیے دونوں حرام ہیں۔ نیز اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۳۶، النسآء حاشیہ ۳۴)

سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کی حرمت

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (النسآء ۴: ۲۲) اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا[1]۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل

۱- تمدنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعموم قرآنِ مجید میں یہ بات ضرور (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے۔

اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جُرم ہے اور قابل دست اندازیِ پولیس ہے۔ ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو موت اور ضبطیِ جایداد کی سزا دی ہے۔ اور ابنِ ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ کلّیہ ارشاد فرمایا تھا کہ مَنْ وَقَعَ عَلٰی ذَاتِ مَحْرَمٍ فَاقْتُلُوْهُ، ''جو شخص محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اُسے قتل کردو''۔ فقہاء کے درمیان اِس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو اسی کے بات قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اِس کا مال ضبط کرلیا جائے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کی ہو تو اس پر حدِّ زنا جاری ہوگی اور اگر نکاح کیا ہو تو اُسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۳۵-۳۳۶، النسآء حواشی ۳۲-۳۳)

جس عورت سے باپ یا بیٹے کا ناجائز تعلّق رہا ہو اُس کا حُکم

اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلّق ہو چکا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سَلف میں سے بعض اِس کی حُرمت کے قائل نہیں ہیں اور بعض اِسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ اُن کے نزدیک جس عورت کو باپ نے شہوت سے ہاتھ لگایا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اِسی طرح سَلف میں اس اَمر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلّق ہو چکا ہو وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اِس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں، مگر یہ بات بادنیٰ تأمّل سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی شخص کے نِکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اُس کا باپ یا اُس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو، یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اُس کی نگاہ ہو ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اِس معاملہ میں اُن قانونی موشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیر نکاح اور قبلِ نکاح اور بعدِ نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فرمائی جاتی ہے کہ ''جو ہو چکا سو ہو چکا''۔ اِس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ بے علمی اور نادانی کے زمانہ میں جو غلطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو اُن پر گرفت نہیں کی جائے گی، بشرطیکہ اَب حُکم آجانے کے بعد طرزِ عمل کی اصلاح کرلو اور جو غلط کام ہیں اُنھیں چھوڑ دو۔ دُوسرے یہ کہ زمانہ سابق کے کسی طریقے کو اَب اگر حرام ٹھیرایا گیا ہے تو اُس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم ورواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جاچکے ہیں اُن کو کالعدم اور اِن سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز اور عائد شدہ ذِمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو آج حرام کیا گیا ہے تو اُس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اَب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے ہیں اُن کی اولاد حرام قرار دی جارہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں اِن کا حقِ وراثت ساقط کیا جارہا ہے۔ اِسی طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں اُنھیں بھی کالعدم ٹھیرایا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اِس طریقے سے کسی نے کمائی ہو اُس سے واپس لی جائے گی یا مالِ حرام ٹھیرائی جائے گی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۳۵، النساء حاشیہ ۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ مَنْ نَظَرَ اِلٰی فَرْجِ اِمْرَأَۃٍ حَرِمَتْ عَلَیْہِ اُمُّھَا وَ اِبْنَتُھَا[1] "جس شخص نے کسی عورت کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالی ہو اُس کی ماں اور بیٹی دونوں اُس پر حرام ہیں"۔ اور لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی رَجُلٍ نَظَرَ اِلٰی فَرْجِ اِمْرَأَۃٍ وَّ اِبْنَتِھَا[2] "خدا اُس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضا صنفی پر نظر ڈالے"۔ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہوجاتا ہے۔ بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ البتہ اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلقات کے نتیجے میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک وہ بھی جائز بیٹی کی طرح محرّمات میں سے ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ محرّمات میں سے نہیں ہے۔ مگر درحقیقت یہ تصور بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ جس لڑکی کے متعلق آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ اُسی کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اُس کے ساتھ نِکاح کرنا اُس کے لیے جائز ہو۔

مختلف بہنوں کا حکم

سگی بہن اور ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن تینوں اس حکم میں یکساں ہیں۔ اِن سب رشتوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن خواہ سگی ہو خواہ سوتیلی، یا باپ شریک بہرحال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اِسی طرح بھائی اور بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک، ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

(تفہیم القرآن، ص۳۳۶-۳۳۷، النساء حواشی ۳۴-۳۷)

خوش دامن اور سوتیلی بیٹی کے احکام

اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نِکاح ہوا ہو اُس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم اس کی حرمت کے قائل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ جب تک کسی عورت سے خلوت نہ ہوئی ہو اُس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

[سوتیلی بیٹی] کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں ہے کہ اُس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ یہ [وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ] الفاظ اللہ تعالیٰ نے محض اس رشتہ کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ فقہائے اُمّت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہرحال حرام ہے، خواہ اُس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔

بیٹے کی بیوی (بہو) کا حکم

[اور تمھارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری صُلب سے ہوں]۔ یہ تمہید اس غرض کے لیے بڑھائی گئی ہے کہ جسے آدمی

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج۵، ص۷۷
۲- ایضاً، ج۵، ص۷۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے بیٹا بنالیا ہو اُس کی بیوہ یا مطلقہ آدمی پر حرام نہیں ہے۔ حرام صرف اُس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صُلب سے ہو۔ اور بیٹے ہی کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی دادا اور نانا پر حرام ہے۔

خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کا ایک نِکاح میں اجتماع

نبی ﷺ کی ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نِکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اِس معاملے میں اُصول سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا بہرحال حرام ہے جن میں سے کوئی ایک اگر مَرد ہوتی تو اُس کا نِکاح دُوسری سے حرام ہوتا۔

دو بہنوں کا ایک مَرد کے نِکاح میں ہونا

جاہلیت کے زمانے میں جو ظلم تم لوگ کرتے رہے ہو کہ دو بہنوں سے بیک وقت نِکاح کر لیتے تھے اِس پر باز پرس نہ ہوگی بشرطیکہ اب اِس سے باز رہو۔ اِسی بنا پر یہ حُکم ہے کہ جس شخص نے حالتِ کفر میں دو بہنوں کو نِکاح میں جمع کر رکھا ہو اُسے اِسلام لانے کے بعد ایک کو رکھنا اور ایک کو چھوڑنا ہوگا۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۶-۳۹، النساء حواشی ۳۹-۴۳)

رضاعی ماں بہنوں کا حُکم

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ أَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (النسآء ۴:۲۳) تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، تمھاری بیٹیاں، تمھاری پھوپھیاں، تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور تمھاری بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دُودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں۔

اِس اَمر پر اُمت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اُس کے لیے وہ عورت ماں کے حُکم میں اور اُس کا شوہر باپ کے حُکم میں ہے اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اِس حُکم کا ماخذ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ[1]۔ البتہ اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ حرمتِ رضاعت کس قدر دُودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے اُتنی ہی مقدار میں اگر بچہ کسی کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

رضاعت کس عمر میں معتبر ہے؟

نیز اِس اَمر میں بھی اختلاف ہے کہ کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اِس باب میں فقہا کے اقوال حسبِ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۴۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذیل ہیں:

۱- اعتبار صرف اُس زمانے میں دُودھ پینے کا ہے جب کہ بچے کا دُودھ چھڑایا نہ جا چکا ہو اور شیر خوارگی ہی پر اُس کے تغذیہ کا انحصار ہو۔ ورنہ دُودھ چھٹائی کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دُودھ پی لیا ہو تو اُس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اُس نے پانی پی لیا۔ یہ رائے ام سلمہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت اس معنی میں آئی ہے۔ زہری، حسن بصری، قتادہ، عکرمہ اور اوزاعی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

۲- دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دُودھ پیا گیا ہو صرف اُسی سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی۔ یہ حضرت عمر، ابنِ مسعود، ابو ہریرۃ اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور فقہا میں سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد اور سفیان ثوری رحمہم اللہ نے اسے قبول کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک قول اسی کی تائید میں منقول ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی حد کے قائل ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ دو سال سے اگر مہینہ دو مہینے زائد عمر بھی ہو تو اُس میں دودھ پینے کا وہی حکم ہے۔

۳- امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام زُفر رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانۂ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر پینے سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

۴- خواہ کسی عمر میں دودھ پیے، حرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اس معاملے میں اصل اعتبار دُودھ کا ہے نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بوڑھا بھی ہو تو اُس کا وہی حُکم ہے جو شیر خوار بچے کا ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عائشہ کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح تر روایت اسی کی تائید میں منقول ہے۔ اور فقہا میں سے عُروہ بن زبیر، عطاء، لیث بن سعد اور ابنِ حزم رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۳۷-۳۳۸، النساء حاشیہ ۳۸)

مدتِ رضاعت میں فقہا کا اختلاف

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ (لقمان ۳۱: ۱۴) اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضُعف پر ضُعف اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دُودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اِسی لیے ہم نے اُس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔

وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ کے الفاظ سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، اور امام محمد رحمہم اللہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچے کی مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ اِس مدت کے اندر اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دُودھ پیا ہو تب تو حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی ورنہ بعد کی کسی رضاعت کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا۔ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت اسی قول کے حق میں ہے۔ لیکن امام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید احتیاط کی خاطر ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے[1]۔ اور اس کے ساتھ ہی امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر دو سال یا اس سے کم مدّت میں بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو اور اپنی غذا کے لیے بچہ دودھ کا محتاج نہ رہا ہو تو اس کے بعد کسی عورت کا دودھ پی لینے سے کوئی حرمت ثابت نہ ہوگی۔ البتہ اگر بچے کی اصلی غذا دودھ ہی ہو تو دوسری غذا تھوڑا بہت کھانے کے باوجود اِس زمانے کی رضاعت سے حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اِس لیے کہ آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ بچے کو لازماً دو سال ہی دودھ پلایا جائے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ[2] (البقرہ ۲:۲۳۳) مائیں بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرنا چاہتا ہو۔

محرّمات کی حُرمت میں پوشیدہ حکمت

س مناکحت کے سلسلے میں ایک عورت اور دوسری عورت میں کیوں امتیاز کیا گیا ہے کہ بعض کو عقد میں لایا جا سکتا ہے اور بعض محرمات کی فہرست میں آتی ہیں؟ اگرچہ ابتدائے انسانیت میں ایسی کوئی قید نظر نہیں آتی ہے جیسا کہ ہابیل اور قابیل کے قصے سے معلوم ہوتا ہے۔ اِس میں کیا حکمت ہے؟ کیا اِس قسم کی شادیاں حیاتیاتی مفاسد کا موجب بھی بن سکتی ہیں؟

ج محرّمات کی فہرست میں جن عورتوں کو شامل کیا گیا ہے، اُن کے حرام ہونے کی اصل وجہ حیاتیاتی حقائق نہیں ہیں، بلکہ اخلاقی اور معاشرتی حقائق ہیں۔ آپ خود غور کریں کہ جس ماں کے شہوانی جذبات بھی اپنے بیٹے سے متعلق ہو سکتے ہوں کیا وہ اُن پاکیزہ و مطہر جذبات کے ساتھ بیٹے کو پال سکتی ہے جو ماں اور بیٹے کے تعلقات میں ہونے چاہییں؟ اور کیا بیٹا ہوش سنبھالنے کے بعد ماں کے ساتھ وہ معصومانہ بے تکلّفی برت سکتا ہے جو ماں اور بیٹے کے درمیان اب ہوتی ہے؟ اور کیا ایک گھر میں باپ اور بیٹے کے درمیان رقابت اور حسد کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں گے اگر ماں اور بیٹے کے درمیان ابدی حُرمت کی دیوار حائل نہ ہو۔

ایسا ہی معاملہ بہن اور بھائی کا بھی ہے۔ اگر ابدی حُرمت اُن کے درمیان قائم نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ معصوم روابط اور شہوات سے پاک محبت اور شُبہات سے بالاتر بے تکلّفی برت سکتے؟ کیا اِس صورت میں یہ ممکن ہوتا کہ والدین، اپنے بیٹوں کو سنِ بلوغ کے قریب پہنچتے پر ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش نہ کرتے؟ اور کیا کوئی شخص بھی کسی لڑکی سے شادی کرتے وقت یہ اطمینان کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں سے بھی بچی ہوئی ہوگی؟

پھر اگر خُسر اور بہو کے درمیان اور ساس اور داماد کے درمیان ابدی حُرمت کی دیواریں حائل نہ کر دی جائیں تو کس طرح ممکن تھا کہ باپ اور بیٹے اور ماں اور بیٹیاں ایک دُوسرے کے ساتھ رقیبانہ کشمکش میں مبتلا ہونے اور ایک دوسرے کو شُبہ کی نظر

۱- ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اِن الفاظ سے یہ نتیجہ اَخذ کیا ہے اور اہلِ علم نے اِس پر اُن سے اتفاق کیا ہے کہ حمل کی قلیل ترین مدت چھ ماہ ہے۔ اِس لیے کہ قرآن میں ایک دُوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا[3] (الاحقاف ۴۶:۱۵) اِس کا پیٹ میں رہنا اور اس کا دودھ چھوٹنا تیس مہینوں میں ہوا۔ یہ ایک اہم قانونی نکتہ ہے جو جائز اور ناجائز ولادت کی بہت سی بحثوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۶، لقمان حاشیہ ۲۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے دیکھنے سے بچ جائیں۔

اس پہلو پر اگر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ شریعت نے کن اہم اخلاقی و معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر اُن تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دُوسرے کے لیے حرام کر دیا ہے۔ جن کے درمیان ایک گھر، ایک خاندان اور ایک دائرۂ معاشرت کے اندر قریب ترین روابط اور بے تکلف روابط فطرتاً ہوتے ہیں اور معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ہونے چاہییں۔ بیٹے اور بیٹیاں پل ہی نہیں سکتیں اگر ماں اور باپ دونوں اس طرف سے بالکل مطمئن نہ ہوں کہ اُن میں سے کسی کا بھی کوئی شہوانی علاقہ اپنی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک ہی گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کا پلنا غیر ممکن ہو جائے اگر بہن کے معاملے میں بھائیوں کے درمیان اور بھائی کے معاملے میں بہنوں کے درمیان شہوانی رقابتیں پیدا ہونے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ ہو۔ خالائیں اور پھوپھیاں اور چچا اور ماموں اگر شُبہ سے بالاتر نہ کر دیے جائیں تو بہن اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے اور بھائی اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے بچانے کی فکر میں لگ جائیں۔

(رسائل و مسائل، دوم، ص ۳۹۰-۳۹۲، مارچ ۱۹۸۲ء بحوالہ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۱ء

توأم (متحد الجسم) بہنوں کا حکم

ان دو (توأم متحد الجسم) لڑکیوں کے معاملے میں چار صورتیں ممکن ہیں:

ایک یہ کہ دونوں کا نکاح دو الگ شخصوں سے ہو۔ دوسری یہ کہ ان میں سے کسی ایک کا نکاح ایک شخص سے کیا جائے اور دوسری محروم رکھی جائے، تیسری یہ کہ دونوں کا نکاح ایک ہی شخص سے کر دیا جائے، چوتھی یہ کہ دونوں ہمیشہ نکاح سے محروم رہیں۔

ان میں سے پہلی دو صورتیں تو ایسی صریح ناجائز، غیر معقول اور ناقابلِ عمل ہیں کہ اُن کے خلاف کسی استدلال کی حاجت نہیں۔ اب رہ جاتی ہیں آخری دو صورتیں۔ یہ دونوں قابلِ عمل ہیں۔ مگر ایک صورت کے متعلق مقامی علما کہتے ہیں کہ یہ چونکہ جمع بین الاختین کی صورت ہے، جسے قرآن میں حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے لامحالہ آخری صورت پر ہی عمل کرنا ہوگا۔ بظاہر علما کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں لڑکیاں توأم بہنیں ہیں اور قرآن کا یہ حکم صاف اور صریح ہے کہ دو بہنوں کا بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ لیکن اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ان لڑکیوں کو دائمی تجرد پر مجبور کیا جائے اور یہ ہمیشہ کے لیے نکاح سے محروم رہیں؟ اور کیا قرآن کا یہ حکم واقعی اس مخصوص اور نادر صورتِ حال کے لیے ہے جس میں یہ دونوں لڑکیاں پیدائشی طور پر مبتلا ہیں؟

میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مخصوص حالت کے لیے نہیں ہے، بلکہ اُس عام حالت کے لیے ہے جس میں دو بہنوں کے الگ الگ مستقل وجود ہوتے ہیں اور وہ ایک شخص کے جمع کرنے سے ہی بیک وقت ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں، ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ عام حالات کے لیے حکم بیان کرتا ہے اور مخصوص، شاذ اور نادر الوقوع یا عسیر الوقوع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حالات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اِس طرح کے حالات سے اگر سابقہ پیش آ جائے تو تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ عام حُکم کو اُن پر جوں کا توں چسپاں کرنے کے بجائے صورتِ حُکم چھوڑ کر مقصدِ حُکم کو مناسب طریقے سے پورا کیا جائے۔

اِس کی نظیر یہ ہے کہ شارع نے روزے کے لیے بالفاظِ صریح یہ حُکم دیا ہے کہ طلوعِ فجر کے ساتھ اُس کو شروع کیا جائے اور رات کا آغاز ہوتے ہی افطار کیا جائے وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ (البقرہ ۲:۱۸۷) یہ حُکم زمین کے اُن علاقوں کے لیے ہے جن میں رات دِن کا اُلٹ پھیر چوبیس گھنٹوں کے اندر پورا ہو جاتا ہے اور حُکم کو اس شکل میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی آبادی کا بیشتر حصّہ اِنھی علاقوں میں رہتا ہے۔ اب ایک شخص سخت غلطی کرے گا اگر اِس حُکم کو اُن مخصوص حالات پر جُوں کا تُوں چسپاں کر دے گا جو قطبِ شمال کے قریب کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں رات اور دِن کا طُول کئی کئی مہینوں تک ممتد ہو جاتا ہے۔ اَیسے علاقوں کے لیے یہ کہنا کہ وہاں بھی طلوعِ فجر کے ساتھ روزہ شروع کیا جائے اور رات آنے پر کھولا جائے، یا یہ کہ وہاں سرے سے روزہ رکھا ہی نہ جائے، کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ اَیسے مقامات پر صورتِ حُکم کو چھوڑ کر کسی دوسری مناسب صورت سے حُکم کا منشا پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ روزوں کے لیے ایسے اوقات مقرر کر دیے جائیں جو زمین کی پیشتر آبادی کے اوقاتِ صوم سے مِلتے جُلتے ہوں۔

یہی صورت میرے نزدیک اِن دو لڑکیوں کے معاملے میں بھی اختیار کرنی چاہیے جن کے جسم آپس میں جُڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے نِکاح دو الگ شخصوں سے کرنے یا سرے سے نِکاح ہی نہ کرنے کی تجویزیں غلط ہیں۔ اس کے بجائے ہونا یہ چاہیے کہ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (النسآء ۴:۲۳) کے ظاہر کو چھوڑ کر صرف اِس کے منشا کو پورا کیا جائے۔ حُکم کا منشا یہ ہے کہ دو بہنوں کو سوکناپے کی رقابت میں مبتلا کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہاں چونکہ اَیسی صورتِ حال درپیش ہے کہ دونوں کا نِکاح یا تو ایک ہی شخص سے ہوسکتا ہے یا پھر کسی سے نہیں ہوسکتا۔ اِس لیے یہ فیصلہ اُنھی دونوں بہنوں پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ بیک وقت ایک شخص کے نِکاح میں جانے پر راضی ہیں یا دائمی تجرّد کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر وہ پہلی صورت کو خود قبول کر لیں تو اُن کا نِکاح کسی اَیسے شخص سے کر دیا جائے جو اُنھیں پسند کرے اور اگر وہ دُوسری صورت ہی کو ترجیح دیں تو پھر اِس ظُلم کی ذمہ داری سے ہم بھی بَری ہیں اور خدا کا قانون بھی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ بالفرض یہ دونوں ایک شخص کے نِکاح میں دے دی جائیں اور بعد میں وہ اِن میں سے کسی ایک کو طلاق دے دے تو کیا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اِس صورت میں دونوں اِس سے جُدا ہو جائیں گی۔ ایک اِس لیے کہ اُسے طلاق دی گئی اور دوسری اِس لیے کہ وہ اِس سے کوئی تمتع نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ خلوت اجنبیہ کے جُرم کا ارتکاب نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اُسے اپنے گھر بھی نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مطلقہ لڑکی کو اپنے گھر رہنے پر مجبور کرنے کا اُسے حق نہیں ہے اور غیر مطلقہ لڑکی اُس کے گھر اُس وقت تک نہیں رہ سکتی جب تک کہ مطلقہ لڑکی بھی اُس کے ساتھ نہ ہو۔ لہٰذا جب وہ اُن میں سے ایک کو طلاق دے گا تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دُوسری کو خُلع کے مطالبے کا جائز حق حاصل ہو جائے گا۔ اگر وہ خُلع نہ کرے تو عدالت کا فرض ہے کہ اُسے خُلع پر مجبور کرے۔ یہ لڑکیاں اپنی پیدائش ہی کی وجہ سے ایسی ہیں کہ کوئی شخص نہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ نِکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی ایک کو طلاق دے سکتا ہے۔ اُن کا نِکاح بھی ایک ساتھ ہوگا اور طلاق بھی۔ هٰذا ما عندي والله اعلم بالصواب۔

(رسائل و مسائل، سوم، ص ۲۵۴-۲۶۰، جولائی ۱۹۷۶ء بحوالہ ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۵۴ء)

سوتیلے بیٹے کی بیوی کا حُکم

حضرت زید اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعے کی روشنی میں: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (الاحزاب ۳۳:۳۷) پھر جب زید اُس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اِس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نِکاح کر دیا تا کہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ اُن سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔ اور اللہ کا حُکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔

حاجت پوری کرنے کا مفہوم: جب زید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اُن کی عدت پوری ہو گئی۔ "حاجت پوری کر چکا" کے الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ کی اس سے کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ اور یہ صورتِ حال محض طلاق دے دینے سے رونما نہیں ہوتی، کیونکہ عدت کے دَوران میں شوہر کو اگر کچھ دِل چسپی باقی ہو تو وہ رُجوع کر سکتا ہے اور شوہر کی یہ حاجت بھی مطلقہ بیوی سے باقی رہتی ہے کہ اِس کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چل جائے۔ اِس لیے مطلقہ بیوی کے ساتھ اس کے سابق شوہر کی حاجت صِرف اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب عدت گزر جائے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۰۱-۱۰۲، الاحزاب حاشیہ ۷۱)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نِکاح اللہ کے حُکم سے ہوا: زَوَّجْنٰكَهَا کے الفاظ اس باب میں صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نِکاح خود اپنی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حُکم کی بنا پر کیا تھا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۰۲، الاحزاب حاشیہ ۷۲)

اِس نکاح کی مصلحت وضرورت: اللہ تعالیٰ نے یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی ضرورت اور مصلحت کی خاطر کرایا تھا جو اس تدبیر کے سوا کسی دُوسرے ذریعہ سے پوری نہ ہوسکتی تھی۔ عرب میں منہ بولے رشتوں کے بارے میں جو غلط رسوم رائج ہو گئی تھیں، اُن کے توڑنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ کا رسول خود آگے بڑھ کر اُن کو توڑ ڈالے۔ لہٰذا یہ نِکاح اللہ تعالیٰ نے محض نبی کے گھر میں ایک بیوی کا اضافہ کرنے کی خاطر نہیں بلکہ ایک اہم ضرورت کی خاطر کروایا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۰۲، الاحزاب حاشیہ ۷۳)

آپ کے لیے یہ نِکاح فرض تھا: مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ (الاحزاب ۳۳:۳۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کر دیا ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان الفاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے تو اِس طرح کا نِکاح مباح ہے مگر نبی ﷺ کے لیے یہ ایک فرض تھا جو اللہ نے آپ پر عائد کیا تھا۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۰۲،الاحزاب حاشیہ ۷۴)

کیا یہ ضابطہ تمام انبیا کے لیے ہے؟: سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (الاحزاب ۳۳:۳۸) اور یہی اللہ کی سنت اُن سب انبیا کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکی ہے اور اللہ کا حُکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔

انبیا کے لیے ہمیشہ سے یہ ضابطہ مقرر رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حُکم بھی آئے اِس پر عمل کرنا اُن کے لیے قضائے مُبرم ہے جس سے کوئی مَفر اُن کے لیے نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر کوئی کام فرض کر دے تو اُسے وہ کام کر کے ہی رہنا ہوتا ہے خواہ ساری دُنیا اُس کی مخالفت پر تُل گئی ہو۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۰۱-۱۰۲،الاحزاب حاشیہ ۷۵)

حضرت زید اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نِکاح وطلاق میں احکامی اشارات

مخالفین کے پروپیگنڈے کے دوران میں اہلِ ایمان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟: وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب ۳۳:۳۷) اے نبی ﷺ! یاد کرو وہ موقع جب تم اُس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر۔

یہاں سے آیت ۴۸ تک کا مضمون اُس وقت نازل ہوا، جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ نِکاح کر چکے تھے اور اس پر منافقین، یہود اور مشرکین نے آپؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ ان آیات کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات اُن دُشمنوں کی تفہیم کے لیے نہیں تھے جو قصداً حضور ﷺ کو بدنام کرنے اور اپنے دِل کی جلن نکالنے کے لیے جھوٹ اور بہتان اور طعن و تشنیع کی مہم چلا رہے تھے، بلکہ اصل مقصود مسلمانوں کو اُن کی اِسی مہم کے اثرات سے بچانا اور اُن کے پھیلائے ہوئے شکوک وشبہات سے محفوظ کرنا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کلام منکرین کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا، اِس سے اگر اطمینان نصیب ہو سکتا تھا تو اُنھی لوگوں کو جو جانتے اور مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اِن بندگانِ حق کے متعلق اُس وقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دُشمنوں کے اعتراضات کہیں اُن کے دِلوں میں بھی شک اور اُن کے دماغوں میں بھی اُلجھن نہ پیدا کر دیں۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تمام امکانی شُبہات کا ازالہ فرما دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور خود نبی ﷺ کو بھی یہ بتایا کہ اِن حالات میں اُن کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۹۹،الاحزاب حاشیہ ۶۷)

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنی بیوی روکے رکھنے کا مشورہ: اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ، اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے اور انھوں نے بار بار شکایات پیش کرنے کے بعد آخر کار نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں اُن کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اگرچہ اللہ اور اُس کے رسول کا حُکم مان کر اُن کے نِکاح میں جانا قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے دِل سے اِس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زید رضی اللہ عنہ ایک آزاد کردہ غلام ہیں، اُن کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اِس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اِس احساس کی وجہ سے اَزدواجی زندگی میں اُنھوں نے کبھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اور اِسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدّت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۰۰، الاحزاب حاشیہ ۶۹)

اس ضمن میں حضور ﷺ کو اللہ سے ڈرنے کا حکم: وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ۖ (الاحزاب ۳۳:۳۷) تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو۔

بعض لوگوں نے اس فقرے کا اُلٹ مطلب یہ نکال لیا ہے کہ نبی ﷺ خود حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نِکاح کے خواہش مند تھے اور آپ کا جی چاہتا تھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اُن کو طلاق دے دیں، مگر جب اُنھوں نے آ کر عرض کیا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپؐ نے معاذ اللہ اُوپری دِل سے اُن کو منع کیا، اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ”تم دِل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا“۔ حالانکہ اصل بات اِس کے برعکس ہے۔ اگر اِس سورہ کی آیات نمبر ۱، ۲، ۳ اور ۷ کے ساتھ ملا کر یہ فقرہ پڑھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور اُن کی اہلیہ کے درمیان تلخی بڑھتی چلی جا رہی تھی اِسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو یہ اشارہ کر چکا تھا کہ زید رضی اللہ عنہ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو اُن کی مطلّقہ خاتون سے آپ کو نِکاح کرنا ہوگا۔ لیکن چونکہ حضور ﷺ جانتے تھے کہ عرب کی اِس سوسائٹی میں مُنہ بولے بیٹے کی مطلّقہ سے نِکاح کرنا کیا معنی رکھتا ہے..... اور وہ بھی عین اِس حالت میں جب کہ مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا باقی سارا عرب آپؐ کے خلاف پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا..... اِس لیے آپؐ اِس شدید آزمائش میں پڑنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اِسی بنا پر جب حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضور ﷺ نے اُن سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ آپ کا منشا یہ تھا کہ یہ شخص طلاق نہ دے تو میں اِس بَلا میں پڑنے سے بچ جاؤں، ورنہ اِس کے طلاق دے دینے کی صورت میں مجھے حُکم کی تعمیل کرنی ہوگی اور پھر مجھ پر وہ کیچڑ اُچھالی جائے گی کہ پناہ بخدا! مگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اُولوا العزمی اور رضا بالقضا کے جس بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتا تھا اُس کے لحاظ سے حضور ﷺ کی یہ بات اُس کو فروتر نظر آئی کہ آپؐ نے قصداً زید رضی اللہ عنہ کو طلاق سے روکا تا کہ آپؐ اُس کام سے بچ جائیں جس میں آپ کو بدنامی کا اندیشہ تھا، حالانکہ اللہ ایک بڑی مصلحت کی خاطر وہ کام لینا چاہتا تھا۔ ”تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو“ کے الفاظ صاف صاف اِسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہی بات اِس آیت کی تشریح میں امام زین العابدین حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو خبر دے چکا تھا کہ زینب رضی اللہ عنہا آپ کی بیویوں میں شامل ہونے والی ہیں، مگر جب زید رضی اللہ عنہ نے آکر شکایت آپؐ سے کی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نہ چھوڑو۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمھیں پہلے خبر دے چکا تھا کہ تمھارا نکاح زینب رضی اللہ عنہا سے کرنے والا ہوں، تم زید سے یہ بات کہتے وقت اُس بات کو چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا (ابنِ جریر، ابنِ کثیر، بحوالہ ابن ابی حاتم)۔

علامہ آلوسی نے بھی تفسیر روح المعانی میں اِس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہ عتاب ہے ترکِ اَولیٰ پر اُس حالت میں اَولیٰ یہ تھا کہ نبی ﷺ خاموش رہتے، یا زید رضی اللہ عنہ سے فرما دیتے کہ تم جو کچھ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ عتاب کا ماحصل یہ ہے کہ تم نے زید رضی اللہ عنہ سے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو، حالانکہ میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ زینب رضی اللہ عنہا تمھاری بیویوں میں شامل ہوں گی۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۰۱، الاحزاب حاشیہ ۷۰)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

متفرق مباحث

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

تعدد ازواج

بنیادی حکم

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ (النسآء ۴:۳) اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ اُن کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا اُن عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمھارے قبضے میں آئی ہیں، بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

اس کے تین مفہوم اہلِ تفسیر نے بیان کیے ہیں:

۱۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں اُن کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ اُن کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ اس کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر اُن پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو دوسری عورتیں دُنیا میں موجود ہیں، اُن میں سے جو تمھیں پسند آئیں اُن کے ساتھ نکاح کرلو۔ اسی سورہ میں اُنیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔[1]

۲۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور اُن کے شاگرد عکرمہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کرلیتا تھا۔ اور جب اس کثرتِ ازدواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے

۱۔ وَمَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ فِیۡ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیۡ لَا تُؤۡتُوۡنَہُنَّ مَا کُتِبَ لَہُنَّ وَ تَرۡغَبُوۡنَ اَنۡ تَنۡکِحُوۡہُنَّ (النسآء ۴:۱۲۷) اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سُنائے جارہے ہیں یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کرلینا چاہتے ہو)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ عدل پر قائم رہ سکو۔

۳- سعید بن جُبیر اور قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے، اہلِ جاہلیت بھی اُن کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں اُن کے ذہن عدل و انصاف کے تصور سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر اُن کے ساتھ ظلم و جور سے پیش آتے تھے۔ اِس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اوّل تو چار سے زیادہ نِکاح ہی نہ کرو اور اِس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ اِن تینوں تفسیروں کے محتمل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مُراد ہوں۔ نیز اِس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو اُن عورتوں سے نِکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں[1]۔

اِس بات پر فقہائے اُمت کا اجماع ہے کہ اِس آیت کی رُو سے تعدّدِ ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اِس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائف کا رئیس غَیلان جب اِسلام لایا تو اس کی نَو بیویاں تھیں نبی ﷺ نے اُسے حُکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اِسی طرح ایک دُوسرے شخص (نَوفل بن معاویہ رضی اللہ عنہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپؐ نے حُکم دیا کہ اِن میں سے ایک کو چھوڑ دے[2]۔

نیز یہ آیت تعدّدِ ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا، مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اُٹھاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ دَغا بازی کرتا ہے۔ حکومتِ اِسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو اُن کی دادرسی کریں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی مسیحیت زدہ رائے سے مغلوب و مرعُوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا

۱- یہ معنی اِس لحاظ سے زیادہ دِل کو لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ یہ سورۃ جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھی اور اِس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بات کہ اسلام میں چار بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے، اور یہ کہ بیک وقت چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اور یہ کہ اس فرمان کا کوئی تعلق یتامیٰ کے معاملے سے نہیں ہے، محض اِس آیت سے نہیں نکلتی بلکہ نبی ﷺ کی اُس قولی و عملی تشریح سے معلوم ہوتی ہے جو آپؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد فرمائی تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے اُن لوگوں کو جن جن کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں تھیں حُکم دے دیا کہ وہ صرف چار رکھ لیں اور اس سے زائد جس قدر بھی ہوں اُنھیں چھوڑ دیں۔ حالانکہ ان کے ہاں یتامیٰ کا کوئی معاملہ پیش نہ تھا۔ نیز آپؐ کے عہد میں بکثرت صحابہ رضی اللہ عنہم نے چار کی حد کے اندر متعدد نکاح کیے اور آپؐ نے کسی سے یہ نہ فرمایا کہ تمھارے لیے یتیم بچوں کی پرورش کا کوئی سوال نہیں ہے، اِس لیے تم اِس اجازت سے فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں رکھتے۔ اِسی بنا پر صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر بعد کے اَدوار تک اُمت کے تمام فقہا نے یہ سمجھا کہ یہ آیت نکاح کے لیے بہ یک وقت چار کی حد مقرر کرتی ہے، جس سے تجاوز جائز نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ چار کی اجازت عام ہے۔ اُس کے ساتھ یہ کوئی قید نہیں کہ یتامیٰ کا کوئی معاملہ بھی درمیان میں ہو۔ خود حضور ﷺ نے متعدد نکاح کیے اور کسی میں یتیموں کے مسئلے کا دخل نہ تھا۔ (رسائل و مسائل، سوم، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۸۱-۸۲)

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۹۱-۹۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اصل مقصد تعدّدِ ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطۂ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا، مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعدّدِ ازواج کا فی نفسہٖ ایک بُرائی ہونا بجائے خود نا قابلِ تسلیم ہے۔ کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز تمدّنی اور اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے، حصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں جس کے نقصانات تمدّن و اخلاق کے لیے اُس سے بہت زیادہ ہیں جو تعدّدِ ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے اُن لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ جن لوگوں کے نزدیک تعدّدِ ازواج فی نفسہٖ ایک بُرائی ہے اُن کو یہ اختیار تو ضرور حاصل رہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اُس کی مذمت کریں اور اُسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں، لیکن یہ حق اُنھیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کو جائز ٹھیرایا ہے اور اشارۃً و کنایۃً بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اُسے مسدود کرنا چاہتا ہے۔[1]

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۱-۳۲۲، النساء حاشیہ ۵)

تعدّدِ ازواج کا حکم عورتوں کے مفاد میں ہے

[یہ خیال، کہ عورت کی پوزیشن خانگی زندگی میں فروتر رکھی گئی ہے اس لیے کہ مرد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے جبکہ عورت کو ایک ہی شوہر کے ساتھ رہنا پڑتا ہے، یہ ایک بے جا خیال ہے] اگر آپ غور کریں تو یہ بات بہت آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ عورت کے لیے تین سوکنوں کا برداشت کرنا جتنا تکلیف دِہ ہے اس سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ چیز اُس کے لیے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے شوہر کی کئی کئی محبوبائیں اور داشتائیں ہوں۔ اسلام نے اسی کو روکنے کے لیے مرد کو ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک مرد ناجائز تعلقات میں جتنا بے باک ہو سکتا ہے۔ شادیاں رچانے میں اتنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شادی کی صورت میں مرد کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور طرح طرح کی پیچیدگیوں سے اُسے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ دراصل عورتوں ہی کے فائدے کے لیے ایک روک تھام ہے نہ کہ مردوں کے لیے بے جا رعایت۔ دوسرے طریقے کا تجربہ آج کل مغرب کی سوسائٹی کر رہی ہے۔ وہاں ایک طرف تو جائز سوکنوں کا سدِّ باب کر دیا گیا ہے۔ لیکن دُوسری طرف ناجائز سوکنوں سے عورت کو بچانے کا کوئی انتظام اس کے سوا نہیں کیا گیا کہ وہ اُنھیں برداشت نہ کر سکے تو شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت میں نالش کر دے۔ [لیکن سوال یہ ہے کہ] کیا اس سے عورت کی مصیبت کچھ کم ہو گئی ہے؟ چھٹری چھٹانک عورت تو شاید سوکن سے بچنے کے لیے طلاق کو آسان سمجھ لے مگر کیا بچوں والی عورت کے لیے بھی یہ نسخہ آسان ہے؟

(رسائل و مسائل، چہارم، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۳۶-۳۷)

۱- مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سنت کی آئینی حیثیت، ص ۳۰۷-۲۱۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعددِ ازواج کی صورت میں پیش آنے والے مسائل

وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۝ (النساء ۴:۱۲۸) جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے[1]۔ نفس تنگ دِلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں[2]، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمھارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا[3]۔

زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور اِن کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اِس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہوگئیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دُوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلّق زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے اور شوہر دُوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبت رکھے؟ جسمانی تعلّق میں بھی یکسانی برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دُوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اِس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کر لے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۰۲، النساء حاشیہ ۱۵۷)

بیویوں کے درمیان عدل کا مطلب

وَ لَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا

۱- طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اِس طرح باہم مصالحت کر کے ایک عورت اُس شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصّہ گزار چکی ہے۔

۲- عورت کی طرف سے تنگ دِلی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مَرد کی طرف سے تنگ دِلی یہ ہے کہ جو عورت دِل سے اُتر جائے پھر بھی اُس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اُس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حقوق ناقابلِ برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۰۲، النساء حواشی ۱۵۸-۱۵۹)

۳- یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مَردہی کے جذبۂ فیاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعموم ایسے معاملات میں اُس کا قاعدہ ہے۔ اِس نے مَرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اِس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو برسوں اِس کی رَفیقِ زندگی رہی ہے اور اِس خدا سے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب سے اپنی نظرِ التفات اس سے پھیر لے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اُتر آئے تو پھر اُس کا دُنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۰۳، النساء حاشیہ ۱۶۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ (النسآء ۴:۱۲۹-۱۳۰) بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا، ایک خوبصورت ہے اور دوسری بدصورت۔ ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ۔ ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست۔ ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج اور اسی طرح کے دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبت و رغبت اور جسمانی تعلق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مساوات رکھی جائے۔ بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اُس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے، لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری بیوی معلق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعدُّدِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ ”تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے“ تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ ”لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک جاؤ“ اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۰۳، النساء حاشیہ ۱۶۱)

حضور ﷺ کے لیے حلال بیویوں کی تعداد

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ (الاحزاب ۳۳:۵۰) اے نبی ﷺ! ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیں تمھاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمھاری ملکیت میں آئیں اور تمھاری وہ چچازاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبی ﷺ اُسے نکاح میں لینا چاہے۔ یہ رعایت خالصۃً تمھارے لیے ہے، دوسرے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

مومنوں کے لیے نہیں ہے۔

یہ دراصل جواب ہے اُن لوگوں کے اعتراض کا جو کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) دُوسرے لوگوں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع قرار دیتے ہیں، مگر خود اُنھوں نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نِکاح کے وقت نبی ﷺ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ ایک حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا جن سے ۳ قبلِ ہجرت میں آپؐ نے نِکاح کیا تھا۔ دُوسری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن سے نِکاح تو ۳ قبلِ ہجرت میں ہو چکا تھا مگر اِن کی رُخصتی شوال ۱ھ میں ہوئی تھی۔ تیسری حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا جن سے شعبان ۳ھ میں آپ کا نِکاح ہوا اور چوتھی حضرت اُمِّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا جنھیں حضور ﷺ نے شوال ۴ھ میں زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ اِس طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اِس پر کفار و منافقین جو اعتراض کر رہے تھے اُس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دے رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! تمھاری یہ پانچوں بیویاں جنھیں مَہر دے کر تم اپنے نِکاح میں لائے ہو، ہم نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہی ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنیٰ کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اگر وہ قید لگانے کے ہم مجاز تھے تو آخر اس استثنا کے مجاز ہم کیوں نہیں ہیں۔

اِس رخصت کا مقصود

اس جواب کے بارے میں یہ بات پھر ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ اِس سے مقصود کفار و منافقین کو مطمئن کرنا نہیں تھا بلکہ اُن مسلمانوں کو مطمئن کرنا تھا جن کے دِلوں میں مخالفینِ اِسلام وسوسے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنھیں چونکہ یقین تھا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا ہے، اِس لیے قرآن کی ایک محکم آیت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ نبی ﷺ نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو خود مستثنیٰ نہیں کر لیا ہے، بلکہ یہ استثنا کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے۔

آپؐ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے نِکاح کی اجازت

پانچویں بیوی کو حضور ﷺ کے لیے حلال کرنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں حضور ﷺ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے بھی نِکاح کی اجازت عطا فرمائی۔

۱- وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپ کی ملکیت میں آئیں۔ اِس اجازت کے مطابق حضور ﷺ نے غزوۂ بنی قُرَیظہ کے سبایا میں سے حضرت رَیحانہ رضی اللہ عنہا، غزوۂ بنی المصطلق کے سبایا میں سے حضرت جُوَیریہ رضی اللہ عنہا، غزوۂ خیبر کے سبایا میں سے حضرت صَفِیہ رضی اللہ عنہا اور مُقَوقِس مصر کی بھیجی ہوئی حضرت ماریہ قِبطِیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے لیے مخصوص فرمایا۔ اِن میں سے مقدم الذکر تین کو آپؐ نے آزاد کر کے اِن سے نِکاح کیا تھا، لیکن حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا سے بر بنائے مِلکِ یمین تمتع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرمایا۔ ان کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے اُن کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا ہو۔

۲- آپ کی چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں میں سے وہ خواتین جنھوں نے ہجرت میں آپ کا ساتھ دیا ہو۔

آیت میں آپ کے ساتھ ''ہجرت کرنے'' کا جو ذکر آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہجرت کے سفر میں آپ کے ساتھ رہی ہوں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کی خاطر راہِ خدا میں ہجرت کر چکی ہوں۔ حضور ﷺ کو اختیار دیا گیا کہ ان رشتہ دار مہاجر خواتین میں سے بھی آپ جس سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس اجازت کے مطابق آپ نے ۷ھ میں حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا (ضمناً اس آیت میں یہ صراحت بھی ہے کہ چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں ایک مسلمان کے لیے حلال ہیں۔ اس معاملہ میں اسلامی شریعت عیسائی اور یہودی، دونوں مذہبوں سے مختلف ہے۔ عیسائیوں کے ہاں کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں کر سکتا جس سے سات پشت تک مرد کا نسب ملتا ہو اور یہودیوں کے ہاں سگی بھانجی اور بھتیجی تک سے نکاح جائز ہے)

۳- وہ مومن عورت جو اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے ہبہ کرے، یعنی بلا مہر اپنے آپ کو حضور ﷺ کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو اور حضور ﷺ اسے قبول کرنا پسند فرمائیں۔ اس اجازت کی بنا پر آپ نے شوال ۷ھ میں حضرت میمونہ کو اپنی زوجیت میں لیا، لیکن آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر اُن کے ہبہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس لیے آپ نے ان کی کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر اُن کو مہر عطا فرمایا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے نکاح میں کوئی موہوبہ بیوی نہ تھیں۔ مگر اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپ نے ہبہ کرنے والی بیوی کو بھی مہر دیے بغیر نہ رکھا۔

عام مسلمان کے لیے حکم

خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ''یہ رعایت خالصۃً تمھارے لیے ہے، دُوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔''

اِس فقرے کا تعلق اگر صرف قریب کے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دُوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے لیے ہبہ کرے اور وہ بلا مہر اس سے نکاح کر لے۔ اور اگر اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے مانا جائے تو اس سے مُراد یہ ہوگی کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی رعایت صرف حضور ﷺ کے لیے ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔

آپ کے لیے چند مخصوص احکام

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ احکام نبی ﷺ کے لیے خاص ہیں جن میں اُمّت کے دُوسرے لوگ آپ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن و سنت کے تتبع سے ایسے متعدد احکام کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً حضور ﷺ کے لیے نمازِ تہجد فرض تھی اور باقی اُمّت کے لیے وہ نفل ہے۔ آپ کے لیے اور آپ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ لینا حرام ہے اور کسی کے لیے وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حرام نہیں ہے۔آپؐ کی میراث تقسیم نہ ہو سکتی تھی، باقی سب کی میراث کے لیے وہ احکام ہیں جو سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؐ کے لیے چار سے زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپؐ پر واجب نہیں کیا گیا، اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرنے کی آپؐ کو اجازت دی گئی، اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی بیویاں تمام اُمت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں سے کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں ہے جو حضور ﷺ کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو۔ مفسرین نے آپؐ کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی ہے کہ آپؐ کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح ممنوع ہے، حالانکہ باقی اُمت کے لیے وہ حلال ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۱۲-۱۱۵، الاحزاب حواشی ۸۷-۸۹)

آپ کو اِس عام قاعدے سے مستثنیٰ فرمانے کی مصلحت

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الاحزاب ۳۳: ۵۰) ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر اُن کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیے ہیں (تمھیں اُن حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تاکہ تمھارے اُوپر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

یہ وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو عام قاعدے سے مستثنیٰ فرمایا۔ 'تنگی نہ رہے' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپؐ کی خواہشاتِ نفسانی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے آپ کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ آپؐ صرف چار بیویوں تک محدود رہنے میں تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اِس فقرے کا یہ مطلب صرف وہی شخص لے سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو کر اس بات کو بھول جائے کہ محمد ﷺ نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی تھی جن کی عمر اُس وقت ۴۰ سال تھی اور پورے ۲۵ برس تک آپؐ اُن کے ساتھ نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے ایک اور سن رسیدہ خاتون حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور پورے چار سال تک تنہا وہی آپؐ کی بیوی رہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل اور ایمان دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال کی عمر سے گزر جانے کے بعد یکا یک حضور کی خواہشاتِ نفسانی بڑھتی چلی گئیں اور آپ کو زیادہ سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔

تنگی نہ رہنے کا مطلب

دراصل 'تنگی نہ رہنے' کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک طرف تو اُس کارِ عظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اُوپر ڈالی تھی اور دوسری طرف اُن حالات کو سمجھے جن میں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے لیے آپؐ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن کو پاک کر کے جو شخص بھی ان دونوں حقیقتوں کو سمجھ لے گا وہ بخوبی جان لے گا کہ بیویوں کے معاملے میں آپؐ کو کھلی اجازت دینا کیوں ضروری تھا اور چار کی قید میں آپؐ کے لیے کیا 'تنگی' تھی۔

حضور ﷺ کے ذِمے سپرد کام کی نوعیت

حضور ﷺ کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ ایک اَن پڑھ قوم کو جو اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نہیں، بلکہ عام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے بھی ناتراشیدہ تھی، ہر شعبۂ زندگی میں تعلیم و تربیت دے کر ایک اعلیٰ درجہ کی مہذب و شائستہ اور پاکیزہ قوم بنائیں۔ اس غرض کے لیے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی نہ تھا، بلکہ عورتوں کی تربیت بھی اُتنی ہی ضروری تھی۔ مگر جو اُصولِ تمدن و تہذیب سکھانے کے لیے آپؐ مامور کیے گئے تھے اُن کی رُو سے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ممنوع تھا اور اس قاعدے کو توڑے بغیر آپؐ کے لیے عورتوں کو براہِ راست خود تربیت دینا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر عورتوں میں کام کرنے کی صرف یہی ایک صورت آپؐ کے لیے ممکن تھی کہ مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدد خواتین سے آپؐ نکاح کریں، اُن کو براہِ راست خود تعلیم و تربیت دے کر اپنی مدد کے لیے تیار کریں اور پھر اُن سے شہری اور بدوی اور جوان اور اُدھیڑ اور بوڑھی، ہر قسم کی عورتوں کو دین سکھانے اور اخلاق و تہذیب کے نئے اُصول سمجھانے کا کام لیں۔

اس کے علاوہ نبی ﷺ کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی تھی کہ پرانے جاہلی نظامِ زندگی کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کر دیں۔ اس خدمت کی انجام دہی سے جاہلی نظام کے علمبرداروں سے جنگ ناگزیر تھی اور یہ کشمکش ایک ایسے ملک میں پیش آ رہی تھی جہاں قبائلی طرزِ زندگی اپنی مخصوص روایات کے ساتھ رائج تھا۔ ان حالات میں دُوسری تدابیر کے ساتھ آپؐ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے بہت سی دوستیوں کو پختہ اور بہت سی عداوتوں کو ختم کر دیں۔ چنانچہ جن خواتین سے آپؐ نے شادیاں کیں اُن کے ذاتی اَوصاف کے علاوہ اُن کے انتخاب میں یہ مصلحت بھی کم و بیش شامل تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کر کے آپؐ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ گہرا اور مستحکم کر لیا۔ حضرت اُمِ سَلَمہ رضی اللہ عنہا اس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالد بن ولید کا تعلق تھا۔ اور حضرت اُمِ حَبِیبہ رضی اللہ عنہا ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بہت بڑی حد تک ان خاندانوں کی دُشمنی کا زور توڑ دیا۔ بلکہ اُمِ حَبِیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور ﷺ کا نکاح ہونے کے بعد تو ابوسفیان پھر کبھی حضور ﷺ کے مقابلے پر نہ آیا۔ حضرت صفیہ، جُوَیریہ اور رَیحانہ رضی اللہ عنہن یہودی خاندان میں سے تھیں۔ اُنھیں آزاد کر کے جب حضور ﷺ نے اُن سے نکاح کیے تو آپؐ کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ اُس زمانے کی عربی روایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی تھی وہ صرف لڑکی کے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا اور داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات تھی۔

معاشرے کی عملی اصلاح اور اس کی جاہلانہ رسوم کو توڑنا بھی آپؐ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ چنانچہ ایک نکاح آپؐ کو اس مقصد کے لیے بھی کرنا پڑا، جیسا کہ اسی سورۂ احزاب میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔

یہ مصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی ﷺ کے لیے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے۔ تاکہ جو کارِ عظیم آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا اُس کی ضروریات کے لحاظ سے آپؐ جتنے نکاح کرنا چاہیں کر لیں۔

تعددِ ازواج سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ

اس بیان سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ تعددِ ازواج صرف چند شخصی ضرورتوں کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خاطر ہی جائز ہے اور اُن کے ماسوا کوئی غرض ایسی نہیں ہوسکتی جس کے لیے یہ جائز ہو۔ ظاہر بات ہے کہ نبی ﷺ نے جو ایک سے زائد نکاح کیے اُن کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی، یا بانجھ تھی، یا اولادِ نرینہ نہ تھی، یا کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپؐ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے کیے، یا اصلاحِ معاشرہ کے لیے، یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لیے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعددِ ازواج کو اُن چند گنی چُنی مخصوص امراض تک، جن کا آج نام لیا جارہا ہے، محدود نہیں رکھا اور اللہ کے رسول نے اُن کے سوا بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے متعدد نکاح کیے تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قیود تجویز کرے اور اوپر سے دعویٰ یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کررہا ہے۔ دراصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیل ہے کہ تعددِ ازواج بجائے خود ایک برائی ہے۔ اسی تخیل کی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعلِ حرام اگر کبھی حلال ہو بھی سکتا ہے تو صرف شدید ناگزیر ضروریات کے لیے ہوسکتا ہے۔ اب اِس درآمد شدہ تخیل پر اسلام کا جعلی ٹھپہ لگانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے، قرآن وسنت اور پوری اُمتِ مُسلمہ کا لٹریچر اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۱۵-۱۱۷، الاحزاب حاشیہ ۹۰)

بیویوں کی باری سے متعلق آپؐ کا طرزِ عمل

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَ لَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا۝ (الاحزاب ۳۳:۵۱) تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلالو۔ اِس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اِس طرح زیادہ متوقع ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم اُن کو دو گے اُس پر وہ سب راضی رہیں گی۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دِلوں میں ہے اور اللہ علیم وحلیم ہے۔

اس آیت سے مقصود نبی ﷺ کو خانگی زندگی کی اُلجھنوں سے نجات دلانا تھا تاکہ آپؐ پورے سکون کے ساتھ اپنا کام کرسکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں حضور ﷺ کو پورے اختیارات دے دیے کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے جس کے ساتھ جو برتاؤ چاہیں کریں تو اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ یہ مومن خواتین آپؐ کو کسی طرح پریشان کرتیں یا آپس میں مسابقت اور رقابت کے جھگڑے پیدا کرکے آپؐ کے لیے اُلجھنیں پیدا کرتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار پالینے کے بعد بھی حضور ﷺ نے تمام ازواجؓ کے درمیان پورا پورا عدل فرمایا، کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی اور باقاعدہ باری مقرر کرکے آپؐ سب کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔ محدثین میں سے صرف ابورزین یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے صرف چار بیویوں (حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب اور حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہن) کو باریوں کی تقسیم میں شامل کیا تھا اور باقی ازواج کے لیے کوئی باری مقرر نہ کی تھی۔ لیکن دوسرے تمام محدثین و مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں اور نہایت قوی روایات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے اس اَمر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس اختیار کے بعد بھی حضور ﷺ تمام ازواج کے ہاں باری باری سے جاتے تھے اور سب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ بخاری، مسلم، نسائی اور ابوداؤد وغیرہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اس آیت کے نزول کے بعد بھی حضور ﷺ کا طریقہ یہی رہا کہ آپ ہم میں سے کسی بیوی کی باری کے دِن دُوسری بیوی کے ہاں جاتے تو اُس سے اجازت لے کر جاتے تھے"۔ ابوبکر جصاص عُروہ بن زبیر کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اُن سے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ باریوں کی تقسیم میں ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپ کسی روز اپنی سب بیویوں کے ہاں نہ جاتے ہوں، مگر جس بیوی کی باری کا دِن ہوتا تھا اُس کے سوا کسی دُوسری بیوی کو چھوتے تک نہ تھے"۔ اور یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی ہے کہ جب حضور ﷺ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے اور نقل وحرکت آپ کے لیے مشکل ہوگئی تو آپ نے سب بیویوں سے اجازت طلب کی کہ مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رہنے دو اور جب سب نے اجازت دے دی تب آپ نے آخری زمانہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزارا۔ ابنِ ابی حاتم امام زُہری کا قول نقل کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کا کسی بیوی کو باری سے محروم کرنا ثابت نہیں ہے۔ اِس سے صِرف حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا مستثنیٰ ہیں جنھوں نے خود اپنی باری بخوشی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بخش دی تھی، کیونکہ وہ بہت سن رسیدہ ہوچکی تھیں۔

ایک شُبہ اور اُس کا ازالہ

اِس مقام پر کسی کے دِل میں یہ شُبہ نہ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ اِس آیت میں اپنے نبیؐ کے ساتھ کوئی بے جا رِعایت کی تھی اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ فرمایا تھا۔ دراصل جن عظیم مصالح کی خاطر نبی ﷺ کو بیویوں کی تعداد کے معاملہ میں عام قاعدے سے مستثنیٰ کیا گیا تھا اُنھی مصالح کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپ کی خانگی زندگی کا سکون بہم پہنچایا جائے اور اُن اسباب کا سدِ باب کیا جائے جو آپؐ کے لیے پریشان خاطری کے موجب ہوسکتے ہوں۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے یہ ایک بہت بڑا شرف تھا کہ اُنھیں نبی ﷺ جیسی بزرگ ترین ہستی کی زوجیت حاصل ہوئی اور اُس کی بدولت اُن کو یہ موقع نصیب ہوا کہ دعوت واصلاح کے اُس عظیم الشان کام میں آپ کی رفیقِ کار بنیں جو رہتی دُنیا تک انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بننے والا تھا۔ اِس مقصد کے لیے جس طرح نبی ﷺ غیر معمولی ایثار وقربانی سے کام لے رہے تھے اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اپنے حدِ استطاعت تک قربانیاں کر رہے تھے۔ اِسی طرح ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا بھی یہ فرض تھا کہ ایثار سے کام لیں۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ کے اِس فیصلے کو تمام ازواجِ رسول نے بخوشی قبول کیا۔

ایک تنبیہ

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دِلوں میں ہے اور اللہ علیم وحلیم ہے۔

یہ تنبیہ ہے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے بھی اور دُوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے تنبیہ اِس بات کی ہے کہ اللہ کا یہ حُکم آجانے کے بعد اگر وہ دِل میں بھی کبیدہ خاطر ہوں گی تو گرفت سے نہ بچ سکیں گی۔ اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دُوسرے لوگوں کے لیے اِس میں یہ تنبیہ ہے کہ نبی ﷺ کی ازدواجی زندگی کے متعلق کسی طرح کی بدگمانی بھی اگر انھوں نے اپنے دِل میں رکھی یا فکر و خیال کے کسی گوشے میں بھی وسوسہ پالتے رہے تو اللہ سے اُن کی یہ چوری چھپی نہ رِہ جائے گی۔ اِس کے ساتھ اللہ کی صفتِ حِلم کا بھی ذِکر کر دیا گیا ہے تا کہ آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ نبیؐ کی شان میں گستاخی کا تخیّل بھی اگرچہ سخت سزا کا مستوجب ہے، لیکن جس کے دِل میں کبھی ایسا کوئی وسوسہ آیا ہو وہ اگر اُسے نکال دے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی کی اُمید ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۱۷-۱۱۸، الاحزاب حواشی ۹۱-۹۲)

حضور ﷺ کو حلال کی گئی عورتوں میں سے کسی کو طلاق دینے کا حق نہیں

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝ (الاحزاب ۳۳:۵۲) اِس کے بعد تمھارے لیے دُوسری عورتیں حلال نہیں ہیں، اور نہ اِس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آ ؤ خواہ اُن کا حُسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو، البتہ لونڈیوں کی تمھیں اجازت ہے۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔

اِس ارشاد کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جو عورتیں اُوپر آیت نمبر ۵۰ میں حضور ﷺ کے لیے حلال کی گئی ہیں اِن کے سوا دُوسری کوئی عورت اب آپؐ کے لیے حلال نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب آپؐ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اِس بات کے لیے راضی ہو گئی ہیں کہ تنگی و تُرشی میں آپ کا ساتھ دیں اور آخرت کے لیے دُنیا کو اُنھوں نے تج دیا ہے اور اِس پر بھی خوش ہیں کہ آپؐ جو برتاؤ بھی اِن کے ساتھ چاہیں کریں تو اب آپؐ کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ اِن میں سے کسی کو طلاق دے کر اُس کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں۔

(تفہیم القرآن، چہارم،ص ۱۱۸، الاحزاب، حاشیہ ۹۳)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

گھریلو اختلافات

ازدواجی تعلقات کے بگاڑ پر ابلیس کا اظہارِ مسرّت

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آ کر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اُس کے شوہر میں جُدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سُن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے تو کام کر کے آیا ہے۔

ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی کا اور اِس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو اُسی درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اِس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمایش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے اُنھیں کیوں حُکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جُدائی ڈالنے کا 'عمل' اُن کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے اُن کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔[1]

(تفہیم القرآن، اوّل، ص۹۹، البقرۃ حاشیہ ۱۰۶)

نشوز[2] (سرکشی) کی حالت میں کارروائی کے حدود

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا (النساء ۴:۳۴) اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو اُنھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو اور مارو، پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ اُن پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اُوپر اللہ موجود ہے

۱- بحوالہ تفہیم الاحادیث، ج۵، ص۳۸، اشاعتِ اوّل

۲- نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔
(حقوق الزواجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص۲۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو بڑا اور بالاتر ہے۔

قانونِ اسلام نے چونکہ مَرد کو قوّام بنایا ہے اور اِس پر عورت کے مَہر، نفقے اور نگہبانی وخبر گیری کی ذِمّہ داری عائد کی ہے۔ اِس لیے وہ مَرد کو عورت پر چند اَیسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے اور اپنے گھر کے اخلاق اور حسنِ معاشرت کی حفاظت کرنے اور خود اپنے حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے اِس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانونِ اسلام میں ان اختیارات کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے اور اِس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کردیے گئے ہیں جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

اگر عورت اپنے شَوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اِس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مَرد پر لازم ہے کہ پہلے اُس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اُس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسبِ ضرورت اُس کے ساتھ سختی کرے اور اگر اُس پر بھی نہ مانے تو وہ اُس کو مار سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُس کی اطاعت کرنے لگے۔

اِس آیت میں وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر اُن کو چھوڑ دو) فرما کر سزا کے طور پر ترکِ مباشرت کی اجازت دی گئی ہے، مگر آیتِ ایلا نے اِس کے لیے ایک فطری حد مقرّر کردی ہے کہ یہ بستر کی علیحدگی چار مہینے سے زیادہ نہ ہو۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شَوہر ناراض ہو کر اُس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شَوہر ازروئے احکامِ الٰہی اِس کو طلاق دے دے گا اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے وہ اِسی قابل ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ چار مہینے کی مدّت اُس کو ادب سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اِس سے زیادہ مدّت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہو گا۔ کیونکہ اِتنے دِن تک اُس کا نشوز پر قائم رہنا، یہ جانتے ہوئے کہ اِس کا نتیجہ طلاق ہے، اِس بات کی دلیل ہے کہ اُس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یا وہ حسنِ معاشرت کے ساتھ کم از کم اِس شَوہر سے نباہ نہیں کرسکتی۔ نیز اِس سے وہ مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لیے ایک مَرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتۂ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسی حالت میں شَوہر اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرنے کے لیے کسی ناجائز طریقے کی طرف مائل ہوجائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنے میں مبتلا ہوجائے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں میاں بیوی میں سے ایک اس قدر ضدّی اور شوریدہ سر ہو وہاں زَوجین میں مودت ورحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سفیان ثوری سے وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ کے معنی میں ایک دُوسرا قول منقول ہے۔ وہ کلامِ عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ھجر کے معنی باندھنے کے ہیں۔ هجر البعير اذا ربطه صاحبه بالهجار، هَجار اُس رَسّی کو کہتے ہیں جو اُونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں اُن کو باندھ کر ڈال دو۔ لیکن یہ معنی قرآنِ مجید کے منشا سے بعید ہیں۔ فی المضاجع کے الفاظ میں قرآن نے اپنے منشا کی طرف صاف اشارہ کردیا ہے۔ مضجع سونے کی جگہ کو کہتے ہیں اور سونے کی جگہ میں باندھنا بالکل ایک بے معنی بات ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے۔ مگر اس کے لیے نبی ﷺ نے یہ قید لگادی ہے کہ ضرب شدید نہ ہونی چاہیے۔

اِضْرِبُوْهُنَّ اِذَا عَصَيْنَكُمْ فِي الْمَعْرُوْفِ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَّلَا يَضْرِبِ الْوَجْهَ وَ لَا يُقَبِّحْ[1] ، اگر وہ تمھارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں تو اُن کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دِہ نہ ہو۔ منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔

یہ دو سزائیں دینے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے سزا اس نافرمانی پر دی جاسکتی ہے جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہو، نہ یہ کہ ہر جا و بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور عورت نہ مانے تو اُس کو سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ، جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اُس پر ترکِ کلام اور جس پر ترکِ کلام کافی ہے اُس پر هجر فی المضاجع اور جس پر هجر فی المضاجع کافی ہے اُس پر مارنا ظلم میں شُمار ہوگا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صِرف شدید اور ناقابلِ برداشت قصور پر ہی دی جاسکتی ہے اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی ﷺ نے مقرر فرمائی ہے[2]۔ اِس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کی زیادتی ہوگی اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اُس کے خلاف قانون سے امداد طلب کرے[3]۔

(حقوق الزّوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۴۶-۴۹)

حَکَم (ثالث) کا تقرّر

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۷۵-۷۶

۲- آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا اُن پر عمل درآمد، تو بہر حال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہوسکتی ہو وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی ﷺ نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے۔ بادلِ نخواستہ دی ہے اور پھر بھی اُسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر درست ہی نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں نبی ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۵۰، النساء حاشیہ ۵۹)

۳- قانونِ اسلامی کے اصول میں اس کی گنجایش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت اور ناقابلِ برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہوگیا ہے اور شوہریت کے معنی یہ سمجھے جارہے ہیں کہ وہ ظلم وجور کا غیر محدود لائسنس ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ مار پیٹ اور گالم گلوچ کی عادت کو خُلع کے جائز اسباب میں شمار کیا جائے اور ایسی عورتوں کو بلا معاوضہ خُلع دلوادیا جائے جن کے شوہروں کی اس عادت کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ (حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عَلِيْمًا خَبِيْرًا (النساء ۴: ۳۵)اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں[1] اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔

اِس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے اور اُس کی تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اِس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اِس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تا کہ اگر زَوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں اور اگر مقدمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

ثالثوں کے اختیارات

اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں؟ فقہا میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ تصفیہ کی جو صورت اُن کے نزدیک مناسب ہو اُس کے لیے سفارش کر سکتے ہیں۔ ماننا یا نہ ماننا زَوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زَوجین نے اُن کو طلاق یا خُلع یا کسی اور اَمر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ اُن کا فیصلہ تسلیم کرنا زَوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حنفی اور شافعی علما کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ حَسن بصری اور قتادہ اور بعض دُوسرے فقہا کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اِس بات کا قائل ہے کہ اِن پنچوں کو ملانے اور جُدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابن عباس، سعید بن جُبَیر، ابراہیم نَخَعی، شَعبی، محمد بن سیرین رحمہم اللہ اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات پنچ مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے اُن کو حاکمانہ اختیارات دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عَقِیل بن ابی طالب اور اُن کی بیوی فاطمہ بنت عُتبہ بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش ہوا تو اُنھوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو پنچ مقرر کیا اور اُن سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں اُن کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اِسی طرح ایک مقدمے میں حضرت

1- دونوں سے مراد ثالث بھی ہیں اور زَوجین بھی۔ ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان ہے بشرطیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور بیچ والے بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

علی رضی اللہ عنہ نے حَکَم مقرر کیے اور اُن کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جدا کر دیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ پنچ بطورِ خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے۔ البتہ اگر عدالت اُن کو مقرر کرتے وقت اُنھیں اختیارات دے دے تو پھر اُن کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہوگا۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۵۰-۳۵۱، النساء حواشی ۶۰-۶۱)

اِس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریقِ کار اختیار فرمایا وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اُس کی بیوی کا مقدمہ آیا۔ آپ نے قرآنِ مجید کے فرمان: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کے مطابق حَکَم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حَکَم تجویز کریں۔ پھر دونوں حَکَموں کو مخاطب کر کے فرمایا: تمھارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملا دو، اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔ پھر عورت سے دریافت فرمایا: کیا تو ان دونوں پنچوں کے فیصلہ پر راضی ہے؟ اُس نے عرض کیا: ہاں میں راضی ہوں، اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا۔ اُس نے کہا: اگر وہ ملا دیں تو مجھے اُن کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اِس پر آپؓ نے فرمایا:

لَيْسَ ذَالِكَ لَكَ لَسْتَ بِبَارِحٍ حَتّٰى تَرْضٰى بِمِثْلِ مَا رَضِيَتْ بِهٖ ؛ تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جا سکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو، تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں ایسی چند دفعات کا اضافہ کیا جائے جن میں تحکیم کے طریقے اور حَکَمین کے اختیارات اور اُن کے متفقہ فیصلے کے طریقِ نفاذ اور اختلاف کی صورت میں عدالت کے طریقِ کار کی صراحت کر دی جائے۔ اسلامی قانون میں یہ ایک بڑی قیمتی چیز ہے کہ خانگی جھگڑوں کو حتی الامکان کھلی عدالت میں زیرِ بحث لانے سے پرہیز کیا جائے اور اگر عدالتوں میں ایسے معاملات آئیں بھی تو حاکم عدالت اُن کی تحقیق اور اُن کا فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں خاندانوں کے ذِمّہ دار افراد سے اُس گتھی کے سُلجھانے میں مدد لے۔

(حقوق الزّوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۰-۱۳۱)

...........OOO...........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

اِیلا

بنیادی حکم

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ ۲: ۲۲۶-۲۲۷) جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر انھوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اصطلاحِ شرع میں اس کو ایلاء کہتے ہیں، میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے۔ بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ ازدواج میں تو بندھے رہیں، مگر عملاً ایک دوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینے کی مدت مقرر کردی کہ یا تو اس دوران میں اپنے تعلقات درست کر لو ورنہ ازدواج کا رشتہ منقطع کر دو تاکہ دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں، اُس کے ساتھ نکاح کر لیں۔

حکم کا اطلاق

آیت میں چونکہ 'قسم کھا لینے' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس لیے فقہائے حنفیہ اور شافعیہ نے اِس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلقِ زن و شو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو، صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو، اِس آیت کا حکم اُس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدت ہے۔ ایک قول امام احمد کا بھی اِسی کی تائید میں ہے (بدایة المجتھد، دوم ص ۸۸ طبع مصر ۱۳۳۹ھ)۔

حضرت علی اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترک تعلق کے لیے ہے جو بگاڑ کی وجہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے ہو، رہا کسی مصلحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا، جبکہ تعلقات خوشگوار ہوں تو اُس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا لیکن دُوسرے فقہا کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کر دے، ایلاء ہے اور اُسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے۔ خواہ ناراضی سے ہو یا رضامندی سے۔

فَاِنْ فَآءُوْا بعض فقہانے اِس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اِس مدت کے اندر اپنی قَسم توڑ دیں اور پھر سے تعلقِ زن و شو قائم کر لیں تو اِن پر قَسم توڑنے کا کفارہ نہیں ہے۔ اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا۔ لیکن اکثر فقہا کی رائے یہ ہے کہ قَسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ غفور رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارہ سے تمھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمھارے کفّارے کو قبول کر لے گا اور ترکِ تعلّق کے دَوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دُوسرے پر کی ہو اُسے معاف کر دیا جائے گا۔

اِیلاء کی انتہائی مدّت

حضرت عثمان، ابنِ مسعود، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وغیرہم کے نزدیک رُجوع کا موقع چار مہینے کے اندر ہی ہے۔ اِس مدّت کا گزر جانا خود اِس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، اِس لیے مدّت گزرتے ہی طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاق بائن ہوگی۔ یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا۔ البتہ اگر وہ دونوں چاہیں تو دوبارہ نِکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمر، علی، ابنِ عباس اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اِس معنی میں منقول ہے اور فقہائے حنفیہ نے اِسی رائے کو قبول کیا ہے۔

سعید بن مُسَیّب، مکحول، زُہری وغیرہ حضرات اِس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی، مگر اِن کے نزدیک وہ ایک طلاق رجعی ہوگی۔ یعنی دورانِ عدّت میں شوہر کو رُجوع کر لینے کا حق ہوگا اور رُجوع نہ کرے تو عدّت گزر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں تو نِکاح کر سکیں گے۔

بخلاف اِس کے حضرت عائشہ، ابوالدَّرداء رضی اللہ عنہما اور اکثر فقہائے مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہوگا اور حاکمِ عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اِس عورت سے رُجوع کرے یا اُسے طلاق دے۔ حضرت عمر، حضرت علی اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم کا ایک قول اِس کی تائید میں بھی ہے اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ نے اُسی کو قبول کیا ہے[1]۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۱-۱۷۳، البقرۃ، حواشی ۲۴۵-۲۴۷)

اِیلاء میں حلف ضروری نہیں ہے

اِس مسئلے میں بعض فقہا نے حلف کی شرط لگائی ہے۔ یعنی اگر شوہر نے بیوی کے پاس نہ جانے کی قَسم کھائی ہے تب تو ایلا ہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا۔ لیکن اگر قَسم نہیں کھائی تو خواہ وہ بیوی سے ناراض ہو کر دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے اُس پر

۱- ایلاء کے متعلق تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۱۷۳ پر ملاحظہ ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایلاء کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔

اِس دعوے کے دلائل

اس سلسلے میں میرے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

اوّل یہ کہ قرآنِ مجید اگر کسی خاص صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حُکم دے اور ایسے الفاظ استعمال کرے جن کا اطلاق اُسی صورتِ معاملہ پر ہوتا ہو تو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اِس حُکم کا اطلاق اُسی صورتِ معاملہ پر ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن نے سوتیلی بیٹی کو اُس کے باپ پر حرام کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ، اور تمھاری وہ پرورده لڑکیاں جنھوں نے تمھاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اِس سے صرف اُن لڑکیوں کے حرام ہونے کا حُکم نکلتا ہے جو چھوٹی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ سوتیلے باپ کے گھر آئی ہوں۔ مگر کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ یہ حُکم صرف اُسی صورت کے لیے خاص ہے۔ بلکہ سب اُس لڑکی کے حرام ہونے پر بھی متفق ہیں جو سوتیلے باپ سے اپنی ماں کے نکاح کے وقت جوان ہو اور جس نے ایک دِن بھی اُس باپ کے گھر میں پرورش نہ پائی ہو۔ اِسی طرح اگر قرآن نے لفظ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ، بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھالیتے ہیں، کے الفاظ استعمال کیے ہیں تو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کے لیے جو حُکم بیان کیا گیا ہے وہ صرف قسم کھانے والے لوگوں ہی کے لیے خاص ہو۔

دوم یہ کہ احکامِ فقہیہ کے استنباط میں یہ اُصول قریب قریب ساری اُمّت میں متفق علیہ ہے کہ جس صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حُکم نہ پایا جاتا ہو اُس کو کسی ایسی صورتِ معاملہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں حُکم موجود ہو، بشرطیکہ دونوں میں علّتِ حُکم مشترک ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ شارع نے ایلاء کرنے والوں کے لیے چار مہینے کی مدّت کس لیے مقرّر کی ہے اور کیوں یہ فرمایا ہے کہ اگر اس مدت کے اندر رجوع نہ کرو تو پھر طلاق دے دو؟ کیا اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ اور بتائی جا سکتی ہے کہ چار مہینے سے زیادہ مدت تک مقاربت سے پرہیز کرنا عورت کے لیے موجبِ ضرار ہے اور شارع ضرار ہی کو روکنا چاہتا ہے؟ اِسی آیت سے اگلے رکوع میں شارع کا یہ ارشاد موجود ہے کہ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا، اُن کو محض ضرار کے لیے نہ روک رکھو تاکہ اُن پر زیادتی کرو۔ اور سورۂ نساء میں شارع فرماتا ہے: فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ، پس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جھک پڑو کہ دُوسری کو مُعلّق چھوڑ دو۔ اِن اشارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو نکاح میں بھی رکھنا اور پھر اُسے معلق رکھ چھوڑنا اور محض ستانے کے لیے روک رکھنا شارع کو پسند نہیں ہے۔ اِس کے سوا چار مہینے کی مدّت مقرّر کرنے کی کوئی دُوسری علّت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اب اگر یہی علّت اِس صورت میں بھی پائی جاتی ہو جب کہ شوہر قسم کھائے بغیر بیوی سے قصداً مباشرت کرنا چھوڑ دے تو کیوں نہ اُس پر بھی یہی حُکم نافذ کیا جائے؟ آخر قسم کھانے یا نہ کھانے سے نفسِ ضرار میں کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا کوئی معقول آدمی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ شوہر قسم کھا کر ترکِ مباشرت کرے تو ضرار ہوگا۔ اور اگر اس نے قسم نہ کھائی ہو تو ساری عمر بھی اِس بیوی کے پاس نہ جانے سے کوئی ضرار نہ ہوگا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سوم یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ازدواجی قانون کا اہم ترین مقصد اخلاق اور عصمت کی حفاظت ہے۔ ایک مرد اگر ایک بیوی سے ناراض ہو کر دُوسری بیوی کو لے تو وہ اِس طرح اپنے آپ کو بدکاری و بدنظری سے بچا سکتا ہے۔ لیکن وہ عورت جسے اس کے شوہر نے خواہشاتِ نفس کی تسکین سے مستقل طور پر محروم کر رکھا ہو وہ کس طرح اپنے اخلاق کی حفاظت کر سکتی ہے۔ جب تک کہ اُس کا شوہر اُس کی طرف رُجوع نہ کرے؟ کیا شارعِ حکیم سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایسی عورت کے شوہر نے اگر اُس سے الگ رہنے کی قسم کھائی ہو تب تو وہ اِس کی اخلاق کی حفاظت کا بندوبست کرے گا، ورنہ اُسے غیر محدود مدّت تک بداخلاقی کے خطرے میں مبتلا چھوڑ دے گا۔

ان وجوہ سے میرے نزدیک فتویٰ فقہائے مالکیہ کے مسلک پر ہونا چاہیے جو فرماتے ہیں کہ ''اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے مباشرت ترک کر دے تو اُس پر بھی ایلاء ہی کا حُکم لگایا جائے گا، اگرچہ اُس نے قسم نہ کھائی ہو کیونکہ ایلاء پر پابندی عائد کرنے سے شارع کا مقصود ضرار کو روکنا ہے اور یہ علّت اُس ترکِ مباشرت میں بھی پائی جاتی ہے جو حلف کے بغیر بقصدِ ضرار کیا جائے''۔ (احکام القرآن لابن العربی، ج ا، ص ۷۵۔ بدایۃ المجتھد لابن رُشد، ج ۲، ص ۸۸)۔

وَ اِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ کی تفسیر میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان، زید بن ثابت، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدّت کا گزر جانا ہی اِس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے۔ لہٰذا اِس مدّت کے ختم ہونے پر اُس کو رُجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت علی و ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ایک قول اِس معنی میں منقول ہے۔ مگر ایک دوسرا قول جو موخر الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے، یہ ہے کہ ختم مدّت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ اپنی بیوی سے رُجوع کر و یا اُس کو طلاق دے دو۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والوں کو بالفاظِ صریح صرف چار مہینے کی مہلت دی ہے۔ اس کو رُجوع کا حق اِس مہلت کے اندر ہی ہے۔ اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز طلاق اور جُدائی کے اور کوئی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص چار مہینے کے بعد اُس کو رُجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اِس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۳۵-۳۸)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

ظِہار

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ (المجادلۃ ۵۸:۲) تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، اُن کی بیویاں اُن کی مائیں نہیں ہیں۔

ظِہار کے لغوی معنی

عرب میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی تھی کہ شوہر اور بیوی میں لڑائی ہوتی تو شوہر غصّے میں آ کر کہتا: اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ، اِس کے معنی تو یہ ہیں کہ ''تو میرے اُوپر ایسی ہے، جیسے میری ماں کی پیٹھ'' لیکن اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ''تجھ سے مباشرت کرنا میرے لیے ایسا ہے جیسے میں اپنی ماں سے مباشرت کروں''۔ اِس زمانے میں بھی بہت سے ناداں لوگ بیویوں سے لڑ کر اُس کو ماں، بہن، بیٹی سے تشبیہ دے بیٹھتے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی گویا اب اُسے بیوی نہیں بلکہ اُن عورتوں کی طرح سمجھتا ہے جو اُس کے لیے حرام ہیں۔ اِسی فعل کا نام ظِہار ہے۔ ظہر عربی زبان میں استعارے کے طور پر سواری کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً سواری کے جانور کو ظہر کہتے ہیں، کیونکہ اُس کی پیٹھ پر آدمی سوار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ لوگ بیوی کو اپنے اُوپر حرام کرنے کے لیے کہتے تھے کہ تجھے ظہر بنانا میرے اُوپر ایسا حرام ہے جیسے اپنی ماں کو ظہر بنانا، اِس لیے یہ کلمات زبان سے نکالنا اُن کی اصطلاح میں ظِہار کہلاتا تھا۔ جاہلیت کے زمانے میں اہلِ عرب کے ہاں یہ طلاق، بلکہ اِس سے بھی زیادہ شدید قطعِ تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اُن کے نزدیک اِس کے معنی یہ تھے کہ شوہر اپنی بیوی سے نہ صرف ازدواجی رِشتہ توڑ رہا ہے بلکہ اُسے ماں کی طرح اپنے اُوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ اِسی بنا پر اہلِ عرب کے نزدیک طلاق کے بعد تو رُجوع کی گنجایش ہوسکتی تھی مگر ظِہار کے بعد رُجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا تھا۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۰، المجادلہ حاشیہ ۳)

ظِہار کے متعلق اللہ کا پہلا فیصلہ

اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ (المجادلۃ ۵۸:۲) اِن کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے اُن کو جنا ہے۔

یہ ظِہار کے متعلق اللہ تعالیٰ کا پہلا فیصلہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے تشبیہ دے دیتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے تو اُس کے ایسا کہنے سے بیوی ماں نہیں ہو سکتی۔ نہ اُس کو وہ حُرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ اب آخر وہ عورت جس نے اُس کو نہیں جنا ہے، محض منہ سے کہہ دینے پر اُس کی ماں کیسے ہو جائے گی، اور اُس کے بارے میں عقل، اخلاق، قانون، کسی چیز کے اعتبار سے بھی وہ حرمت کیسے ثابت ہو گی جو اُس امرِ واقعی کی بنا پر جننے والی ماں کے لیے ہے۔ اِس طرح یہ بات ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اُس قانون کو منسوخ کر دیا جس کی رُو سے ظِہار کرنے والے شوہر سے اُس کی بیوی کا نِکاح ٹوٹ جاتا تھا اور وہ اِس کے لیے ماں کی طرح قطعی حرام سمجھ لی جاتی تھی۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۱، المجادلہ حاشیہ ۴)

بیوی کو ماں سے تشبیہ دینا نہایت بے ہودہ بات اور جھوٹ ہے

وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۚ (المجادلة ۵۸:۲) یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔

بیوی کو ماں سے تشبیہ دینا اوّل تو ایک نہایت ہی بے ہودہ اور شرمناک بات ہے جس کا تصور بھی کسی شریف آدمی کو نہ کرنا چاہیے، کجا کہ وہ اُسے زبان سے نکالے۔ دُوسرے یہ جھوٹ بھی ہے۔ کیونکہ ایسی بات کہنے والا اگر یہ خبر دے رہا ہے کہ اُس کی بیوی اُس کے لیے اب ماں ہو گئی ہے تو جھوٹی خبر دے رہا ہے۔ اور اگر وہ اپنا یہ فیصلہ سنا رہا ہے کہ آج سے اُس نے اپنی بیوی کو ماں کی سی حُرمت بخش دی ہے تو بھی اُس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے، کیونکہ خدا نے اُسے یہ اختیارات نہیں دیے ہیں کہ جب تک چاہے ایک عورت کو بیوی کے حُکم میں رکھے اور جب چاہے اُسے ماں کے حُکم میں کر دے۔ شارع وہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جننے والی ماں کے ساتھ مادری کے حُکم میں دادی، نانی، ساس، دودھ پلانے والی عورت اور ازواجِ نبی ﷺ کو شامل کیا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اِس حُکم میں اپنی طرف سے کسی اور عورت کو داخل کر دے، کجا کہ اُس عورت کو جو اُس کی بیوی رہ چکی ہے۔ اِس ارشاد سے یہ دوسرا قانونی حُکم نکلا کہ ظِہار کرنا ایک بڑا گناہ اور حرام فعل ہے جس کا مُرتکب سزا کا مستحق ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۱، المجادلہ حاشیہ ۵)

جرم کی ہلکی سی سزا

وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (المجادلة ۵۸:۲) اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔

یعنی یہ حرکت تو ایسی ہے کہ اِس پر آدمی کو بہت ہی سخت سزا ملنی چاہیے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اُس نے اوّل تو ظِہار کے معاملے میں جاہلیت کے قانون کو منسوخ کر کے تمھاری خانگی زندگی کو تباہی سے بچا لیا، دوسرے اِس فعل کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے وہ سزا تجویز کی جو اس جرم کی ہلکی سے ہلکی سزا ہو سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی مہربانی یہ ہے کہ سزا کسی ضرب یا قید کی شکل میں نہیں بلکہ چند ایسی عبادات اور نیکیوں کی شکل میں تجویز کی جو تمھارے نفس کی اصلاح کرنے والی اور تمھارے معاشرے میں بھلائی پھیلانے والی ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اِسلام میں بعض جرائم اور گناہوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پر جو عبادات بطورِ کفارہ مقرر کی گئی ہیں وہ نہ محض سزا ہیں کہ عبادت کی رُوح سے خالی ہوں اور نہ محض عبادت ہیں کہ سزا کی اذیت کا کوئی پہلو اُن میں نہ ہو، بلکہ اُن میں یہ دونوں پہلو جمع کر دیے گئے ہیں، تاکہ آدمی کو اذیت بھی ہو اور ساتھ ساتھ وہ ایک نیکی اور عبادت کر کے اپنے گناہ کی تلافی بھی کر دے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۲، المجادلہ حاشیہ ۲)

عہدِ رسالت میں ظِہار کے چند واقعات

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ (المجادلۃ ۵۸:۳) جو لوگ اپنی بیویوں سے ظِہار کریں پھر اپنی اُس بات سے رُجوع کریں جو اُنھوں نے کہی تھی تو قبل اِس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ اِس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

یہاں سے ظِہار کے قانونی حُکم کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اِس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ظِہار کے وہ واقعات نگاہ میں رہیں جو نبی ﷺ کے عہدِ مبارک میں پیش آئے تھے، کیونکہ اِسلام میں ظِہار کا مفصل قانون اُنھی آیات اور اُن فیصلوں سے ماخوذ ہے جو اِن آیات کے نزول کے بعد حضور ﷺ نے پیش آمدہ واقعات میں صادر فرمائے۔

پہلا واقعہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق اِسلام میں ظِہار کا پہلا واقعہ اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کا ہے جن کی بیوی خولہ رضی اللہ عنہا کی فریاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ محدثین نے اِس واقعے کی جو تفصیلات متعدد راویوں سے نقل کی ہیں اُن میں فروعی اختلافات تو بہت سے ہیں، مگر قانونی اہمیت رکھنے والے ضروری اجزا قریب قریب متفق علیہ ہیں۔ خلاصہ ان روایات کا یہ ہے کہ حضرت اَوس بن صامت رضی اللہ عنہ بڑھاپے میں کچھ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے۔ اور بعض روایات کی رُو سے اُن کے اندر کچھ جنون کی سی لٹک بھی پیدا ہو گئی تھی جس کے لیے راویوں نے کَانَ بِهٖ لَمَمٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لَمَمٌ عربی زبان میں دیوانگی کو نہیں کہتے، بلکہ اُس طرح کی ایک کیفیت کو کہتے ہیں جسے ہم اردو زبان میں 'غصے میں پاگل ہو جانے' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِس حالت میں وہ پہلے بھی متعدد مرتبہ اپنی بیوی سے ظِہار کر چکے تھے، مگر اِسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ بیوی سے لڑ کر اُن سے پھر اِس حرکت کا صدور ہو گیا۔ اِس پر اُن کی اہلیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا قصہ آپؐ سے بیان کر کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میری اور میرے بچوں کی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لیے رخصت کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے جو جواب دیا وہ مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں کہ ''ابھی تک اِس مسئلے میں مجھے کوئی حُکم نہیں دیا گیا ہے'' اور بعض میں یہ الفاظ ہیں کہ ''میرا خیال یہ ہے کہ تم اُس پر حرام ہو گئی ہو'' اور بعض میں یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''تم اِس پر حرام ہو گئی ہو''۔ اِس جواب کو سُن کر وہ نالہ و فریاد کرنے لگیں۔ بار بار اُنھوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اُنھوں نے طلاق کے الفاظ تو نہیں کہے ہیں، آپؐ کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صورت ایسی بتائیں جس سے میں اور میرے بچے اور میرے بوڑھے شوہر کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔ ﷺ اُن کو وہی جواب دیتے رہے۔ اِتنے میں آپؐ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ اِس آپؐ نے اُن سے کہا اور بعض روایات کی رُو سے اُن کے شوہر کو بلا کر اُن سے فرمایا کہ ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اُنھوں نے اُ سے معذوری ظاہر کی تو فرمایا دو مہینے کے لگا تار روزے رکھنے ہوں گے۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ اُس کا حال تو یہ ہے کہ دِن میں تین مرتبہ کھائیں پئیں نہیں تو اُن کی بینائی جواب دینے لگتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا دینا پڑے گا۔ اُنھوں نے عرض کیا: وہ اتنی مقدرت بھی نہیں رکھتے، اِلا یہ کہ آپؐ مدد فرمائیں۔ تب آپؐ نے اُنھیں اِتنی مقدار میں سامانِ خوراک عطا فرمایا جو ۶۰ آدمیوں کی دو وقت کی غذا کے لیے کافی ہو۔ اِس کی مقدار مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے اور بعض روایات میں یہ ہے کہ جتنی مقدار حضور ﷺ نے عطا فرمائی اُتنی ہی خود حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کو دی تا کہ وہ کفارہ ادا کر سکیں (ابنِ جریر، مسند احمد، ابو داؤد، ابنِ ابی حاتم)۔

دوسرا واقعہ: ظِہار کا دوسرا واقعہ سَلَمہ بن صَخر بَیاضی کا ہے۔ اِن صاحب پر اعتدال سے کچھ زیادہ شہوت کا غلبہ تھا۔ رمضان آیا تو اُنھوں نے اِس اندیشہ سے کہ کہیں روزے کی حالت میں دِن کے وقت بے صبری نہ کر بیٹھیں۔ رمضان کے اختتام تک کے لیے بیوی سے ظِہار کر لیا۔ مگر اپنی اِس بات پر قائم نہ رہ سکے اور ایک رات بیوی کے پاس چلے گئے۔ پھر نادم ہو کر رسول اللہ ﷺ سے ماجرا عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ایک غلام آزاد کرو۔ اُنھوں نے کہا: میرے پاس تو ایک بیوی کے سوا کوئی نہیں جسے آزاد کر دوں۔ فرمایا: دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ روزوں ہی میں تو صبر نہ کر سکنے کی وجہ سے اِس مصیبت میں پھنسا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ اُنھوں نے کہا: ہم تو اِس قدر غریب ہیں کہ رات بے کھائے سوئے ہیں۔ اِس پر آپؐ نے بنی زُرَیق کے محصّلِ زکوٰۃ سے اُن کو اِتنا سامانِ خوراک دلوایا کہ ۶۰ آدمیوں میں بانٹ دیں اور کچھ اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لیے بھی رکھ لیں (مسندِ احمد، ابو داؤد، ترمذی)۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ نام کی تصریح کے بغیر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے ظِہار کیا اور پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے ہی اُس سے مباشرت کر لی۔ بعد میں حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو آپؐ نے حُکم دیا کہ اِس سے الگ رہو جب تک کفارہ ادا نہ کرو (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ)۔

چوتھا واقعہ: چوتھا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پکار رہا ہے۔ اِس پر آپؐ نے غصے سے فرمایا: ''یہ تیری بہن ہے؟'' مگر آپؐ نے اُسے ظِہار قرار نہیں دیا (ابو داؤد)۔

يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا کا مفہوم

لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''پلٹیں اُس بات کی طرف جو اُنھوں نے کہی''۔ لیکن عربی زبان اور محاورے کے لحاظ سے ان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الفاظ کے معنی میں بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے:

پہلا مفہوم: ایک مفہوم اِن کا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ظِہار کے الفاظ منہ سے نکل جانے کے بعد پھر اِن کا اعادہ کریں۔ ظاہر یہ اور بُکَیر بن الاشجّ اور یحیٰی بن زِیاد الفرّاء اسی کے قائل ہیں اور عطا بن ابی رَباح سے بھی ایک قول اِس کی تائید میں منقول ہوا ہے۔ اُن کے نزدیک ایک دفعہ کا ظِہار تو معاف ہے، البتہ آدمی اُس کی تکرار کرے تب اُس پر کفارہ لازم آتا ہے۔ لیکن یہ تفسیر دو وجوہ سے صریحاً غلط ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ظِہار کو بے ہودہ اور جھوٹی بات قرار دے کر اُس کے لیے سزا تجویز فرمائی ہے۔ اب کیا یہ بات قابل تصور ہے کہ ایک مرتبہ جھوٹی اور بے ہودہ بات آدمی کہے تو معاف ہو اور دوسری مرتبہ کہے تو سزا کا مستحق ہو جائے۔ دوسری وجہ اِس کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ظِہار کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ سوال نہیں کیا کہ آیا اُس نے ایک بار ظِہار کیا ہے یا دو بار؟

دوسرا مفہوم: دوسرا مفہوم اُس کا یہ ہے کہ جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں یہ حرکت کرنے کے عادی تھے وہ اگر اِسلام میں اِس کا اعادہ کریں تو اُس کی یہ سزا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ ظِہار کرنا بجائے خود مستوجب سزا ہو اور جو شخص بھی اپنی بیوی کے لیے ظِہار کے الفاظ منہ سے نکالے اُس پر کفارہ لازم آ جائے۔ خواہ وہ اس کے بعد بیوی کو طلاق دے دے یا اس کی بیوی مر جائے یا اس کا کوئی ارادہ اپنی بیوی سے تعلقِ زن و شو رکھنے کا نہ ہو۔ فقہا میں سے طاؤس، مجاہد، شَعبی، سُفیان ثَوری اور قتادہ کا یہی مسلک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظِہار کے بعد اگر عورت مر جائے تو شوہر اس وقت تک اُس کی میراث نہیں پا سکتا جب تک کہ کفارہ ادا نہ کرے۔

تیسرا مفہوم: تیسرا مفہوم یہ ہے کہ ظِہار کے الفاظ زبان سے نکالنے کے بعد آدمی پلٹ کر اُس بات کا تدارک کرنا چاہے جو اُس نے کہی ہے۔ بالفاظِ دیگر عَادَ لِمَا قَالَ کے معنی ہیں کہنے والے نے اپنی بات سے رُجوع کر لیا۔

چوتھا مفہوم: چوتھا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو آدمی نے ظِہار کر کے اپنے لیے حرام کیا تھا اُسے پلٹ کر پھر اپنے لیے حلال کرنا چاہے، بالفاظِ دیگر عَادَ لِمَا قَالَ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص تحریم کا قائل تھا وہ اب تحلیل کی طرف پلٹ آیا۔ اکثر و بیشتر فقہا نے اِنھی دو مفہوموں میں سے کسی ایک کو ترجیح دی ہے۔

ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۔ اِس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے۔

یہ حُکم تمھاری تادیب کے لیے دیا جا رہا ہے تا کہ مسلم معاشرے کے لوگ جاہلیت کی اِس بُری عادت کو چھوڑ دیں اور تم میں سے کوئی شخص اِس بے ہودہ حرکت کا ارتکاب نہ کرے۔ بیوی سے لڑنا ہے تو بھلے آدمیوں کی طرح لڑو۔ طلاق ہی دینا ہو تو سیدھی طرح طلاق دے دو۔ یہ آخر کیا شرافت ہے کہ آدمی جب بیوی سے لڑے تو اُسے ماں، بہن بنا کر ہی چھوڑے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

یعنی اگر آدمی گھر میں چپکے سے بیوی کے ساتھ ظِہار کر بیٹھے اور پھر کفارہ ادا کیے بغیر میاں اور بیوی کے درمیان حسب سابق زوجیت کے تعلقات چلتے رہیں تو چاہے دُنیا میں کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہو، اللہ کو تو بہر حال اس کی خبر ہوگی۔ اللہ کے مواخذہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے بچ نکلنا اُن کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۳-۳۴۴، المجادلہ حاشیہ ۸-۱۰)

قانونِ ظہار

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۚ (المجادلۃ ۵۸: ۴) اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے در پے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دُوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جو اُس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

قانون کی تفصیلات

یہ ہے ظہار کے بارے میں اللہ کا حکم۔ فقہائے اِسلام نے اِس آیت کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں اور اِسلام کے اصولِ عامہ سے اس مسئلے میں جو قانون اخذ کیا ہے اِس کی تفصیلات یہ ہیں:

جاہلی رسومات کی تنسیخ: ظہار کا یہ قانون عرب جاہلیت کے اُس رواج کو منسوخ کرتا ہے جس کی رُو سے یہ فعل نِکاح کے رشتے کو توڑ دیتا تھا اور عورت شوہر کے لیے ابداً حرام ہو جاتی تھی۔ اِسی طرح یہ قانون اُن تمام قوانین اور رواجوں کو بھی منسوخ کرتا ہے جو ظہار کو بے معنی اور بے اثر سمجھتے ہوں اور آدمی کے لیے اِس بات کو جائز رکھتے ہوں کہ وہ اپنی بیوی کو ماں یا محرمات سے تشبیہ دے کر بھی اُس کے ساتھ حسبِ سابق زن وشو کا تعلق جاری رکھے۔ کیونکہ اِسلام کی نگاہ میں ماں اور دُوسری محرمات کی حرمت ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ انسان اُن کے اور بیوی کے درمیان مشابہت کا خیال بھی کرے، کجا کہ اُس کو زبان پر لائے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اِسلامی قانون نے اس معاملے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ تین بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ ظہار سے نِکاح نہیں ٹوٹتا، بلکہ عورت بدستور شوہر کی بیوی رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ظہار سے عورت وقتی طور پر شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ حُرمت اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک شوہر کفّارہ ادا نہ کر دے اور یہ کہ صِرف کفّارہ ہی اس حُرمت کو رفع کر سکتا ہے۔

ظہار کرنے کی اہلیت: ظہار کرنے والے شخص کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس [شوہر] کا ظہار معتبر ہے جو عاقل و بالغ ہو اور بحالت ہوش وحواس ظہار کے الفاظ زبان سے ادا کرے۔ بچے اور مجنون کا ظہار معتبر نہیں ہے۔ نیز ایسے شخص کا ظہار بھی معتبر نہیں جو ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو، مثلاً سوتے میں بڑبڑائے، یا کسی نوعیت کی بے ہوشی میں مبتلا ہو گیا ہو۔

فقہا کے اختلافات: اِس کے بعد حسبِ ذیل امور میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے:

(۱) نشے کی حالت میں ظہار کرنے والے کے متعلق ائمہ اربعہ سمیت فقہا کی عظیم اکثریت یہ کہتی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نشہ آور چیز جان بوجھ کر استعمال کی ہو تو اُس کا ظہار اُس کی طلاق کی طرح قانوناً صحیح مانا جائے گا، کیونکہ اُس نے یہ حالت اپنے اُوپر خود طاری کی ہے۔ البتہ اگر مرض کی وجہ سے اُس نے کوئی دوا پی ہو اور اُس سے نشہ لاحق ہو گیا ہو یا پیاس کی شدت میں وہ جان بچانے کے لیے شراب پینے پر مجبور ہوا ہو تو اس طرح کے نشے کی حالت میں اُس کے ظہار و طلاق کو نافذ نہیں کیا جائے گا۔ احناف اور شوافع اور حنابلہ کی رائے یہی ہے اور صحابہ کا عام مسلک بھی یہی تھا۔ بخلاف اِس کے عثمان رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق و ظہار معتبر نہیں ہے۔ احناف میں سے امام طحاوی اور کرخی رحمہما اللہ اس قول کو ترجیح دیتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایسے نشے کی حالت میں ظہار معتبر ہو گا جس میں آدمی بالکل بہک نہ گیا ہو، بلکہ وہ مربوط اور مرتب کلام کر رہا ہو اور اُسے یہ احساس ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ب: امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک ظہار صرف اُس شوہر کا معتبر ہے جو مسلمان ہو۔ ذمّیوں پر ان احکام کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ قرآنِ مجید میں اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں جن کا خطاب مسلمانوں سے ہے اور تین قِسم کے کفاروں میں سے ایک کفارہ تو قرآن میں روزہ بھی تجویز کیا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ ذمّیوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ احکام ذِمّی اور مسلمان دونوں کے ظہار پر نافذ ہوں گے، البتہ ذِمّی کے لیے روزہ نہیں ہے۔ وہ یا غلام آزاد کرے یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

کیا عورت ظہار کر سکتی ہے؟ ج: - کیا مرد کی طرح عورت بھی ظہار کر سکتی ہے؟ مثلاً اگر وہ شوہر سے کہے کہ تو میرے لیے میرے باپ کی طرح ہے یا میں تیرے لیے تیری ماں کی طرح ہوں تو کیا یہ بھی ظہار ہو گا؟ ائمۂ اربعہ کہتے ہیں کہ یہ ظہار نہیں ہے اور اس پر ظہار کے قانونی احکام کا سرے سے اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآنِ مجید نے صریح الفاظ میں یہ احکام صرف اس صورت کے لیے بیان کیے ہیں جبکہ شوہر بیویوں سے ظہار کریں (اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ) اور ظہار کرنے کے لیے اختیارات اُسی کو حاصل ہو سکتے ہیں جسے طلاق دینے کا اختیار ہے۔ عورت کو شریعت نے جس طرح یہ اختیار نہیں دیا کہ شوہر کو طلاق دے دے اُسی طرح اُسے یہ اختیار بھی نہیں دیا کہ اپنے آپ کو شوہر کے لیے حرام کر لے۔ یہی رائے سُفیان ثوری، اسحاق ابن رَاہوَیہ، ابوثور اور لیث بن سعد کی ہے کہ عورت کا ایسا قول بالکل بے معنی اور بے اثر ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ظِہار تو نہیں ہے، مگر اس سے عورت پر قسم کا کفارہ لازم آئے گا، کیونکہ عورت کا ایسے الفاظ کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اُس نے اپنے شوہر سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھائی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی ابن قدامہ نے یہی نقل کیا ہے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر شادی سے پہلے عورت نے یہ بات کہی ہو کہ میں اُس شخص سے شادی کروں تو وہ میرے لیے ایسا ہے جیسے میرا باپ تو یہ ظہار ہو گا اور اگر شادی کے بعد کہے تو یہ قسم کے معنی میں ہو گا جس سے کفارۂ یمین لازم آئے گا۔ بخلاف اس کے حسن بصری، زہری، ابراہیم نخعی اور حسن بن زیاد لؤلؤی کہتے ہیں کہ یہ ظہار ہے اور ایسا کہنے سے عورت پر کفارۂ ظہار لازم آئے گا۔ البتہ عورت کو یہ حق نہ ہو گا کہ کفارہ دینے سے پہلے شوہر کو اپنے پاس آنے سے روک دے۔ ابراہیم نخعی اس کی تائید میں یہ واقعہ بیان کرتے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی عائشہ سے حضرت زُبیر کے صاحبزادے مصعب نے نکاح کا پیغام دیا۔ اُنھوں نے اِسے ردکرتے ہوئے یہ الفاظ کہہ دیے کہ اگر میں اُن سے نکاح کروں تو هُوَ عَلَيَّ كَظَهْرِ أَبِي، وہ میرے اُوپر ایسے ہوں جیسے میرے باپ کی پیٹھ۔ کچھ مدت بعد وہ اُن سے شادی کرنے پر راضی ہوگئیں۔ مدینے کے علما سے اِس کے متعلق فتویٰ لیا گیا تو بہت سے فقہا نے جن میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی شامل تھے یہ فتویٰ دیا کہ عائشہ پر کفارۂ ظِہار لازم ہے۔ اِس واقعے کو نقل کرنے کے بعد ابراہیم نخعی اپنی یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ اگر عائشہ یہ بات شادی کے بعد کہتیں تو کفارہ لازم نہ آتا۔ مگر اُنھوں نے شادی سے پہلے یہ کہا تھا جب اُنھیں نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اِس لیے کفارہ اُن پر واجب ہوگیا۔

صریح اور غیر صریح الفاظ کا فرق: جو عاقل و بالغ آدمی ظِہار کے صریح الفاظ بحالت ہوش وحواس زبان سے ادا کرے اُس کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ اُس نے غصے میں، یا مذاق مذاق میں یا پیار سے ایسا کیا، یا یہ کہ اُس کی نیت ظِہار کی نہ تھی۔ البتہ جو الفاظ اِس معاملے میں صریح نہیں ہیں اور جن میں مختلف معنوں کا احتمال ہے، اُن کا حُکم الفاظ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ ظِہار کے صریح الفاظ کون سے ہیں اور غیر صریح کون سے۔

غیر عورت سے ظِہار کا مسئلہ: یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ ظِہار اُس عورت سے کیا جا سکتا ہے جو آدمی کے نِکاح میں ہو۔ البتہ اس اَمر میں اختلاف ہے کہ کیا غیر عورت سے بھی ظِہار ہوسکتا ہے۔ اِس معاملے میں مختلف مسالک یہ ہیں:

حنفیہ کہتے ہیں کہ غیر عورت سے اگر آدمی یہ کہے کہ ”میں تجھ سے نِکاح کروں تو میرے اُوپر تُو ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ“ تو جب بھی وہ اُس سے نِکاح کرے گا کفارہ ادا کیے بغیر اُسے ہاتھ نہ لگا سکے گا۔ یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے۔ اُن کے زمانے میں ایک شخص نے ایک عورت سے یہ بات کہی اور بعد میں اُس سے نِکاح کرلیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسے کفارۂ ظِہار دینا ہوگا۔

مالکیہ اور حنابلہ بھی یہی بات کہتے ہیں اور وہ اِس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ اگر عورت کی تخصیص نہ کی گئی ہو بلکہ کہنے والے نے یوں کہا ہو کہ تمام عورتیں میرے اُوپر ایسی ہیں تو جس سے بھی وہ نِکاح کرے گا اُسے ہاتھ لگانے سے پہلے کفارہ دینا ہوگا۔ یہی رائے سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ نِکاح سے پہلے ظِہار بالکل بے معنی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ کی بھی یہی رائے ہے۔

ظِہار کے لیے وقت کی تحدید: کیا ظِہار ایک خاص وقت تک کے لیے ہوسکتا ہے؟ حنفی اور شافعی کہتے ہیں کہ اگر آدمی نے کسی خاص وقت کی تعیین کر کے ظِہار کیا ہو تو جب تک وہ وقت باقی ہے بیوی کو ہاتھ لگانے سے کفارہ لازم آئے گا اور اس وقت کے گزر جانے پر ظِہار غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اِس کی دلیل سَلمہ بن صخر بیاضی کا واقعہ ہے جس میں اُنھوں نے اپنی بیوی سے رمضان کے لیے ظِہار کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ وقت کی تعیین بے معنی ہے۔ بخلاف اس کے امام مالک اور ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ ظِہار جب بھی کیا جائے گا، ہمیشہ کے لیے ہوگا اور وقت کی تخصیص غیر مؤثر ہوگی، کیونکہ جو حرمت واقع

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

ہو چکی ہے وہ وقت گزر جانے پر آپ سے آپ ختم نہیں ہوسکتی۔

مشروط ظہار: مشروط ظہار کیا گیا ہو تو جس وقت بھی شرط کی خلاف ورزی ہوگی، کفارہ لازم ہو جائے گا۔ مثلاً آدمی بیوی سے یہ کہتا ہے کہ اگر میں گھر میں آؤں تو میرے اُوپر تو ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ۔ اِس صورت میں وہ جب بھی گھر میں داخل ہوگا کفارہ ادا کیے بغیر بیوی کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔

ایک بیوی سے کئی مرتبہ ظہار: ایک بیوی سے کئی مرتبہ ظہار کے الفاظ کہے گئے ہوں تو حنفی اور شافعی کہتے ہیں کہ خواہ ایک ہی نشست میں ایسا کہا گیا ہو یا متعدد نشستوں میں، بہرحال جتنی مرتبہ یہ الفاظ کہے گئے ہوں اُتنے ہی کفارے لازم آئیں گے، اِلّا یہ کہ کہنے والے نے ایک دفعہ کہنے کے بعد اس قول کی تکرار محض اپنے پہلے قول کی تاکید کے لیے کی ہو۔ بخلاف اس کے امام مالک اور امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی مرتبہ اس قول کی تکرار کی گئی ہو، قطع نظر اس سے کہ اعادہ کی نیت ہو یا تاکید کی، کفارہ ایک ہی لازم ہوگا۔ یہی قول شعبی، طاؤس، عطاء بن ابن رباح، حسن بصری، اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر تکرار ایک نشست میں کی گئی ہو تو ایک ہی کفارہ ہوگا اور مختلف نشستوں میں ہو تو جتنی نشستوں میں کی گئی ہو اُتنے ہی کفارے دینے ہوں گے۔ قتادہ اور عمرو بن دینار کی رائے بھی یہی ہے۔

بیک وقت دو بیویوں سے ظہار: دو یا زائد بیویوں سے بیک وقت اور بیک لفظ ظہار کیا جائے، مثلاً اُن کو مخاطب کر کے شوہر کہے کہ تم میرے اُوپر ایسی ہو جیسی میری ماں کی پیٹھ تو حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کو حلال کرنے کے لیے الگ الگ کفارے دینے ہوں گے۔ یہی رائے حضرت عمر، حضرت علی، عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، طاؤس، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں سب کے لیے ایک ہی کفارہ لازم ہوگا۔ ربیعہ، اَوزاعی، اسحاق بن راہویہ اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

دوبارہ ظہار: ایک ظہار کا کفارہ دینے کے بعد اگر آدمی پھر ظہار کر بیٹھے تو یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ پھر کفارہ دیے بغیر بیوی اُس کے لیے حلال نہ ہوگی۔

کفّارہ کی ادائیگی سے پہلے جماع کی صورت میں حُکم: کفارہ ادا کرنے سے پہلے اگر بیوی سے تعلق زن وشو قائم کر بیٹھا ہو تو ائمہ اربعہ کے نزدیک اگرچہ یہ گناہ ہے، اور آدمی کو اُس پر استغفار کرنا چاہیے اور پھر اس کا اعادہ نہ کرنا چاہیے مگر کفارہ اُسے ایک ہی دینا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جن لوگوں نے ایسا کیا تھا اُن سے آپؐ نے یہ تو فرمایا تھا کہ استغفار کرو اور اُس وقت تک بیوی سے الگ رہو جب تک کفارہ ادا نہ کردو۔ مگر یہ حُکم آپ نے نہیں دیا تھا کہ کفارہ ظہار کے علاوہ اس پر اُنھیں کوئی کفارہ بھی دینا ہوگا۔ حضرت عمرو بن عاص، قَبیصہ بن ذُوَیب، سعید بن جُبیر، زُہری اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس پر دو کفارے لازم ہوں گے۔ اور حَسن بَصری اور ابراہیم نخعی کی رائے یہ ہے کہ تین کفارے دینے ہوں گے۔ غالباً اِن حضرات کو وہ احادیث نہ پہنچی ہوں گی جن میں اس مسئلہ پر حضور ﷺ کا فیصلہ بیان ہوا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیوی کو کس سے تشبیہ دینا ظہار ہے؟: بیوی کو کس سے تشبیہ دینا ظہار ہے؟ اِس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔

عامر شعبی کہتے ہیں کہ صرف ماں سے تشبیہ ظہار ہے اور ظاہر یہ کہتے ہیں کہ ماں کی بھی صرف پیٹھ سے تشبیہ ظہار ہے، باقی اور کسی بات پر اِس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مگر فقہائے اُمّت میں سے کسی گروہ نے بھی اُن سے اِس معاملے میں اتفاق نہیں کیا ہے، کیونکہ قرآن نے ماں سے تشبیہ کو گناہ قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ نہایت بیہودہ اور جھوٹی بات ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن عورتوں کی حُرمت ماں جیسی ہے اُن کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینا بے ہودگی اور جھوٹ میں اِس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اِس کا حکم وہی نہ ہو جو ماں سے تشبیہ کا حکم ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اِس حکم میں تمام وہ عورتیں داخل ہیں جو نسب یا رضاعت، یا ازدواجی رشتے کی بنا پر آدمی کے لیے ابداً حرام ہیں۔ مگر وقتی طور پر جو عورتیں حرام ہوں اور کسی وقت حلال ہو سکتی ہوں وہ اِس میں داخل نہیں ہیں۔ جیسے بیوی کی بہن، اُس کی خالہ، اُس کی پھوپھی، یا غیر عورت جو آدمی کے نکاح میں نہ ہو۔ ابدی محرّمات میں سے کسی عورت کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دینا جس پر نظر ڈالنا آدمی کے لیے حلال نہ ہو ظہار ہوگا۔ البتہ بیوی کے ہاتھ، پاؤں، سر، بال، دانت وغیرہ کو ابداً حرام عورت کی پیٹھ سے یا بیوی کو اُس کے سر، ہاتھ، پاؤں، جیسے اجزائے جسم سے تشبیہ دینا ظہار نہ ہوگا کیونکہ ماں بہن کے اِن اعضا پر نگاہ ڈالنا حرام نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ تیرا ہاتھ میری ماں کے ہاتھ جیسا ہے، یا تیرا پاؤں میری ماں کے پاؤں جیسا ہے ظہار نہیں ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اِس حکم میں صرف وہی عورتیں داخل ہیں جو ہمیشہ حرام تھیں اور ہمیشہ حرام رہیں گی، یعنی ماں، بہن، بیٹی وغیرہ۔ مگر وہ عورتیں اس میں داخل نہیں ہیں جو کبھی حلال رہ چکی ہوں، جیسے رضاعی ماں، بہن، ساس، اور بہو یا کسی وقت حلال ہو سکتی ہوں جیسے سالی۔ ان عارضی اور وقتی حرام عورتوں کے ماسوا ابدی حُرمت رکھنے والی عورتوں میں سے کسی کے اُن اعضا کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینا ظہار ہوگا جن کا ذکر بغرضِ اظہار اکرام وتوقیر عادتاً نہیں کیا جاتا۔ رہے وہ اعضا جن کا اظہار اکرام وتوقیر کے لیے کیا جاتا ہے تو اُن سے تشبیہ صرف اُس صورت میں ظہار ہوگی جب کہ یہ بات ظہار کی نیت سے کہی جائے۔ مثلاً بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لیے میری ماں کی آنکھ یا جان کی طرح ہے۔ یا ماں کے ہاتھ پاؤں یا پیٹ کی طرح ہے، یا ماں کے پیٹ یا سینے سے بیوی کے پیٹ یا سینے کو تشبیہ دینا یا بیوی کے سر، پیٹھ یا ہاتھ کو اپنے لیے ماں کی پیٹھ جیسا قرار دینا، یا بیوی کو یہ کہنا کہ تو میرے لیے میری ماں جیسی ہے، ظہار کی نیت سے ہو تو ظہار ہے اور عزّت کی نیت سے ہو تو عزّت ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ہر عورت جو آدمی کے لیے حرام ہو، اُس سے بیوی کو تشبیہ دینا ظہار ہے، حتیٰ کہ بیوی سے یہ کہنا بھی ظہار کی تعریف میں آتا ہے کہ تو میرے اُوپر فلاں غیر عورت کی پیٹھ جیسی ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ ماں اور ابدی محرّمات کے کسی عضو سے بیوی کو یا بیوی کے کسی عضو کو تشبیہ دینا ظہار ہے اور اِس میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اعضا ایسے ہوں جن پر نظر ڈالنا حلال نہ ہو، کیونکہ ماں کے کسی عضو پر بھی اُس طرح کی نظر ڈالنا جیسی بیوی پر ڈالی جاتی ہے حلال نہیں ہے۔

حنابلہ اِس حکم میں تمام اُن عورتوں کو داخل سمجھتے ہیں جو ابداً حرام ہوں، خواہ وہ پہلے کبھی حلال رہ چکی ہوں مثلاً ساس یا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دودھ پلانے والی ماں۔ رہیں وہ عورتیں جو بعد میں کسی وقت حلال ہو سکتی ہوں (مثلاً سالی) تو اُن کے معاملہ میں امام احمد کا ایک قول یہ ہے کہ اُن سے تشبیہ بھی ظِہار ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اُن سے تشبیہ ظِہار نہیں ہے۔ نیز حنابلہ کے نزدیک بیوی کے کسی عضو کو محرّمات کے کسی عضو سے تشبیہ دینا ظِہار کی تعریف میں آ جاتا ہے۔ البتہ بال، ناخن، دانت جیسے غیر مستقل اجزائے جسم اِس حُکم سے خارج ہیں۔

ظِہار کے صریح اور کنایہ الفاظ: اِس اُمر میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ بیوی سے یہ کہنا کہ "تو میرے اُوپر میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے" صریح ظِہار ہے کیونکہ اہلِ عرب میں یہی ظِہار کا طریقہ تھا اور قرآن مجید کا حُکم اِس کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ البتہ اِس اُمر میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ دوسرے الفاظ میں سے کون سے ایسے ہیں جو صریح ظِہار کے حُکم میں ہیں اور کون سے ایسے ہیں جن کے ظِہار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ قائل کی نیت پر کیا جائے گا۔

حنفیہ کے نزدیک ظِہار کے صریح الفاظ وہ ہیں جن میں صاف طور پر حلال عورت (بیوی) کو حرام عورت (یعنی محرّمات ابدیہ میں سے کسی عورت) سے تشبیہ دی گئی ہو، یا تشبیہ ایسے عضو سے دی گئی ہو جس پر نظر ڈالنا حلال نہیں ہے، جیسے یہ کہنا کہ تو میرے اُوپر ماں یا فلاں حرام عورت کے پیٹ یا ران جیسی ہے۔ اِن کے سوا دُوسرے الفاظ میں اختلاف کی گنجایش ہے۔ اگر کہے کہ "تو میرے اُوپر حرام ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ" تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ صریح ظِہار ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ظِہار کی نیت ہو تو ظِہار ہے اور طلاق کی نیت ہو تو طلاق۔ اگر کہے کہ "تو میری ماں جیسی ہے یا میری ماں کی طرح ہے تو حنفیہ کا عام فتویٰ یہ ہے کہ یہ ظِہار کی نیت سے ظِہار ہے، طلاق کی نیت سے طلاقِ بائن اور اگر کوئی نیت نہ ہو تو بے معنی ہے۔ لیکن امام محمد کے نزدیک یہ قطعی ظِہار ہے۔ اگر بیوی کو ماں یا بہن یا بیٹی کہہ کر پکارے تو یہ سخت بے ہودہ بات ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصّے کا اظہار فرمایا تھا۔ مگر اُسے ظِہار نہیں قرار دیا۔ اگر کہے کہ "تو میرے اُوپر ماں کی طرح حرام ہے" تو یہ ظِہار کی نیت سے ظِہار ہے، طلاق کی نیت سے طلاق اور کوئی نیت نہ ہو تو ظِہار ہے۔ اگر کہے کہ "تو میرے لیے ماں کی طرح یا ماں جیسی ہے تو نیت پوچھی جائے گی۔ عزّت اور توقیر کی نیت سے کہا ہو تو عزّت اور توقیر ہے۔ ظِہار کی نیت سے کہا ہو تو ظِہار ہے۔ طلاق کی نیت سے کہا ہو تو طلاق ہے۔ کوئی نیت نہ ہو اور یوں ہی یہ بات کہہ دی ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بے معنی ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک اِس پر ظِہار کا تو نہیں مگر قسم کا کفّارہ لازم آئے گا اور امام محمد کے نزدیک یہ ظِہار ہے۔

شافعیہ کے نزدیک ظِہار کے صریح الفاظ یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو میرے نزدیک یا میرے ساتھ یا میرے لیے ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ۔ یا تو میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے یا تیرا جسم، یا تیرا بدن، یا تیرا نفس میرے لیے میری ماں کے جسم یا بدن یا نفس کی طرح ہے۔ اِن کے سوا باقی تمام الفاظ میں قائل کی نیت پر فیصلہ ہوگا۔

حنابلہ کے نزدیک ہر وہ لفظ جس سے کسی شخص نے بیوی کو یا اِس کے مستقل اعضا میں سے کسی عضو کو کسی ایسے عورت سے جو اُس کے لیے حرام ہے، یا اُس کے مستقل اعضا میں سے کسی عضو سے صاف صاف تشبیہ دی ہو تو ظِہار کے معاملے میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صریح مانا جائے گا۔

مالکیہ کا مسلک بھی تریب قریب یہی ہے، البتہ تفصیلات میں اُن کے فتوے الگ الگ ہیں۔ مثلاً کسی شخص کا بیوی سے یہ کہنا کہ "تو میرے لیے میری ماں جیسی ہے، یا میری ماں کی طرح ہے" مالکیوں کے نزدیک ظہار کی نیت سے ہو تو ظہار ہے، طلاق کی نیت سے ہو تو طلاق اور کوئی نیت نہ ہو تو ظہار ہے۔ حنبلیوں کے نزدیک بہ شرط نیت صرف ظہار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص بیوی سے کہے کہ "تو میری ماں ہے" تو مالکیہ کہتے ہیں کہ یہ ظہار ہے اور حنابلہ کہتے ہیں کہ یہ بات اگر جھگڑے اور غصے کی حالت میں کہی گئی ہو تو ظہار ہے اور پیار محبت کی بات چیت میں کہی گئی ہو تو گویہ بہت بُری بات ہے، لیکن ظہار نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کہے "تجھے طلاق ہے تو میری ماں کی طرح ہے" تو حنابلہ کے نزدیک یہ طلاق ہے نہ کہ ظہار۔ اور اگر کہے "تو میری ماں کی طرح ہے تجھے طلاق ہے" تو ظہار اور طلاق دونوں واقع ہو جائیں گے۔ یہ کہنا کہ "تو میرے اُوپر ایسی حرام ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ" مالکیہ اور حنابلہ دونوں کے نزدیک ظہار ہے خواہ طلاق ہی کی نیت سے یہ الفاظ کہے گئے ہوں، یا نیت کچھ بھی نہ ہو۔

عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں ظہار کے الفاظ: الفاظِ ظہار کی اِس بحث میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فقہانے اِس باب میں جتنی بحثیں کی ہیں وہ سب عربی زبان کے الفاظ اور محاورات سے تعلق رکھتی ہیں اور ظاہر ہے کہ دُنیا کی دوسری زبانیں بولنے والے نہ عربی زبان میں ظہار کریں گے نہ ظہار کرتے وقت عربی الفاظ اور فقروں کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ زبان سے ادا کریں گے۔ اس لیے کسی لفظ یا فقرے کے متعلق اگر یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ ظہار کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں تو اُسے اِس لحاظ سے نہیں جانچنا چاہیے کہ وہ فقہا کے بیان کردہ الفاظ میں سے کس کا صحیح ترجمہ ہے، بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا قائل نے بیوی کو جنسی (sexual) تعلق کے لحاظ سے محرّمات میں سے کسی کے ساتھ صاف صاف تشبیہ دی ہے، یا اُس کے الفاظ میں دوسرے مفہومات کا بھی احتمال ہے؟ اس کی نمایاں ترین مثال خود وہ فقرہ ہے جس کے متعلق تمام فقہا اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ عرب میں ظہار کے لیے وہی بولا جاتا تھا اور قرآنِ مجید کا حکم اُسی کے بارے میں نازل ہوا ہے، یعنی اَنتِ عَلَیَّ کَظَھرِ اُمِّی (تو میرے اُوپر میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے)۔ غالباً دُنیا کی کسی زبان میں اور کم از کم اردو کی حد تک تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان میں کوئی ظہار کرنے والا ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا جو اُس عربی فقرے کا لفظی ترجمہ ہوں۔ البتہ وہ اپنی زبان کے ایسے الفاظ ضرور استعمال کر سکتا ہے جن کا مفہوم ٹھیک وہی ہو جسے ادا کرنے کے لیے ایک عرب یہ فقرہ بولا کرتا تھا۔ اِس کا مفہوم یہ تھا کہ "تجھ سے مباشرت میرے لیے ایسی ہے جیسے اپنی ماں سے مباشرت" یا جیسے بعض جہلا بیوی سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ "تیرے پاس آؤں تو اپنی ماں کے پاس جاؤں"۔

کفارہ کا سبب: قرآنِ مجید میں جس چیز کو کفارہ لازم آنے کا سبب قرار دیا گیا ہے وہ محض ظہار نہیں ہے بلکہ ظہار کے بعد 'عوذ' ہے۔ یعنی اگر آدمی صرف ظہار کر کے رہ جائے اور عود نہ کرے تو اُس پر کفارہ لازم نہیں آتا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عود کیا ہے جو کفارہ کا موجب ہے؟ اس بارے میں فقہا کے مسالک یہ ہیں:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حنفیہ کہتے ہیں کہ عود سے مُراد مباشرت کا ارادہ ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض ارادے اور خواہش پر کفارہ لازم آ جائے، حتیٰ کہ اگر آدمی ارادہ کر کے رہ جائے اور عملی اقدام نہ کرے تب بھی اُسے کفارہ دینا پڑے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو شخص اُس حُرمت کو رفع کرنا چاہے جو اُس نے ظہار کر کے بیوی کے ساتھ تعلق زن و شو کے معاملے میں اپنے اُوپر عائد کر لی تھی وہ پہلے کفارہ دے، کیونکہ یہ حُرمت کفارہ کے بغیر رفع نہیں ہو سکتی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس معاملے میں تین قول ہیں، مگر مالکیہ کے ہاں اُن کا مشہور ترین اور صحیح ترین قول اُس مسلک کے مطابق ہے جو اُوپر حنفیہ کا بیان ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظہار سے جس چیز کو اُس نے اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا وہ بیوی کے ساتھ مباشرت کا تعلق تھا۔ اُس کے بعد عود یہ ہے کہ وہ اُس کے ساتھ یہی تعلق رکھنے کے لیے پلٹے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی ابن قُدامہ نے قریب قریب وہی نقل کیا ہے جو اُوپر دونوں اماموں کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظہار کے بعد مباشرت کے حلال ہونے کے لیے کفارہ شرط ہے۔ ظہار کرنے والا جو شخص اُسے حلال کرنا چاہے وہ گویا تحریم سے پلٹنا چاہتا ہے۔ اس لیے اُسے حُکم دیا گیا کہ اُسے حلال کرنے سے پہلے کفارہ دے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی شخص ایک غیر عورت کو اپنے لیے حلال کرنا چاہے تو اُس سے کہا جائے گا کہ اُسے حلال کرنے سے پہلے نکاح کرے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ان تینوں سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کا اپنی بیوی سے ظہار کرنے کے بعد اُسے حسبِ سابق بیوی بنائے رکھنا یا بالفاظِ دیگر اُسے بیوی کی حیثیت سے روکے رکھنا عود ہے۔ کیونکہ جس وقت اُس نے ظہار کیا اُسی وقت گویا اُس نے اپنے لیے یہ بات حرام کر لی کہ اُسے بیوی بنا کر رکھے۔ لہٰذا اگر اُس نے ظہار کرتے ہی فوراً اُسے طلاق نہ دی اور اتنی دیر تک اُسے روکے رکھا جس میں وہ طلاق کے الفاظ زبان سے نکال سکتا تھا تو اُس نے عود کر لیا اور اُس پر کفارہ واجب ہو گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سانس میں ظہار کرنے کے بعد اگر آدمی دُوسرے ہی سانس میں طلاق نہ دے دے تو کفارہ لازم آ جائے گا خواہ بعد میں اُس کا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو بیوی بنا کر نہیں رکھنا ہے۔ اور اُس کا کوئی ارادہ اُس کے ساتھ تعلق زن و شو رکھنے کا نہ ہو۔ حتیٰ کہ چند منٹ غور کر کے وہ بیوی کو طلاق بھی دے ڈالے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی رُو سے کفارہ اُس کے ذمے لازم رہے گا۔

کفارہ ادا کرنے سے پہلے بیوی کو ہاتھ لگانا: قرآن کا حُکم ہے کہ ظہار کرنے والا کفارہ دے، قبل اس کے کہ زوجین ایک دوسرے کو 'مَس' کریں۔ ائمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں مَس سے مُراد چھونا ہے، اس لیے کفارہ سے پہلے صِرف مباشرت ہی حرام نہیں ہے بلکہ شوہر کسی طرح بھی بیوی کو چھو نہیں سکتا۔ شافعیہ شہوت کے ساتھ چھونے کو حرام کہتے ہیں، حنابلہ ہر طرح کے تلذذ کو حرام قرار دیتے ہیں اور مالکیہ لذّت کے لیے بیوی کے جسم پر بھی نظر ڈالنے کو ناجائز ٹھیراتے ہیں اور اُن کے نزدیک صِرف چہرے اور ہاتھوں پر نظر ڈالنا اس سے مستثنیٰ ہے۔

کفارۂ ظہار کو طلاق بھی ختم نہیں کر سکتی: ظہار کے بعد اگر آدمی بیوی کو طلاق دے دے تو رجعی طلاق ہونے کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صورت میں رُجوع کر کے بھی وہ کفارہ دیے بغیر اُس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ بائن ہونے کی صورت میں اگر اُس سے دوبارہ نکاح کرے تب بھی اُسے ہاتھ لگانے سے پہلے کفارہ دینا ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر تین طلاق دے چکا ہو اور عورت دوسرے آدمی سے نکاح کرنے کے بعد بیوہ یا مطلّقہ ہو چکی ہو اور اُس کے بعد ظہار کرنے والا شوہر اُس سے از سرِ نو نکاح کر لے پھر بھی کفارے کے بغیر وہ اُس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ اُسے ماں یا محرّمات سے تشبیہ دے کر اپنے اُوپر ایک دفعہ حرام کر چکا ہے اور یہ حُرمت کفارے کے بغیر رفع نہیں ہو سکتی۔ اِس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

کفارہ ادا نہ کرنے کی صورت میں بیوی کو حُکم: عورت کے لیے لازم ہے کہ جس شوہر نے اُس کے ساتھ ظہار کیا ہے اُسے ہاتھ نہ لگانے دے جب تک وہ کفارہ ادا نہ کرے اور چونکہ تعلقِ زن وشو عورت کا حق ہے جس سے ظِہار کر کے شوہر نے اُسے محروم کیا ہے، اِس لیے اگر وہ کفارہ نہ دے تو بیوی عدالت سے رُجوع کر سکتی ہے۔ عدالت اُس کے شوہر کو مجبور کرے گی کہ وہ کفارہ دے کر حُرمت کی وہ دیوار ہٹائے جو اُس نے اپنے اور اُس کے درمیان حائل کر لی ہے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو عدالت اُسے ضرب یا قید یا دونوں طرح کی سزائیں دے سکتی ہے۔ یہ بات بھی چاروں مذاہبِ فقہ میں متفق علیہ ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مذہب حنفی میں عورت کے لیے صرف یہی ایک چارۂ کار ہے، ورنہ ظِہار پر خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے، عورت کو اگر عدالت اس مشکل سے نہ نکالے تو وہ تمام عمر معلّق رہے گی، کیونکہ ظِہار سے نکاح ختم نہیں ہوتا، صرف شوہر کا حقِ تمتع سلب ہوتا ہے۔ مالکی مذہب میں اگر شوہر عورت کو ستانے کے لیے ظِہار کر کے معلّق چھوڑ دے تو اُس پر ایلا کے احکام جاری ہوں گے، یعنی وہ چار مہینے سے زیادہ عورت کو روک کر نہیں رکھ سکتا۔ شافعیہ کے نزدیک اگرچہ ظہار میں احکام ایلا تو صرف اُس وقت جاری ہو سکتے ہیں جب کہ شوہر نے ایک مدتِ خاص کے لیے ظِہار کیا ہو اور وہ مدت چار مہینے سے زیادہ ہو، لیکن چونکہ مذہب شافعی کی رُو سے شوہر پر اُسی وقت کفارہ واجب ہو جاتا ہے جب وہ عورت کو بیوی بنا کر رکھے رہے۔ اِس لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ کسی طویل مدت تک اُس کو معلّق رکھے۔

کفارۂ ظِہار کے احکام

اجمالی بیان: قرآن اور سنت میں تصریح ہے کہ ظِہار کا پہلا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے۔ اِس سے آدمی عاجز ہو تب دو مہینے کے روزوں کی شکل میں کفارہ دے سکتا ہے۔ اور اِس سے بھی عاجز ہو تب ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے۔ لیکن اگر تینوں کفاروں سے کوئی شخص عاجز ہو تو چوں کہ شریعت میں کفّارے کی کوئی اور شکل نہیں رکھی گئی ہے اس لیے اُسے اُس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک وہ ان میں سے کسی ایک پر قادر نہ ہو جائے۔ البتہ سنت سے یہ ثابت ہے کہ ایسے شخص کی مدد کی جانی چاہیے تاکہ وہ تیسرا کفارہ ادا کر سکے۔ نبی ﷺ نے بیت المال سے ایسے لوگوں کی مدد فرمائی ہے جو اپنی غلطی سے اِس مشکل میں پھنس گئے تھے اور تینوں کفاروں سے عاجز تھے۔

غلام آزاد کرنا: قرآن مجید کفّارہ میں رَقَبَہ آزاد کرنے کا حُکم دیتا ہے جس کا اطلاق لونڈی اور غلام دونوں پر ہوتا ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ شیر خوار بچہ بھی اگر غلامی کی حالت میں ہو تو اُسے آزاد کر دینا کفارہ کے لیے کافی ہے۔ البتہ فقہا کے درمیان اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ آیا مومن اور کافر، دونوں قسم کے غلام آزاد کیے جا سکتے ہیں یا صرف مومن غلام ہی آزاد کرنا ہوگا۔ حنفیہ اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ غلام خواہ مومن ہو یا کافر، اُس کا آزاد کر دینا کفارہ ظہار کے لیے کافی ہے، کیونکہ قرآن میں مطلق رَقَبہ کا ذکر ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ مومن ہی ہونا چاہیے۔ بخلاف اِس کے شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ اِس کے لیے مومن کی شرط لگاتے ہیں اور اُنھوں نے اِس حکم کو اُن دوسرے کفاروں پر قیاس کیا ہے جن میں رَقَبہ کے ساتھ قرآنِ مجید میں مومن کی قید لگائی گئی ہے۔

دو ماہ کے روزے رکھنا: غلام نہ پانے کی صورت میں قرآن کا حکم ہے کہ ظہار کرنے والا مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے، قبل اِس کے کہ زَوجین ایک دُوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اِس فرمانِ الٰہی پر عمل کرنے کی تفصیلات مختلف فقہی مذاہب میں حسبِ ذیل ہیں:

ا: اِس اَمر پر اتفاق ہے کہ مہینوں سے مُراد ہلالی مہینے ہیں۔ اگر طلوعِ ہلال سے روزوں کا آغاز کیا جائے تو دو مہینے پورے کرنے ہوں گے۔ اگر بیچ میں کسی تاریخ سے شروع کیا جائے تو حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ۶۰ روزے رکھنے چاہییں اور شافعیہ کہتے ہیں کہ پہلے اور تیسرے مہینے میں مجموعی طور پر ۳۰ روزے رکھے اور بیچ کا ہلالی مہینہ خواہ ۲۹ کا ہو یا ۳۰ کا، اُس کے روزے رکھ لینے کافی ہیں۔

ب: حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ روزے ایسے وقت شروع کرنے چاہیں جبکہ بیچ میں نہ رمضان آئے نہ عیدین نہ یوم النحر اور ایامِ تشریق۔ کیونکہ کفارہ کے روزے رکھنے کے دوران میں رمضان کے روزے رکھنے اور عیدین اور یوم النحر اور ایامِ تشریق کے روزے چھوڑنے سے دو مہینے کا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے پڑیں گے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ بیچ میں رمضان کے روزے رکھنے اور حرام دِنوں کے روزے نہ رکھنے سے تسلسل نہیں ٹوٹتا۔

ج: دو مہینوں کے دوران میں خواہ آدمی کسی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑے یا بلا عذر، دونوں صورتوں میں حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے۔ یہی رائے امام محمد باقر، ابراہیم نخعی، سعید بن جُبیر اور سُفیان ثوری کی ہے۔ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک مرض یا سفر کے عذر سے بیچ میں روزہ چھوڑا جا سکتا ہے اور اس سے تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ البتہ بلا عذر روزہ چھوڑ دینے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اِن کا استدلال یہ ہے کہ کفارہ کے روزے رمضان کے فرض روزوں سے زیادہ مؤکد نہیں ہیں۔ جب اُن کو عذر کی بنا پر چھوڑا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اِن کو نہ چھوڑا جا سکے۔ یہی قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حسن بصری، عطاء بن ابی رباح، سعید بن المسیّب، عمرو بن دینار، شعبی، طاؤس، مجاہد، اسحاق بن راہویہ، ابوعُبید، اور ابوثور رحمہم اللہ کا ہے۔

د: دو مہینوں کے دوران میں اگر آدمی اُس بیوی سے مباشرت کر بیٹھے جس سے اُس نے ظہار کیا ہو تو تمام ائمہ کے نزدیک اس سے تسلسل ٹوٹ جائے گا اور نئے سرے سے روزے رکھنے ہوں گے کیونکہ ہاتھ لگانے سے پہلے دو مہینے کے مسلسل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا: قرآن اور سنت کی رُو سے تیسرا کفارہ (یعنی ۶۰ مسکینوں کا کھانا) وہ شخص دے سکتا ہے جو دوسرے کفارے (دو مہینے کے مسلسل روزوں) کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اِس حکم پر عمل درآمد کے لیے فقہا نے جو تفصیلی احکام مرتب کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

أ: ائمۂ اربعہ کے نزدیک روزوں پر قادر نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی یا تو بڑھاپے کی وجہ سے قادر نہ ہو، یا مرض کے سبب سے، یا اِس سبب سے کہ وہ مسلسل دو مہینے تک مباشرت سے پرہیز نہ کرسکتا ہو اور اُسے اندیشہ ہو کہ اِس دوران میں کہیں بے صبری نہ کر بیٹھے۔ اِن تینوں عذرات کا صحیح ہونا اُن احادیث سے ثابت ہے جو اَوس بن صامت انصاری اور سَلَمہ بن صَخر بَیاضی کے معاملے میں وارد ہوئی ہیں۔ البتہ مرض کے معاملے میں فقہا کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ مرض کا عذر اس صورت میں صحیح ہوگا جب کہ یا تو اُس کے زائل ہونے کے اُمید نہ ہو یا روزوں سے مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر روزوں سے ایسی شدید مشقت لاحق ہوتی ہو جس سے آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ دو مہینے کے دوران میں کہیں سلسلہ منقطع نہ کرنا پڑے تو یہ عذر بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی کا گمانِ غالب یہ ہو کہ وہ مستقبل میں روزہ رکھنے کے قابل ہوسکے گا تو انتظار کرے اور اگر گمانِ غالب اِس قابل نہ ہوسکنے کا ہو تو مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ روزے سے مرض بڑھ جانے کا اندیشہ بالکل کافی عذر ہے۔

ب: کھانا صِرف اُن مساکین کو دِیا جاسکتا ہے جن کا نفقہ آدمی کے ذِمّہ واجب نہ ہوتا ہو۔

ج: حنفیہ کہتے ہیں کہ کھانا مسلمان اور ذِمّی دونوں قسم کے مساکین کو دِیا جاسکتا ہے۔ البتہ حربی اور مستامن کفار کو نہیں دِیا جاسکتا۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ صرف مسلمان مساکین ہی کو دیا جاسکتا ہے۔

د: یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ کھانا دینے سے مُراد دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا دینا ہے۔ البتہ کھانا دینے کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ دو وقت کی شکم سیری کے قابل غلّہ دے دینا، یا کھانا پکا کر دو وقت کھلا دینا، دونوں یکساں صحیح ہیں، کیونکہ قرآنِ مجید میں طعام کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خوراک دینے کے بھی ہیں اور کھلانے کے بھی۔ مگر مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ پکا کر کھلانے کو صحیح نہیں سمجھتے، بلکہ غلّہ دے دینا ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ غلّہ دینے کی صورت میں یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ وہ غلّہ دینا چاہیے جو اُس شہر یا علاقے کے لوگوں کی عام غذا ہو۔ اور سب مسکینوں کو برابر دینا چاہیے۔

ہ: حنفیہ کے نزدیک اگر ایک ہی مسکین کو ۶۰ دِن تک کھانا دیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے، البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک ہی دن اُسے ۶۰ دنوں کی خوراک دے دی جائے۔ لیکن باقی تینوں مذاہب ایک مسکین کو دینا صحیح نہیں سمجھتے۔ اِن کے نزدیک ۶۰ ہی مساکین کو دینا ضروری ہے اور یہ بات چاروں مذاہب میں جائز نہیں ہے کہ ۶۰ آدمیوں کو ایک وقت کی خوراک اور دوسرے ۶۰ آدمیوں کو دوسرے وقت کی خوراک دی جائے۔

و: یہ بات چاروں مذاہب میں سے کسی میں جائز نہیں ہے کہ آدمی ۳۰ دِن کے روزے رکھے اور ۳۰ مسکینوں کو کھانا دے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دو کفارے جمع نہیں کیے جا سکتے۔ روزے رکھنے ہوں تو پورے دو مہینوں کے مسلسل رکھنے چاہییں۔ کھانا کھلانا ہو تو ۶۰ مسکینوں کو کھلایا جائے۔

کھانا کھلانے کے دوران بیوی کو چھونے کا حکم: ر- اگرچہ قرآنِ مجید میں کفارۂ طعام کے متعلق یہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں کہ زوجین کے ایک دوسرے کو چھونے سے پہلے ادا ہونا چاہیے، لیکن فحوائے کلام اس کا مقتضی ہے کہ اس تیسرے کفارے پر بھی اس قید کا اطلاق ہوگا۔ اسی لیے ائمۂ اربعہ نے اس کو جائز نہیں رکھا ہے کہ کفارۂ طعام کے دوران میں آدمی بیوی کے پاس جائے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جو شخص ایسا کر بیٹھے اُس کے متعلق حنابلہ یہ حکم دیتے ہیں کہ اُسے ازسرِنو کھانا دینا ہوگا اور حنفیہ اس معاملے میں رعایت کرتے ہیں، کیونکہ اس تیسرے کفارے کے معاملے میں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا کی صراحت نہیں ہے اور یہ چیز رعایت کی گنجایش دیتی ہے۔

یہ احکام فقہ کی حسبِ ذیل کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں:

فقہ حنفی: هدايه۔ فتح القدير۔ بدائعُ الصَّنائع۔ احكام القرآن لِلْجصّاص۔

فقہ شافعی: المنهاج لِلنَّوَوِی مع شرح مُغنی المحتاج۔ تفسير كبير۔

فقہ مالکی: حاشيه الدَّسُوقِی على الشرح الكبير۔ بدايةُ المُجْتَهِد، احكام القرآن ابن العربی۔

فقہ حنبلی: المُغنی لابن قُدامه۔

فقہ ظاہری: المُحلّٰی لابنِ حَزم

(تفہیم القرآن پنجم ص ۳۴۵-۳۵۵، المجادلۃ حاشیہ ۱۱)

...........OOO...........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

لِعان[1]

قرآن میں لِعان کا بیان

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ○ (النور ۲۴: ۶-۱۰) اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور اُن کے پاس خود اُن کے اپنے سوا دوسرے گواہ نہ ہوں تو اُن میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اُس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔ تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اُس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمھیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)۔

واقعاتِ لِعان

حدِ قذف کا حکم جب نازل ہوا تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ غیر مرد اور عورت کی بدچلنی دیکھ کر تو آدمی صبر کر سکتا ہے، گواہ موجود نہ ہوں تو زبان پر قفل چڑھائے اور معاملے کو نظر انداز کر دے۔ لیکن اگر وہ خود اپنی بیوی کی بدچلنی دیکھ لے تو کیا کرے؟ قتل کر دے تو اُلٹا سزا کا مستوجب ہو۔ گواہ ڈھونڈے جائیں تو اُن کے آنے تک مجرم کب ٹھیرا رہے گا۔ صبر کرے تو آخر کیسے کرے۔ طلاق دے کر عورت کو رخصت کر سکتا ہے مگر نہ اس عورت کو کسی قسم کی مادّی یا اخلاقی سزا ملی نہ اُس کے آشنا کو۔ اور اگر اُسے ناجائز حمل ہو تو غیر کا بچہ الگ گلے پڑا۔ یہ سوال ابتداً تو حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے ایک فرضی سوال کی حیثیت میں کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ میں اگر خدانخواستہ اپنے گھر میں یہ معاملہ دیکھوں تو گواہوں کی تلاش میں نہیں جاؤں گا بلکہ تلوار

۱- لِعان سے متعلقہ احادیث تفہیم الاحادیث ج ۵، ص ۲۰۵-۲۲۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے اُسی وقت معاملہ طے کردوں گا (بخاری و مسلم)۔ لیکن تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ بعض ایسے مقدمات عملاً پیش آ گئے جن میں شوہروں نے اپنی آنکھوں سے یہ معاملہ دیکھا اور نبی ﷺ کے پاس اس کی شکایت لے گئے۔ عبداللہ بن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایات ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص (غالباً عُوَیمِر عَجلانی رضی اللہ عنہ) نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے اور منہ سے بات نکالے تو آپؐ حدِ قذف جاری کر دیں گے، قتل کر دے تو آپ اُسے قتل کر دیں گے، چپ رہے تو غیظ میں مبتلا رہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ اس پر حضور ﷺ نے دُعا کی کہ خدایا! اس مسئلے کا فیصلہ فرما (مسلم، بخاری، ابو داؤد، احمد، نَسائی) ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہلال بن اُمَیّہ رضی اللہ عنہ نے آ کر اپنی بیوی کا معاملہ پیش کیا جسے اُنھوں نے بچشم خود مُلوّث دیکھا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "ثبوت لاؤ ورنہ تم پر حدِ قذف جاری ہو گی"۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں اس سے عام پریشانی پھیل گئی اور ہلال نے کہا: اُس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے، میں بالکل صحیح واقعہ عرض کر رہا ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ایسا حُکم نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ بچا دے گا۔ اِس پر یہ آیت نازل ہوئی (بخاری، احمد، ابو داؤد)۔ اِس میں جو طریق تصفیہ تجویز کیا گیا ہے اُسے اِسلامی قانون کی اصطلاح میں 'لعان' کہا جاتا ہے۔

یہ حُکم آ جانے کے بعد نبی ﷺ نے جن مقدمات کا فیصلہ فرمایا اُن کی مفصل روداد یں کتبِ حدیث میں منقول ہیں اور وہی لعان کے مفصل قانون اور ضابطۂ کارروائی کا ماخذ ہیں۔

ہلال بن اُمَیّہ رضی اللہ عنہ کا مقدمہ: ہلال بن اُمَیّہ کے مقدمے کی جو تفصیلات صحاحِ سِتّہ اور مُسنَد احمد اور تفسیر ابنِ جَریر میں ابنِ عباس اور اَنس بن مالک رضی اللہ عنہما سے منقول ہوئی ہیں اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِس آیت کے نزول کے بعد ہلال رضی اللہ عنہ اور اُن کی بیوی، دونوں عدالتِ نبوی میں حاضر کیے گئے۔ حضور ﷺ نے پہلے حُکمِ خداوندی سنایا۔ پھر فرمایا: "خوب سمجھ لو کہ آخرت کا عذاب دُنیا کے عذاب سے زیادہ سخت چیز ہے"۔ ہلالؓ نے عرض کیا: میں نے اس پر بالکل صحیح الزام لگایا ہے۔ عورت نے کہا: یہ بالکل جھوٹ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اچھا! تو اِن دونوں میں مُلاعَنَت کرائی جائے"۔ چنانچہ پہلے ہلالؓ اُٹھے اور اُنھوں نے حُکمِ قرآنی کے مطابق قسمیں کھانی شروع کیں۔ نبی ﷺ اس دوران میں بار بار فرماتے رہے: "اللہ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا"؟ پانچویں قسم سے پہلے حاضرین نے ہلالؓ سے کہا: "خدا سے ڈرو، دُنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ یہ پانچویں قسم تم پر عذاب واجب کر دے گی"۔ ہلالؓ نے کہا: جس خدا نے یہاں میری پیٹھ بچائی ہے وہ آخرت میں بھی مجھے عذاب نہیں دے گا۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے پانچویں قسم بھی کھالی۔ پھر عورت اُٹھی اور اُس نے بھی قسمیں کھانی شروع کیں۔ پانچویں قسم سے پہلے اُسے بھی روک کر کہا گیا کہ "خدا سے ڈر، آخرت کے عذاب کی بہ نسبت دُنیا کا عذاب برداشت کر لینا آسان ہے۔ یہ آخری قسم تجھ پر عذاب الٰہی کو واجب کر دے گی"۔ یہ سُن کر وہ کچھ دیر رُکتی اور جھجکتی رہی۔ لوگوں نے سمجھا اعتراف کرنا چاہتی ہے۔ مگر پھر کہنے لگی "میں ہمیشہ کے لیے اپنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قبیلے کو رسوا نہیں کروں گی''۔ اور پانچویں قسم بھی کھا گئی۔ اس کے بعد نبی ﷺ نے دونوں کے درمیان تفریق کرادی اور فیصلہ فرمایا کہ اس کا بچہ (جو اس وقت پیٹ میں تھا) ماں کی طرف منسوب ہوگا، باپ کا نہیں پکارا جائے گا، کسی کو اس پر یا اس کے بچے پر الزام لگانے کا حق نہ ہوگا، جو اس پر یا اس کے بچے پر الزام لگائے گا وہ حدِ قذف کا مستحق ہوگا اور اُس کو زمانۂ عدت کے نفقے اور سکونت کا کوئی حق ہلال ؓ پر حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ طلاق یا وفات کے بغیر شوہر سے جُدا کی جارہی ہے۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ اس کے ہاں جب بچہ ہو تو دیکھو وہ کس پر گیا ہے۔ اگر اس اس شکل کا ہو تو ہلال ؓ کا ہے اور اگر اس صورت کا ہو تو اُس شخص کا ہے جس کے بارے میں اس پر الزام لگایا گیا ہے۔ وضع حمل کے بعد دیکھا گیا کہ وہ مؤخر الذکر صورت کا تھا۔ اِس پر حضور ﷺ نے فرمایا: لولا الآیمان (یا بروایت دیگر لولا مضی من کتاب الله لکان) لی ولها شان، یعنی اگر قسمیں نہ ہوتیں (یا خدا کی کتاب پہلے ہی فیصلہ نہ کر چکی ہوتی) تو میں اس عورت سے بُری طرح پیش آتا۔

عُوَیمر عَجلانی رضی اللہ عنہ کا مقدمہ: عُوَیمر عَجلانی کے مقدمے کی روداد سَہل بن سعد ساعدی اور ابنِ عمرؓ سے بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ملتی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ عُوَیمر اور اُن کی بیوی دونوں مسجد نبوی میں بُلائے گئے۔ مُلاعنت سے پہلے حضور ﷺ نے اُن کو بھی تنبیہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا ''اللہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا''؟ جب کسی نے توبہ نہ کی تو دونوں میں مُلاعنت کرائی گئی۔ اس کے بعد عُوَیمر نے کہا: ''یا رسول اللہ! اب اگر میں اس عورت کو رکھوں تو جھوٹا ہوں'' یہ کہہ کر اُنھوں نے تین طلاقیں دے دیں بغیر اس کے کہ حضور ﷺ نے اُن کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہوتا۔ سَہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ اِن طلاقوں کو حضور ﷺ نے نافذ فرمادیا اور اُن کے درمیان تفریق کرادی اور فرمایا کہ ''یہ تفریق ہے ہر ایسے جوڑے کے معاملے میں جو باہم لِعان کرے'' اور سنت یہ قائم ہوگئی کہ لِعان کرنے والے زوجین کو جُدا کر دیا جائے، پھر وہ دونوں کبھی جمع نہیں ہوسکتے۔ مگر ابنِ عمر رضی اللہ عنہ صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اُن کے درمیان تفریق کرادی۔ سَہل بن سعدؓ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عورت حاملہ تھی اور عُوَیمر نے کہا کہ یہ حمل میرا نہیں ہے۔ اس بنا پر بچہ ماں کی طرف منسوب کیا گیا اور سنت یہ جاری ہوئی کہ اس طرح کا بچہ ماں سے میراث پائے گا اور ماں ہی اُس سے میراث پائے گی۔

اِن دونوں مقدموں کے علاوہ متعدد روایات ہم کو کتب حدیث میں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ کن اشخاص کے مقدموں کی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض انھی دونوں مقدموں سے تعلق رکھتی ہوں، مگر بعض میں کچھ دوسرے مقدمات کا بھی ذِکر ہے اور ان سے قانونِ لِعان کے بعض اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۵۶-۳۵۷، النور حاشیہ ۷)

احکامِ لِعان

۱- لِعان قاضی کے سامنے ہونا چاہیے۔ عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لِعان نہیں کرسکتے۔ نہ ایسے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لِعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

۲۔ لِعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ اُن میں سے کوئی ایک قصور کا اعتراف کر لے، جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں، تب لِعان کرایا جائے۔

۳۔ فریقین کی طرف سے لِعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کرے گا کہ اِن کے درمیان تفریق کر دی گئی ہے۔ جمہور کا خیال یہ ہے کہ لِعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے ہے کہ تفریق کے لیے حُکمِ حاکم ضروری ہے۔ تمام معتبر احادیث جو اِس مسئلے میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہؒ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی ﷺ نے لِعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا اعلان فرمایا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ نے محض ملاعنت کو فرقت کے لیے کافی نہیں سمجھا۔

۴۔ لِعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اِس کے بعد فریقین اگر دوبارہ آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اِس معاملے میں تحلیل کا وہ قانون بھی جاری نہیں ہوتا جو حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ لِعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہر صورت مہر اُس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر دے چکا ہے تو اُس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

۶۔ اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لِعان کرنے سے انکار کرے تو جمہور کی رائے میں اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی۔ اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہو گا۔ اِسی طرح اگر شوہر کے لِعان کر چکنے کے بعد لِعان سے انکار کرے تو شافعی، مالک اور احمدؒ کی رائے ہے کہ اُس کو رجم کیا جائے گا اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ اُس کو قید کیا جائے گا۔ اِس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور مبنی بر مصلحت ہے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۴۸-۱۵۰)

لِعان کے بعد مہر کی واپسی

ابنِ عمر رضی اللہ عنہ ایک مقدمے کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زوجین جب لِعان کر چکے تو نبی ﷺ نے اُن کے درمیان تفریق کر دی (بخاری۔ مسلم۔ نسائی۔ احمد۔ ابنِ جریر)۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص اور اُس کی بیوی کے درمیان لِعان کر دیا گیا۔ پھر اُس نے حمل سے انکار کیا۔ نبی ﷺ نے اُن کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ بچہ صرف ماں کا ہو گا (صحاح ستّہ۔ احمد)۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ملاعنت کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: "تمھارا حساب اب اللہ کے ذِمّے ہے، تم میں سے ایک بہر حال جھوٹا ہے"۔ پھر آپ نے مرد سے فرمایا "لا سبیل لک علیھا" (یعنی اب یہ تیری نہیں رہی، نہ تو اُس پر کوئی حق جتا سکتا ہے، نہ کسی قسم کی دست درازی یا دوسری منتقمانہ حرکت اُس کے خلاف کرنے کا مجاز ہے)۔ مرد نے کہا: یارسول اللہ اور میرا مال [یعنی وہ مہر تو مجھے دلوایئے جو میں نے اِسے دیا تھا]؟ فرمایا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

:لا مال لک، اِن کنت صدقت علیها فهو بما استحللت من فرجها و ان کنت کذبت علیها فذاک ابعدُ و ابعد لک منها یعنی مال واپس لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو وہ مال اُس لذت کا بدل ہے جو تو نے حلال کر کے اُس سے اُٹھائی، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال تجھ سے اور بھی زیادہ دور چلا گیا اور اُس کی بہ نسبت تجھ سے زیادہ دور ہے۔ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد)

لِعان کے بعد دوبارہ نکاح

دار قُطنی نے علی ابن ابی طالب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: ''سنت یہ مقرر ہو چکی ہے کہ لِعان کرنے والے زوجین پھر کبھی باہم جمع نہیں ہو سکتے'' ۔ یعنی ان کا دوبارہ نکاح پھر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور دار قُطنی ہی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ یہ دونوں پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

چند دیگر واقعات

قَبیصَہ بن ذُؤیب کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی کے حمل کو ناجائز قرار دیا، پھر اعتراف کرلیا کہ یہ حمل اُس کا اپنا ہے، پھر وضع حمل کے بعد کہنے لگا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے اُس پر حدِ قذف جاری کی اور فیصلہ کیا کہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہوگا (دار قُطنی، بَیہقی)۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: میری ایک بیوی ہے جو مجھے بہت محبوب ہے۔ مگر اُس کا حال یہ ہے کہ کسی ہاتھ لگانے والے کا ہاتھ نہیں جھٹکتی (واضح رہے کہ یہ کنایہ تھا جس کے معنی زنا کے بھی ہو سکتے ہیں اور زنا سے کم تر درجے کی اخلاقی کمزوری کے بھی)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طلاق دے دے۔ اُس نے کہا: مگر میں اُس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ فرمایا: تو اُسے رکھے رہ (یعنی آپ نے اُس سے اِس کنایہ کی تشریح نہیں کرائی اور اُس کے قول کو الزامِ زنا پر محمول کر کے لِعان کا حکم نہیں دیا) (نسائی)۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک اَعرابی نے حاضر ہو کر عرض کیا: میری بیوی نے کالا لڑکا جنا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ میرا ہے (یعنی محض لڑکے کے رنگ نے اُسے شُبہ میں ڈالا تھا ورنہ بیوی پر زنا کا الزام لگانے کے لیے اُس کے پاس کوئی اور وجہ نہ تھی)۔ آپ نے پوچھا: تیرے پاس کچھ اُونٹ تو ہوں گے۔ اُس نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے پوچھا اُن کے رنگ کیا ہیں؟ کہنے لگا: سُرخ۔ آپؐ نے پوچھا: اُن میں خاکستری بھی ہے؟ کہنے لگا: ہاں، بعض ایسے بھی ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: یہ رنگ کہاں سے آیا؟ کہنے لگا: شاید کوئی رگ کھینچ لی گئی (یعنی اُن کے باپ دادا میں سے کوئی اُس رنگ کا ہوگا اور اُس کا اثر ان میں آ گیا۔ فرمایا: ''شاید اِس بچے کو بھی کوئی رگ کھینچ لے گئی''۔ اور آپؐ نے اُسے نفی ولد (بچے کے نسب سے انکار) کی اجازت نہ دی (بخاری۔ مسلم۔ احمد۔ ابوداؤد)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابو ہریرہؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی ﷺ نے آیت لعان پر کلام کرتے ہوئے فرمایا: ''جو عورت کسی خاندان میں ایسا بچہ گھسا لائے جو اُس خاندان کا نہیں ہے (حرام کا پیٹ رکھوا کر شوہر کے سر منڈھ دے) اُس کا اللہ سے کچھ واسطہ نہیں، اللہ اُس کو جنت میں ہرگز داخل نہ کرے گا۔ اور جو مرد اپنے بچے کے نسب سے انکار کرے حالانکہ بچہ اُس کو دیکھ رہا ہو، اللہ قیامت کے روز اُس سے پردہ کرے گا اور اُسے تمام اگلی پچھلی خلق کے سامنے رسوا کر دے گا (ابو داؤد، نسائی، دارمی)۔

ضابطۂ لعان کی اہم دفعات

آیتِ لعان اور یہ روایات و نظائر اور شریعت کے اصولِ عامہ اسلام میں قانونِ لعان کے وہ مآخذ ہیں جن کی روشنی میں فقہا نے لعان کا مفصل ضابطہ بنایا ہے۔ اِس ضابطے کی اہم دفعات یہ ہیں:

۱۔ زنا کی حالت میں بیوی کو قتل کرنا: جو شخص بیوی کی بدکاری دیکھے اور لعان کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قتل کا مرتکب ہو جائے تو اُس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اُسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اُس کو بطورِ خود حد جاری کرنے کا حق نہ تھا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اُسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اُس کے فعل پر کوئی مواخذہ ہوگا بشرطیکہ اُس کی صداقت ثابت ہو جائے (یعنی یہ کہ فی الواقع اُس نے زنا ہی کے ارتکاب پر یہ فعل کیا)۔ امام احمد اور اسحاق بن راہَوَیہ کہتے ہیں کہ اُسے اِس اَمر کے دو گواہ لانے ہوں گے کہ قتل کا سبب یہی تھا۔ مالکیہ میں سے ابن القاسم اور ابن حبیب اِس پر مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ زانی جسے قتل کیا گیا ہو وہ شادی شُدہ ہو۔ ورنہ کنوارے زانی کو قتل کرنے پر اُس سے قصاص لیا جائے گا۔ مگر جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اُس کو قصاص سے صرف اُس صورت میں معاف کیا جائے گا جبکہ وہ زنا کے چار گواہ پیش کرے یا مقتول مرنے سے پہلے خود اِس اَمر کا اعتراف کر چکا ہو کہ وہ اُس کی بیوی سے زنا کر رہا تھا اور مزید یہ کہ مقتول شادی شُدہ ہو (نیل الاوطار، ج۶ ص ۲۲۸)۔

۲۔ لعان کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے: لعان گھر بیٹھے آپس ہی میں نہیں ہو سکتا۔ اِس کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے۔

۳۔ عورت بھی لعان کا مطالبہ کر سکتی ہے: لعان کے مطالبے کا حق صرف مَرد ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ عورت بھی عدالت میں اس کا مطالبہ کر سکتی ہے جب کہ شوہر اُس پر بدکاری کا الزام لگائے یا اُس کے بچے کا نسب تسلیم کرنے سے انکار کرے۔

۴۔ لعان کی شرائطِ اہلیت: کیا لعان ہر زَوج اور زَوجہ کے درمیان ہو سکتا ہے یا اس کے لیے دونوں میں کچھ شرائط ہیں؟ اِس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ جس کی قسم قانونی حیثیت سے معتبر ہو اور جس کو طلاق دینے کا اختیار ہو وہ لعان کر سکتا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک صرف عاقل اور بالغ ہونا اہلیتِ لعان کے لیے کافی ہے خواہ زَوجین مسلم ہوں یا کافر، غلام ہوں یا آزاد، مقبول الشہادت ہوں یا نہ ہوں، مسلم شوہر کی بیوی مسلمان ہو یا ذِمّی۔ قریب قریب یہی رائے امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کی بھی ہے۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ لعان صرف آزاد مسلمان زَوجین ہی میں ہو سکتا ہے جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قذف کے جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں۔ اگر عورت اور مرد دونوں کافر ہوں یا غلام ہوں یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ ہوں تو اُن کے درمیان لعان نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں اگر عورت کبھی اس سے پہلے حرام یا مشتبہ طریقے پر کسی مرد سے ملوث ہو چکی ہو تب بھی لعان درست نہ ہوگا۔ یہ شرطیں حنفیہ نے اس بنا پر لگائی ہیں کہ اُن کے نزدیک لعان کے قانون اور قذف کے قانون میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ غیر آدمی اگر قذف کا مرتکب ہو تو اُس کے لیے حد ہے اور شوہر اِس کا ارتکاب کرے تو وہ لعان کر کے چھوٹ سکتا ہے۔ باقی تمام حیثیتوں سے لعان اور قذف ایک ہی چیز ہے۔ علاوہ بریں حنفیہ کے نزدیک چونکہ لعان کی قسمیں شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں، اِس لیے وہ کسی ایسے شخص کو اُس کی اجازت نہیں دیتے جو شہادت کا اہل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں حنفیہ کا مسلک کمزور ہے اور صحیح بات وہی ہے جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے قذفِ زوجہ کے مسئلے کو آیت قذف کا ایک جُز نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے لیے الگ قانون بیان کیا ہے۔ اِس لیے اِس کو قانونِ قذف کے ضمن میں لا کر وہ تمام شرائط اس میں شامل نہیں کی جاسکتیں جو قذف کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ آیتِ لعان کے الفاظ آیتِ قذف کے الفاظ سے مختلف ہیں اور دونوں الگ الگ حکم ہیں۔ اِس لیے لعان کا قانون آیتِ لعان ہی سے اخذ کرنا چاہیے نہ کہ آیت قذف سے۔ مثلاً آیتِ قذف میں سزا کا مستحق وہ شخص ہے جو پاک دامن عورتوں (محصنات) پر الزام لگائے۔ لیکن آیتِ لعان میں پاک دامن بیوی کی شرط کہیں نہیں ہے۔ ایک عورت چاہے کبھی گناہ گار بھی رہی ہو، اگر بعد میں وہ توبہ کر کے کسی شخص سے نکاح کر لے اور پھر اُس کا شوہر اُس پر ناحق الزام لگائے تو آیتِ لعان یہ نہیں کہتی کہ اِس عورت پر تہمت رکھنے کی یا اُس کی اولاد کے نسب سے انکار کر دینے کی شوہر کو کھلی چھٹی دے دو کیونکہ اس کی زندگی کبھی داغ دار رہ چکی ہے۔ دوسری اور اتنی ہی اہم وجہ یہ ہے کہ قذفِ زوجہ اور قذفِ اجنبیہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اِن دونوں کے بارے میں قانون کا مزاج ایک نہیں ہو سکتا۔ غیر عورت سے آدمی کا کوئی واسطہ نہیں، نہ جذبات کا، نہ عزت کا، نہ معاشرت کا، نہ حقوق کا اور نہ نسل و نسب کا۔ اُس کے چال چلن سے اگر ایک آدمی کو کوئی بڑی سے بڑی باوقعت دِل چسپی ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ معاشرے کو بداخلاقی سے پاک دیکھنے کا جوش اُسے لاحق ہو۔ اس کے برعکس اپنی بیوی سے آدمی کا تعلق ایک طرح کا نہیں کئی طرح کا ہے اور بہت گہرا ہے۔ وہ اُس کے نسب اور اُس کے مال اور اُس کے گھر کی امانت دار ہے۔ اُس کی زندگی کی شریک ہے۔ اُس کے رازوں کی امین ہے۔ اُس کے نہایت گہرے اور نازک جذبات اُس سے وابستہ ہیں۔ اُس کی بدچلنی سے آدمی کی غیرت اور عزت پر، اُس کے مفاد پر اور اُس کی آیندہ نسل پر سخت چوٹ لگتی ہے۔ یہ دونوں معاملے آخر ایک کس حیثیت سے ہیں کہ دونوں کے لیے قانون کا مزاج ایک ہی ہو۔ کیا ایک ذمّی یا ایک غلام یا ایک سزا یافتہ آدمی کے لیے اُس کی بیوی کا معاملہ کسی آزاد اہلِ شہادت مسلمان کے معاملے سے کچھ بھی مختلف یا اہمیت اور نتائج میں کچھ بھی کم ہے؟ اگر وہ اپنی آنکھوں سے کسی کے ساتھ اپنی بیوی کو ملوث دیکھ لے، یا اُس کو یقین ہو کہ اُس کی بیوی غیر سے حاملہ ہے تو کونسی معقول وجہ ہے کہ اُسے لعان کا حق نہ دیا جائے؟ اور یہ حق اُس سے سلب کرنے کے بعد ہمارے قانون میں اُس کے لیے اور کیا چارۂ کار ہے؟ قرآن کا منشا تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ جوڑوں کو اُس پیچیدگی سے نکالنے کی ایک صورت پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں بیوی کی حقیقی بدکاری یا ناجائز حمل سے ایک شوہر اور شوہر کے جھوٹے الزام یا اولاد کے نسب سے بے جا انکار کی بدولت ایک بیوی مبتلا ہو جائے۔ یہ ضرورت صرف اہلِ شہادت آزاد، مسلمانوں کے لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مخصوص نہیں ہے اور قرآن کے الفاظ میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اُس کو صرف اِنھی تک محدود کرنے والی ہو۔ رہا یہ استدلال کہ قرآن نے لِعان کی قَسموں کو شہادت قرار دیا ہے اِس لیے شہادت کی شرائط یہاں عائد ہوں گی تو اُس کا تقاضا پھر یہ ہے کہ اگر عادل مقبول الشہادت شوہر قَسمیں کھالے اور عورت قَسم کھانے سے پہلو تہی کرے تو عورت کو رجم کر دیا جائے، کیونکہ اِس کی بدکاری پر شہادت قائم ہو چکی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اِس صورت میں حنفیہ رجم کا حکم نہیں لگاتے۔ یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ خود بھی اِن قَسموں کو بعینہٖ شہادت کی حیثیت نہیں دیتے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود قرآن بھی اِن قَسموں کو شہادت کے لفظ سے تعبیر کرنے کے باوجود شہادت نہیں قرار دیتا ورنہ عورت کو چار کی بجائے آٹھ قَسمیں کھانے کا حکم دیتا۔

۵-وجوبِ لِعان کے الفاظ: لِعان محض کنایے اور استعارے یا اظہارِ شک و شُبہ پر لازم نہیں آتا، بلکہ صرف اُس صورت میں لازم آتا ہے جب کہ شوہر صریح طور پر زنا کا الزام عائد کرے یا صاف الفاظ میں بچے کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ امام مالک اور لیث بن سعدؒ اِس پر یہ مزید شرط بڑھاتے ہیں کہ قَسم کھاتے وقت شوہر کو یہ کہنا چاہیے کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے بیوی کو زنا میں مبتلا دیکھا ہے۔ لیکن یہ قید بے بنیاد ہے۔ اِس کی کوئی اصل نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔

۶-الزام کے بعد قَسم سے انکار

اگر الزام لگانے کے بعد شوہر قَسم کھانے سے پہلو تہی کرے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اصحاب کہتے ہیں کہ اُسے قید کر دیا جائے گا اور جب تک وہ لِعان نہ کرے یا اپنے الزام کا جھوٹا ہونا نہ مان لے اُسے نہ چھوڑا جائے گا اور جھوٹ مان لینے کی صورت میں اُس کو حدِ قذف لگائی جائے گی۔ اِس کے برعکس امام مالک، شافعی، حسن بن صالح اور لیث بن سعد رحمہم اللہ علیہم کی رائے یہ ہے کہ لِعان سے پہلو تہی کرنا خود ہی اقرارِ کذب ہے۔ اِس لیے حدِ قذف واجب آجاتی ہے۔

۷-عورت کا لِعان سے انکار: اگر شوہر کے قَسم کھا چکنے کے بعد عورت لِعان سے پہلو تہی کرے تو حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اُسے قید کر دیا جائے اور اُس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک وہ لِعان نہ کرے، یا پھر زنا کا اقرار نہ کرلے۔ دوسری طرف مذکورۂ بالا ائمہ کہتے ہیں کہ اِس صورت میں اُسے رجم کر دیا جائے گا۔ اُن کا استدلال قرآن کے اِس ارشاد سے ہے کہ عورت سے عذاب صرف اُس صورت میں دفع ہوگا جب کہ وہ بھی قَسم کھالے۔ اب چونکہ وہ قَسم نہیں کھاتی اِس لیے لامحالہ وہ عذاب کی مستحق ہے۔ لیکن اِس دلیل میں کمزوری یہ ہے کہ قرآن یہاں 'عذاب' کی نوعیت تجویز نہیں کرتا، بلکہ مطلقاً سزا کا ذِکر کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ سزا سے مُراد یہاں زنا ہی کی سزا ہو سکتی ہے تو اِس کا جواب یہ ہے کہ زنا کی سزا کے لیے قرآن نے صاف الفاظ میں چار گواہوں کی شرط لگائی ہے۔ اِس شرط کو محض ایک شخص کی چار قَسمیں پورا نہیں کر دیتیں۔ شوہر کی قَسمیں اِس بات کے لیے تو کافی ہیں کہ وہ خود قذف کی سزا سے بچ جائے اور عورت پر لِعان کے احکام مترتب ہو سکیں، مگر اِس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اِن سے عورت پر زنا کا الزام ثابت ہو جائے۔ عورت کا جوابی قَسمیں کھانے سے انکار شُبہ ضرور پیدا کرتا ہے اور بڑا قوی شُبہ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن شُبہات پر حدود جاری نہیں کی جاسکتیں۔ اِس معاملے کو مَرد کی حدِ قذف پر قیاس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اِس کا قذف تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثابت ہے، جبھی تو اُس کو لعان پر مجبور کیا جاتا ہے مگر اِس کے برعکس عورت پر زنا کا الزام ثابت نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے اپنے اقرار یا چار عینی شہادتوں کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا۔

۸- لعان کے بعد پیدا ہونے والے بچے کا حکم: اگر لعان کے وقت عورت حاملہ ہو تو امام احمد کے نزدیک لعان بجائے خود اِس بات کے لیے کافی ہے کہ مَرد اس حمل سے بری الذِمّہ ہو جائے اور بچہ اُس کا قرار نہ پائے قطع نظر اس سے کہ مَرد نے حمل کو قبول کرنے سے انکار کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مَرد کا الزامِ زنا اور نفیِ حمل دونوں ایک چیز نہیں ہیں، اِس لیے مَرد جب تک حمل کی ذِمّہ داری قبول کرنے سے صریح طور پر انکار نہ کرے وہ الزامِ زنا کے باوجود اُسی کا قرار پائے گا کیونکہ عورت کے زانیہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا حمل بھی زنا ہی کا ہو۔

۹- لعان کو وضعِ حمل تک ملتوی کرنا: امام مالک امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دورانِ حمل میں مَرد کو نفیِ حمل کی اجازت دیتے ہیں اور اِس بنیاد پر لعان کو جائز رکھتے ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر مَرد کے الزام کی بنیاد زنا نہ ہو بلکہ صِرف یہ ہو کہ اُس نے عورت کو ایسی حالت میں حاملہ پایا ہے جب کہ اُس کے خیال میں حمل اُس کا نہیں ہوسکتا تو اِس صورت میں لِعان کے معاملے کو وضعِ حمل تک ملتوی کرنا چاہیے، کیونکہ بسا اوقات کوئی بیماری حمل کا شُبہ پیدا کر دیتی ہے اور درحقیقت حمل نہیں ہوتا ہے۔

۱۰- بچے سے انکار کا متفق علیہ حُکم

اگر باپ بچے کے نسب سے انکار کرے تو بالاتفاق لعان لازم آتا ہے۔ اور اِس اَمر میں بھی اتفاق ہے کہ ایک دفعہ بچے کو قبول کر لینے کے بعد (خواہ یہ قبول کر لینا صریح الفاظ میں ہو یا قبولیت پر دلالت کرنے والے افعال مثلاً پیدائش پر مبارک باد لینے یا بچے کے ساتھ پدرانہ شفقت برتنے اور اُس کی پرورش سے دِل چسپی لینے کی صورت میں) پھر باپ کو انکارِ نسب کا حق نہیں رہتا اور اگر کرے تو حدِ قذف کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مگر اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ باپ کو کس وقت تک انکارِ نسب کا حق حاصل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر شوہر اُس زمانے میں گھر پر موجود رہا ہے جبکہ بیوی حاملہ تھی تو زمانہ حمل سے لے کر وضعِ حمل تک اُس کے لیے انکار کا موقع ہے۔ اِس کے بعد وہ انکار کا حق نہیں رکھتا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر پیدائش کے بعد ایک دو روز کے اندر وہ انکار کرے تو لعان کر کے وہ بچے کی ذِمّہ داری سے بری ہو جائے گا، لیکن اگر سال دو سال بعد انکار کرے تو لِعان ہو گا مگر وہ بچے کی ذِمّہ داری سے بری نہ ہو سکے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ولادت کے بعد یا ولادت کا علم ہونے کے بعد چالیس دِن کے اندر اندر باپ کو انکارِ نسب کا حق ہے، اِس کے بعد یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ مگر یہ چالیس دِن کی قید بے معنی ہے۔ صحیح وہی ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے کہ ولادت کے بعد یا اِس کا علم ہونے کے بعد ایک دو روز کے اندر ہی انکارِ نسب کیا جا سکتا ہے۔ اِلّا یہ کہ اِس میں کوئی ایسی رکاوٹ ہو جسے معقول رکاوٹ تسلیم کیا جا سکے۔

۱۱- طلاق دینے کے بعد زنا کا الزام: اگر شوہر طلاق دینے کے بعد مطلّقہ بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لِعان نہیں ہو گا بلکہ اس پر قذف کا مقدمہ قائم کیا جائے گا۔ کیونکہ لِعان زوجین کے لیے ہے اور مطلّقہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عورت اُس کی بیوی نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ طلاق رجعی ہو اور مدتِ رُجوع کے اندر وہ الزام لگائے۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ قذف صرف اُس صورت میں ہے جب کہ کسی حمل یا بچے کا نسب قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ درمیان میں نہ ہو۔ ورنہ مَرد کو طلاق بائن کے بعد بھی لعان کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ عورت کو بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود ایک ایسے بچے کی ذِمّہ داری سے بچنے کے لیے لعان کر رہا ہے جسے وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ قریب قریب یہی رائے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

۱۲- لِعان کے متفق علیہ نتائج: لِعان کے قانونی نتائج میں سے بعض متفق علیہ ہیں، اور بعض میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ متفق علیہ نتائج یہ ہیں: عورت اور مَرد دونوں کسی سزا کے مستحق نہیں رہتے۔ مَرد بچے کے نسب کا منکر ہو تو بچہ صرف ماں کا قرار پائے گا، نہ باپ کی طرف منسوب ہوگا، نہ اُس سے میراث پائے گا۔ ماں اِس کی وارث ہوگی اور وہ ماں کا وارث ہو گا۔ عورت کو زانیہ اور اُس کے بچے کو ولد الزنا کہنے کا کسی کو حق نہ ہوگا۔ خواہ لعان کے وقت اُس کے حالات ایسے ہی کیوں نہ ہوں کہ لوگوں کو اُس کے زانیہ ہونے میں شک نہ رہے۔ جو شخص لعان کے بعد اِس پر یا اُس کے بچے پر سابق الزام کا اعادہ کرے گا وہ حد کا مستحق ہوگا۔ عورت کا مہر ساقط نہ ہوگا۔ عورت دورانِ عدت میں مَرد سے نفقہ اور مسکن پانے کی حق دار نہ ہوگی۔ عورت اِس مَرد کے لیے حرام ہو جائے گی۔

دو اختلافی مسئلے: اختلاف دو مسئلوں میں ہے۔ ایک یہ کہ لِعان کے بعد عورت اور مَرد کی علیحدگی کیسے ہوگی؟ دوسرے یہ کہ لعان کی بنا پر علیحدہ ہو جانے کے بعد کیا اِن دونوں کا پھر مِل جانا ممکن ہے؟ پہلے مسئلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جس وقت مَرد لعان سے فارغ ہو جائے اُسی وقت فرقت آپ سے آپ واقع ہو جاتی ہے۔ خواہ عورت جوابی لعان کرے یا نہ کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، لیث بن سعد اور زُفر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مَرد اور عورت دونوں جب لعان سے فارغ ہوں تب فُرقت واقع ہوتی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ لعان سے فُرقت آپ ہی آپ واقع نہیں ہو جاتی، بلکہ عدالت کے تفریق کرانے سے ہوتی ہے۔ اگر شوہر خود طلاق دے دے تو بہتر، ورنہ حاکم عدالت اُن کے درمیان تفریق کا اعلان کرے گا۔ دُوسرے مسئلے میں امام مالک، ابو یوسف، زُفر، سُفیان ثوری، اسحاق بن راہَوَیہ، شافعی، احمد بن حنبل اور حسن بن زیاد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ لِعان سے جو زوجین جُدا ہوئے ہوں وہ پھر ہمیشہ کے لیے ایک دُوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ وہ باہم نکاح کرنا بھی چاہیں تو کسی حال میں نہیں کر سکتے۔ یہی رائے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی بھی ہے۔ بخلاف اِس کے سعید بن مسیَّب، ابراہیم نخعی، شعبی، سعید بن جُبیر، ابو حنیفہ اور محمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر شوہر اپنا جھوٹ مان لے اور اِس پر حدِّ قذف جاری ہو جائے تو پھر اُن دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اُن کو ایک دُوسرے کے لیے حرام کرنے والی چیز لعان ہے۔ جب تک وہ اِس پر قائم رہیں حُرمت بھی قائم رہے گی۔ مگر جب شوہر اپنا جھوٹ مان کر سزا پا گیا تو لعان ختم ہو گیا اور حُرمت بھی اُٹھ گئی۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۵۷-۳۶۳، النور حاشیہ ۷)

..........OOO..........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

نِکاحِ کتابیات

اہلِ کتاب کی عورتوں سے نِکاح[1]

قرآن مجید کی جس آیت میں اہل کتاب کی عورتوں سے نِکاح کی اجازت دی گئی ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ (المائدہ ۵:۵) آج تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اُن لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمھارے لیے حلال ہے۔ اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی بھی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے (تمھارے لیے حلال ہیں) بشرطیکہ تم اُن کو اُن کے مہر ادا کر کے قیدِ نکاح میں لاؤ نہ یہ کہ تم کھلم کھلا بدکاری کرنے والے یا چوری چھپے تعلقات رکھنے والے بنو۔

اس سے مُراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ نکاح کی اجازت صرف اُنھی کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ وہ محصنات (محفوظ عورتیں) ہوں۔ اس حُکم کی تفصیلات میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ یہاں اہلِ کتاب سے مُراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں۔ رہے دار الحرب اور دار الکفر کے

۱- ایک دوست کا تقاضا ہے کہ ’فرنگیات‘ کی درآمد کا فتنہ بڑھتا جا رہا ہے اور ’اہلِ کتاب‘ عورتوں سے نکاح کی شرعی اجازت ایک بہانہ بن گئی ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق مذہبی احکام کی صحیح تشریح ہونی چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ فی الواقع یہ ایک بڑا فتنہ ہے۔ ہندوستان، مصر اور شام وغیرہ ممالک میں تو اس کا اثر اِسی حد تک رہا ہے کہ میم صاحبات نے اسلامی نظامِ معاشرت میں گھس کر تہذیب اسلامی کی خوب بیخ کنی فرمائی۔ لیکن ٹرکی میں اس کے سیاسی نتائج بھی نہایت خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ یہ اُن اہم اسباب میں سے ہے جن کی بدولت ترکوں کی عظیم الشان سلطنت تباہ ہوئی۔ اس بنا پر اگر دردمند مسلمانوں کو اس کے سدِ باب کی ضرورت کا احساس ہو تو یہ بالکل جائز ہے، لیکن ہمارے نزدیک مصالح کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کسی شرعی مسئلہ میں ترمیم کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید جس نے نازل کیا ہے وہ حکیمِ مطلق ہے اور اُس کی نظر تمام مصالح و ضروریات پر غایت درجہ توازن و تناسب کے ساتھ پڑتی ہے۔ اس کے احکام کو سمجھنے اور حالات پر اُن کو ٹھیک منطبق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حتی الامکان نظر کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر تمام چھوٹی اور بڑی مصالح کا جائزہ لیا جائے اور ہر ایک کو رعایت کا وہی درجہ دیا جائے جو خود شارع نے دیا ہے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۳۱۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہود و نصاریٰ تو اُن کی عورتوں سے نِکاح کرنا درست نہیں۔ حَنَفِیہ اِس سے تھوڑا اختلاف کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بیرونی ممالک کے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نِکاح کرنا حرام تو نہیں ہے، مگر مکروہ ضرور ہے۔ بخلاف اِس کے سعید بن المسیب اور حَسن بَصری رحمہما اللہ اِس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حُکم میں عام ہے۔ لہٰذا ذِمّی اور غیر ذِمّی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر محصنات کے مفہوم میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اِس سے مُراد پاک دامن، عصمت مآب عورتیں ہیں اور اِس بنا پر وہ اہلِ کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اِس اجازت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ یہی رائے حَسن، شَعبی اور ابراہیم نَخعی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور حَنَفِیہ نے بھی اِسی کو پسند کیا ہے۔ بخلاف اِس کے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، یعنی اِس سے مُراد اہلِ کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں۔

وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ٘ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (المائدہ ۵:۵) اور [جس] کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اُس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔

اہلِ کتاب کی عورتوں سے نِکاح کی اجازت دینے کے بعد یہ فقرہ اس لیے تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اِس اجازت سے فائدہ اُٹھائے وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اِس کے عقائد اور اعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۴۶-۴۴۷، المائدہ حواشی ۲۲-۲۳)

اختلافاتِ سلف

اِس [مذکورہ بالا] آیت کی تفسیر میں سلف کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہوئے ہیں۔ لیکن جمہور علما نے ہر زمانے میں اِس کے حُکم کو ظاہر الفاظ اور عمومِ اطلاق ہی پر باقی رکھا ہے۔ اِس لیے کہ کسی حُکمِ قرآنی کو ظاہر سے پھیرنے اور عام کو خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اور یہاں سرے سے کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ قرآن بھیجنے والے سے بڑھ کر صاحبِ حِکمت مقنّن کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے حُکم میں کسی استثنا یا تخصیص کی ضرورت سمجھتا تو وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے ساتھ کوئی قید ضرور بڑھاتا۔ اِس کی شانِ تشریع سے یہ اَمر بہت بعید ہے کہ وہ قانونی احکام کے بیان میں اتنی چُست زبان بھی استعمال نہ کر سکے جتنی دُنیا کے واضعینِ قانون استعمال کر لیتے ہیں۔ کِس طرح ممکن ہے کہ اِس کا مقصد تو اہلِ کتاب کے کِسی خاص گروہ کو حلال کرنا ہو اور وہ بیانِ حُکم کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرے جو تمام اہلِ کتاب کے لیے عام ہوں اور جن میں استثنا اور تخصیص کے لیے قطعاً کوئی اشارہ تک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین اور ائمۂ سلف نے عموماً اِس آیت کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے نِکاح کی عام اجازت پر محمول کیا ہے اور صِرف محمول ہی نہیں کیا ہے بلکہ اُس کے مطابق عمل بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ نے نائلہ بنت فرافصۂ کَلبیہ سے نِکاح کیا جو نصرانیہ تھی۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رضی اللہ عنہ نے ایک شامی یہودیہ سے نکاح کیا۔ حذیفہ بن الیمان اور کعب بن مالک اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم وغیرہم نے بھی کتابیات سے نکاح کیے یا اُن کو نکاح کے پیغام دیے۔

۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک: صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے صرف ایک ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں کو حرام کیا ہے: وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ (البقرہ ۲:۲۲۱) (مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں) اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرک ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ بن مریم یا کسی بندۂ خدا کو خدا قرار دیا جائے"۔ اس بنا پر وہ تمام اُن اہلِ کتاب کی عورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن کے اعتقاد میں کفر و شرک پایا جاتا ہو۔ والمحصنات کی تفسیر اُنھوں نے والمسلمات سے کی ہے۔ یعنی اُن کی رائے میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سے جو عورتیں مسلمان ہوجائیں اُن کے ساتھ بھی نکاح کرنا تمھارے لیے حلال ہے۔

لیکن اِس مسئلے میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رائے درست نہیں ہے جس کے وجوہ مختصراً ہم بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں خود ہی اہلِ کتاب کے وہ تمام عقائد بیان فرمائے ہیں جو صریح شرک پر مبنی ہیں۔ مثلاً اُن کا یہ اعتقاد کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ (المائدہ ۵:۷۲) اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ (المائدہ ۵:۷۳) اور وَ قَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ۨابۡنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ ؕ (التوبہ ۹:۳۰)۔ یہی نہیں بلکہ اِس نے لفظِ شرک اور کفر کو بھی اُن کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اُس نے کسی جگہ بھی اُن کے لیے 'مشرک' کا لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ تمام قرآن میں جہاں کہیں بھی اُن کا ذکر آیا ہے۔ اہلِ کتاب یا اُس کے ہم معنیٰ دُوسرے الفاظ کے ساتھ ہی آیا ہے۔ قرآن کو اوّل سے آخر تک دیکھ جائیے۔ تین گروہ بالکل الگ الگ نظر آئیں گے۔ ایک گروہ مشرکین و کفار، یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی ہدایت محرّف یا غیر محرّف موجود نہیں ہے۔ دُوسرے اہلِ کتاب جو اپنی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کے باوجود کسی نبی اور کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ تیسرے مؤمنین جن سے مُراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہیں، عام اس سے کہ وہ اسلام میں پیدا ہوئے ہوں، یا اہلِ کتاب کے گروہ سے اِسلام میں آئے ہوں، یا مشرکین و کفار کے گروہ سے نکل کر مسلمان ہو گئے ہوں۔ قرآن اِن تینوں گروہوں کے درمیان واضح امتیاز برتتا ہے اور کہیں اُن کو خلط ملط نہیں کرتا کہ مطلقاً اہلِ کتاب بول کر مشرک مُراد لے، یا مطلقاً مشرک بول کر اہلِ کتاب مُراد لے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ کہہ کر مسلمان مُراد لے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ فرما کر نکاح سے منع فرمایا اور دوسری جگہ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ کہہ کر نکاح کی اجازت دی تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت میں اَلۡمُشۡرِكٰت سے بُت پرستوں اور دوسری غیر کتابی قوموں کی عورتیں مُراد ہیں اور دوسری آیت میں اُن غیر مسلم گروہوں کی عورتیں مُراد ہیں جن کے پاس قرآن سے پہلے کتابیں تھیں۔ اگر یہ معنیٰ نہ لیے جائیں تو قرآن کی دو آیتوں میں صریح تعارض لازم آتا ہے جس کو یہ کہہ کر دفع نہیں کیا جاسکتا کہ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ سے مُراد وہ عورتیں ہیں جو یہُودیت و نصرانیت چھوڑ کر مسلمان ہوگئی تھیں، یا اُن کتابی فرقوں کی عورتیں ہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو شرک وکفر سے پاک تھے، اس لیے کہ:

اوّلاً اللہ تعالیٰ نے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ سے پہلے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ فرمایا دیا ہے۔ اور مؤمنات سے صرف وہی عورتیں مُراد نہیں ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئی ہوں، بلکہ وہ سب عورتیں بھی مُراد ہیں جو اپنے سابق مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں آ ئی ہوں۔ پس جب مومنات سے نِکاح کو عموماً حلال کر دیا تھا اور ان میں وہ عورتیں بھی آپ سے آپ داخل تھیں جو اسلام سے پہلے نصرانی یا یہودی تھیں تو پھر خاص طور پر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کے ذکر کی کون سی ضرورت تھی؟ اس طرح تو یہ فقرہ بالکل بے معنی اور عبث ہو جاتا ہے۔

ثانیاً اس آیت سے پہلے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اُن لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی ہے۔ کیا وہاں بھی اہلِ کتاب سے مُراد وہ مسلمان ہیں جو نصرانیت اور یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہوں؟ اگر نہیں تو کس بنا پر جائز ہوا کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے میں لفظِ اہلِ کتاب کے ایک معنی لیے جائیں اور دوسرے ٹکڑے میں دوسرے معنی؟

ثالثاً، نصاریٰ اور یہود کا کون سا فرقہ ایسا ہے جو شرک یا کفر سے پاک ہو؟ خدا کے بارے میں صحیح اعتقاد اُن میں باقی ہی کہاں تھا اور کہاں سے آ سکتا تھا؟ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات ہی ان کے ہاں محرّف ہو چکی تھیں۔ پھر صحتِ اعتقاد کا راستہ مل کہاں سکتا تھا کہ ان میں کوئی فرقہ راہِ راست پر ہوتا؟ پس یہ خیال قطعاً صحیح نہیں کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ سے یہود ونصاریٰ کا کوئی صحیح العقیدہ گروہ مُراد ہے۔ قرآن کی جن آیات سے یہ شُبہہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ صحیح العقیدہ فرقے بھی تھے، اِن کا اشارہ دراصل ایسے اہلِ کتاب کی طرف ہے جو نیک دِل اور سلیم الفطرت ہونے کی بنا پر نبی ﷺ کی ہدایت کو قبول کر چکے تھے یا عنقریب قبول کرنے والے تھے۔

رابعاً اگر بالفرض یہود ونصاریٰ کا کوئی خاص گروہ ایسا ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ کے ساتھ کوئی قید ایسی نہیں بڑھائی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ یہ حُکم صِرف اُسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے اور دُوسرے اہلِ کتاب اِس سے خارج ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ اہلِ کتاب کے اِعتقادات کی چھان بین میں لگ جائیں اور اپنے قیاس سے یہ طے کریں کہ اِن میں سے کِس فِرقے کی عورتیں حلال ہیں اور کِس فِرقے کی حرام۔

جن لوگوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی تائید کی ہے وہ آیت وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ لیکن یہ آیت خاص طور پر اُن مردوں اور عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو دارالحرب سے دارالِاسلام کی طرف مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے ہوں اور جن کے شوہر یا بیویاں دارالحرب میں بحالتِ کفر رہ گئی ہوں۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ اُن کے دارالِاسلام میں آتے ہی جاہلیت کا نِکاح ٹوٹ جاتا ہے اور مہاجر مَرد وعورت دونوں نِکاح کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی تو شانِ نزول کے لحاظ سے متحقق ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص نفسِ الفاظ ہی پر حصر کرے تو ہم کہیں گے کہ ایک جگہ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے ایک عام حُکم بیان کیا گیا تھا۔ پھر دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کہہ کر بتا دیا گیا کہ کفار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں سے ایک خاص جماعت، یعنی اہلِ کتاب اس عام ممانعت سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر آپ یہ نہیں مانتے کہ پہلے حکمِ عام کو یہ دوسرا حکمِ خاص کر رہا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ متضاد باتیں کرتا ہے، ایک جگہ ایک چیز کی اجازت دیتا ہے اور دوسری جگہ اُس کی ممانعت کر دیتا ہے۔ معاذ اللہ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مسلک: ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرے صحابی جنھوں نے نکاحِ کتابیات کی اجازت کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف ذِمّی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ نصاریٰ اور یہود میں جو لوگ اسلامی سلطنت کی رعایا ہوں صرف اُنھی کی عورتوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے، خواہ اُن کے اعتقادات میں کیسا ہی فساد ہو۔ رہے اہلِ حرب (یعنی وہ لوگ جو حدودِ دارالاسلام سے باہر رہتے ہوں) تو اُن کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے اس گروہ سے جنگ کا حکم دیا ہے: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبہ ۹:۲۹) نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کے دشمن ہوں اُن سے محبت رکھنا اہلِ ایمان کا کام نہیں ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (المجادلہ ۵۸:۲۲) دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ازدواجی تعلق کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہے وہ مودّت اور رحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے: خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (الروم ۳۰:۲۱) پس جب نکاح کا تعلق محبت و اخلاص کا مقتضی ہے اور حربی مشرکین و اہلِ کتاب سے محبت رکھنا حرام اور جنگ کرنا مامور بہ، تو لازم آیا کہ اُن کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہ ہو۔

یہ ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا استدلال۔ مگر ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اُن کی اس رائے کو بھی جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین و ائمہ متقدمین رحمہم اللہ نے تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ دارالحرب اور دارالکفر کی رہنے والی کتابی عورت سے نکاح کو بالاتفاق سب مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کی حُرمت کا کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ کیونکہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کی اجازت حربی اور غیر حربی سب کو شامل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ پس جہاں تک قانونی جواز کا تعلق ہے، اُس کو ٹھیک اُسی عموم پر باقی رکھنا چاہیے جو آیتِ قرآنی میں پایا جاتا ہے۔ رہا قومی مصالح یا شخصی حالات کے لحاظ سے نکاح کا مناسب نہ ہونا اور اُس کا لائقِ پرہیز ہونا تو یہ بالکل ایک دُوسری چیز ہے۔ ہم جائز کو ناجائز نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ حق ہم کو حاصل ہے کہ جو فعلِ جائز کسی خاص حالت میں یا کسی خاص وجہ سے ہمارے لیے مناسب نہ ہو اُس سے ہم پرہیز کریں، کیونکہ جواز کے معنی اَمر اور لزوم کے نہیں ہیں۔

جمہور کا مسلک اور اُن کے اختلافات: ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کو رد کر دینے کے بعد جو لوگ آیت زیرِ بحث کے حکم کو عام قرار دیتے ہیں اُن کے درمیان تمام تر اختلاف صرف دو لفظوں کی تفسیر میں ہے۔ ایک اَلْمُحْصَنٰتُ، دوسرے اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

محصنہ کے معنی ایک گروہ کے نزدیک 'پاک دامن عورت' کے ہیں اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محصنہ وہ عورت ہے جو آزاد ہو۔ لونڈی نہ ہو۔ پہلے گروہ کے نزدیک اہلِ کتاب کی صِرف اُن عورتوں سے نِکاح جائز ہے جو عفیفہ ہوں، بدکار اور آبرُو باختہ اور بے حیا عورتیں اِس حُکم سے خارج ہیں۔ دُوسرے گروہ کی رائے میں کتابیہ لونڈی سے نِکاح جائز نہیں، خواہ وہ عفیفہ ہی کیوں نہ ہو اور آزاد کتابیہ سے جائز ہے خواہ وہ بدکار ہی کیوں نہ ہو۔

اہلِ کتاب کے متعلق اختلاف اِس اَمر میں ہے کہ کون کون سے گروہ اُن میں شامل ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب صِرف وہ یہودی اور نصرانی ہیں جو بنی اسرائیل سے ہوں۔ رہیں دُوسری قومیں جنھوں نے یہودیت یا نصرانیت قبول کر لی ہے تو وہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ صِرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دُوسری قومیں اِن کی دعوت کی مخاطب ہی نہ تھیں۔

حنفیہ اور جمہور فقہا کہتے ہیں کہ ہر وہ قوم جو کسی نبی کو مانتی ہو اور کسی کتابِ الٰہی پر ایمان رکھتی ہو، اہلِ کتاب شُمار کی جائے گی۔ اِس میں یہُود و نصاریٰ کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگر کوئی گروہ صُحُفِ ابراہیم کا ماننے والا یا صِرف زبورِ داوٗد پر ایمان رکھنے والا ہوتا تو وہ کتابی گروہ ہوتا۔ سَلَف میں ایک قلیل جماعت اِس طرف بھی گئی ہے کہ جن قوموں کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس پر آسمانی ہونے کا شُبہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی اہلِ کتاب میں سے ہیں۔ مثلاً مجوسی۔ موجودہ زمانے کے بعض 'مجتہدین' نے اسی خیال کو وُسعت دے کر یہ اجتہاد فرمایا ہے کہ ہندو اور جینی اور بودھ مت والے بھی اہلِ کتاب ہیں اور اُن کی عورتوں سے بھی نِکاح جائز ہے۔ کیونکہ بہر حال اِن کے ہاں بھی کوئی نہ کوئی نبی آیا ہوگا اور کوئی نہ کوئی کتاب اِن کو ضرور دی گئی ہوگی۔

صحیح مسلک: ان تمام اختلافات میں جو مسلک سب سے زیادہ صحیح ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے مُراد صِرف یہُود و نصاریٰ ہیں عام اس سے کہ وہ اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی۔ قرآنِ مجید میں اہلِ کتاب کا لفظ اِنھی دونوں گروہوں کے لیے آیا ہے اور ایک جگہ تو تصریح کر دی گئی ہے کہ یہی دو گروہ اہلِ کتاب ہیں: وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝[1] (الانعام ۶:۱۵۵-۱۵۶) اُن دو گروہوں کے علاوہ جن دُوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں اُنھوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل ضائع کر دیا اور اُن کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیماتِ انبیا پر باقی نہیں رہی، اِس لیے اُن پر لفظ اہلِ کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہلِ کتاب قرار نہیں دیا۔ حالانکہ وہ زَرتُشت کو مانتے ہیں جس پر نبی ہونے کا شُبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُنُّوا بهم سنة اهل الكتاب[2] (اِن کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرو) یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپؐ نے مجوسِ ہجر کو لکھا تھا اُس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ: فَاِنْ اَسْلَمْتُمْ فَلَكُمْ مَالَنَا و عليكم ما عَلَيْنَا وَ مَنْ اَبٰى فَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ غَيْرَ اَكْلِ ذَبَآئِحِهِمْ وَلَا نِكَاحِ نِسَآءِ هِمْ ، اگر تم اِسلام قبول کرو گے تو تمھارے وہی حقوق

۱- اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو۔ بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی، اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۶ ص ۳۴۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں اور جو لوگ تم میں سے انکار کریں گے اُن پر جزیہ عائد کر دیا جائے گا۔ مگر نہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ اُن کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔

اِس تصریح کے بعد یہ شُبہ کرنے کی گنجایش ہی نہیں رہتی کہ غیر یہود و نصاریٰ کو بھی اکلِ ذبائح اور نکاحِ محصنات کی اغراض کے لیے اہلِ کتاب میں شُمار کیا جا سکتا ہے۔

رہی اسرائیلیت کی قید جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لگائی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ بلاشبہ دعوت موسوی وعیسوی کے مخاطب صِرف بنی اسرائیل تھے مگر جن غیر اسرائیلی قوموں نے نصرانیت کو قبول کیا، اُنھیں بھی تو خدا اور رسول نے اہلِ کتاب ہی میں شُمار کیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نامۂ مبارک قیصرِ رُوم کے نام لِکھا تھا اُس میں یہ آیت نقل فرمائی تھی کہ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔ دیکھیے یہاں رُومیوں کو 'اے اہلِ کتاب' کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ رُومی اسرائیلی نہ تھے۔

پھر جن لوگوں نے محصنات کا ترجمہ عفیفہ یا حرہ کیا ہے اور عفت یا حریت کو نکاحِ کتابیہ کے لیے شرط قرار دیا ہے اُن کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اِس میں شک نہیں کہ احصان کے مفہوم میں عفت اور شرافت دونوں داخل ہیں اور محصنہ سے مُراد ایسی ہی عورت ہے جو پاک دامن بھی ہو اور شریف و معزز بھی۔ لیکن شارع کا مقصود ان دونوں چیزوں کو نکاح کے لیے شرط قرار دینا نہیں ہے، بلکہ محض افضلیت اور اولویت کا اظہار مقصود ہے۔ شارع دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم نکاح کرنے کو تو ہر مومن اور کتابی عورت سے کر سکتے ہو مگر اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ وہ عورت محصنہ، یعنی شریف اور پاک دامن ہو۔ قرآنی احکام میں اس قِسم کی قیُود بکثرت لگائی گئی ہیں جو ثبوتِ حُکم کے لیے شرط کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ کِسی فعلِ جائز کے افضل پہلو یا فعلِ ناجائز کے ارذل پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے بطورِ ایک قیدِ زائد کے رکھ دی گئی ہیں تا کہ اہلِ ایمان افضل کے اختیار اور ارذل سے اجتناب کا اہتمام کریں۔ بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا ہے۔ حضرت حُذیفہ بن الیمان نے ایک یہودیہ سے نِکاح کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے لِکھا کہ اِسے چھوڑ دو۔ اُنھوں نے دریافت کیا کہ یہ حُکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ سے نِکاح کرنا حرام ہے؟ آپؓ نے جواب دیا کہ حرام نہیں ہے بلکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہلِ کتاب کی آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

پس تمام مسالک میں جو مسلک ہمارے نزدیک اصح ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نِکاح کرنے کے شرعی جواز کو عام قرار دیا جائے خواہ وہ حربیہ ہوں یا ذِمیہ، عفیفہ ہوں یا نہ ہوں، لونڈیاں ہوں یا آزاد۔

مصالح و حِکَم

بہت سی احادیث[1] ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نِکاح کی اہمیت صِرف ایک تمدّنی ضرورت کو پورا کرنے ہی

ا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم احکام القرآن، سوم، بحث: نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مقصد تحصینِ نفس، اور طہارتِ اخلاق اور تہذیبِ اسلامی کا فروغ اور خالص مسلمان نسلیں پیدا کرنا ہے۔ اور ان اغراض کے لیے صِرف یہی کافی نہیں ہے کہ مسلمان نِکاح کریں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کے نِکاح ایسی عورتوں سے ہوں جو مسلمان ہوں، دِین دار ہوں، شریف اور باعصمت ہوں۔ کیونکہ ایک صالح اِسلامی سوسائٹی ایسے ہی مَردوں اور عورتوں کے ازدواج سے وجود میں آسکتی ہے اور ایک صالح مسلمان نسل ایسی ہی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوسکتی ہے۔

• **مخلوط شادیوں کی مضرّت:** دِینی نقطۂ نظر سے ہٹ کر خالص عمرانی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوط شادیوں (mixed marriages) سے بڑھ کر کوئی چیز نظامِ معاشرت اور خاندانی زندگی کو فاسد کرنے والی نہیں ہوسکتی۔ دو ایسے میاں بیوی جن کے خیالات میں بُعد المشرقین ہو اور جنھوں نے دو بالکل مختلف ماحولوں میں مختلف روایات اور مختلف معاشرتوں کے زیرِ اثر پرورش پائی ہو، اپنے باہمی اختلاط سے نہ تو خود اپنی زندگی میں سکون و راحت حاصل کر سکتے ہیں، نہ اپنے گھر کو کسی نظامِ معاشرت کا صالح رُکن بنا سکتے ہیں اور نہ کوئی ایسی نسل پیدا کر سکتے ہیں جو کسی نظامِ تمدّن میں اچھی طرح کھپ سکتی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اُن کے درمیان محبت ہو اور آخر تک رہے، مگر اُن کی محبت اور رفاقت زیادہ سے زیادہ صِرف اُنھی کی ذات کے لیے لُطف ولذّت کی موجب ہوسکتی ہے۔ اِس سے بڑھ کر اس کا کوئی تمدّنی فائدہ نہیں ہے۔ اختلافِ مذہب اور اختلافِ قومیت تو خیر بڑی چیز ہے۔ خاندانی زندگی کی کامیابی اور نظامِ تمدن کی بہتری کے لیے تو ایسی شادیاں بھی مُفید نہیں ہوتیں جن کے دونوں فریق ایک ہی سوسائٹی کے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہوں[1]۔

اِختلافِ دِین کے نقصانات: عدمِ کفاءت کے نقصانات تو صِرف اسی قدر ہیں کہ اس سے زَوجین میں مودّت و رحمت کم اور نتیجہ خیز اشتراک کمتر ہوتا ہے۔ مگر اختلافِ مذہب و قومیت کے نقصانات اس سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اِس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں جو اولاد تربیت پاکر اُٹھے گی وہ دِین و اخلاق کے اعتبار سے اِسلامی سوسائٹی کے کسی کام کی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ایک مسلمان گھر میں غیر اِسلامی طریقے رائج کرے گی اور جن جن کے گھروں سے اُس کے روابط ہوں گے وہ سب کم و بیش اِس عضوِ فاسد کے شَر سے متاثر ہوں گے۔ پھر خود شوہر بھی اُس کے اثرات سے محفوظ نہ رہے گا۔ اگر وہ اُس کی محبت میں زیادہ گرفتار ہو تو ممکن ہے کہ اپنے دِین و ایمان کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ لیکن یہ فساد اِس حد تک نہ بھی پہنچے تو اُس کا کم سے کم یہ اثر تو ضرور ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کے بہت سے ارکان کی بربادی ہوتے دیکھے گا اور اس کو گوارا کرے گا۔ سیاسی حیثیت سے بھی اِس قسم کی شادیاں خالی از مضرت نہیں۔ سازش اور جاسوسی اور سلطنتِ اِسلامی کی بیخ کنی کے لیے مسلمان گھر کی کافر بہو بہت آسانی کے ساتھ استعمال کی جاسکتی ہے اور اگر وہ زیادہ ہوشیار ہو تو اپنے شوہر کو بھی اِن اغراض کے لیے آلۂ کار بنا سکتی ہے۔ یہ سب وہ مضرتیں ہیں جو پہلے بھی ظاہر ہو چکی ہیں اور آج بھی ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے نظامِ معاشرت کو مشرکانہ رَسموں اور جاہلانہ عادتوں سے

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: مسئلہ کفاءت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کس نے آلودہ کیا؟ انھی عورتوں نے جو مذہب شرک پر قائم رہ کر یا برائے نام مسلمان ہو کر مسلمان خاندانوں میں داخل ہوئیں۔ مسلمانوں کی نسلوں کو دین و اخلاق کے اعتبار سے کس نے تباہ کیا؟ اُنھی ماؤں نے جن کے سینوں سے مسلمانوں کے بچے شرک و جاہلیت کا دودھ پی پی کر بڑے ہوئے۔ اسلامی حکومتوں کو کس چیز نے غارت کیا؟ زیادہ تر اُن کافر عورتوں کی محبت نے جو مسلمان اُمرا کے دلوں پر متصرف ہوگئی تھیں۔ آج اسلامی نظامِ معاشرت کی بنیادوں کو کونسی چیز کھوکھلا کر رہی ہے؟ ایک بڑی حد تک اُن مغربی عورتوں کی حکومت جو ہماری سوسائٹی کے خوشحال اور بااثر طبقوں پر مسلط ہوگئی ہیں۔

اِسلامی قانونِ ازدواج کی شانِ اعتدال: جب حال یہ ہے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنا بالکلیہ ممنوع ہونا چاہیے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شارع نے اس چیز کو جائز رکھا؟ اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہم کو اِس مسئلہ کے دُوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں شارع کا کمالِ حکمت اور اُس کے طریقِ تشریع کا انتہائی اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔

انسان جب کوئی قانون بناتا ہے تو عموماً وہ کسی ایک پہلو کی طرف اس قدر جھک جاتا ہے کہ دُوسرے پہلو اس کی رعایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ اجتماعی مصالح پر زیادہ زور دیتا ہے اور شخصی مصالح نظر انداز کر دیتا ہے اور کبھی شخصی مصالح کی اتنی رعایت کرتا ہے کہ اجتماعی مصالح باطل ہو جاتے ہیں۔ مگر شارعِ اسلام کی حکیمانہ شان ایسی ہے کہ وہ ہر مصلحت پر نظر رکھتا ہے اور ہر ایک کی اُتنی ہی رعایت کرتا ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، اجتماعی مصالح کا، اور ایک بڑی حد تک شخصی مصالح کا بھی اقتضا یہ تھا کہ مسلمانوں کی شادیاں مسلمان عورتوں ہی سے ہوں، اور پھر اُن میں بھی مماثلت اور اتحاد کو ملحوظ رکھا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے کفاءت کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ تَخَيَّرُوا لِنُطَفِكُمْ وَ اَنْكِحُوا الْاَكْفَآءَ [رُوِیَ ذٰلِكَ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ وَ اَنَسٍ وَ عُمَرَ مِنْ طُرُقٍ عَدِيدَةٍ] اپنے نطفوں کے لیے اچھی قرار گاہیں تلاش کرو اور اپنے جوڑ کے لوگوں میں شادیاں کرو۔

اور صاف طور پر بتا دیا گیا کہ کفاءت میں سب سے پہلے اور سب سے اہم چیز دین ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ (التوبہ ۹:۷۱) مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں (اس لیے کہ) وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، بدی سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶) اے اہلِ ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (النساء ۴:۲۵) اور تم میں سے جو کوئی پاک دامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ اُن مومن لڑکیوں میں سے اپنے لیے جوڑا منتخب کرے جو تمھاری مملوک ہیں۔ اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک دوسرے کے ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تَزَوَّجُوْهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ فَلَامَةٌ خَرْقَاءُ سَوْدَاءُ ذَاتُ دِيْنٍ اَفْضَلُ (الحديث) تم ان سے دین کی بنا پر شادیاں کرو، کیونکہ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دین دار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔

دوسری طرف بعض شخصی مصالح اِس کی بھی مقتضی تھیں کہ غیر قوموں میں نِکاح کرنے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ کر دِیا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کسی غیر مسلم عورت کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور حصولِ مقصود کا دروازہ بالکل بند پا کر حرام کی طرف جھک پڑے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں مسلمان عورت بہم نہ پہنچ سکتی ہو اور مجرّد رہنے کی وجہ سے اُس کے اخلاق بگڑنے اور اُس کی خانگی زندگی خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے مخصوص حالات کے لیے کسی حد تک رُخصت کا دروازہ کھول دینا ضروری تھا۔ چنانچہ شارع نے یہ دروازہ کھولا، مگر اِس فتحِ باب میں شخصی مصالح کی رعایت کے ساتھ یہ بات ملحوظ رکھی کہ اجتماعی مصالح کو کم سے کم نقصان پہنچے۔

مسلمہ اور غیر مسلم کے نِکاح کی حُرمت: سب سے پہلے تو یہ بات طے کر دی گئی کہ غیر مسلموں کے ساتھ شادی کرنے کی رخصت صِرف مَردوں کو دی جا سکتی ہے، عورتوں کے لیے یہ دروازہ قطعاً مسدود ہے: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ (الممتحنہ ۶۰:۱۰) نہ مسلمان عورتیں کافر مَردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ کافر مَرد مسلمان عورتوں کے لیے حلال۔

یہ اِس لیے کہ عورت کی فطرت ایک انفعالی فطرت ہے۔ اُس میں ڈھال لینے سے زیادہ ڈھل جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ مَرد کے اثرات اور اپنے ماحول کے اثرات کو زیادہ شدّت کے ساتھ قبول کرتی ہے اور خانگی زندگی میں وہ عموماً شوہر سے مغلوب ہی ہو کر رہتی ہے۔ ایک غیر مسلم مَرد سے اُس کی شادی ہونے میں کم از کم ۹۰ فی صدی خطرہ اِس بات کا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور اُس کی تہذیب سے کٹ جائے گی اور یہ خطرہ تو سو فی صدی ہے کہ اُس کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ ملّتِ کفر پر رہے گی۔ پس تمام مصالح و حِکَم اِس بات کے مقتضی تھے کہ مسلمان عورتوں کے لیے غیر مسلموں کی زوجیت قطعی طور پر حرام کر دی جائے۔ اور رخصت کا دروازہ اگر کھولا بھی جائے تو وہ صِرف مَردوں کے لیے ہو۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۳۱۶-۳۲۲)

اِس حُرمت کی علّت و مصلحت: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۠ (البقرہ ۲:۲۲۱) تم مشرک عورتوں سے ہرگز نِکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نِکاح مشرک مَردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے۔ اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔[1]

۱۔ مسلمان مَردوں اور عورتوں کے لیے تمام اُن غیر مسلموں سے ازدواجی تعلق کو ممنوع کر دیا گیا ہے جو اہلِ کتاب نہیں ہیں، (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے علّت و مصلحت اُس حکم کی جو مشرکین کے ساتھ شادی بیاہ کا تعلق نہ رکھنے کے متعلق اُوپر بیان ہوا تھا۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ایک گہرا تمدنی اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ قلبی تعلق ہو تو جہاں اِس اَمر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اَثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اُس کے خاندان اور آئندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرزِ زندگی کا نقش ثبت ہوگا وہیں اِس اَمر کا بھی امکان ہے کہ مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی بلکہ اُس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متاثر ہو جائے گی۔ اور غالب امکان اِس اَمر کا ہے کہ ایسے ازدواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایک ایسی معجون مرکب اُس گھر اور اُس خاندان میں پرورش پائے گی جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں، مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اُس کے گھر اور اُس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متاثر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے، تب بھی اُس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۶۹، البقرہ حاشیہ ۲۳۷)

اِس حکم کی بنیاد، ایک نفسیاتی حقیقت: اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہلِ کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساسِ برتری پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ مَرد بالعموم متاثر کم ہوتا ہے اور اَثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعموم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اَثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلمہ اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اِس کا امکان کم ہوتا ہے کہ وہ اِس مسلمان کو غیر مسلم بنا لے گی اور اِس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اُس کے غیر مسلمہ ہو جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنا سکے گی۔ اِسی لیے مسلمانوں کو اِس کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح غیر مسلموں سے کریں۔ البتہ اگر اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص خود اپنی بیٹی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اُس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اِس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم بیوی کی محبت میں مبتلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا۔ اور آخرت میں تم خسارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کیونکہ وہ اپنے مذہب، اپنے خیالات، اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے طور طریقوں میں مسلمانوں سے اتنے مختلف ہیں کہ ایک حقیقی مسلمان کا دلی محبت اور قلب و روح کی یکجہتی کے ساتھ اُن سے میل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑے جائیں تو اُن کا ازدواجی رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا بلکہ محض ایک شہوانی رشتہ بن جائے گا۔ اور اس میں یا تو مودّت و رحمت نہ ہوگی یا ہوگی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے اور خود اُس مسلمان کے لیے مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مضر ہو جائے گی (حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۲۴)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت ایسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے مواقع پر ہی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبولِ عام حاصل ہو، بلکہ بعض حالات میں تو اسے روکا بھی گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے سے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشو ونما نہ ہو سکے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ص۴۲۶-۴۲۷، اشاعت اوّل)

مسلم اور غیر مسلمہ کے نِکاح کے قیود

پھر مردوں کے لیے بھی یہ رُخصت عام نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو ازدواجی اغراض کے لیے دو طبقوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

ایک وہ طبقہ جو اسلام اور اُس کی تہذیب سے کوسوں دُور ہے جس کے عقائد اور اصولِ حیات اور قوانینِ اخلاق و معاشرت کسی جہت میں بھی مسلمانوں سے نہیں ملتے۔

دُوسرا وہ طبقہ جو تمام غیر مسلموں میں اسلام سے اقرب ہے، نبوّت اور وحی کو کسی نہ کسی حد تک مانتا ہے، خدا اور یوم آخر کے اعتقاد میں بھی کسی حد تک اسلام کے قریب ہے، اصولِ اخلاق اور قوانینِ معاشرت میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ابھی تک اُس کے پاس محفوظ ہیں جو منبعِ نبوّت سے نکلی ہوئی ہیں۔

ان دونوں طبقوں میں سے پہلے طبقے کے ساتھ شادی بیاہ کرنا مسلمانوں کے لیے قطعی ممنوع کر دیا گیا۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ (البقرہ ۲:۲۲۱) اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو کتنی ہی پسند ہو اور اپنی عورتوں کی شادیاں بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔ وہ آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خدا اپنے اذن سے جنّت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔

نِکاحِ کتابیہ کی اجازت[1]

رہا دُوسرا طبقہ تو اُس کی عورتوں سے شادیاں کرنے کی اجازت دے دی گئی، مگر اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ کام خطرے سے خالی نہیں ہے، تاہم یہ رُخصت صِرف اس لیے عطا کی گئی ہے کہ تم حرام کاری میں مبتلا نہ ہو۔

۱- اہلِ کتاب مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح پھر بھی ممنوع ہے، کیونکہ عورت کی فطرت میں اَثر پذیری اور قبولیت کا مادّہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اس لیے ایک غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی میں غیر مسلم شوہر کے ساتھ اُس کے رہنے سے یہ خطرہ زیادہ ہے کہ وہ اُن کا رنگ اختیار کر لے گی اور یہ توقع بہت کم ہے کہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ نیز اگر وہ اس کا اثر قبول نہ کرے تو یہ امر یقینی ہے کہ اس کا یہ رشتہ محض ایک شہوانی رشتہ بن کر رہ جائے گا۔ نہ غیر مسلم مرد سے وہ مودّت اور رحمت کے ساتھ پیوستہ رہ سکے گی اور نہ غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی کے ساتھ اُس کا کوئی مفید تمدنی رابطہ قائم ہو سکے گا۔ (حاشیہ حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص۲۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (المائدہ ۵:۵) اور حلال کی گئی ہیں تمھارے لیے اُن لوگوں کی عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، بشرطیکہ تم اُن کے مہر ادا کر کے اُنھیں قیدِ نکاح میں لاؤ، علانیہ یا چوری چھپے زنا کاری نہ کرو (اور یاد رکھو کہ) جو شخص اپنے ایمان سے پھرا اُس کا سب کیا کرایا غارت ہو جائے گا۔ اور آخرت میں وہ نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

آخری فقرہ قابلِ غور ہے۔ اِس میں صاف طور پر متنبہ کر دیا گیا ہے کہ غیر مسلم عورت سے شادی کرنے میں ایمان کا خطرہ ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اگر ایسے خطرناک کام کی اجازت دِی گئی ہے تو وہ غیر معمولی حالات وضروریات ہی کے لیے ہے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۲-۳۳۴)

نِکاحِ کتابیہ کی کراہیت

اہلِ کتاب کے معاملے میں اگرچہ قانون اِس کی اجازت دیتا ہے کہ اُن کی عورتوں سے نِکاح کر لیا جائے، کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور اُن کے درمیان اشتراک ہے۔ لیکن اس کو بھی اِسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک کتابیہ سے نِکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو منع فرما دیا اور ممانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی: اِنَّهَا لَا تُحْصِنُكَ، وہ تجھے محصن نہیں بنا سکتی[1]۔ مطلب یہ ہے کہ اِس صورت میں دونوں کے درمیان وہ مودّت ورحمت نہ ہوگی جو حِصان کی اصل رُوح ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودیہ سے نِکاح کرنا چاہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو لکھا کہ اِسے چھوڑ دو۔ حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کتابیات سے نِکاح کو بصراحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کراہیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (المجادلۃ ۵۸:۲۲) یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا جو اللہ اور اُس کے رسول کے مخالف ہوں اور جب زَوجَین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نِکاح کس کام کا؟

(حقوق الزّوجَین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۲۵-۲۶)

جو لوگ شریعتِ اِسلام کی رُوح سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُنھوں نے اِسی بنا پر اِس اجازت کو ہمیشہ رُخصت ہی کے قبیل سے سمجھا اور اس کو پسند نہ کیا کہ مسلمانوں میں کتابیات سے شادی کرنے کا عام رواج ہو۔ شریعت کے سب سے بڑے رازدان اپنے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اُنھوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو جو کچھ لکھا تھا وہ شریعت کے مقصد پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ زمانہ اسلام کے غلبے کا تھا مسلمان علاقہ شام میں فاتح اور حکمران کی حیثیت سے تھے۔ معاملہ ایک ایسے جلیل القدر مسلمان کا تھا جس نے براہِ راست شمعِ نبوّت سے نورِ ایمان کا اکتساب کیا تھا۔ اِسلامی اخلاق اور اِسلامی تہذیب میں اِس

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۵۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے بڑھ کر اور کون پختہ ہوسکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ایک کتابیہ کے ساتھ ازدواجی تعلق رکھنے سے منع کیا۔ پھر یہ نہیں فرمایا کہ کتابیہ سے شادی کرنا حرام ہے بلکہ یہ فرمایا کہ اس سے مسلمان گھروں میں اہلِ کتاب کی بداخلاق عورتوں کے گھس آنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس اجازت سے فائدہ نہ اُٹھانا ہی بہتر ہے۔

غور کیجیے کہ جب غلبے کی حالت میں نکاحِ کتابیہ کے متعلق اسلام کا یہ طرزِ عمل ہے تو ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے جب کہ ایک مسلمان کفار سے مغلوب اور مرعوب ہو اور اُن کی سوسائٹی میں گھرا ہوا ہو۔ اس وقت تو نکاحِ کتابیہ کی کراہت اور زیادہ بڑھ جانی چاہیے کیونکہ دارالکفر میں اس کی مضرتیں کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئمۂ اسلام نے عموماً نکاحِ کتابیہ کو مکروہ اور خصوصاً دارالکفر میں نہایت مکروہ قرار دیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں:

یجوز للمسلم ان یتزوج کتابیة فی دار الحرب ولکنه یکره لانه اذا تزوجها ثمه ربما یختار المقام فیهم و اذا ولدت تخلّق الولد باخلاق الکفار و فیه بعض الفتنة فیکره لهٰذا ... وسئل علیٌّ رضی الله عنه عن مناکحة اهل الحرب من اهل الکتاب فکره ذالک (المبسوط، ج۵،ص۵۰) مسلمان کے لیے دارالحرب میں کتابیہ سے شادی کرنا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے کیونکہ اگر وہ وہاں شادی کرے گا تو ممکن ہے کہ کفار ہی کے ملک میں رہ پڑے ... اور جب کتابیہ کے پیٹ سے اولاد پیدا ہو تو وہ کفار کے اخلاق پر اُٹھے۔ اس میں اور بھی فتنے ہیں۔ اس لیے یہ مکروہ ہے۔ ... حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حربی عورتوں کے ساتھ نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اُس کو مکروہ فرمایا۔

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ذمیہ اور حربیہ دونوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ نکاح کرنے والا ایسی جگہ نہ ہو جہاں اس کی اولاد کے کفر پر مجبور ہونے کا خوف ہو (تفسیر ابن جریر جزء ٦،ص ٦١)

ہدایہ میں ہے:

و یجوز تزویج الکتابیات والاولیٰ ان لا یفعل ولا یأکل ذبیحتهم الا لضرورة و تکره الکتابیة الحربیة اجماعا لانفتاح باب الفتنة من امکان التعلق المستدعی للمقام معها فی دارالحرب و تعریض الولد علی التخلق باخلاق اهل الکفر (هدایة، کتاب النکاح) کتابیات سے نکاح کرنا جائز تو ہے مگر بہتر یہی ہے کہ نہ کیا جائے اور نہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے۔ الا یہ کہ کوئی ضرورت آ پڑے۔ اور حربی کتابیہ سے نکاح کرنا تو بالاجماع مکروہ ہے کیونکہ اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت سے ایسا گہرا تعلق ہو جائے کہ مسلمان شوہر اُسی کے ساتھ کافروں کے ملک میں رہ پڑے اور یہ کہ اُس کی اولاد اہلِ کفر کے اخلاق سے متخلق ہو کر اُٹھے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کتابیہ کو حرام اور باطل ٹھیرانا تو درست نہیں ہے، البتہ قانونِ اسلامی کی رُوح اور ائمۂ اسلام کے اجماع سے اس کا مکروہ ہونا اور خصوصاً دارالکفر میں اور غلبۂ کفار کی حالت میں نہایت درجہ مکروہ و مبغوض ہونا ثابت ہے۔ اس کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ صرف نکاحِ کتابیہ ہی کے معاملے میں نہیں، بلکہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شریعت کی تمام رُخصتوں کے معاملے میں جن سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا اندیشہ پایا جاتا ہو، مسلمانوں کے اولی الامر کو امتناعی احکام جاری کرنے کا حق ہے اور اِس قسم کے امتناعی احکام جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام کیے بغیر نافذ کیے جاسکتے ہیں۔ مگر ایسے احکام جاری کرنے والوں میں اِتنا تفقہ ہونا چاہیے کہ وہ قانونِ شریعت کی شانِ اعتدال کو ضائع نہ کریں۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۲۰۰۴ء ص ۳۱۴-۳۱۹)

منکوحہ کتابیہ کے لیے آزادیِ عمل کے حدود

اہلِ کتاب کی جن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے اُن کے بارے میں قرآنِ مجید دو شرطیں لگاتا ہے، ایک یہ کہ وہ محصنات (پاک دامن) ہوں، دوسرے یہ کہ اُن سے نکاح کر کے ایک مسلمان خود اپنے ایمان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھے (ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ آیت ۵)[1]۔ ان شرائط کی رُو سے فاسق و فاجر کتابیات کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے اور یہ دیکھنا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جس عورت سے وہ شادی کر رہا ہے وہ اُس کے گھر میں، اُس کے خاندان میں اور اُس کے بچوں میں ایسے افعال رائج کرنے کی موجب نہ بنے جو اِسلام میں حرام ہیں۔ بلاشُبہ وہ اُسے مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اُس کو چرچ جانے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اُسے شادی سے پہلے ہی یہ شرط کر لینی چاہیے کہ وہ اُس کی زوجیت میں آنے کے بعد شراب، سُؤر کے گوشت اور دُوسری حرام چیزوں سے اجتناب کرے گی۔ ایسی شرط پہلے ہی طے کر لینے کا اُسے حق بھی ہے اور ایسا کرنا اُس کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دِین کے معاملے میں سخت تساہل کرنے والا آدمی ہے۔ اِس کے بعد اگر اُس کی اولاد اِن حرام افعال میں مبتلا ہو (ظاہر ہے کہ اولاد کا ماں سے متاثر نہ ہونا متوقع نہیں ہوسکتا) تو اِس ذِمہ داری میں وہ بھی شریک ہوگا۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۵۱ء، ص ۳۲۳-بحوالہ ترجمان القرآن جولائی ۱۹۵۲ء)

موجودہ دَور میں یہودی اور عیسائی عورتوں سے نِکاح

س کیا اِس زمانے کے یہودی اور عیسائی اہلِ کتاب میں شُمار ہوسکتے ہیں؟ کیا ایک مسلمان اِس زمانے کی ایک یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کرسکتا ہے؟

ج اس زمانے کے یہودیوں اور عیسائیوں میں کوئی نئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو نزولِ قرآن کے زمانے میں اُن کے اندر موجود نہ رہی ہو۔ اس وجہ سے یہ اب بھی اہلِ کتاب ہی ہیں۔ رہا اِن سے شادی کرنے کا تعلق تو اِس کے بارے میں آپ تین باتوں کو ملحوظ رکھیں۔

ایک یہ کہ قرآن میں اجازت دی گئی ہے حُکم نہیں دِیا گیا ہے۔

دُوسرے یہ کہ جن عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے اُن کے لیے ایک شرط تو یہ لگائی گئی ہے کہ وہ محصنات (یعنی باعصمت) ہوں اور دُوسری شرط یہ کہ ان سے خفیہ یا علانیہ ناجائز تعلّقات پیدا نہ کیے جائیں اور شادی کر کے اُن کی خاطر

---

[1] اس بحث کے آغاز میں نقل ہوئی ہے۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتب "

www.KitaboSunnat.com

اپنے ایمان اور اپنی آخرت کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو کام شرعاً جائز ہیں اُن پر عمل کرنے سے پہلے آدمی کو اپنے زمانے کے حالات اور ماحول پر نگاہ ڈال کر یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اِس زمانے اور اِس ماحول میں یہ کام کرنے سے کوئی قباحت تو پیدا نہیں ہوگی۔ اب آپ دیکھیے کہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں وہ اصطلاحاً (technically) تو اہلِ کتاب ضرور ہیں، لیکن ان میں بہت کم تعداد ایسی عورتوں کی ہے جو صحیح معنوں میں اہلِ کتاب ہوں۔ یعنی خدا اور رسول اور کتابوں اور آخرت پر ایمان رکھتی ہوں۔ پھر جو ایسی ہیں بھی اُن پر محصنات ہونے کا اطلاق مشکل ہی سے ہوسکتا ہے۔ اب رہا زمانے اور حالات کا معاملہ تو اُن ممالک میں رہتے ہوئے کسی یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو نہیں تو اپنی آئندہ نسل کو غیر مسلم معاشرے میں بالکل جذب ہوجانے کے خطرے میں مبتلا کر رہا ہے۔ اور اگر وہ بالفرض اُس عورت کو اپنے مسلم معاشرے میں لے بھی جائے تو اِس طرح کی عورتوں میں بمشکل ایک فی صد عورت ایسی ملے گی جو اپنے آپ کو، اپنے گھر کو اور اپنے بچوں کو اسلامی معاشرے کے آداب اور طرزِ زندگی میں ڈھال لے۔ اِس کے برعکس خود شوہر صاحب اِس کی خاطر اپنے پورے گھر کو ایک مغربی گھر کا نمونہ بنالیتے ہیں اور اُن کی میم صاحبہ صرف اپنے ہی گھر کو نہیں بلکہ شوہر کے خاندان اور رشتہ داروں کو بھی اسلامی طرزِ زندگی اور اسلامی افکار سے ہٹانے کی موجب بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جذبات سے مغلوب ہوکر محض جواز کے حیلے سے عیسائی یا یہودی عورتوں سے شادی کرلینا دینی مصلحت کے بالکل خلاف ہے۔

(خطبات یورپ، مئی ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۵--۱۱۶)

قادیانی عورت سے مسلمان کا نکاح

ایک قادیانی عورت سے ایک مسلمان مرد کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ آپ کا نکاح اگر کردیا گیا ہے تو اُس پیچیدگی کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ آپ کی بیوی قادیانیت سے توبہ کرلیں۔ بصورت دیگر علیحدگی کے سوا چارہ نہیں۔

(مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اوّل، جون ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۷)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

تبدیلیِ دین کی صورت میں احکام

اگر زوجین میں سے ایک مسلمان ہو جائے

وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْیَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (الممتحنہ ۶۰:۱۰) اُن کے کافر شوہروں نے جو مَہر اُن کو دیے تھے وہ اُنھیں پھیر دو۔ اور اُن سے نِکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ تم اُن کے مَہر اُن کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نِکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مَہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے اُنھیں وہ واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حُکم ہے۔ وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اُن کے کافر شوہروں کو اُن کے مَہر واپس کیے جائیں گے وہی اُن عورتوں کے مَہر شُمار نہ ہوں گے، بلکہ اب جو مسلمان بھی اُن میں سے کسی عورت سے نِکاح کرنا چاہے وہ اُس کا مَہر ادا کرے اور اُس سے نِکاح کر لے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۳۷، الممتحنہ حاشیہ ۱۵)

چار بڑے احکام

اِن آیات میں چار بڑے اہم حُکم بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق اِسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی۔

۱- اوّل یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جائے وہ اپنے کافر شوہر کے لیے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اُس کے لیے حلال رہتا ہے۔

۲- دوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دارالکفر سے دارالِاسلام میں ہجرت کر آئے اُس کا نِکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان بھی چاہے اُس کا مَہر دے کر اُس سے نِکاح کر سکتا ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ جو مَرد مسلمان ہو جائے اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اُس کی بیوی اگر کافر ہے تو وہ اُسے اپنے نِکاح میں روکے رکھے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۴- چوتھے یہ کہ اگر دارالکفر اور دارالاسلام کے درمیان صُلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دارالکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دارالاسلام میں ہجرت کر آئی ہوں اُن کے مہر مسلمانوں کی طرف سے واپس دے دیے جائیں اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں جو دارالکفر میں رہ گئی ہوں اُن کے مہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔

اِن احکام کا تاریخی پس منظر

اِن احکام کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ آغازِ اسلام میں بکثرت مرد ایسے تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا مگر ان کی بیویاں مسلمان نہ ہوئیں۔ اور بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو مسلمان ہو گئیں، مگر اُن کے شوہروں نے اسلام قبول نہ کیا۔ خود رسول اللہ ﷺ کی ایک صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر ابوالعاص رضی اللہ عنہ غیر مسلم تھے اور کئی سال تک غیر مسلم رہے۔ ابتدائی دَور میں ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے اُس کا کافر شوہر اور مسلمان مرد کے لیے اُس کی مشرک بیوی حلال نہیں ہے۔ اِس لیے اُن کے درمیان ازدواجی رشتے برقرار رہے۔ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک یہ صورتِ حال رہی کہ بہت سی عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر آئیں اور اُن کے کافر شوہر دارالکفر میں رہے اور بہت سے مسلمان مرد ہجرت کر کے آ گئے اور اُن کی کافر بیویاں دارالکفر میں رہ گئیں۔ مگر اِس کے باوجود اُن کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم رہا۔ اُس سے خاص طور پر عورتوں کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو رہی تھی، کیونکہ مرد تو دوسرے نکاح بھی کر سکتے تھے مگر عورتوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک سابق شوہروں سے اُن کا نکاح فسخ نہ ہو جائے وہ کسی اور شخص سے نکاح کر سکیں۔ صلح حُدَیبیہ کے بعد جب یہ آیات نازل ہوئیں تو اُنھوں نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابق کے ازدواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آیندہ کے لیے اُن کے بارے میں ایک قطعی اور واضح قانون بنا دیا۔

مسئلے کی چار صورتیں

فقہائے اسلام نے اِس قانون کو چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے:

۱- ایک وہ حالت جس میں زَوجَین دارالاسلام میں ہوں اور اُن میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

۲- دوسرے وہ حالت جس میں زَوجَین دارالکفر میں ہوں اور اُن میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

۳- تیسرے وہ حالت جس میں زَوجَین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو کر دارالاسلام میں ہجرت کر کے آ جائے اور دوسرا دارالکفر میں کافر رہے۔

۴- چوتھے وہ حالت جس میں مسلم زَوجَین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فقہا کے مسالک

ذیل میں ہم ان چاروں حالتوں کے متعلق فقہا کے مسالک الگ الگ بیان کرتے ہیں:

دارالاسلام میں شوہر کا مسلمان ہونا: [اگر تبدیلیِ مذہب کا واقعہ دارالاسلام میں پیش آیا ہو تو اس کے متعلق درج ذیل احکام ہیں:]

پہلی صورت میں اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور اُس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے تو دونوں کے درمیان نکاح باقی رہے گا، کیونکہ مسلمان مرد کے لیے اہلِ کتاب بیوی جائز ہے۔ یہ امر تمام فقہا کے درمیان متفق علیہ ہے۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والے مرد کی بیوی غیر اہلِ کتاب میں سے ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے تو حنفیہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا۔ اس صورت میں اگر زوجین کے درمیان خلوت ہو چکی ہو تو عورت مہر کی مستحق ہو گی اور خلوت نہ ہوئی ہو تو اُس کو مہر پانے کا حق نہ ہو گا۔ کیونکہ فرقت اُس کے انکار کی وجہ سے واقع ہوئی ہے (المبسوط۔ ھدایہ۔ فتح القدیر)۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اگر زوجین کے درمیان خلوت نہ ہوئی ہو تو مرد کے اسلام قبول کرتے ہی عورت اس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک اُس کے نکاح میں رہے گی۔ اس دوران میں وہ خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ تیسری بار ایام سے فارغ ہوتے ہیں آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ذمیوں کو اُن کے مذہب سے تعرض نہ کرنے کی جو ضمانت ہماری طرف سے دی گئی ہے اُس کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک کمزور بات ہے، کیونکہ ایک ذمّی عورت کے مذہب سے تعرض تو اُس صورت میں ہو گا جب کہ اُس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اُس سے صرف یہ کہنا کوئی بے جا تعرض نہیں ہے کہ تو اسلام قبول کر لے تو اپنے شوہر کے ساتھ رہ سکے گی ورنہ تجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی نظیر پیش بھی آ چکی ہے۔ عراق کے ایک مجوسی زمیندار نے اسلام قبول کیا اور اُس کی بیوی کافر رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس کے سامنے اسلام پیش فرمایا اور جب اُس نے انکار کیا تب آپؓ نے دونوں کے درمیان تفریق کرادی (المبسوط)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر خلوت نہ ہو چکی ہو تو مرد کے اسلام لاتے ہی اُس کی کافر بیوی اُس سے فوراً جدا ہو جائے گی اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا اور اُس کے انکار کی صورت میں جدائی واقع ہو جائے گی (المُغنی لابن قُدامہ)۔

عورت کا مسلمان ہونا: اور اگر اسلام عورت نے قبول کیا ہو اور مرد کافر رہے، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہو یا غیر اہلِ کتاب میں سے، تو حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں میں خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی، ہر صورت میں شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کرے تو عورت اُس کے نکاح میں رہے گی، انکار کر دے تو قاضی دونوں میں تفریق کرا دے گا۔ اس دوران میں جب تک مرد اسلام سے انکار نہ کرے عورت اُس کی بیوی تو رہے گی مگر اُس کو مقاربت کا حق نہ ہو گا۔ شوہر کے انکار کی صورت میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفریق طلاقِ بائن کے حکم میں ہوگی۔ اگر اس سے پہلے خلوت نہ ہوئی ہو تو عورت نصف مہر پانے کی حق دار ہوگی، اور خلوت ہو چکی ہو تو عورت پورا مہر بھی پائے گی اور عدت کا نفقہ بھی (المبسوط۔ هدایه۔ فتح القدیر)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خلوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کے اسلام قبول کرتے ہی نکاح فسخ ہو جائے گا اور خلوت ہونے کی صورت میں عدت ختم ہونے تک عورت اُس مرد کے نکاح میں رہے گی۔ اس مدت کے اندر وہ اسلام قبول کرلے تو نکاح باقی رہے گا ورنہ عدت گزرتے ہی جدائی واقع ہو جائے گی۔ لیکن مرد کے معاملہ میں بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے وہی رائے ظاہر کی ہے جو عورت کے معاملہ میں اوپر منقول ہوئی کہ اُس کے سامنے اسلام پیش کرنا جائز نہیں، اور یہ مسلک بہت کمزور ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ عورت نے اسلام قبول کرلیا اور مرد سے اسلام لانے کے لیے کہا گیا اور جب اُس نے انکار کر دیا تو دونوں کے درمیان تفریق کرادی گئی۔ مثلاً بنی تَغلِب کے ایک عیسائی کی بیوی کا معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا۔ اُنھوں نے مرد سے کہا یا تو تو اسلام قبول کرلے ورنہ میں تم دونوں کے درمیان تفریق کردوں گا۔ اُس نے انکار کیا اور آپ نے تفریق کی ڈگری دے دی۔ بَہرُ المَلِک کی ایک نو مسلم زمیندارنی کا مقدمہ اُن کے پاس بھیجا گیا۔ اُس کے معاملہ میں بھی اُنھوں نے حکم دیا کہ اُس کے شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ دونوں میں تفریق کرادی جائے۔ یہ واقعات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے پیش آئے تھے اور کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص، المبسوط۔ فتح القدیر)۔ امام مالکؒ کی رائے اس معاملے میں یہ ہے کہ اگر خلوت سے پہلے عورت مسلمان ہو جائے تو شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ فوراً تفریق کرادی جائے۔ اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور اُس کے بعد عورت اسلام لائی ہو تو زمانۂ عدت ختم ہونے تک انتظار کیا جائے، اس مدت میں شوہر اسلام قبول کرلے تو نکاح باقی رہے گا۔ ورنہ عدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام احمدؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کی تائید میں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہو جانا بہرحال فوری تفریق کا موجب ہے، خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو (المغنی)۔

دارالکفر میں ہجرت کے بغیر صرف مسلمان ہونا: دارالکفر میں اگر عورت مسلمان ہو جائے اور مرد کافر رہے یا مرد مسلمان ہو جائے اور اُس کی بیوی (جو عیسائی یا یہودی نہ ہو بلکہ کسی غیر کتابی مذہب کی ہو) اپنے مذہب پر قائم رہے تو حنفیہ کے نزدیک خواہ اُن کے درمیان خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، تفریق واقع نہ ہوگی جب تک عورت کو تین مرتبہ ایامِ ماہواری نہ آجائیں، یا اُس کے غیر حائضہ ہونے کی صورت میں تین مہینے نہ گزر جائیں۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق بھی مسلمان ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ مدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس معاملے میں بھی خلوت اور عدمِ خلوت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو زوجین کے درمیان دین کا اختلاف واقع ہوتے ہی فرقت ہو جائے گی۔ اور اگر خلوت ہو جانے کے بعد دین کا اختلاف رونما ہوا ہو تو عدت کی مدت ختم ہونے تک اُن کا نکاح باقی رہے گا۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق اسلام قبول نہ کرے تو عدت ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح بھی ختم ہو جائے گا (المبسوط۔ فتح القدیر۔ احکام القرآن للجصاص)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسلمان ہونے کے ساتھ ہجرت کرنا: جس صورت میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین کے ساتھ اختلافِ دار بھی واقع ہو جائے، یعنی اُن میں سے کوئی دار الکفر میں رہے اور دُوسرا دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائے، اس کے متعلق حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان نکاح کا تعلق آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ اگر ہجرت کرنے والی عورت ہو تو اُسے فوراً دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہے، اُس پر کوئی عدت نہیں ہے، البتہ مقاربت کے لیے اُس کے شوہر کو استبراءِ رحم کی خاطر ایک مرتبہ ایامِ ماہواری آ جانے تک انتظار کرنا ہوگا اور اگر وہ حاملہ ہو تب بھی نکاح ہو سکتا ہے مگر مقاربت کے لیے وضعِ حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے صرف اتنا اختلاف کیا ہے کہ اُن کے نزدیک عورت پر عدت لازم ہے اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے اُس کا نکاح نہیں ہو سکتا (المبسوط. هدایه. احکام القرآن للجصاص)۔ امام شافعی امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اختلافِ دار کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اصل چیز صرف اختلافِ دین ہے۔ یہ اختلاف اگر زوجین میں واقع ہو جائے تو احکام وہی ہیں جو دارالاسلام میں زوجین کے درمیان یہ اختلاف واقع ہونے کے احکام ہیں (المُغنی)۔ امام شافعی رحمہ اللہ اپنی مذکورہ بالا رائے کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کے معاملے میں یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کافر شوہر سے لڑ کر اس کے حقِ زوجیت کو ساقط کرنے کے ارادے سے آئی ہو تو اختلافِ دار کی بنا پر نہیں، بلکہ اُس کے اِس قصد کی بنا پر فوراً فُرقت واقع ہو جائے گی (المبسوط۔هدایه)۔

اِس صورت میں نکاح کا حکم: قرآنِ مجید کی زیرِ بحث آیت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں صحیح ترین رائے وہی ہے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ظاہر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہجرت کر کے آنے والی مومن عورتوں ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے اور اُنھی کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے اُن کافر شوہروں کے لیے حلال نہیں رہیں جنھیں وہ دار الکفر میں چھوڑ آئی ہیں اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اُن کے مہر ادا کر کے اُن سے نکاح کر لیں۔ دوسری طرف مہاجر مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اپنی اُن کافر بیویوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو جو دار الکفر میں رہ گئی ہیں اور کفار سے اپنے وہ مہر واپس مانگ لو جو تم نے اُن عورتوں کو دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اختلافِ دین ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ ان احکام کو جس چیز نے یہ خاص شکل دے دی ہے وہ اختلافِ دار ہے۔ اگر ہجرت کی بنا پر مسلمان عورتوں کے نکاح اُن کے کافر شوہروں سے ٹوٹ نہ گئے ہوتے تو مسلمانوں کو اُن سے نکاح کر لینے کی اجازت کیسے دی جا سکتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ اس اجازت میں عدت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ اِسی طرح اگر لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ کا حکم آ جانے کے بعد بھی مسلمان مہاجرین کی کافر بیویاں اُن کے نکاح میں باقی رہ گئی ہوتیں تو ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا کہ اُنھیں طلاق دے دو۔ مگر یہاں اُس کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں۔

بعض کا اپنی کافر بیویوں کو طلاق دینا: بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اِس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور بعض دُوسرے مہاجرین نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی، مگر یہ اِس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اُن کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا اور اُن بیویوں کے ساتھ تعلقِ زوجیت کا انقطاع اُن کے طلاق دینے پر موقوف تھا، اور اگر وہ طلاق نہ دیتے تو وہ بیویاں اُن کے نِکاح میں باقی رہ جاتیں۔

نِکاح نہ ٹوٹنے کے حق میں چند دلائل: اِس کے جواب میں عہدِ نبوی کے تین واقعات کی نظیریں پیش کی جاتی ہیں جن کو اِس اَمر کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے کہ اِن آیات کے نزول کے بعد بھی نبی ﷺ نے اختلافِ دار کے باوجود مومن اور کافر زَوجین کے درمیان نِکاح کا تعلق برقرار رکھا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ فتحِ مکہ سے ذرا پہلے ابوسُفیان مرّالظَّہران (وادی فاطمہ) کے مقام پر لشکرِ اِسلام میں آئے اور یہاں اُنھوں نے اِسلام قبول کر لیا اور اُن کی بیوی ہند مکہ میں کافر رہیں۔ پھر فتحِ مکہ کے بعد ہند نے اِسلام قبول کیا اور نبی ﷺ نے تجدیدِ نِکاح کے بغیر ہی اُن کو سابق نِکاح پر برقرار رکھا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد عِکرِمہ بن ابی جہل اور حکیم بن حزام مکہ سے فرار ہو گئے اور اُن کے پیچھے دونوں کی بیویاں مسلمان ہو گئیں۔ پھر اُنھوں نے حضور ﷺ سے اپنے شوہروں کے لیے امان لے لی اور جا کر اُن کو لے آئیں۔ دونوں اصحاب نے حاضر ہو کر اِسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ نے اُن کے بھی سابق نِکاحوں کو برقرار رکھا۔ تیسرا واقعہ حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ہے جو ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئی تھیں اور اُن کے شوہر ابوالعاص بحالتِ کفر مکہ ہی میں مقیم رِہ گئے تھے۔ اُن کے متعلق مُسندِ احمد، ابو داؤد، تِرمِذی اور ابن ماجہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ وہ ۸ ھ میں مدینہ آ کر مسلمان ہوئے اور حضور ﷺ نے تجدیدِ نِکاح کے بغیر سابق نِکاح ہی پر صاحبزادی کو اُن کی زَوجیت میں رہنے دِیا۔

اِن دلائل کا جواب: لیکن اِن میں سے پہلے دو واقعے تو درحقیقت اختلافِ دار کی تعریف ہی میں نہیں آتے، کیونکہ اختلافِ دار اِس چیز کا نام نہیں ہے کہ ایک شخص عارضی طور پر ایک دار سے دُوسرے دار کی طرف چلا گیا یا فرار ہو گیا۔ بلکہ یہ اختلاف صرف اُس صورت میں واقع ہوتا ہے جب کوئی آدمی ایک دار سے منتقل ہو کر دُوسرے دار میں آباد ہو جائے اور اُس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق 'قومیت' (natiionality) کا فرق واقع ہو جائے۔ رہا سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو اُس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی ہے جس کا حوالہ اُوپر دِیا گیا ہے اور دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ہے، جس کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اِس دُوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے صاحبزادی کو جدید نِکاح اور جدید مُہر کے ساتھ پھر ابوالعاص رضی اللہ عنہ ہی کی زوجیت میں دے دیا۔ اِس اختلافِ روایت کی صورت میں اوّل تو یہ نظیر اُن حضرات کے لیے قطعی دلیل نہیں رہتی جو اختلافِ دار کی قانونی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔ دوسرے اگر وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی کی روایت کے صحیح ہونے پر اصرار کریں تو یہ اُن کے مسلک کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ اُن کے مسلک کی رُو سے تو جن میاں بیوی کے درمیان اختلافِ دِین واقع ہو گیا ہو اور وہ باہم خلوت کر چکے ہوں اُن کا نِکاح عورت کو صرف تین ایامِ ماہواری آنے تک باقی رہتا ہے۔ اِس دوران میں دوسرا فریق اِسلام قبول کر لے تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زوجیت قائم رہتی ہے، ورنہ تیسری بار ایامِ ماہواری آتے ہی نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے جس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں اس میں زوجین کے درمیان اختلافِ دین واقع ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہجرت کے چھ سال بعد ابو العاص رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے اور اُن کے ایمان لانے سے کم از کم دو سال پہلے قرآن میں وہ حُکم نازل ہو چکا تھا جس کی رُو سے مسلمان عورت مشرکین پر حرام کر دی گئی تھی۔

ارتداد کی صورت میں احکام: چوتھا مسئلہ ارتداد کا ہے۔ اِس کی ایک صورت یہ ہے کہ زوجین ایک ساتھ مُرتد ہو جائیں اور دُوسری صورت یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک مُرتد ہو اور دوسرا مسلمان رہے۔

اگر دونوں ایک ساتھ مُرتد ہوں: اگر زوجین ایک ساتھ مُرتد ہو جائیں تو شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ خلوت سے پہلے ایسا ہو تو فوراً اور خلوت کے بعد ہو تو عدّت کی مدّت ختم ہوتے ہی دونوں کا وہ نکاح ختم ہو جائے گا جو حالتِ اسلام میں ہوا تھا۔ اِس کے برعکس حنفیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قیاس یہی کہتا ہے کہ اُن کا نکاح فسخ ہو جائے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو فتنۂ ارتداد برپا ہوا تھا اُس میں ہزارہا آدمی مُرتد ہوئے، پھر مسلمان ہو گئے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کسی کو بھی تجدیدِ نکاح کا حُکم نہیں دیا۔ اِس لیے ہم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متفقہ فیصلے کو قبول کرتے ہوئے خلافِ قیاس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زوجین کے ایک ساتھ مُرتد ہونے کی صورت میں اُن کے نکاح نہیں ٹوٹتے (المبسوط۔ هدایه۔ فتح القدیر۔ الفقه علی المذاهب الاربعه)۔

اگر شوہر مُرتد ہو جائے: اگر شوہر مُرتد ہو جائے اور عورت مسلمان رہے تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا، خواہ اُن کے درمیان پہلے خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ لیکن شافعیہ اور حنابلہ اس میں خلوت سے پہلے اور خلوت کے بعد کی حالت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اگر خلوت سے پہلے ایسا ہوا ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا اور خلوت کے بعد ہوا ہو تو زمانۂ عدت تک باقی رہے گا۔ اِس دوران میں وہ شخص مسلمان ہو جائے تو زوجیت برقرار رہے گی، ورنہ عدت ختم ہوتے ہی اُس کے ارتداد کے وقت سے نکاح فسخ شُدہ شُمار کیا جائے گا۔ یعنی عورت کو پھر کوئی نئی عدت گزارنی نہ ہوگی، چاروں فقہا کا اِس پر اتفاق ہے کہ خلوت سے پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہو تو عورت کو نصف مَہر اور خلوت کے بعد پیش آیا ہو تو پورا مَہر پانے کا حق ہوگا۔

اگر عورت مُرتد ہو جائے: اور اگر عورت مُرتد ہو گئی ہو تو حنفیہ کا قدیم فتویٰ یہ تھا کہ اس صورت میں بھی نکاح فوراً فسخ ہو جائے گا، لیکن بعد کے دَور میں علمائے بلخ و سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مُرتد ہونے سے فوراً فُرقت واقع نہیں ہوتی اور اِس سے اِن کا مقصد اِس اَمر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔ مالکیہ کا فتویٰ بھی اِس سے مِلتا جُلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرائن یہ بتا رہے ہوں کہ عورت نے محض شوہر سے علیحدگی حاصل کرنے کے لیے بطورِ حیلہ ارتداد اختیار کیا ہے تو فُرقت واقع نہ ہوگی۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عورت کے ارتداد کی صورت میں قانون وہی ہے جو مَرد کے ارتداد کی صورت میں ہے، یعنی خلوت سے پہلے مُرتد ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا اور خلوت کے بعد ہو تو زمانۂ عدت گزرنے تک نکاح باقی رہے گا۔ اِس دوران میں وہ مسلمان ہو جائے تو زوجیت کا رِشتہ برقرار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رہے گا ورنہ عدّت گزرتے ہی نکاح وقتِ ارتداد سے فسخ شمار ہوگا۔ مہر کے بارے میں یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ خلوت سے پہلے اگر عورت مُرتد ہوئی ہے تو اُسے کوئی مہر نہ ملے گا اور اگر خلوت کے بعد اُس نے ارتداد اختیار کیا ہو تو وہ پورا مہر پائے گی (المبسوط۔ ہدایہ۔ فتح القدیر۔ المُغنی۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۴۳-۴۴۴، الممتحنہ حاشیہ ۱۶)

نومسلم شادی شُدہ عورت غیر مسلم معاشرے میں: اِسلام میں یہ صاف حُکم ہے کہ ایک مسلمان عورت کسی غیر مسلم کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ لیکن کفار کے مُلک میں، جہاں کفار کی اپنی حُکومت ہے اور مسلمان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں، اگر کوئی شادی شُدہ عورت مسلمان ہو جائے اور اُس کا شوہر کافر رہے تو قانون اُس کی مدد نہیں کر سکتا، نہ قانون کی مدد کے بغیر وہ عورت اُس مَرد سے پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ ایسی حالت میں اِس عورت کا معاملہ اُن مسلمان عورتوں کے معاملے سے مشابہ ہوگا جو ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں مسلمان ہو گئی تھیں اور اُن کے شوہر مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اِن بیچاریوں کو اُس وقت تک اپنے کافر شوہروں ہی کے پاس رہنا پڑا جب تک اللہ تعالیٰ نے، اُن کے لیے خلاصی کی راہ پیدا نہ فرما دی۔ اِس کیفیت کو اگرچہ جائز نہیں کہا جا سکتا، لیکن جب تک مجبوری کی حالت باقی رہے اُسے گوارا کرنے کے سِوا چارہ نہیں ہے۔ البتہ عورت کو حتیٰ الامکان اپنے شوہر کی ہر اُس مرحلے میں مزاحمت کرنی چاہیے جہاں اُس کے مطالبات شریعت کے احکام سے ٹکراتے ہوں مثلاً:

۱- اُسے اپنا لباس تبدیل کر کے گردن سے ٹخنوں تک اور ہاتھ کی کلائیوں تک پورا جسم ڈھانکنا چاہیے۔

۲- ڈانس میں جانے اور غیروں کے ساتھ ناچنے سے انکار کر دینا چاہیے۔ البتہ اگر اپنے گھر میں تنہائی کی حالت میں شوہر اُس کے ساتھ ناچنا چاہے تو اُسے قبول کر لینا چاہیے۔

۳- سؤر کا گوشت اگر شوہر کھائے تو اُسے برداشت کرنا چاہیے، لیکن اپنا کھانا پینا اور کھانے کے برتن اُس سے الگ کر لینے چاہییں۔

۴- بچوں کو اگر شوہر گرجا لے جائے تو اُسے روکنا نہیں چاہیے، لیکن جب بھی موقع ملے بچوں کے ذہن میں اِسلامی عقائد اور خیالات بٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۵- اپنے طرزِ عمل سے شوہر کو محسوس کرانا چاہیے کہ دونوں کے درمیان کفر و اِسلام کا فرق واضح ہو جانے کے بعد پہلی سی محبت باقی نہ رہی ہے اور یہ محبت صِرف اُسی صورت میں عَود کر سکتی ہے جب کہ شوہر بھی اِسلام قبول کر لے۔

اِن باتوں کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ شوہر بھی سنجیدگی کے ساتھ اِسلام کے بارے میں سوچنا شروع کر دے گا اور آپ کو اُس کی اصلاح وہدایت کا موقع مِل جائے گا یا پھر وہ اُس سے بیزار ہو کر خود علیحدگی کے لیے تیار ہو جائے گا اور یہ علیحدگی کسی بہتر سمجھوتے کے ساتھ ہو سکے گی۔ دُوسری صورت پیش آنے پر عورت کو مہر کے ساتھ اُسے قبول کر لینا چاہیے اور اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے کہ وہ اُسے کوئی اچھا مسلمان شوہر دلوا دے گا۔

(مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، اوّل، جون ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۴-۱۲۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت ومناکحت: جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔ رہا اُن مہاجرین کا معاملہ جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہیں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں تو اُن کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں اپنی میراث پا سکتے ہیں اور نہ اُن کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں اُن سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں۔ نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو نہیں ٹوٹ سکتا، لیکن اگر زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہے اور دُوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جا سکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیے۔[1]

(رسائل و مسائل، دوم، مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۰-۱۵۷، بحوالہ ترجمان القرآن، شعبان ۱۳۷۰ھ، جون ۱۹۵۱ء)

............OOO............

۱- اس مسئلے پر مولانا ظفر احمد عثمانی سے خط وکتابت رسائل و مسائل، دوم ص ۱۵۲-۱۸۴ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہشتم

نِکاحِ مُتعہ

(کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر خاص مدّت کے لیے نِکاح کرنا)

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النسآء ۴:۲۴) پھر جو ازدواجی زندگی کا لُطف تم اُن سے اٹھاؤ اُس کے بدلے اُن کے مہر بطور فرض کے ادا کرو۔

تاریخی پس منظر

اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں نِکاح کے جو طریقے رائج تھے، اُن میں سے ایک 'نِکاحِ متعہ' بھی تھا۔ یعنی یہ کہ کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر ایک خاص مدت کے لیے اُسے نِکاح کرلیا جائے۔ نبی ﷺ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کسی چیز کی نہی کا حُکم نہ مِل جاتا تھا، آپ پہلے سے رائج شدہ طریقوں کو منسوخ نہ فرماتے تھے۔ بلکہ یا تو اُن کے رواج پر سکوت فرماتے یا بوقتِ ضرورت اُن کی اجازت بھی دے دیتے۔ چنانچہ یہی صورت متعہ کے بارے میں بھی پیش آئی۔ ابتدا آپؐ نے اُس کے رواج پر سکوت فرمایا۔ اور بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقع پر اگر لوگوں نے اپنی شہوانی ضرورت کی شدت ظاہر کی تو آپؐ نے اُس کی اجازت بھی دے دی، کیونکہ حُکمِ نہی اُس وقت تک نہ آیا تھا۔ پھر جب حُکمِ نہی آ گیا تو آپؐ نے اُس کی قطعی ممانعت فرمادی۔ لیکن یہ حُکم تمام لوگوں تک نہ پہنچ سکا اور اُس کے بعد بھی کچھ لوگ ناواقفیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے۔ آخر کار حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس حُکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوّت کے ساتھ اس رواج کو بند کیا

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۴۲)

یہ اَمر ملحوظِ خاطر رہے کہ دُوسری صدی ہجری کے آغاز تک متعہ کا مسئلہ مختلف فیہ تھا اور اختلاف صرف اَمر میں تھا کہ آیا یہ قطعی حرام ہے، یا اس کی حُرمت مُردار اور خنزیر کی سی ہے جو اضطرار کی حالت میں جواز سے بدل سکتی ہو۔ اکثریت پہلی بات کی قائل تھی اور ایک چھوٹی سی اقلیت دُوسری بات کی۔ بعد میں اہلِ سُنّت کے تمام اہلِ علم اس پر متفق ہو گئے کہ یہ قطعی حرام ہے اور جواز بحالت اضطرار کا مسلک رَد کر دیا گیا۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات نے اس کے مطلق حلال ہونے کا عقیدہ اختیار کیا اور اضطرار کیا معنی ضرورت تک کی شرط باقی نہ رہنے دی۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۵۳)

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

حُرمت کے دلائل

بعض مفسّرین نے متعہ کی حُرمت (سورۂ مومنون کی آیت فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ[1]) سے ثابت کی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی کے حُکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حُکم میں۔ لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں اُن میں سے کسی کا بھی اِس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ وہ مَرد کی وارث ہوتی ہے اور نہ مَرد اُس کا وارث ہوتا ہے۔ نہ اُس کے لیے عدّت ہے، نہ طلاق، نہ نفقہ، نہ ایلا اور ظہار اور لعان وغیرہ۔ بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی وہ مستثنیٰ ہے۔ پس جب وہ 'بیوی' اور 'لونڈی' دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ''اِن کے علاوہ کچھ اور'' میں شُمار ہوگی جس کے طالب کو قرآن ''حد سے گزرنے والا'' قرار دیتا ہے۔ یہ استدلال بہت قوی ہے، مگر اِس میں کمزوری کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی بنا پر یہ کہنا مشکل ہے کہ متعہ کی حُرمت کے بارے میں یہ آیت ناطق ہے۔

وہ پہلو یہ ہے کہ نبی ﷺ نے متعہ کی حُرمت کا آخری اور قطعی حُکم فتح مکہ کے سال دیا ہے اور اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حرمتِ متعہ کا حُکم قرآن کی اِس آیت ہی میں آ چکا تھا جو بالاتفاق مکی ہے اور ہجرت سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی تو کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ اُسے فتح مکہ تک جائز رکھتے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ متعہ کی حُرمت قرآنِ مجید کے کسی صریح حُکم پر نہیں بلکہ نبی ﷺ کی سنت پر مبنی ہے۔ سُنت میں اس کی صراحت نہ ہوتی تو محض اِس آیت کی بنا پر تحریم کا فیصلہ کر دینا مشکل تھا۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۶٦، المومنون حاشیہ ۷)

متعہ سے متعلق روایات

اِس مسئلے میں فقہا کے سامنے متعدد سوالات تحقیق طلب تھے۔ مثلاً یہ کہ آیا حضور ﷺ نے کبھی اِس کی صریح اجازت بھی دی تھی؟ اور اگر دی تھی تو کس موقع پر؟ اور یہ کہ آپؐ نے اُسے منع فرمایا ہے یا نہیں؟ اور منع فرمایا ہے تو کب اور کن الفاظ میں؟ اور یہ کہ آیا اس کی تحریم حضور ﷺ کا اپنا فعل ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ذِمّہ داری پر اُس رواج کو بند کیا؟ یہ اور اِس طرح کے متعدد دُوسرے سوالات تھے جن کی تحقیق کے لیے فقہا اور محدثین کو وہ تمام روایات جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی جو اس مسئلے سے متعلق مختلف لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ اِسی سلسلے میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے وہ دونوں روایات بھی نقل کیں جن کو معترضین نے اعتراض کے لیے چھانٹا ہے۔

مُسلم میں مروی روایات

ان میں سے ایک حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ اور حضرت

---

[1] شیعہ حضرات اسی آیت کو مروّجہ متعہ کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ [مرتب]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں متعہ کرتے تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کی ممانعت کر دی۔ دُوسری حدیث سبرة الجہنی کی ہے جو بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ میں نے خود ایک چادر کے عوض ایک عورت سے متعہ کیا، مگر بعد میں اسی غزوے کے زمانے میں آپؐ نے اعلان فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے متعے کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث مسلم اور دوسرے محدثین نے جمع کی ہیں جو اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اگر محدثین یہ مواد جمع نہ کرتے تو اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے آخر کس بنیاد پر متعے کے جواز وعدمِ جواز کا فیصلہ کرتے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۳)

دو باتوں کی توضیح

مسئلے کا جب ذِکر آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی اور توضیح کر دی جائے۔ اوّل یہ کہ اس کی حُرمت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اُسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرام کیا ہے درست نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حُکم کے موجد نہیں تھے بلکہ صرف اُسے شائع اور نافذ کرنے والے تھے، چونکہ یہ حُکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر زمانے میں دیا تھا اور عام لوگوں تک نہ پہنچا تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی عام اشاعت کی اور بذریعہ قانون اسے نافذ کیا۔ دوم یہ کہ شیعہ حضرات نے متعہ کو مطلقاً مباح ٹھیرانے کا جو مسلک اختیار کیا ہے اُس کے لیے تو بہر حال نصوصِ کتاب وسنّت میں سرے سے گنجایش ہی نہیں ہے۔

حالت اضطرار میں جواز کے قائلین

صدرِ اوّل میں صحابہ اور تابعین اور فقہا میں سے چند بزرگ جو اس کے جواز کے قائل تھے وہ اِسے صِرف اضطرار اور شدید ضرورت کی حالت میں جائز رکھتے تھے۔ اُن میں سے کوئی بھی اسے نِکاح کی طرح مباحِ مطلق اور عام حالات میں معمول بہ بنا لینے کا قائل نہ تھا۔

ابنِ عباسؓ کا مسلک اور اُس کی توضیح

ابن عباس رضی اللہ عنہ جن کا نام قائلینِ جواز میں سب سے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے، اپنے مسلک کی توضیح خود اِن الفاظ میں کرتے ہیں کہ ماھی اِلّا کالمیتة لا تحل الا للمضطر (یہ تو مُردار کی طرح ہے کہ مضطر کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں)۔ اور فتوے سے بھی وہ اُس وقت باز آ گئے تھے جب اُنھوں نے دیکھا کہ لوگ اباحت کی گنجایش سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر آزادانہ متعہ کرنے لگے ہیں اور ضرورت تک اُسے موقوف نہیں رکھتے۔ اِس سوال کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اُن کے ہم خیال چند گِنے چُنے اصحاب نے اِس مسلک سے رُجوع کر لیا تھا یا نہیں، تو اُن کے مسلک کو اختیار کرنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والا زیادہ سے زیادہ جواز بحالتِ اضطرار کی حد تک جا سکتا ہے۔ مطلق اباحت اور بلاضرورت تمتع حتیٰ کہ منکوحہ بیویوں تک کی موجودگی میں بھی ممتوعات سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوقِ سلیم بھی گوارا نہیں کرتا کجا کہ اسے شریعت محمدیہ کی طرف منسوب کیا جائے اور ائمۂ اہلِ بیت کو اس سے متہم کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ خود شیعہ حضرات میں سے بھی کوئی شریف آدمی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اُس کی بیٹی یا بہن کے لیے نکاح کے بجائے متعہ کا پیغام دے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جوازِ متعہ کے لیے معاشرے میں زنانِ بازاری کی طرح عورتوں کا ایک ایسا ادنیٰ طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے تمتع کرنے کا دروازہ کھلا رہے۔ یا پھر یہ کہ متعہ صرف غریب لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ہو اور اس سے فائدہ اُٹھانا خوشحال طبقے کے مردوں کا حق ہو۔ کیا خدا اور رسول کی شریعت سے اس طرح کے غیر منصفانہ قوانین کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کیا خدا اور اُس کے رسول سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایسے فعل کو مباح کر دیں گے، جسے ہر شریف عورت اپنے لیے بے عزتی بھی سمجھے اور بے حیائی بھی؟

(تفہیم القرآن، سوم، ص۲۶۶-۲۶۷، المؤمنون حاشیہ ۷)

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

www.kitabosunnat.com

جناب نے سورۂ مومنون کی تفسیر کرتے ہوئے متعہ کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر چند صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ سب حضرات اضطراری صورت میں متعہ کے قائل تھے، مگر تقریباً اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حلّتِ متعہ سے رُجوع کر لیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا رُجوع آپ کی نظر سے کیوں مخفی رہا۔ اِس میں شک نہیں کہ آپ نے بھی متعہ کو حرام مانا ہے لیکن اضطرار کی ایک فرضی اور خیالی صورت تحریر فرما کر اسے جائز ٹھیرا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی رائے پر نظرِ ثانی کریں گے۔ یہ اہلِ سنّت کا متفقہ مسئلہ ہے۔

اس مسئلے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس کا مدعا دراصل یہ بتانا ہے کہ صحابہ و تابعین اور فقہا میں سے جو چند بزرگ جوازِ متعہ کے قائل ہوئے ہیں اُن کا منشا اس فعل کا مطلق جواز نہ تھا، بلکہ وہ اسے حرام سمجھتے ہوئے بحالتِ اضطرار جائز رکھتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا کہ عام حالات میں متعہ کو نکاح کی طرح معمول بنایا جائے۔ اضطرار کی ایک فرضی مثال جو میں نے دی ہے اُس سے محض اضطراری حالات کا ایک تصور دلانا مقصود تھا تاکہ ایک شخص یہ سمجھ سکے کہ شیعہ حضرات کو اگر قائلینِ جواز کا مسلک ہی اختیار کرنا ہے تو اُنہیں کس قسم کی مجبوریوں تک اُسے محدود رکھنا چاہیے۔ اِس سے میں تو دراصل اُن لوگوں کے خیال کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، جنھوں نے اضطرار کی شرط اُڑا کر متعہ کو مطلقاً حلال ٹھیرا دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے طرزِ بیان نے آپ کی طرح بعض اصحاب کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ میں خود حالتِ اضطرار میں اس کو جائز قرار دے رہا ہوں، حالانکہ میں اس کی قطعی حُرمت کا قائل ہوں اور اب سے کئی سال پہلے رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۰-۲۳ میں اِس کی تصریح کر چکا ہوں۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں کہ نظرِ ثانی کے موقع پر اس عبارت میں ایسی اصلاح کر دی جائے گی کہ اس طرح کی کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے......

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس بحث میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ متعہ کی حُرمت تو بہر حال ثابت ہے اور مطلق حِلّت کا خیال کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ سلف کے ایک گروہ کی رائے میں اس کے جواز کی گنجایش اضطرار کی حالت کے لیے تھی۔ لہٰذا متعہ کے قائلین اگر اُنھی کی رائے کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو اُنھیں کم از کم اس حد سے تو تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

آپ نے متعہ کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے رجوع کا جو ذکر کیا ہے اس کے متعلق گزارش ہے کہ اہلِ علم کے دو اقوال میرے سامنے موجود ہیں جن میں اُن کے رجوع کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دعویٰ مختلف فیہ ہے۔ اس باب میں جو روایات نقل کی گئی ہیں اُن سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کی غلطی مان لی تھی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف مصلحتاً اس کے حق میں فتویٰ دینے سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر ابن بطال کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ۔ روی اهل مكة واليمن عن ابن عباس اباحة المتعة و روى عنه الرجوع باسانيد ضعيفة، و اجازة المتعة عنه أصح ،اہل مکہ و یمن نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعہ کی اباحت نقل کی ہے۔ اگرچہ اس قول سے اُن کے رجوع کی روایات بھی آئی ہیں۔ مگر اُن کی سندیں ضعیف ہیں اور زیادہ صحیح روایات یہ ہیں کہ وہ اس کو جائز رکھتے تھے۔ آگے چل کر خود ابن حجر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کا رجوع مختلف فیہ ہے (فتح الباری، ج ۹ ص ۱۳۸)۔

علامہ ابن قیم اس معاملے میں اپنی تحقیق جس طرح بیان کرتے ہیں اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصلحتاً فتویٰ دینے سے اُن کے اجتناب ہی کو اُن کا رجوع سمجھ لیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں:

فلما توسع فيها من توسع و لم يقف عند الضرورة امسك ابن عباس عن الافتاء بحلها و رجع عنه، جب لوگ اس معاملے میں توسع برتنے لگے اور ضرورت تک اُنھوں نے اِسے محدود نہ رکھا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی حِلّت کا فتویٰ دینے سے رُک گئے اور اس سے رجوع کر لیا (زاد المعاد، دوم، ص ۳۰)۔

(رسائل و مسائل ،سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۵۱-۵۴، بحوالہ ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۱۳۷۵ھ، نومبر ۱۹۵۵ء)

............ooo............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل نہم

حُرمتِ زنا وفواحش

حُرمتِ زنا

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۲) زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے۔

’زنا کے قریب نہ پھٹکو‘ اِس حُکم کے مخاطب افراد بھی ہیں اور معاشرہ بحیثیت مجموعی بھی۔ افراد کے لیے اِس حُکم کے معنی یہ ہیں کہ وہ محض فعلِ زنا ہی سے بچنے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ زنا کے مقدِمات اور اُس کے اُن ابتدائی محرّکات سے بھی دور رہیں جو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ رہا معاشرہ، تو اِس حُکم کی رُو سے اُس کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں زنا اور محرّکاتِ زنا اور اسبابِ زنا کا سدِ باب کرے اور اس غرض کے لیے قانون سے، تعلیم و تربیت سے، اجتماعی ماحول کی اصلاح سے، معاشرتی زندگی کی مناسب تشکیل سے، اور دوسری تمام مؤثر تدابیر سے کام لے۔

یہ دفعہ آخر کار اِسلامی نظامِ زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔ اِس کے منشا کے مطابق زنا اور تہمتِ زنا کو فوجداری جُرم قرار دیا گیا۔ پردے کے احکام جاری کیے گئے، فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا، شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر (جو زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بندشیں لگائی گئیں اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نِکاح آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۱۳ - ۶۱۴، بنی اسرائیل حاشیہ ۳۲)

حُرمتِ فواحش

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۳۳) اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام، خواہ کھُلے ہوں یا چھپے ...... اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اُسی نے فرمائی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اصل میں لفظ 'فواحش' استعمال ہوا ہے، جس کا اطلاق اُن تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی بُرائی بالکل واضح ہے۔ قرآن میں زنا، عملِ قومِ لوط، برہنگی، جھوٹی تُہمت اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فحش افعال میں شُمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملۂ فواحش کہا گیا ہے۔ اسی طرح دُوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ علانیہ کیے جائیں نہ چھپ کر۔

(تفہیم القرآن ، اوّل، ص ۵۹۹، الانعام حاشیہ ۱۳۰)

زانی اور زانیہ کا نکاح

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ٘ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ۝ (النور ۲۴: ۳) زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر۔

یعنی زانی غیر تائب کے لیے اگر موزوں ہے تو زانیہ ہی موزوں ہے یا پھر مشرکہ۔ کسی مومنۂ صالحہ کے لیے وہ موزوں نہیں ہے۔ اور حرام ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی لڑکیاں ایسے فاجروں کو دیں۔ اسی طرح زانیہ (غیر تائبہ) عورتوں کے لیے اگر موزوں ہیں تو انھی جیسے زانی یا مشرک۔ کسی مومن صالح کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں اور حرام ہے مومنوں کے لیے کہ جن کی بدچلنی کا حال اُنھیں معلوم ہو اُن سے وہ دانستہ نکاح کریں۔ اس حکم کا اطلاق صرف اُنھی مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو اپنی بُری روش پر قائم ہوں جو لوگ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں اُن پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ توبہ و اصلاح کے بعد 'زانی' ہونے کی صفت اُن کے ساتھ لگی نہیں رہتی۔

زانی کا نکاح حرام ہونے کا مطلب: زانی کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا مطلب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لیا ہے کہ سرے سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مُراد محض ممانعت ہے نہ یہ کہ اس حکمِ ممانعت کے خلاف اگر کوئی نکاح کرے تو وہ قانوناً نکاح ہی نہ ہو اور اس نکاح کے باوجود فریقین زانی شُمار کیے جائیں۔ نبی ﷺ نے یہ بات ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر ارشاد فرمائی ہے کہ الحرام لا یحرم الحلال، حرام حلال کو حرام نہیں کر دیتا (طبرانی، دار قطنی)۔ یعنی ایک غیر قانونی فعل کسی دوسرے قانونی فعل کو غیر قانونی نہیں بنا دیتا۔ لہٰذا کسی شخص کا ارتکابِ زنا اس بات کا موجب نہیں ہو سکتا کہ وہ نکاح بھی کرے تو اس کا شُمار زنا ہی میں ہو اور معاہدۂ نکاح کا دوسرا فریق جو بدکار نہیں ہے وہ بھی بدکار قرار پائے۔ اصولاً بغاوت کے سوا کوئی غیر قانونی فعل اپنے مرتکب کو خارج از حدودِ قانون (out law) نہیں بنا دیتا ہے کہ پھر اس کا کوئی فعل بھی قانونی نہ ہو سکے۔ اس چیز کو نگاہ میں رکھ کر اگر آیت پر غور کیا جائے تو اصل منشا صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی بدکاری جانی بوجھی ہو ان کو نکاح کے لیے منتخب کرنا ایک گناہ ہے جس سے اہلِ ایمان کو پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بدکاروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے، حالانکہ شریعت انھیں معاشرے کا ایک مکروہ اور قابلِ نفرت عنصر قرار دینا چاہتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زانی مسلم کا نکاح مشرک عورت سے؟: اسی طرح اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ زانی مسلم کا نکاح مشرک عورت سے اور زانیہ مسلمہ کا نکاح مشرک مرد سے صحیح ہے۔ آیت کا منشا دراصل یہ بتانا ہے کہ زنا ایسا سخت قبیح فعل ہے کہ جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ مسلم معاشرے کے پاک اور صالح لوگوں سے اُس کا رشتہ ہو۔ اسے یا تو اپنے ہی جیسے زانیوں میں جانا چاہیے، یا پھر اُن مشرکوں میں جو سرے سے احکامِ الٰہی پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔

احادیث کی روشنی میں آیت کی توضیح: آیت کے منشا کی صحیح ترجمانی وہ احادیث کرتی ہیں جو اس سلسلے میں نبی ﷺ سے مروی ہیں۔ مسند احمد اور نسائی میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک عورت ام مہزول نامی تھی جو قحبہ گری کا پیشہ کرتی تھی۔ ایک مسلمان نے اُس سے نکاح کرنا چاہا اور نبی ﷺ سے اجازت طلب کی۔ آپ نے منع فرمایا اور یہی آیت پڑھی۔ ترمذی اور ابو داؤد میں ہے کہ مرثد بن ابی مرثد ایک صحابی تھے جن کے زمانۂ جاہلیت میں مکے کی ایک بدکار عورت عناق سے ناجائز تعلقات رہ چکے تھے۔ بعد میں انھوں نے چاہا کہ اس سے نکاح کر لیں اور حضور ﷺ سے اجازت مانگی۔ دو دفعہ پوچھنے پر آپ خاموش رہے۔ تیسری دفعہ پھر پوچھا تو آپ نے فرمایا: یا مرثد! اَلزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً فَلَا تَنْكِحْهَا[1]۔ اس کے علاوہ متعدد روایات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص دیوث ہو (یعنی جسے معلوم ہو کہ اُس کی بیوی بدکار ہے اور یہ جان کر بھی وہ اُس کا شوہر بنا رہے) وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا“ (احمد، نسائی، ابوداؤد، طیالسی)۔

شیخین، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جو غیر شادی شدہ مرد و عورت زنا کے الزام میں گرفتار ہوتے اُن کو وہ پہلے سزائے تازیانہ دیتے تھے اور پھر انھی کا آپس میں نکاح کر دیتے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک روز ایک شخص بڑی پریشانی کی حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کچھ اس طرح بات کرنے لگا کہ اس کی زبان پوری طرح کھلتی نہ تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اسے الگ لے جا کر معاملہ پوچھو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ ایک شخص اُس کے ہاں مہمان کے طور پر آیا تھا۔ وہ اُس کی لڑکی سے ملوث ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: قبحک اللہ الاسترت علی ابنتک، تیرا بُرا ہو تو نے اپنی لڑکی کا پردہ ڈھانک نہ دیا؟ آخر کار لڑکے اور لڑکی پر مقدمہ قائم ہوا، دونوں پر حد جاری کی گئی اور پھر ان دونوں کا باہم نکاح کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک سال کے لیے اُن کو شہر بدر کر دیا۔ ایسے ہی اور چند واقعات قاضی ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں نقل کیے ہیں (جلد ۲، ص ۸۶)۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۴۵، النور حاشیہ ۵)

ایک گمنام خط اور اُس کا جواب

سوال میں نے ایک دوشیزہ کو لالچ دیا کہ میں اُس سے شادی کروں گا۔ پھر اُس کے ساتھ خلافِ اخلاق تعلقات رکھے۔ میں نہایت دیانت داری سے اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اُس لڑکی کے خاندان کی عام عورتیں

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۸ ص ۳۶۵، اشاعت اوّل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زانیہ اور بدکار ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی ماں بھی۔ اب مجھے خوف ہے کہ اگر میں اُس لڑکی سے شادی کر لُوں تو وہ بھی بدچلن ثابت نہ ہو۔ ترجمان القرآن کے ذریعہ سے مطلع کیجیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج یہ ایک گمنام خط ہے جو ہمیں حال میں موصول ہوا ہے۔ عموماً گمنام خطوط جواب کے مستحق نہیں ہوا کرتے لیکن اس کا جواب اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ہماری بدقسمت سوسائٹی میں اس وقت بہت سے نوجوان موجود ہیں جن کے اندر سائل کی سی ذہنیت پائی جاتی ہے۔ خود بدکار ہیں مگر شادی کے لیے کوئی ایسی لڑکی چاہتے ہیں جو عفیفہ ہو۔ جس ظرف کو انھوں نے خود گندہ کیا ہے اُسے دُوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیے کوئی ایسا ظرف تلاش کرتے ہیں جسے کسی نے گندہ نہ کیا ہو۔

جناب سائل سے گزارش ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے خود شادی سے پہلے خراب کیا ہے اُس کے لیے اب آپ سے زیادہ موزُوں کون ہو سکتا ہے؟ اور وہ آپ سے زیادہ اور کس کے لیے موزُوں ہو سکتی ہے؟ آپ کو اپنے لیے نیک چلن لڑکی کیوں درکار ہے جب کہ آپ خود بدچلن ہیں؟ جب اُس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنے جسم کو آپ کے حوالے کیا تھا کیا اُسی وقت آپ کو یہ معلُوم نہ ہو گیا تھا کہ وہ بدچلن ہے؟ پھر آپ کو اب یہ اندیشہ کیوں لاحق ہوا کہ آگے چل کر وہ کہیں بدچلن ثابت نہ ہو؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے ملوّث ہونا تو نیک چلنی ہے اور بدچلنی صرف دُوسروں سے ملوّث ہونے کا نام ہے؟ پھر اُس کے خاندان کی عورتوں پر آپ کا اعتراض بھی عجیب ہے۔ وہ خواتین کرام جیسی کچھ بھی ہیں، اسی لیے ہیں کہ آپ جیسے معزز اصحاب سے اُن کو سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ آپ اگر اس راہ پر بعد میں آئے ہیں تو آخر اپنے پیش رووں کے انجام دیے ہوئے کارناموں سے اس درجہ نفرت کیوں ظاہر فرماتے ہیں؟ بُرا نہ مانیے، آپ دانستہ یا نادانستہ ٹھیک اس خاندان میں پہنچ گئے ہیں جس کے لیے آپ موزُوں تر ہیں اور جو آپ کے لیے موزُوں تر ہے۔ کسی دُوسرے پاکیزہ خاندان کو خراب کرنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ آپ اُسی خاندان میں ٹھیر جائیں جس کو آپ جیسے لوگ پہلے خراب کر چکے ہیں اور جسے خراب کرنے میں آپ کا حصّہ بھی شامل ہے۔

آخر میں محترم سائل کو قرآن کی دو آیتیں بھی سُن لینی چاہییں۔ پہلی آیت ہے:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۚ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ○ (النور ۲۴: ۳) زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر۔

اس آیت میں نکاح نہ کرنے سے مطلب یہ ہے کہ زانی مرد اس لائق نہیں ہے کہ اُس کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی اور سے ہو۔ اور زانیہ عورت کے لیے اگر کوئی شخص موزُوں ہے تو زانی یا مشرک مرد نہ کہ کوئی مومن صالح۔

دوسری آیت یہ ہے:

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لیے ہیں اور بدکار مرد بدکار عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔

(رسائل و مسائل دوم، مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۴۰۰-۴۰۳، بحوالہ ترجمان القرآن جنوری فروری ۱۹۵۱ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فحبہ گری اور اسلام

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور ۲۴: ۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دُنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ خود پاکدامن رہنا چاہتی ہوں اور جو کوئی اُن کو مجبور کرے تو اِس جبر کے بعد اللہ اُن کے لیے غفور و رحیم ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں خود پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو اُن کو قحبہ گری[1] پر مجبور کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لونڈی خود اپنی مرضی سے بدکاری کی مرتکب ہو تو وہ اپنے جُرم کی آپ ذِمّہ دار ہے، قانون اُس کے جُرم پر اُسی کو پکڑے گا، لیکن اگر اُس کا مالک جبر کر کے اُس سے یہ پیشہ کرائے تو ذِمّہ داری مالک کی ہے اور وہی پکڑا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جَبر کا سوال پیدا ہی اُس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی کو اُس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ رہا دُنیوی فائدوں کی خاطر، کا فقرہ تو دراصل یہ ثبوتِ حُکم کے لیے شرط اور قید کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے کہ اگر مالک اِس کی کمائی نہ کھا رہا ہو تو لونڈی کو قحبہ گری پر مجبور کرنے میں وہ مجرم نہ ہو، بلکہ اِس سے مقصود اُس کمائی کو بھی حُرمت کے حُکم میں شامل کرنا ہے جو اِس ناجائز جبر کے ذریعے حاصل کی گئی ہے۔

عرب میں قحبہ گری کی صورتیں: لیکن اِس حُکم کا پورا مقصد محض اِس کے الفاظ اور سِیاق سَباق سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں یہ نازل ہوا ہے۔ اُس وقت عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ، دوسرے باقاعدہ چکلہ۔

'خانگی' کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا۔ یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مَردوں سے بیک وقت اُن کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ اُن کو مدد خرچ دیں گے اور اپنی حاجت رَفع کرتے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت اُن مَردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اُس کا ہے اُسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلّم ادارہ تھا جسے اہلِ جاہلیت ایک قسم کا 'نِکاح' سمجھتے تھے۔ اسلام نے آ کر نِکاح کے صِرف اُس معروف طریقے کو قانونی نِکاح قرار دیا جس میں ایک عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے اور اِس طرح باقی تمام صورتیں زنا میں شُمار ہو کر آپ سے آپ جُرم ہو گئیں (ابو داؤد، فی وجوه النكاح التی كان يتناكح اهل الجاهلية)[2]۔

دُوسری صورت، یعنی کھلی قحبہ گری، تمام تر لونڈیوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ اِس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ

۱- قحبہ گری اس کو کہتے ہیں کہ ایک مَرد کسی عورت سے اُس کا جسم کرایہ پر مستعار حاصل کرے۔ اور آج کل کی 'مہذب' سوسائٹی میں ایک نئی قسم قحبہ گری کی وہ بھی پیدا ہو گئی ہے جسے 'شوقیہ قحبہ گری' (amateurtish prostitution) کہتے ہیں۔ جس میں یہی عارضی تعلق باقاعدہ طے شُدہ کرایے کے معاوضے میں نہیں بلکہ ہدیوں اور تحفوں کے بدلے میں قائم ہوتا ہے اور سوسائٹی میں خاتونِ محترمہ کی عزت بدستور برقرار رہتی ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۵۱ء، ص ۳۳۲-۳۳۳۔ بحوالہ ترجمان القرآن، مارچ جون ۴۵ء)

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۸ ص ۳۶۳، اشاعت اوّل۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو۔ اور وہ بے چاریاں بدکاری کرا کرا کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس کے سوا نہ کسی دوسرے ذریعے سے وہ اتنا کما سکتی تھیں نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعے سے یہ رقم لایا کرتی ہیں اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہوسکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور اُن کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنھیں دیکھ کر دور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ حاجت مند آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں 'قلیقیات' کہلاتی تھیں اور ان کے گھر 'مواخیر' کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے معزز رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن اُبَیّ (رئیس المنافقین، وہی صاحب جنھیں نبی ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ طے کر چکے تھے اور وہی صاحب جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے) مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی گئی تھیں۔ اُن کے ذریعے سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع بھی اُنھی سے فرمایا کرتے تھے اور اُن کی ناجائز اولاد سے اپنے خدم وحشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔ انھی لونڈیوں میں سے ایک جس کا نام مُعاذَہ تھا، مسلمان ہوگئی اور اُس نے توبہ کرنی چاہی۔ ابن اُبَیّ نے اُس پر تشدد کیا۔ اُس نے جا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انھوں نے معاملہ سرکار تک پہنچایا اور سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے حکم دیا کہ لونڈی اس ظالم کے قبضے سے نکال لی جائے (ابن جریر، ج ۱۸، ص ۵۵-۵۸، ۱۰۳-۱۰۴۔ الاستیعاب لابن عبدالبر، ج ۲، ص ۷۶۲- ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۸۸-۲۸۹)۔ یہی زمانہ تھا جب بارگاہِ خداوندی سے یہ آیت نازل ہوئی۔

اس پس منظر و نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود محض لونڈیوں کو جرمِ زنا پر مجبور کرنے سے روکنا نہیں ہے، بلکہ دولت اسلامیہ کے حدود میں قحبہ گری (prostitution) کے کاروبار کو بالکل خلافِ قانون قرار دے دینا ہے اور ساتھ ساتھ اُن عورتوں کے لیے اعلانِ معافی بھی ہے جو اس کاروبار میں جبراً استعمال کی گئی ہوں۔

ارشاداتِ نبویؐ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان آ جانے کے بعد نبی ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ لا مساعاة فی الاسلام، اسلام میں قحبہ گری کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے (ابوداؤد، بروایت ابن عباس، باب فی ادعاء ولد الزنا)۔ دوسرا حکم جو آپ نے دیا وہ یہ تھا کہ زنا کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ آپ نے مہر البغی یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شر المکاسب، ناپاک اور بدترین آمدنی قرار دیا (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)۔

ابوجحیفه کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کسب البغی یعنی پیشہ زنا سے کمائی ہوئی آمدنی کو حرام ٹھیرایا (بخاری، مسلم، احمد)۔ ابومسعود عقبہ بن عمرو کی روایت ہے کہ آپ نے مہر البغی کا لین دین ممنوع قرار دیا (صحاح ستہ و احمد)۔ تیسرا حکم آپ نے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ دیا کہ لونڈی سے جائز طور پر صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لی جا سکتی ہے اور مالک کوئی ایسی رقم اس پر عائد، یا اس سے وصول نہیں کر سکتا جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کر کے لاتی ہے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ نہی رسول اللهِ صلّی الله علیهِ و سلّمَ عن کَسْبِ الْأمَةِ حتّی یُعلَمَ مِن أینَ هو ، رسول اللہ ﷺ نے لونڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ آمدنی اُسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے (ابوداؤد، کتاب الاجارۃ)۔ رافع بن رفاعہ انصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے کہ وَنهَانا نبیُ اللهِ صَلّی اللهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ عن کَسْبِ الْأمَةِ إلّا ما عمِلت بِیدِها وقالَ هٰکذا بِأصابِعِه نحو الْخُبْزِ والغزْلِ والنَّفْشِ. اللہ کے نبی ﷺ نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع کیا۔ بجز اس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے اور آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں، جیسے روٹی پکانا، سوت کاتنا، یا اون اور روئی دھنکنا (مسند احمد، ابو داؤد، کتاب الاجارہ)۔ اسی معنی میں ایک روایت ابوداؤد اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس میں کسب الاماء (لونڈیوں کی کمائی) اور مھر البغی (زنا کی آمدنی) وصول کرنے سے منع کیا گیا ہے[1]۔ اس طرح نبی ﷺ نے قرآن کی اس آیت کے منشا کے مطابق قحبہ گری کی اُن تمام صورتوں کو مذہباً ناجائز اور قانوناً ممنوع قرار دے دیا جو اُس وقت عرب میں رائج تھیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، عبداللہ بن اُبَی کی لونڈی مُعاذَہ کے معاملے میں جو کچھ آپؐ نے فیصلہ فرمایا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لونڈی سے اُس کا مالک جبراً پیشہ کرائے اُس پر سے مالک کی ملکیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ امام زہری کی روایت ہے جسے ابن کثیر نے مُسندِ عبدالرزاق کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم ص ۴۰۳-۴۰۵، النور حاشیہ ۵۹)

حکم نامے کے اختتام پر سخت تنبیہ: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ۠ (النور ۲۴:۳۴) ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمہارے پاس بھیج دی ہیں اور ان قوموں کی عبرتناک مثالیں بھی ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں، اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں۔

اس آیت کا تعلق صرف اُوپر کی آخری آیت ہی سے نہیں ہے، بلکہ اُس پورے سلسلۂ بیان سے ہے جو آغاز سورہ سے یہاں تک چلا آ رہا ہے۔ صاف صاف ہدایتیں دینے والی آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں [illegible] معاشرت کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ بدکار مردوں اور عورتوں سے اہلِ ایمان کو شادی بیاہ کے معاملہ میں مقاطعہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، شریف لوگوں پر بے بنیاد تہمتیں لگانے اور معاشرے میں فواحش کی اشاعت کرنے سے روکا گیا ہے، مردوں اور عورتوں کو غضِ بصر اور حفظِ فروج کی تاکید کی گئی ہے، عورتوں کے لیے پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں، شادی کے قابل لوگوں کے مجرد بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے، غلاموں کی آزادی کے لیے کتابت کی صورت تجویز کی گئی ہے اور معاشرے کو قحبہ گری کی لعنت سے پاک کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان ارشادات کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے ڈر کر سیدھی راہ اختیار کر لینے والوں کو جس طرح تعلیم دی جاتی ہے

۱- ان ساری احادیث کی تخریج ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۸، ص ۳۶۰-۳۶۵۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ تو ہم نے دے دی ہے۔اب اگر تم اِس تعلیم کے خلاف چلو گے تو اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم اُن قوموں کا سا انجام دیکھنا چاہتے ہو جن کی عبرتناک مثالیں خود اسی قرآن میں ہم تمھارے سامنے پیش کر چکے ہیں...... غالباً ایک حُکم نامے کے اختتام پر اس سے زیادہ سخت تنبیہ کے الفاظ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔مگر آفرین ہے اِس قوم پر جو ماشاء اللہ مومن بھی ہو اور اِس حُکم نامے کی تلاوت بھی کرے اور پھر ایسی سخت تنبیہ کے باوجود اِس حُکم نامے کی خلاف ورزی بھی کرتی رہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۴۰۵، النور حاشیہ ۶۰)

دورِ جدید میں افواج کے لیے قحبہ گری اور اِسلام:

س: آج کل جنگ میں جہاں سپاہیوں کو وطن سے ہزاروں میل دُور جانا پڑتا ہے اور اُن کی واپسی کم از کم دو سال سے پہلے ناممکن ہو جاتی ہے، سوشل قباحتیں مثلاً زنا وغیرہ کا پھیل جانا لازمی ہے۔کیونکہ جنگ کے جذبہ کی بیداری کے ساتھ تمام جذباتِ سفلی بھی بھڑک اُٹھتے ہیں۔اِس چیز کو روکنے کے لیے یا قابو میں لانے کے لیے فوجیوں کے لیے رجسٹرڈ رنڈیاں بہم پہنچانے کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے اور اُن کے دلوں کو خوش رکھنے کے لیے W.A.C.I دفتروں میں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔یہ دونوں صورتیں قابلِ نفرت ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ اِن کی تردید کے بعد اِسلام اِس عقدہ کے حَل کا کیا طریقہ بتاتا ہے۔کنیزوں کا سسٹم کس حد تک اس قباحت کا ازالہ کر سکتا ہے اور کیا وہ بھی ایک طرح کی جائز کردہ قحبہ گری (prostitiution) نہیں ہے؟

ج: آپ کے سوال میں ایک پیچیدگی ہے جسے شاید آپ نے اپنا سوال تحریر کرتے وقت محسوس نہیں کیا۔آپ جس مسئلے کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں اس میں آپ کے پیشِ نظر تو ہیں، موجودہ زمانے کی فوجیں اور اُن کی ضروریات، لیکن اس کا حل چاہتے ہیں آپ اِسلام سے۔حالانکہ اِسلام جن فوجوں کی ضروریات کا ذِمّہ لیتا ہے وہ اِس کی اپنی فوجیں ہیں نہ کہ فسّاق وفجّار اور جبابرہ کی فوجیں۔

موجودہ زمانے کی فوجوں کا حال یہ ہے کہ اُنھیں محض لڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور جو سلطنتیں اُن کو تیار کرتی ہیں، اُن کے پیشِ نظر کوئی پاکیزہ اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا۔اگر وہ اپنی قومی فوج تیار کرتی ہیں تو اُن کے اندر صرف وہ اخلاقیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو قوم کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کے لیے درکار ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان اخلاقیات میں طہارت اخلاق کے عنصر کا کوئی مقام نہیں ہے۔اور اگر وہ اپنی محکوم قوموں میں سے اپنی اغراض کے لیے فوجیں تیار کرتی ہیں تو اُنھیں صرف اُس اخلاق کی تربیت دیتی ہیں جو پالتو شکاری کتوں میں پیدا کیا جاتا ہے۔یعنی یہ کہ روٹی دینے والے کے وفادار رہیں اور شکار اُس کے لیے ماریں، نہ کہ اپنے لیے۔اِس کے سوا کسی دُوسرے اخلاق کی اہمیت سرے سے اِن 'مہذب' قوموں میں ہے ہی نہیں۔رہیں زنا، شراب، جوا اور دُوسری قسم کی بداخلاقیاں تو نیچے سے لے کر اُونچے طبقوں تک وہ اُن کے ہاں پوری قوم کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔نیز جب کہ اِن کا اخلاقی نقطہ نظر ہی یہ ہے کہ "بابر بعیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست" تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فوجوں میں کسی قسم کا اخلاقی انضباط پایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اُن کی فوجیں مار دھاڑ کے فنون میں تو انتہائی کمال کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن طہارتِ اخلاق کے

www.KitaboSunnat.com

نقطۂ نظر سے پستی کی اُس حد تک گری ہوئی ہوتی ہیں جس کا مشکل ہی سے کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ اُنھیں کھانے کے لیے دِل کھول کر راشن دیا جاتا ہے، پینے کے لیے خُمِ شراب کا منہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے، خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی کافی دے دیے جاتے ہیں، پھر سانڈوں کی طرح اُنھیں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشاتِ نفس جہاں اور جس طرح چاہیں پوری کرتے پھریں۔ حکومتیں خود بھی اُن کے لیے قحبہ خانے تیار رکھتی ہیں۔ قوم کی لڑکیوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی خاطر اپنے جسم رضا کارانہ طور پر پیش کرنے کو قومی ایثار اور سرمایۂ افتخار سمجھیں اور اِس پر بھی جب اِن انسانی درندوں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تو اُن کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ انسانی گلہ میں جہاں بھی مادائیں اُن کو نظر آئیں، اُن سے 'بزور' یا 'بزر' اُن کے جسم خرید لیں یا چھین لیں۔ اِس طرح جن فوجوں کو پالا گیا ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب وہ دُشمنوں کے ممالک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوں گی تو وہاں اُن کی شہوانی ضروریات کتنی بڑھ جاتی ہوں گی اور کس قیامت خیز صورت میں وہ پوری کی جاتی ہوں گی۔

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ ایسی فوجوں کے مسائل اور اُن کی ضروریات کا حل اِسلام کیسے بتا سکتا ہے؟ اُنھیں مغرب ہی کے مادّہ پرستانہ اخلاق نے پیدا کیا ہے اور اُن کے شرمناک مسائل کا حل بھی وہی پیش کر سکتا ہے۔ اِسلام جن فوجوں کو تیار کرتا ہے وہ سیاسی و معاشی جغرافیہ کے اوراق پھاڑنے اور جوڑنے کے لیے تیار نہیں کی جاتیں، بلکہ صِرف اِس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دُنیا اگر خدا کی اطاعت سے پھری ہوئی ہو اور دعوت و تبلیغ سے راہِ راست پر نہ آئے تو اُسے بزورِ شمشیر اتنا بے زور کر دیا جائے کہ وہ کم از کم فتنہ و فساد سے تو باز آ جائے۔ اِس متعین مقصود کے لیے جو فوجیں جہاد کرتی ہیں، اُن کا جہاد فی سبیل النفس نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں بھی اُسی جذبۂ عبادت کے ساتھ جاتی ہیں، جس کے ساتھ وہ صحنِ مسجد میں قدم رکھتی ہیں۔ پھر اُس میدان میں اُن کو اُتارنے سے پہلے تزکیۂ نفس اور تطہیرِ اخلاق کے ایک پورے کورس سے گزارا جاتا ہے۔ اُنھیں خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی سرکوبی کا کام سکھانے کے ساتھ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو، اگر وہ خدا سے پھر رہا ہو، کس طرح زیر کریں اور دُوسروں کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو کس طرح خدا کا مطیع بنائیں۔ اُنھیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں قدم قدم پر خدا کو یاد کرتے ہوئے بڑھیں، عین لڑائی کی حالت تک میں نماز اپنے وقت پر ادا کریں اور دِن اُن کے گھوڑے یا ٹینک کی پشت پر گذریں تو راتیں مصلّے پر۔ ظاہر ہے کہ اِس طرح کی تربیت یافتہ فوج جو ایک پاکیزہ اخلاقی مقصد کے لیے لڑے اور اپنے عقیدے کے مطابق زمانۂ جنگ کو زمانۂ عبادت سمجھتی ہوئی رقبۂ جنگ میں رہے، اُس کی شہوانی ضروریات موجودہ فوجوں کی ضروریات جیسی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ اپنی اُن ضروریات کو پورا کرنے میں اِن فوجوں کی طرح آزادی کی خواہش مند ہو سکتی ہیں۔

اگرچہ بعض روایات کے مطابق زمانۂ جنگ میں نبی ﷺ نے متعہ کو جائز رکھا تھا (جسے عرب میں پہلے جائز سمجھا جاتا تھا) لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بہت جلدی آپؐ نے اُس کو ممنوع قرار دیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِس میں شک نہیں کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوئی ہوں، اُن سے تمتع کرنے کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے، مگر سخت جاہل ہے وہ شخص جس نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ جس طرح آج کل کی ناخدا ترس فوجیں غنیم کے ملک میں گھسنے کے بعد عورتوں کو آزادانہ پکڑتی پھرتی ہیں اور جہاں جس سپاہی کو جو عورت مل جاتی ہے وہ اُس سے زنا کر ڈالتا ہے، ایسی ہی اجازت اسلام نے بھی اپنی فوجوں کو دے دی ہے۔ دراصل یہ اجازت چند شرائط کے ساتھ ہے:

اوّل تو عورتوں کو پکڑنا فی نفسہٖ مقصود کی حیثیت نہیں رکھتا کہ خواہ مخواہ فوج کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کی خاطر دُشمن قوم کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑ لایا جائے، بلکہ عہدِ نبویؐ اور زمانہ خلافتِ راشدہ کی نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جب کبھی گرفتار ہوں گی دو ہی صورتوں میں ہوں گی۔ ایک اس صورت میں جب کہ وہ دُشمن کے لشکر میں ہوں۔ اس صورت میں جس طرح لشکر کے مرد گرفتار ہوں گے اُسی طرح عورتیں بھی گرفتار کر لی جائیں گی۔ دُوسرے اُس صورت میں جب کہ کوئی شہری آبادی اِسلامی فوج کا مقابلہ کرے اور عنوۃً (by storm) فتح ہو۔ اِس صورت میں اِسلامی فوج کے کمانڈر کو حق ہے کہ ضرورت سمجھے تو پوری آبادی کو گرفتار کر لے۔ نیز اِس صورت میں جو عورتیں اور بچے ایسے رہ جائیں جن کے سرپرست مرد مارے جا چکے ہوں اُن کو بھی اِسلامی فوج اپنے چارج میں لے لے گی۔

پھر جو عورتیں ان صورتوں میں سے کسی صورت میں فوج کے قبضے میں آجائیں اُنھیں کوئی سپاہی اُس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتا جب تک کہ اسلامی حکومت اِس اَمر کا فیصلہ نہ کرلے کہ اُنھیں لونڈیاں بنالینا ہے اور جب تک کہ اُن کو فوج میں باقاعدہ تقسیم نہ کر دیا جائے۔ اور یہ فیصلہ صرف اُسی صورت میں کیا جائے گا جب کہ غنیم سے فدیے پر، یا اسیرانِ جنگ کے تبادلے پر کوئی معاملہ طے نہ ہوا ہو۔

اِس طرح جو عورت حکومت کی جانب سے کسی مرد کی ملک میں باقاعدہ دے دی گئی ہو اُس پر صرف وہی ایک مرد تمتع کر سکے گا اور اس کے لیے بھی قانون یہ ہے کہ استبراءِ رحم کی خاطر وہ اُس وقت تک صبر کرے جب تک کہ اُس عورت کو ایک مرتبہ حیض نہ آجائے۔ یہ اس غرض کے لیے ہے تاکہ اِس اَمر کا اطمینان ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے اور اگر حاملہ ہو تو پھر وضعِ حمل تک اُس کو صبر کرنا چاہیے۔ اس دوران میں وہ اس سے مباشرت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

پھر جو عورت اس طریقے سے کسی شخص کی ملک میں دی گئی ہو، وہ اگر اُس سے تمتع کرے تو جو اولاد اُس کے بطن سے پیدا ہو گی وہ اُس شخص کی جائز اولاد قرار پائے گی اور اُس کی وارث ہوگی۔ نیز اولاد کی ماں بن جانے کے بعد پھر وہ شخص اُس عورت کو بیچنے کا مجاز نہ رہے گا اور اُس کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جائے گی۔

یہ ہے جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں کے بارے میں اِسلام کا اصل قانون۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اِسلام حالتِ جنگ میں اپنی فوجوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اخلاقی قیود میں کسی قسم کی ڈھیل پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام تو اُن پر پابندی عائد کرتا ہے کہ جائز تعلق کے مواقع میسر آنے تک بہرحال وہ ضبطِ نفس سے کام لیں خواہ ایسے موقع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میسر آنے میں کتنی ہی مدت لگ جائے۔

دُوسری طرف احادیث و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ دیکھنا بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ اُس کے سپاہی زیادہ مدت تک اپنی عورتوں سے علیحدہ رہ کر، اور اُن کی عورتیں زیادہ دیر تک اپنے مَردوں سے جُدا رہ کر کہیں بداخلاقیوں میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ یہی غرض تھی جس کی خاطر نبی ﷺ نے فرمایا:

حُرِمَت نِسَآءُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ كَحُرْمَةِ أُمَّهَاتِكُمْ، مجاہدین کی بیویاں پیچھے رہنے والے مَردوں کے لیے ویسی ہی حرام کی گئی ہیں جیسی خود اُن کی مائیں اُن پر حرام ہیں۔

اور یہ کہ: مَا مِنْ رَجُلٍ مِّنَ الْقَاعِدِيْنَ يَخْلُفُ رَجُلًا مِّنَ الْمُجَاهِدِيْنَ فِىْ اَهْلِهٖ فَيَخُوْنُهٗ فِيْهِمْ اِلَّا وُقِفَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَأْخُذُ مِنْ عَمَلِهٖ مَا يَشَآءُ فَمَا ظَنُّكُمْ[1]، پیچھے رہ جانے والے مَردوں میں سے جو شخص مجاہدین میں سے کسی کے بال بچوں میں اُس کا جانشین ہو اور پھر وہ اُن کے معاملے میں اُس کے ساتھ کسی قسم کی خیانت کرے وہ قیامت کے روز کھڑا کیا جائے گا اور اُس مجاہد کو حق دیا جائے گا کہ اُس شخص کے عمل میں سے جو کچھ چاہے لے لے۔ پھر تمھارا کیا گمان ہے کہ وہ اُس کے پاس کچھ چھوڑ دے گا؟

اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینے کے دو خوبصورت نوجوانوں کو صرف اِس لیے شہر سے منتقل کر دیا کہ آپ نے بعض عورتوں کی زبان سے اُن کے حُسن کی تعریف سُن لی تھی اور آپ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں یہ چیز اُن عورتوں کے حق میں فتنہ نہ بن جائے جن کے شوہر جہاد پر گئے ہوئے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص کسی عورت سے تشبیب[2] کرے گا اُس کو دُرّے لگائے جائیں گے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ایک مرتبہ ایک مجاہد کی بیوی کو اپنے شوہر کے فراق میں مشتاقانہ اشعار گاتے ہوئے سُنا تو آ کر پہلا حکم جو آپ نے جاری کیا وہ یہ تھا کہ آئندہ سے سپاہیوں کو اتنی طویل مدت تک اُن کی بیویوں سے جُدا نہ رکھا جائے جس سے اُن کے کسی بداخلاقی میں ملوث ہوجانے کا احتمال ہو۔ بالفاظِ دیگر فوج میں رخصت (furlough) کا طریقہ اسلامی حکومت میں جاری ہی اِس غرض کے لیے کیا گیا تھا کہ حکومت اپنے سپاہیوں اور اُن کی عورتوں کے اخلاق کی حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

(رسائل و مسائل، حصہ اول، نمبر ۵۱، ص ۳۲۲-۳۳۲، بحوالہ ترجمان القرآن، مارچ جون ۴۵ء)

عملِ قومِ لُوط اور اُس کی سزا

عملِ قومِ لُوط ایک بدترین گناہ ہے جس پر ایک قوم اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہوئی۔ اس کے بعد یہ بات ہمیں نبی ﷺ کی رہنمائی سے معلوم ہوئی کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرے کو پاک رکھنے کی کوشش کرنا حکومتِ اسلامی کے فرائض میں سے ہے، اور یہ کہ اِس جُرم کے مُرتکبین کو سخت سزا دی جانی چاہیے۔ حدیث میں مختلف روایات، جو حضور ﷺ سے

۱- احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث ج ۶، ص ۳۴۳-۳۴۵، اشاعت اوّل۔

۲- یعنی اپنے اشعار میں اُس سے اظہارِ عشق کرے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مروی ہیں اُن میں سے کسی میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں کہ: اُقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ ، فاعل اور مفعول کو قتل کردو۔ کسی میں اِس حکم پر اتنا اضافہ اور ہے کہ: اَحْصَنَا اور لَمْ یُحْصِنَا، شادی شُدہ ہوں یا غیر شادی شُدہ۔ اور کسی میں ہے: فَارْجُمُوا الْاَعْلٰی وَ الْاَسْفَلَ ، اُوپر اور نیچے والا، دونوں سنگسار کیے جائیں۔ لیکن چونکہ نبی ﷺ کے زمانے میں ایسا کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا اِس لیے قطعی طور پر یہ بات متعین نہ ہو سکی کہ اِس کی سزا کس طرح دی جائے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ مجرم تلوار سے قتل کیا جائے اور دفن کرنے کے بجائے اُس کی لاش جلائی جائے۔ اِس رائے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اتفاق فرمایا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے وہ عمارت اُن پر ڈھادی جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ یہ ہے کہ بستی کی سب سے اُونچی عمارت پر سے اُن کو سَر کے بل پھینک دیا جائے اور اُوپر سے پتھر برسائے جائیں۔

فقہا کی آرا: فقہا میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ فاعل ومفعول واجب القتل ہیں۔ خواہ شادی شُدہ ہوں یا غیر شادی شُدہ۔ شعبی، زُہری، مالک اور احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اِن کی سزا رجم ہے۔ سعید بن المسیّب، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، سُفیان ثوری اور اَوزاعی رحمہم اللہ کی رائے میں اِس جُرم پر وہی سزا دی جائے گی جو زنا کی سزا ہے، یعنی غیر شادی شُدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور جلاوطن کر دیا جائے گا اور شادی شُدہ کو رجم کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں اِس پر کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ یہ فعل تعزیر کا مستحق ہے، جیسے حالات وضروریات ہوں، اُن کے لحاظ سے کوئی عبرتناک سزا اُس پر دی جا سکتی ہے۔ ایک قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اِس کی تائید میں منقول ہے۔

معلوم رہے کہ آدمی کے لیے یہ بات قطعی حرام ہے کہ وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ عملِ قومِ لوط کرے۔ ابوداؤد میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ مَلْعُوْنٌ مَّنْ اَتَی الْمَرْأَۃَ فِیْ دُبُرِھَا ، عورت سے یہ فعل کرنے والا ملعون ہے۔ ابن ماجہ اور مُسندِ احمد میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ لَا یَنْظُرِ اللّٰہُ اِلٰی رَجُلٍ جَامَعَ اِمْرَأَتَہٗ فِیْ دُبُرِھَا ، اللہ اِس مرد کی طرف ہرگز نظرِ رحمت سے نہ دیکھے گا جو اپنی عورت سے اِس فعل کا ارتکاب کرے۔ ترمذی میں آپ کا یہ فرمان ہے کہ: مَنْ اَتٰی حَائِضًا اَوِ امْرَأَۃً فِیْ دُبُرِھَا اَوْ کَاھِنًا فَصَدَّقَہٗ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ، جس نے حائضہ عورت سے مجامعت کی، یا عورت کے ساتھ عملِ قومِ لُوط کا ارتکاب کیا، یا کاہن کے پاس گیا اور اُس کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کی اُس نے اِس تعلیم سے کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔[1]

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۵۳- ۵۴، الاعراف حاشیہ ۶۸)

جدید مغربی تہذیب میں اِس کا عرُوج: اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ (الاعراف ۷:۸۱) تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔

یہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت اِس قوم نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اِس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز

۱- اس فصل کی احادیث کی تخریج ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۹۰- ۹۵، اشاعت اوّل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں آئے، لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اُس کے فلاسفہ نے اِس گھناؤنے جُرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اُٹھانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اُسے جدید مغربی تہذیب نے پورا کیا کہ علانیہ اِس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا، یہاں تک کہ بعض ملکوں کی مجالسِ قانون ساز نے اسے باقاعدہ جائز ٹھیرا دیا۔ حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذِی حیات انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے اور نوعِ انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اُس سے تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت کی دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک [میں] دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے، اُن کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے اور اُن کے جذب و انجذاب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی اور محرک بھی ہے اور اِس خدمت کا صِلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اوّلاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اُس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے جس سے دونوں کے جسم و نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کا ارتکاب کرتا ہے۔ کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صِلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق سے وابستہ کیا تھا وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر چرا لیتا ہے۔ ثالثاً وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اُٹھا لیتا ہے مگر جب اُس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقے پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کے لیے صرف غیر مُفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خِدمت کے لیے نااہل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم،ص ۵۱-۵۲، الاعراف حاشیہ ۶۴)

جنسی خواہش پوری کرنے کی دیگر حرام صورتیں

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (المومنون ۲۳:۷) البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس فقرے نے ازواج اور مملوکات کی دو جائز صورتوں کے سوا خواہشِ نفس پوری کرنے کی تمام دُوسری صورتوں کو حرام کر دیا، خواہ وہ زنا ہو، یا عملِ قومِ لُوط یا وطیِ بہائم یا کچھ اور۔ استمنا بالید (masturbation) کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اس کو قطعی حرام ٹھیراتے ہیں اور حنفیہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے نزدیک اگرچہ یہ حرام ہے، لیکن وہ کہتے ہیں کہ اگر شدید غلبۂ جذبات کی حالت میں آدمی سے احیاناً اس فعل کا صدور ہو جائے تو اُمید ہے کہ معاف کر دیا جائے گا۔

اِستمنا بالید کا شرعی حکم

س ایک شخص کا شباب عروج پر ہے۔ نفسانی جذبات کا زور ہے۔ اب ان جذبات کو قابو میں رکھنے کی چند ہی صُورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱- اول یہ کہ وہ نکاح کرے۔ مگر جس لڑکی سے اُس کی نسبت ہے وہ اتنی چھوٹی ہے کہ کم از کم تین چار سال انتظار کرنا ہوگا۔

۲- دوم یہ کہ وہ اپنے خاندان سے باہر کہیں شادی کر لے، مگر ایسا کرنے سے تمام خاندان ناراض ہوتا ہے، بلکہ بعید نہیں کہ اُس کا اپنے خاندان سے رشتہ ہی کٹ جائے۔

۳- سوم یہ کہ وہ اس نیت سے کوئی عارضی نکاح کر لے کہ اپنی خاندانی منسوبہ سے شادی ہو جانے کے بعد پہلی بیوی کو طلاق دے دے گا، مگر اس میں اور متعہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

۴- چہارم یہ کہ وہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لیے مسلسل روزے رکھے، مگر وہ ایک محنت پیشہ آدمی ہے جسے تمام دن مشغول رہنا پڑتا ہے۔ اتنی محنت روزوں کے ساتھ سخت مشکل ہے۔

۵- آخری چارۂ کار یہ ہے کہ وہ زنا سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھ سے کام لے۔ کیا ایسے حالات میں وہ اس طریقے کو اختیار کر سکتا ہے؟

ج نکاح بالید، یعنی ہاتھ سے شہوت رفع کرنے کے بارے میں فقہائے اسلام کے تین مسلک ہیں:

(۱) یہ کہ وہ مباح ہے اور زیادہ سے زیادہ اگر اس کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ مکارمِ اخلاق کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ ایک مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس مسلک کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ کسی نص میں اس فعل کے حرام ہونے کی تصریح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ ، اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے اُس کو وہ تمھارے لیے مفصل بیان کر چکا ہے۔ لہٰذا جب محرّمات کی تفصیل میں یہ مذکور نہیں ہے تو حلال ہے۔ ابن حزم نے المحلّٰی میں اس رائے کو پورے دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے اور سند کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار اور مجاہد اس کی اباحت کے قائل تھے۔ اور عطاء اس کو صرف مکروہ سمجھتے تھے (المحلّٰی ج ۱۱ ص ۹۲-۹۳)۔ علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "یہ فعل عند الضرورت، اُسی طرح جائز ہے جیسے فصد اور پچھنے" (روح المعانی، ج ۱۸، ص ۱۰) لیکن مجھے فقہ حنبلی کی کسی مستند کتاب میں یہ فتویٰ نہیں ملا۔

(۲) یہ کہ وہ حرام ہے لیکن اگر زنا کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور آدمی اس سے بچنے کے لیے اس طریقے سے شہوت کی تسکین کر لے تو اُمید ہے کہ اُسے عذاب نہ دیا جائے گا۔ یہ رائے حنفیہ کی ہے۔ چنانچہ رد المحتار میں تصریح ہے کہ یہ فعل حرام اور مستلزمِ عذاب ہے، اِلّا یہ کہ اگر زنا کے اندیشے سے کوئی اس کا ارتکاب کرے تو یُرجی اَلّا و بَال علیه (ردالمحتار، باب الصوم اور باب الحدود)۔ اسی کے قریب علامہ آلوسی نے ابن ہُمام کا قول نقل کیا ہے (روح المعانی، ج ۱۸،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ص ۱۰)، اور اسی سے ملتی جلتی رائے علامہ ابن عابدین نے فقیہ ابواللیث سے نقل کی ہے۔ اس رائے کے حق میں کوئی خاص نص نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کے اُصولِ عامہ سے مستنبط کی گئی ہے، مثلاً حالتِ اضطرار میں حرام شے کے استعمال کی اجازت اور دو ناجائز کاموں کے ناگزیر ہو جانے کی صورت میں کم تر درجے کی ناجائز کو اختیار کرنے کا قاعدہ۔

(۳) یہ کہ وہ قطعاً حرام ہے۔ امام شافعی اور امام مالک ﷫ کی یہی رائے ہے اور وہ سورۂ مومنون کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اپنی بیویوں کے اور اُن عورتوں کے جو اُن کی ملکِ یمین میں ہوں، کہ اُن سے پرہیز نہ کرنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ پھر جو اُس کے ماسوا کوئی اور راہ (قضائے شہوت کی) تلاش کرے تو ایسے ہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس آیت سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ منکوحہ بیوی اور ملکِ یمین میں آئی ہوئی لونڈی کے سوا تسکینِ شہوت کی تمام صورتیں ازروئے قرآن حرام ہیں، خواہ وہ زنا ہو یا استمنا بالید، یا عملِ قومِ لوط، یا وطی بہائم، یا کچھ اور۔ پھر اس کی تائید یہ احادیث بھی کرتی ہیں: نَاكِحُ الْيَدِ مَلْعُوْنٌ، اپنے ہاتھ سے نکاح کرنے والا ملعون ہے۔ عَذَّبَ اللّٰهُ تَعَالٰى اُمَّةً كَانُوْا يَعْبَثُوْنَ بِمَذَاكِيْرِهِمْ، اللہ نے ایسے لوگوں کو عذاب دیا جو اپنے اعضا جنسی سے کھیلتے تھے۔

یہ دونوں حدیثیں علامہ آلوسی نے روح المعانی میں نقل کی ہیں۔ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور حدیث نقل کی ہے، مگر ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، نیز اس کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے۔

سَبْعَةٌ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَا يَجْمَعُهُمْ مَعَ الْعَالَمِيْنَ وَ يُدْخِلُهُمُ النَّارَ فِيْ اَوَّلِ الدَّاخِلِيْنَ اِلَّا اَنْ يَّتُوْبُوْا وَمَنْ تَابَ، تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّاكِحُ يَدَهٗ وَالْفَاعِلُ وَالْمَفْعُوْلُ بِهٖ وَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ، وَالضَّارِبُ وَالِدَيْهِ حَتّٰى يَسْتَغِيْثَا وَ الْمُؤْذِيْ جِيْرَانَهٗ حَتّٰى يَلْعَنُوْهُ وَالنَّاكِحُ حَلِيْلَةَ جَارِهٖ، سات آدمی ہیں جن کی طرف اللہ قیامت کے روز نظر نہ فرمائے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور نہ انھیں دوسرے لوگوں کے ساتھ جمع کرے گا اور سب سے پہلے دوزخ میں داخل ہونے والوں میں شامل کرے گا الّا یہ کہ وہ توبہ کرلیں اور جو توبہ کرے اللہ اُسے معاف کر دیتا ہے۔ (۱) اپنے ہاتھ سے نکاح کرنے والا۔ (۲) عملِ قومِ لوط کرنے والا۔ (۳) یہ فعل کرانے والا۔ (۴) عادی شراب خور۔ (۵) اپنے والدین کو مارنے والا یہاں تک وہ فریاد کریں۔ (۶) اپنے ہمسایوں کو ستانے والا یہاں تک وہ اس پر لعنت کریں۔ (۷) اپنے ہمسائے کی بیوی سے بدکاری کرنے والا۔[1]

ان مختلف مسلکوں اور اُن کے دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پہلا مسلک نہایت کمزور بلکہ غلط ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں حرام وحلال کے کئی اُصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ پس ہر وہ چیز جو قرآن کے بیان کردہ کسی کلیہ کے تحت آتی ہو اُس پر وہی حکم جاری ہوگا جو کلیہ میں ارشاد ہوا ہو۔ الّا یہ کہ اُس کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے کوئی دلیل موجود ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن یہ عام قاعدہ بیان کر چکا ہے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضائے شہوت کے تمام طریقے عدوان

۱۔ مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۷۹-۸۰، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں تو اُس سے نکاح بالید کے مستثنیٰ ہونے کی آخر دلیل کیا ہے؟ اس کے جواب میں بعض لوگوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ''عرب میں اِس فعل کا کوئی رواج نہ تھا، نہ کلامِ عرب میں اُس کا کوئی ذِکر ہے۔ لہٰذا فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ میں داخل نہیں ہے''۔

لیکن یہ دلیل دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ لغتِ عرب میں اس کے لیے جلد عمیرہ اور خَضْخَضَه کے الفاظ موجود ہیں اور زبان میں کسی لفظ کا موجود ہونا اِس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اہلِ زبان اِس تصوّر سے آشنا تھے۔ دُوسرے یہ کہ اگر عرب اِس سے واقف نہ تھے تو خدا تو انسانوں کے سب افعال سے واقف تھا۔ اِس کے بیان کردہ کلیات صِرف اُنھی جزئیات تک آخر کیسے محدود ہو جائیں گے جن سے اُس زمانے کے عرب واقف ہوں۔

اِن دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اِس کی حُرمت زنا اور عملِ قومِ لُوط اور وطیِ بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اِس لیے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مُبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اُس سے بچنے کے لیے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اِس ذریعے سے کر لے تو اُس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اُسے سزا نہ دے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۸-۲۰۲، بحوالہ ترجمان القرآن، اکتوبر نومبر ۵۲ء)

عورت اور عورت کا جنسی اختلاط

س: اِن دنوں زنانہ کالجوں کی مسموم فضا میں لڑکیوں کے اندر عجیب وبائیں پھیل رہی ہیں۔ بالعموم دو لڑکیوں کی دوستیِ خلوص اور محبت کی حدُود سے گزر کر جنسی محبت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ شرعاً یہ کس درجہ کا گناہ ہے...... کبیرہ یا صغیرہ؟

ج: مَرد اور مَرد کی جنسی محبت جتنا بڑا گناہ ہے، عورت اور عورت کی محبت بھی اُتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ اخلاقی حیثیت سے اِن دونوں میں نہ نوعیت کا فرق ہے اور نہ درجے کا۔ افسوس ہے کہ یہ نام نہاد 'ادبِ لطیف' جو رسالوں اور افسانوں اور ناولوں کی شکل میں گھر گھر پہنچ رہا ہے اور یہ فحش تصویریں اور فلم جنھیں آزادی کے ساتھ مَردوں کی طرح عورتیں بھی دیکھ رہی ہیں اور یہ عشق آموز گانے جو ریڈیو کی برکت سے بچے بچے کی زبان پر چڑھ رہے ہیں اور یہ اختلاطِ مَرد و زَن جس کو روز بروز ہماری سوسائٹی میں فروغ نصیب ہو رہا ہے، ان ساری چیزوں نے مِل جُل کر نوجوان مَردوں کی طرح نوجوان لڑکیوں کو بھی غیر معمولی جذباتی ہیجان میں مُبتلا کر دیا ہے۔ شہوانی جذبات کی ایک بھٹی ہے جو سینوں میں بھڑکا دی گئی ہے اور بہت سی دُھونکنیاں ہر آن اُسے زیادہ سے زیادہ بھڑکانے میں لگی ہوئی ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بگاڑ اب تک زیادہ تر مَردوں میں پایا جاتا تھا وہ ایک وَبا کی طرح شریف گھروں کی لڑکیوں اور درسگاہوں کی طالبات اور اُستانیوں میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ جن خواتین کو زنانہ درسگاہوں کے حالات قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا ہے، اُن کی اطلاع یہ ہے کہ آج لڑکیوں میں جو بے حیائی، بے باکی، جنسی مسائل پر کھلی کھلی گفتگو کرنے کی جرأت اور جنسی رجحانات...... فطری اور غیر فطری ہر دو طرح کے رجحانات...... کے اظہار و اعلان کی عام جسارت پائی جاتی ہے، چند سال پہلے تک اس کا تصوّر کرنا مشکل تھا۔ اب لڑکیوں میں یہ چرچے عام ہو رہے ہیں کہ کون سی صاحبزادی کس اُستانی کی منظورِ نظر ہیں اور کون سی صاحبزادی کس دُوسری صاحبزادی کے عشق میں مُبتلا ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون!۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لُطف یہ ہے کہ اِس جہنم کی طرف جو لوگ اپنی قوم کو دھکیل رہے ہیں وہ اپنی اب تک کی کوششوں کے نتائج سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ اُنھیں حسرت یہ ہے کہ کاش مُلّا کی مخالفت و مزاحمت راہ میں حائل نہ ہوتی تو وہ ترقی کے مزید قدم ذرا جلدی جلدی اُٹھا سکتے۔

(رسائل و مسائل، دوم، مارچ ۸۲ء، ص ۳۹۹-۴۰۰، بحوالہ ترجمان القرآن، جون جولائی ۵۲ء)

ایامِ ماہواری میں بیوی کے ساتھ تعلقات کے حدود: وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى یَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ○ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (البقرہ ۲: ۲۲۲-۲۲۳) پوچھتے ہیں: حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو: وہ ایک گندگی کی حالت ہے۔ اس میں عورتوں سے الگ رہو اور اُن کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں، تو اُن کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے، جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو، اپنی کھیتی میں جاؤ۔ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے اور اے نبیؐ! جو تمھاری ہدایات کو مان لیں اُنھیں فلاح و سعادت کا مژدہ سُنا دو۔

وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ اصل میں اَذًی کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی گندگی کے بھی ہیں اور بیماری کے بھی۔ حیض صرف ایک گندگی ہی نہیں ہے، بلکہ طبی حیثیت سے وہ ایک ایسی حالت ہے، جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے قریب تر ہوتی ہے۔

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ قرآنِ مجید اِس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس نے 'الگ رہو' اور 'قریب نہ جاؤ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اُسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہنود اور بعض دُوسری قوموں کا دستور رہا ہے[۱]۔ نبی ﷺ نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔ یہاں حکم سے مُراد حکمِ شرعی نہیں ہے، بلکہ وہ فطری حکم مُراد ہے، جو انسان اور حیوان، سب کی جبلّت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر متنفس بالطبع واقف ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ فطرتاً اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیرگاہ نہیں بنایا ہے، بلکہ اُن

۱۔ یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اُس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے، نہ اُس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اُس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دِنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (سورۃ البقرہ کی) اس آیت کی رُو سے حکم دیا کہ ایامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلقات عورتوں کے ساتھ اُسی طرح رکھے جائیں جس طرح دُوسرے دِنوں میں ہوتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۵، ۲، نساء، حاشیہ ۲۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا، بلکہ اِس لیے جاتا ہے کہ اُس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اِس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اِس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اِس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اُس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں اور اُس غرض کے لیے جاؤ کہ اُس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ جامع الفاظ ہیں جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک یہ کہ اپنی نسل قائم رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمھارے دُنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دُوسرے یہ کہ آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو اُس کو دین، اخلاق اور آدمیت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرے میں اس بات پر بھی تنبیہ فرمادی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً کوتاہی کی تو اللہ تم سے باز پرس کرے گا۔

(تفہیم القرآن، اوّل ص ۱۶۹-۱۷۱، البقرہ حواشی: ۲۳۸-۲۴۲)

.... ○○○ ....

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دہم

ضبطِ ولادت

ضبطِ ولادت بصورتِ عزل

سوال: آج کل ضبطِ ولادت کو خاندانی منصوبہ بندی کے عنوانِ جدید کے تحت مقبولِ عام بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے حق میں معاشی دلائل کے علاوہ بعض لوگوں کی طرف سے مذہبی دلائل بھی فراہم کیے جارہے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جارہا ہے کہ حدیث میں عزل کی اجازت ہے اور برتھ کنٹرول کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اب حکومت کی طرف سے مَردوں کو بانجھ بنانے کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جارہی ہیں۔ چنانچہ بعض ایسے ٹیکے ایجاد ہورہے ہیں جن سے مَرد کا جوہرِ حیات اس قابل نہیں رہتا کہ وہ افزائش نسل کا ذریعہ بن سکے۔ لیکن جنسی لذت برقرار رہتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ طریقہ بھی شرعاً قابلِ اعتراض نہیں اور نہ یہ قتلِ اولاد یا اسقاطِ حمل ہی کے ضمن میں آسکتا ہے۔ براہِ کرم اس بارے میں بتائیں کہ آپ کے نزدیک اسلام اس طرزِ عمل کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟

جواب: آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ عزل کے متعلق جو کچھ آنحضور ﷺ سے پوچھا گیا اور اُس کے جواب میں جو کچھ حضور ﷺ نے بیان فرمایا اُس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا۔ ضبطِ ولادت کی کوئی عام دعوت تحریک ہرگز پیشِ نظر نہ تھی۔ نہ ایسی کسی تحریک کا مخصوص فلسفہ تھا جو عوام میں پھیلایا جارہا ہو، نہ ایسی تدابیر وسیع پیمانے پر ہر مرد و عورت کو بتائی جارہی تھیں کہ وہ باہم مباشرت کرنے کے باوجود استقرارِ حمل کو روک سکیں اور نہ حمل کو روکنے والی دوائیں اور آلات ہر کس و ناکس کی دست رس تک پہنچائے جارہے تھے۔ عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں اُن کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضور ﷺ نے انھیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبی ﷺ سے حدیث میں منقول ہیں، اُن سے اگر عزل کا جواز[1] نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبطِ ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جاسکتا جس کی پُشت پر ایک باقاعدہ خالص مادّہ پرستانہ اور اباحیت پسندانہ فلسفہ کار فرما ہے۔ ایسی کوئی تحریک اگر آنحضور ﷺ کے سامنے اُٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اُس کے خلاف ویسا

۱۔ عزل سے متعلق احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۲۵۳-۲۵۹

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

ہی جہاد کرتے جیسا شرک و بُت پرستی کے خلاف آپؐ نے کیا۔ میں ہر اُس شخص کو جو عزل سے متعلق آنحضور ﷺ کے ارشادات کا غلط استعمال کر کے اُنھیں موجودہ تحریک کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے خدا سے ڈراتا ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ وہ رسولِ خدا ﷺ کے مقابلے میں اس جسارت سے باز رہے۔ مغرب کی بے خدا تہذیب و فکر کی پیروی اگر کسی کو کرنی ہو تو سیدھی طرح اُسے دینِ مغرب سمجھ کر ہی اختیار کرے۔ آخر وہ اُسے عین خدا اور رسول کی تعلیم قرار دے کر خدا کا مزید غضب مول لینے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۸۸-۲۹۱، بحوالہ ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۶۰ء)

قصداً بانجھ بننا

اسلام جس طرح ضبطِ ولادت کی عمومی تحریک کو روا نہیں رکھتا۔ اسی طرح وہ قصداً بانجھ بننے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ یہ کہنا کہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو بانجھ کر لینا کوئی ناجائز کام نہیں ہے، اُتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا غلط ہے کہ آدمی کا خودکشی کر لینا جائز ہے۔ دراصل اس طرح کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے نزدیک آدمی اپنے جسم اور اُس کی قوّتوں کا خود مالک ہے اور اپنے جسم اور اُس کی قوّتوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر لینے کا حق رکھتا ہے۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے جاپانی خودکشی کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس غلط خیال کی وجہ سے بعض جوگی اپنے ہاتھ یا پاؤں یا زبان بیکار کر لیتے ہیں، لیکن جو شخص اپنے آپ کو خدا کا مملوک سمجھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ یہ جسم اور اُس کی قوّتیں خدا کا عطیہ اور اُس کی امانت ہیں، اُس کے نزدیک اپنے آپ کو بانجھ کر لینا ویسا ہی گناہ ہے جیسا کسی دُوسرے انسان کو زبردستی بانجھ کر دینا یا کسی کی بینائی ضائع کر دینا گناہ ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۹۱)

ضبطِ ولادت کی تحریک کے نتائج

سوال: دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے آج اسلام کیا حل پیش کرتا ہے؟ برتھ کنٹرول (پیدائش روکنے) کے لیے دواؤں کا استعمال، فیملی پلاننگ وغیرہ کو کیا آج بھی غیر شرعی قرار دے کر ممنوع قرار دیا جائے گا؟

جواب: دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے رزق کے جو ذرائع پیدا کیے ہیں اُن کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جائے اور جو ذرائع اب تک مخفی ہیں اُن کو دریافت کرنے کی پیہم سعی کی جاتی رہے۔ آبادی روکنے کی ہر کوشش خواہ وہ قتلِ اولاد ہو یا اسقاطِ حمل یا منعِ حمل، غلط اور بے حد تباہ کُن ہے۔ ضبطِ ولادت کی تحریک کے چار نتائج ایسے ہیں جن کو رُونما ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا:

۱- زنا کی کثرت۔

۲- انسان کے اندر خود غرضی اور اپنا معیارِ زندگی بڑھانے کی خواہش کا اس حد تک ترقی کر جانا کہ اُسے اپنے بوڑھے ماں باپ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اپنے یتیم بھائیوں اور اپنے دُوسرے محتاجِ امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی روٹی میں خود اپنی اولاد کو شریک کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ دُوسروں کو بھلا کیسے شریک کر سکے گا۔

۳- آبادی کے اضافے کا کم سے کم مطلوب معیار بھی جو ایک قوم کو زندہ رکھنے کے لیے ناگزیر ہے برقرار نہ رہنا۔ اس لیے کہ جب یہ فیصلہ کرنے والے افراد ہوں گے کہ وہ کتنے بچے پیدا کریں اور کتنے نہ کریں، اور اس فیصلہ کا مدار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو نئے بچوں کی آمد کی وجہ سے گرنے نہ دیں تو بالآخر وہ اتنے بچے بھی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے جتنے ایک قوم کو اپنی قومی آبادی برقرار رکھنے کی لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس طرح کے حالات سے کبھی کبھی نوبت یہ بھی آجاتی ہے کہ شرحِ پیدائش شرحِ اموات سے کم تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ فرانس دیکھ چکا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کو "بچے زیادہ پیدا کرو" کی تحریک چلانی پڑی اور انعامات کے ذریعے سے اُس کی ہمت افزائی کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔

۴- قومی دفاع کا کمزور ہو جانا۔ یہ نتیجہ خصوصی طور پر ایک ایسی قوم کے لیے بے حد خطرناک ہے جو اپنے سے کئی گُنا زیادہ دُشمن آبادی میں گھری ہوئی ہے۔ پاکستان کے تعلقات ہندوستان اور افغانستان کے ساتھ جیسے کچھ ہیں سب کو معلوم ہیں اور امریکہ کی دوستی نے کمیونسٹ ممالک سے بھی اُس کے تعلقات خراب کر دیے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان، چین، رُوس اور افغانستان کی آبادی ہم سے تیرہ گُنی ہے۔ اِن حالات میں لڑنے کے قابل افراد کی تعداد گھٹانا جیسی کچھ عقلمندی ہے اسے ایک صاحبِ عقل آدمی خود سوچ سکتا ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۹۲-۲۹۴، بحوالہ ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۶۰ء)

عزل کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

عرب جاہلیت میں برتھ کنٹرول کے لیے قتل کا طریقہ رائج تھا جس کے دو وجوہ تھے۔ ایک معاشی حالات کی خرابی، جن کی وجہ سے ماں باپ اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے تاکہ اُن کے رزق میں کوئی شریک پیدا نہ ہو۔ دُوسرے غیرت کا خدا سے بڑا ہوا جذبہ جو لڑکیوں کے قتل کا محرک ہوتا تھا۔ اسلام نے آ کر اُس کو سختی کے ساتھ منع کیا اور اس باب میں عربوں کی ذہنیت ہی بدل دی۔

اس کے بعد مسلمانوں کا رجحان عزل یعنی "مباشرت بلا انزال فی الفرج" کی طرف راغب ہوا۔ لیکن یہ رجحان عام نہ تھا، نہ برتھ کنٹرول کی کوئی تحریک جاری ہوئی تھی، نہ اُس کو قومی پالیسی بنانا مقصود تھا، نہ اُس کے محرک وہ عہد جاہلیت کے جذبات و خیالات تھے جن کی وجہ سے قتلِ اولاد کے ظالمانہ طریقے پر عمل کیا جاتا تھا۔ بلکہ دراصل اس کے تین وجوہ تھے جو احادیث کے تتبع سے ہم کو معلوم ہوتے ہیں:

۱- ایک یہ خیال کہ لونڈی سے اولاد پیدا نہ ہو۔

۲- دوسرے یہ کہ لونڈی کے اُمِ ولد[1] بن جانے سے یہ خوف تھا کہ اُس کو پھر ہمیشہ اپنے پاس رکھنا ہوگا۔

۱- یعنی بچے کی ماں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۳- تیسرے یہ کہ زمانۂ رضاعت میں حمل ٹھیر جانے سے شیر خوار بچے کو نقصان پہنچ جانے کا خوف تھا۔

اِن وجوہ سے مخصوص حالات میں بعض صحابہ نے عزل کی ضرورت محسوس کی اور یہ دیکھ کر کہ اس فعل کے عدمِ جواز کا کوئی صریح حکم کتاب وسنّت میں نہیں آیا ہے۔ اِس پر عمل کیا، مثلاً ابن عباس، سعد بن ابی وقاص اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم۔ انھی بزرگوں میں سے ایک بزرگ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی ہیں جنھوں نے شارع کے سکوت کو رضا پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ اُن سے جو احادیث مروی ہیں اُن کے الفاظ یہ ہیں:

كُنَّا نَعْزِلُ علی عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عزل کرتے تھے۔

كُنَّا نَعْزِلُ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ ، ہم عزل کرتے تھے اس حالت میں کہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

كُنَّا نَعْزِلُ علی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ ، ہم عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عزل کرتے تھے جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا[1]۔

اِن احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور اُن کے ہم خیال صحابہ رضی اللہ عنہم نے عزل کے بارے میں کوئی صریح حکم نہ ہونے کو جواز کی دلیل سمجھا۔ ایک اور حدیث جو انھی صحابی سے امام مسلم نے نقل کی ہے یہ ہے کہ "ہم عہدِ رسالت میں عزل کرتے تھے، اِس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی اور آپؐ نے ہم کو منع نہ فرمایا"۔ اِس حدیث میں بھی ابہام ہے۔ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ عزل کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھا گیا یا نہیں اور پوچھا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر کیا فرمایا۔

دُوسری احادیث یہ بتاتی ہیں کہ اِس مسئلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں اور ہم نے عزل کیا، پھر اِس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تم ایسا کرتے ہو؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟ قیامت تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے"۔ (بخاری)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اُنھی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بنی المُصطلق میں ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں۔ اہل وعیال سے دوری ہم پر شاق گزر رہی تھی۔ ہم نے چاہا کہ اُن عورتوں سے استمتاع کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہماری خواہش یہ بھی تھی کہ اُن کو فروخت کر دیں۔ اِس لیے ہم نے خیال کیا کہ اُن سے عزل کرنا چاہیے تاکہ اولاد پیدا نہ ہو۔ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا: مَا عَلَيْكُمْ أَنْ لَا تَفْعَلُوا مَا مِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا وَهِيَ كَائِنَةٌ ، کیا بگڑ جائے اگر تم ایسا نہ کرو۔ قیامت تک جو بچے پیدا ہونے والے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے۔

مسلم کی حدیث میں ہے کہ جب عزل کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: لَا عَلَيْكُمْ أَنْ لَا تَفْعَلُوْا ذَالِكَ ، اگر تم ایسا نہ کرو تو کچھ نقصان نہ ہو جائے گا۔ ایک دُوسری حدیث میں ہے وَلِمَ يَفْعَلُ ذَالِكَ اَحَدُكُمْ ، تم میں سے کوئی یہ فعل کیوں کرے[2]؟

---

[1] تخریج کے لیے دیکھیے تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۳۰-۳۳۸، اشاعت اوّل ۲- ایضاً ج ۵، ص ۳۳۶-۳۳۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ میرے پاس ایک لونڈی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس سے اولاد ہو۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا:

اِعْزِلْ عنها إنْ شئتَ فإنّه سيأتيها ما قُدِرَ لها "تو چاہے تو عزل کرلے مگر جو اولاد اس کی تقدیر میں لکھی ہے وہ پیدا ہو کر رہے گی۔"

ان کے علاوہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ترمذی نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ صحابہ میں سے جو اہل علم تھے وہ عموماً عزل کو مکروہ سمجھتے تھے۔ مؤطا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جو عزل کو ناپسند کرتے تھے۔

ان سب روایات کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس فعل کی اجازت نہ دی تھی بلکہ آپ اس کو عبث اور ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے اور آپ کے جن اصحاب کو تفقہ فی الدین کا مرتبہ حاصل تھا وہ بھی اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ لیکن چونکہ عزل کی کوئی عام تحریک قوم میں جاری نہیں ہوئی تھی اور اس کو ایک عام تمدنی طرزِ عمل نہیں بنایا جا رہا تھا بلکہ محض چند افراد اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کی بنا پر اس فعل کا ارتکاب کرتے تھے، اس لیے آپ نے اس کی ممانعت کا کوئی قطعی اعلان بھی نہ فرمایا۔ اگر اس وقت برتھ کنٹرول کی کوئی عام تحریک شروع ہوتی تو یقیناً حضور ﷺ نہایت سختی کے ساتھ روکتے۔

عزل پر ضبطِ ولادت کے دوسرے طریقوں کو بھی قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو شارع نے صرف اس وجہ سے حرام نہیں کیا کہ بعض حالات میں انسان فی الواقع ان کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور احتیاط کا مقتضٰی یہی ہے کہ ان کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ مثلاً حمل ٹھیرنے سے عورت کی جان کا خطرے میں پڑ جانا۔ یا اس کی صحت کو غیر معمولی نقصان پہنچنے کا خوف۔ یا زمانہ رضاعت میں شیر خوار بچے کو مضرت پہنچنے کا اندیشہ یا اور ایسے ہی دوسرے وجوہ۔ ایسے حالت میں اگر طبی مشورے سے ضبطِ ولادت کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ جائز ہے، لیکن بلاضرورت اس کو ایک عام طرزِ عمل اور قومی پالیسی بنانا احکامِ اسلام کے قطعاً خلاف ہے اور وہ تمام خیالات جن کی بنا پر ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے، اُصولِ اسلام کے بالکل منافی ہیں۔

(اسلام اور ضبطِ ولادت، مئی ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۱-۱۳۵)

افلاس کے اندیشے سے منعِ حمل

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۱) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔

یہ آیت اُن معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اُٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا اور آج وہ ایک تیسری تدبیر، یعنی منعِ حمل کی طرف دُنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشورِ اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر اُن تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اِس دفعہ کی رُو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزایشِ نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اُس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے۔ بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دُنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے اُتنے ہی، بلکہ بار ہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

یہ اُسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے دَور سے لے کر آج تک کسی دَور میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کُشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہونے پایا۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۲۳، بنی اسرائیل حاشیہ ۳۱)

اسقاطِ حمل

سوائے ایسی صُورت کے جس میں ماں کی جان کے لیے خطرہ ہو، اسقاطِ حمل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اسقاط بھی ایک قسم کا قتل ہی ہے، صرف یہ بات کہ کوئی عورت یا بیوی اور شوہر دونوں مزید بچے نہیں چاہتے ایک جان کو ہلاک کرنے کے لیے کافی وجہ جواز نہیں ہے۔

(مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، دوم، نومبر ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۹)

[قرآن میں ارشادِ ربانی ہے] وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔ اِس میں اسقاطِ حمل بھی شامل ہے خواہ وہ جائز حمل کا اسقاط ہو یا ناجائز حمل کا۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۴۶، الممتحنہ حاشیہ ۲۰)

آلات کے ذریعے توالد و تناسل

سوال: کیمیاوی آلات کے ذریعے سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اُس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل مضرت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اِس اَمر کا خیال رکھیے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حصے کی نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کر دے تو پھر اُس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ امریکہ میں اِس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے۔

جواب: آلات کے ذریعے استقرارِ حمل کا جواز تو دُور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصور ہی ناقابلِ برداشت ہے کہ عورت گھوڑی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنفِ اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجیے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے نروں سے ملنے کا لُطف حاصل نہیں کرنے دیتا اور اُن سے صِرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کی اپنی 'مادہ' کے ساتھ بھی یہی برتاؤ شروع ہو جائے تو اُس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔

آج کی 'فیشن دار' عورت جو مَرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اُس کی فطرت کو مصنوعی فکری وصنفی ماحول نے مسخ کر دیا ہے۔ ورنہ اگر وہ صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اِس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے، بلکہ عورت اور مَرد کا تعلق انسانی تمدّن کی قدرتی بنیاد ہے۔ فطرتِ الٰہی نے عورت اور مَرد کو اِس لیے پیدا کیا ہے کہ اُن میں مودّت اور رحمت ہو، حسنِ معاشرت ہو، مِل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشو و نما حاصل کرے۔ اِس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مَرد کے درمیان نِکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قیدِ نِکاح میں پیدا ہو۔ اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اُسے حلالی نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔ نیز اُس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہو گا اور وہ باپ کے ورثے سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اُس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجیے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اُس کی تربیت کا ذِمّہ دار کون ہو گا؟ صِرف ماں؟ کیا یہ ظُلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچے کے لیے ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں اُن میں سے آدھے ساقط کر دیے جائیں اور وہ صِرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دُنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذِمّہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذِمّہ داری تو قائم رہے مگر مَرد ہمیشہ کے لیے باپ ہونے کی ذِمّہ داری سے سبکدوش ہو جائے؟

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے 'امتحانی نلیوں' میں پالا جائے۔ یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی، عورت چاہے گی کہ اُسے صِرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اِس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے وہ تیار نہ ہو گی۔

یہ صورت جب رونما ہو گی تو انسانی بچے اُسی طرح 'کثیر پیداآوری' (mass production) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اُس کا اسفل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

السافلین ہوگا۔ ان 'کارخانہ ہائے نسل کشی' سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے، جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات واحساسات کی خو برائے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہوگا جو تمدن کی رنگا رنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔ اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، تمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۹۷-۲۰۱، بحوالہ ترجمان القرآن، جنوری فروری ۱۹۴۴ء)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

احکام طلاق و خلع وغیرہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

طلاق

طلاق اور اُس کی شرائط

اصطلاحِ شرع میں طلاق سے مُراد وہ علیحدگی ہے جس کا حق مَرد کو دیا گیا ہے۔ مَرد اپنے اِس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے اُن حقوقِ زوجیت سے دست بردار ہو سکتا ہے جن کو اس نے مَہر کے معاوضے میں حاصل کیا تھا۔ مگر شریعت طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ اَبغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے[1]۔ اور تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ، شادیاں کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا[2]۔ اِس لیے مَرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے۔

قرآنِ مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو، تو جہاں تک ہو سکے اُس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النسآء ۴:۱۹) اُن کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اُسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے[3]۔

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۰۶-۱۰۷، اشاعت سوم ۲- ایضاً، ج ۵، ص ۱۲۱-۱۲۲

۳- یعنی اگر عورت خوب صورت نہ ہو، یا اُس میں کوئی ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اُسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتیٰ الامکان اُسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوب صورت نہیں ہوتی، مگر اُس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسنِ صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اُسے اپنی اُن خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداً محض اس کی صورت کی خرابی سے دِل برداشتہ ہو رہا تھا، اُس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اِس سے بددل ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے تو اُس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اُس کی بیوی بُرائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اُس کو طلاق دے دو، مگر یک لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔ ایک ایک طُہر کے فاصلے سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے طُہر کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے یا عورت کے رویّے میں کوئی خوش آئند تغیر ہو جائے۔ یا خود تمھارا ہی دِل بدل جائے۔ البتہ اگر اُس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمھارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیے تو پھر چاہو تو تیسرے طُہر پر آخری طلاق دے دو، ورنہ رُجوع کیے بغیر یوں ہی عدت گذر جانے دو[1]۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۖ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ (البقرہ ۲۲۹:۲) طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا پھر شریفانہ طریقے سے چھوڑ دیا جائے۔

وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ .... وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا ؕ (البقرہ ۲۲۸:۲) مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک انتظار میں رکھیں .... اگر اُن کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت میں وہ اُن کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہوں گے۔

اس کے ساتھ حُکم یہ ہے کہ تین حیضوں کی اِس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے بھیج نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو۔ ممکن ہے کہ ساتھ رہنے بسنے سے دِل ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰ لِكَ اَمۡرًا ۝ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ (الطلاق ۶۵:۱-۲) جب تم عورتوں کو طلاق دو تو زمانہ عدت میں رُجوع کی گنجایش رکھتے ہوئے طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور اُن کو گھروں سے نکال نہ دو اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی بُرائی کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظُلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اِس کے بعد کوئی (اصلاح کی) صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ مدت مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں تو یا اُن کو بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے جُدا ہو جاؤ۔

پھر حالت حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا اور حُکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طُہر کی حالت میں دو۔ اِس کی دو وجہیں ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالکل آخری چارہ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ اَبۡغَضُ الۡحَلَالِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی الطَّلَاقُ، یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تَزَوَّجُوا وَلَا تُطَلِّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيۡنَ وَالذَّوَّاقَاتِ، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے پھریں۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۲۳۴-۲۳۵، النساء حاشیہ ۳۰)

۱- احسن طریقہ یہ ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق نہ دی جائے۔ بلکہ یوں ہی عدت گزر جانے دی جائے۔ اِس صورت میں یہ موقع باقی رہتا ہے کہ اگر یہ زوجین باہم نکاح کرنا چاہیں تو دوبارہ ان کا نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن تیسری بار طلاق دینے سے طلاق، مغلّظ ہو جاتی ہے جس کے بعد تحلیل کے بغیر سابق زن وشوہر کا ایک دوسرے سے پھر نکاح نہیں ہوسکتا۔ افسوس یہ ہے کہ لوگ بالعموم اس مسئلے سے ناواقف ہیں۔ اور جب طلاق دینے پر آتے ہیں تو چھوٹتے ہی تین طلاق دے ڈالتے ہیں۔ بعد میں پچھتاتے ہیں اور مفتیوں سے حیلے پوچھتے پھرتے ہیں۔ [مؤلف]

www.KitaboSunnat.com
" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک یہ کہ حیض کی حالت میں عموماً عورتیں چڑچڑی اور بدمزاج ہو جاتی ہیں اور اُن کے جسمانی نظام میں کچھ ایسا تغیر واقع ہو جاتا ہے کہ بلا ارادہ اُن سے وہ باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں، جنھیں عام حالت میں وہ خود پسند نہیں کرتیں، یہ ایک طبّی حقیقت ہے۔ اس لیے زمانہ حیض میں میاں اور بیوی میں جو نزاع واقع ہو جائے اُس پر طلاق دینے سے منع کر دیا گیا ہے۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں زوجین کے درمیان وہ جسمانی تعلق نہیں ہوتا جو اُن کی باہمی دلچسپی و چسپیدگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس زمانے میں دونوں کے درمیان بدمزگی پیدا ہو جانا بعید نہیں ہے۔ یہ رکاوٹ دُور ہو جانے کے بعد توقع کی جا سکتی ہے کہ شاید جذباتِ لطیف زوجین کو پھر باہم شیر و شکر کر دیں اور وہ غبار دُور ہو جائے جو شوہر کو طلاق کی طرف مائل کر رہا تھا۔

انھی وجوہ سے نبی ﷺ نے حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانے میں طلاق دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سُن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اُسے حکم دو کہ رُجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے۔ ایک دُوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو اس فعل پر توبیخ فرمائی اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی:

''ابن عمر! تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طُہر کا انتظار کرو۔ پھر ایک ایک طُہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ (تیسری مرتبہ) طاہر ہو تو اُس وقت یا طلاق دے دو یا اُس کو روک لو''۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہِ اَرءَ یتَ لَوْ کُنْتُ طَلَّقتُهَا ثَلَاثًا اَکَانَ لِی اَنْ اُرَاجِعَهَا، اگر میں اُس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رُجوع کا حق باقی رہتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا کَانَتْ تَبِیْنُ وَ تَکُوْنُ مَعْصِیَۃً نہیں وہ جُدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا[1] (دار قطنی و ابن ابی شیبہ)۔

طلاق ثلاثہ گناہ ہے

اِس سے ایک اور بات معلوم ہوئی، وہ یہ کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے۔ دراصل یہ فعل شرعِ اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے۔ اور اس سے اللہ کی وہ حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام کا سورۂ طلاق میں سخت تاکیدی حکم دیا گیا ہے[2]۔ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ جو شخص مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا اُن کے پاس آتا، وہ اُس کو مارتے

۱- ایک روایت میں آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ: اِذًا قد عصیتَ رَبَّکَ وَ بَانَتْ مِنْکَ، اگر تم ایسا کرتے تو اپنے رب کی نافرمانی کرتے اور تمھاری بیوی تم سے جدا ہو جاتی۔ (اس پوری حدیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۲۳ اور ۱۲۵، اشاعت سوم)

۲- جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم بیان کر آئے ہیں، شریعت کا منشا تو یہ ہے کہ جواز دواجی تعلق ایک مرتبہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان قائم ہو گیا اُسے حتی الامکان برقرار رکھا جائے۔ اور اگر توڑا بھی جائے تو اُس وقت جب کہ نباہ اور مصالحت کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہوں۔ اس بنا پر شریعت چاہتی ہے کہ جو شخص بھی طلاق دے خوب سوچ سمجھ کر دے اور طلاق دینے پر بھی صلح صفائی کا دروازہ تین حیضوں تک کھلا رہے۔ مگر جو شخص بیک وقت تین طلاق دیتا ہے وہ ان تمام مصلحتوں کو ایک ہی وار میں کاٹ پھینکتا ہے۔

''محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ''

www.KitaboSunnat.com

تھے اور اُس کے بعد زَوجین کو جُدا کر دیتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اُس کا کیا حُکم ہے؟ آپؓ نے فرمایا: اِنَّهٗ قَدْ عَصٰی رَبَّهٗ وَ بَانَتْ اِمْرَأَتُهٗ (ابن جریر) اِس شخص نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی عورت اس سے جُدا ہوگئی''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لَوْ اَنَّ النَّاسَ اَصَابُوْا حَدَّ الطَّلَاقِ مَانَدِمَ اَحَدٌ عَلٰی امْرَأَتِهٖ، اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے تو کسی شخص کو اپنی بیوی کے جُدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا''۔

(حقوق الزّوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۵۱-۵۶)

ایک ہی مجلس[1] میں تین طلاقیں

بیک وقت تین طلاقیں دے کر عورت کو جُدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے اُمّت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اِس اَمر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاقِ رجعی کے حُکم میں ہیں یا تین طلاقِ مغلّظہ کے حُکم میں۔ لیکن اِس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اُس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے طلاق کے لیے مقرر فرمایا ہے اور اُس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور ﷺ غصہ میں آ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اَیُلْعَبُ بِکِتٰبِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ[2] کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمھارے درمیان موجود ہوں۔ بعض دُوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضور ﷺ نے اس فعل کو معصیت فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص اِن کے پاس مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اُس کو دُرّے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ہمارے زمانے میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ کسی فوری جذبے کے تحت اپنی بیویوں کو جھٹ طلاق دے ڈالتے ہیں۔ پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستُور سابق تعلّقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لیے متعدد دُوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ اِن خرابیوں کا سدِ باب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل

۱- ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کرنا۔

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۳۳، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا ارتکاب نہ کرسکیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں۔ عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے اور ہرجانہ کی مقدار کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اِس کے علاوہ اور صورتیں بھی روک تھام کی نکل سکتی ہیں۔ جن کو ہمارے علما و ماہرینِ قانون غور وخوض کے بعد تجویز کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مسئلے کو کثرت سے لوگوں میں شائع کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ فعل ناجائز ہے تاکہ جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اس میں مُبتلا ہوتے ہیں وہ آگاہ ہوجائیں۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۰-۱۵۱)

تین طلاقیں جہالت کا کرشمہ: یہ جہالت ہی کا کرشمہ ہے کہ مسلمان بالعموم طلاق دینے کے صرف ایک ہی طریقے سے واقف ہیں اور وہ یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں۔ حتیٰ کہ طلاق کی دستاویز لکھنے والے بھی جب لکھتے ہیں، تین ہی طلاق لکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں یہ بدعت اور سخت گناہ ہے۔ اِس سے بڑی قانونی پیچیدگیاں واقع ہوجاتی ہیں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ایک طلاق دینے سے وہ مقصد بھی حاصل ہوجاتا ہے جس کے لیے تین طلاقیں دی جاتی ہیں اور اس صورت میں عدّت کے اندر رُجوع اور عدّت گزر جانے پر دوبارہ نِکاح کر لینے کا موقع بھی باقی رہتا ہے، تو کتنے ہی گھر تباہ ہونے سے اور کتنے ہی بندگانِ خدا جھوٹ اور حیلہ بازیوں اور دُوسری قانون شکنیوں سے بچ جاتے۔

(حاشیہ حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۲)

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت رکاوٹ یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاقِ مُغلّظہ[1] دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نِکاح نہیں کرسکتا تاوقتیکہ وہ عورت ایک دُوسرے شخص سے نِکاح نہ کرلے اور وہ دُوسرا مَرد اِس سے لُطف اندواز ہوچکنے کے بعد برضا و رغبت اُسے طلاق نہ دے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ (البقرہ ۲: ۲۳۰) پھر اگر وہ اُس کو تیسری بار طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوسکتی جب تک وہ ایک دُوسرے مَرد سے نِکاح نہ کرلے۔

یہ ایک ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو تیسری طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا اور اُس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک وہ اس اَمر کا قطعی فیصلہ نہ کرلے کہ اُسے اس عورت کے ساتھ نِباہ کرنا ہے یا نہیں۔

بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لیے یہ حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت کو تین بار طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اُس سے پھر نِکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نِکاح کسی دُوسرے شخص سے کرادے اور پھر کچھ دے دِلا کر اُس کو خلوت سے پہلے طلاق دِلوا دے۔ لیکن نبی ﷺ نے صاف تصریح فرمادی ہے کہ تحلیل کے لیے محض نِکاحِ تزویج کافی نہیں ہے، بلکہ عورت اُس وقت تک پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوسکتی جب تک کہ دُوسرا شوہر اُس سے لُطفِ صحبت حاصل نہ کرلے۔

لَا تَحِلُّ لِزَوْجِهَا الْأَوَّلِ حَتَّى يَذُوقَ الْآخِرُ عُسَيْلَتَهَا وَتَذُوقَ عُسَيْلَتَهُ

۱۔ یعنی تین طلاق جن کے بعد عورت دوبارہ اس شوہر کے نِکاح میں نہیں آسکتی، تاوقتیکہ اُس کا نکاح کسی اور شخص سے ہوکر فُرقت واقع نہ ہوجائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھر جو شخص محض اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے اُس کا نکاح کرائے اور جو ایسا سازشی نکاح کرے اُن دونوں پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی۔ لَعنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهٗ۔ اور ایسے شخص کو آپ تیس مُستعَار (کرائے کے سانڈ) سے تشبیہ دیتے ہیں۔ فی الواقع اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت اُن علما پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں[1]۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۵۷-۵۸)

ضابطۂ طلاق، قرآن وسنّت اور فقہا کی تصریحات کی روشنی میں

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ (الطلاق ۶۵:۱) اے نبیؐ! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انھیں اُن کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو۔ اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو۔

یعنی تم لوگ طلاق دینے کے معاملے میں یہ جلد بازی نہ کیا کرو کہ جوں ہی میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا فوراً ہی غصّے میں آکر طلاق دے ڈالی اور نکاح کا جھٹکا اس طرح کیا کہ رُجوع کی گنجایش بھی نہ چھوڑی۔ بلکہ جب تمھیں بیویوں کو طلاق دینا ہو تو اُن کی عدت کے لیے دیا کرو۔

عِدّت کے لیے طلاق دینے کا مطلب

عدّت کے لیے طلاق دینے کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی یہاں مُراد ہیں۔

۱- عدّت کا آغاز کرنے کے لیے: ایک مطلب اِس کا یہ ہے کہ عدّت کا آغاز کرنے کے لیے طلاق دو یا بالفاظِ دیگر اُس وقت طلاق دو جس سے اُن کی عدّت شروع ہوتی ہو۔ یہ بات سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸ میں بتائی جا چکی ہے کہ جس مدخولہ عورت کو حیض آتا ہو اُس کی عدت طلاق کے بعد تین مرتبہ حیض آنا ہے۔ اس حُکم کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو عدّت کا آغاز کرنے کے لیے طلاق دینے کی صورت لازماً یہی ہوسکتی ہے کہ عورت کو حالتِ حیض میں طلاق نہ دی جائے، کیونکہ اُس کی عدت اُس حیض سے شروع نہیں ہوسکتی جس میں اُسے طلاق دی گئی ہو اور اس حالت میں طلاق دینے کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ اللہ کے حُکم کے خلاف عورت کی عدّت تین حیض کے بجائے چار حیض بن جائے۔ مزید برآں اس حُکم کا تقاضا یہ بھی ہے کہ عورت کو اُس طُہر میں طلاق نہ دی جائے جس میں شوہر اُس سے مباشرت کر چکا ہو، کیونکہ اس صورت میں طلاق دیتے وقت شوہر اور بیوی دونوں میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ آیا مباشرت کے نتیجے میں کوئی حمل قرار پا گیا ہے یا نہیں۔ اس وجہ سے عدّت کا آغاز نہ اس مفروضے پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ عدت آیندہ حیضوں کے اعتبار سے ہوگی اور نہ اسی مفروضے پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ حاملہ عورت کی عدت ہوگی۔ پس یہ حُکم بیک وقت دو باتوں کا مقتضی ہے۔ ایک یہ کہ حیض کی حالت میں طلاق نہ دی جائے۔ دُوسرے یہ کہ طلاق

۱- ان احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۱۴۰-۱۴۲، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یا تو اُس طُہر میں دی جائے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو، یا پھر اُس حالت میں دی جائے جب کہ عورت کا حاملہ ہونا معلوم ہو۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ طلاق پر یہ قیدیں لگانے میں بہت بڑی مصلحتیں ہیں۔ حیض کی حالت میں طلاق نہ دینے کی مصلحت یہ ہے کہ یہ وہ حالت ہوتی ہے جس میں عورت اور مرد کے درمیان مباشرت ممنوع ہونے کی وجہ سے ایک طرح کا بُعد پیدا ہو جاتا ہے اور طبّی حیثیت سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ اس حالت میں عورت کا مزاج معمول پر نہیں رہتا۔ اِس لیے اگر اُس وقت دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہو جائے تو عورت اور مرد دونوں اُسے رفع کرنے کے معاملے میں ایک حد تک بے بس ہوتے ہیں اور جھگڑے سے طلاق تک نوبت پہنچانے کے بجائے اگر عورت کے حیض سے فارغ ہونے تک انتظار کر لیا جائے تو اس اَمر کا کافی امکان ہوتا ہے کہ عورت کا مزاج بھی معمول پر آ جائے اور دونوں کے درمیان فطرت نے جو طبعی کشش رکھی ہے وہ بھی اپنا کام کر کے دونوں کو پھر سے جوڑ دے۔ اس طرح جس طُہر میں مباشرت کی جا چکی ہو اُس میں طلاق کے ممنوع ہونے کی مصلحت یہ ہے کہ اُس زمانے میں اگر حمل قرار پا جائے تو مرد اور عورت دونوں میں سے کسی کو بھی اُس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے وہ وقت طلاق دینے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ حمل کا علم ہو جانے کی صورت میں تو مرد بھی دس مرتبہ سوچے گا کہ جس عورت کے پیٹ میں اُس کا بچہ پرورش پا رہا ہے اُسے طلاق دے یا نہ دے اور عورت بھی اپنے اور اپنے بچے کے مستقبل کا خیال کر کے شوہر کی ناراضی کے اسباب دُور کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ لیکن اندھیرے میں بے سوچے سمجھے تیر چلا بیٹھنے کے بعد اگر معلوم ہو کہ حمل قرار پا چکا تھا تو دونوں کو پچھتانا پڑے گا۔

۲۔عدّت تک کے لیے: یہ تو ہے عدت کے لیے طلاق دینے کا پہلا مطلب، جس کا اطلاق صِرف اُن مدخولہ عورتوں پر ہوتا ہے جن کو حیض آتا ہو اور جن کے حاملہ ہونے کا امکان ہو۔ اب رہا اس کا دُوسرا مطلب تو وہ یہ ہے کہ طلاق دینا ہو تو عدت تک کے لیے طلاق دو، یعنی بیک وقت تین طلاق دے کر ہمیشہ کی علیحدگی کے لیے طلاق نہ دے بیٹھو، بلکہ ایک یا حد سے حد دو طلاقیں دے کر عدت تک انتظار کرو تاکہ اس مدت میں ہر وقت تمھارے لیے رُجوع کی گنجایش باقی رہے۔ اِس مطلب کے لحاظ سے یہ حکم اُن مدخولہ عورتوں کے معاملے میں بھی مُفید ہے جن کو حیض آتا ہو اور اُن کے معاملے میں بھی مُفید ہے جن کو حیض آنا بند ہو گیا ہو یا جنھیں ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو یا جن کا طلاق کے وقت حاملہ ہونا معلوم ہو۔ اِس فرمانِ الٰہی کی پیروی کی جائے تو کسی شخص کو بھی طلاق دے کر پچھتانا نہ پڑے، کیونکہ اِس طرح طلاق دینے سے عدت کے اندر رُجوع بھی ہو سکتا ہے اور عدّت گزر جانے کے بعد بھی یہ ممکن رہتا ہے کہ سابق میاں بیوی پھر باہم رشتہ جوڑنا چاہیں تو ازسرِنو نکاح کر لیں۔

اکابر مفسّرین کی رائے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کے یہی معنی اکابر مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "طلاق حیض کی حالت میں نہ دے اور نہ اُس طُہر میں دے جس کے اندر شوہر مباشرت کر چکا ہو، بلکہ اُسے چھوڑے رکھے یہاں تک کہ حیض سے فارغ ہو کر وہ طاہر ہو جائے۔ پھر اُسے ایک طلاق دے دے۔ اِس صورت میں اگر وہ رُجوع نہ بھی کرے اور عدت گزر جائے تو وہ صِرف ایک ہی طلاق سے جُدا ہو گی" (ابنِ جریر)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "عدت کے لیے طلاق یہ ہے کہ طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دی جائے"۔ یہی تفسیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت عبداللہ بن عمر، عطاء، مجاہد، میمون بن مہران، مقاتل بن حیان اور ضحاک رحمہم اللہ سے مروی ہے (ابن کثیر)۔ عکرمہ اس کا مطلب بیان کرتے ہیں: ''طلاق اس حالت میں دے کہ عورت کا حاملہ ہونا معلوم ہو اور اس حالت میں نہ دے کہ وہ اس سے مباشرت کر چکا ہو اور کچھ پتہ نہ ہو کہ وہ حاملہ ہوگئی ہے یا نہیں'' (ابن کثیر)۔ حضرت حسن بصری اور ابن سیرین، دونوں کہتے ہیں: ''طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دی جائے، یا پھر اس حالت میں دی جائے جب کہ حمل ظاہر ہو چکا ہو'' (ابن جریر)۔

احادیث میں اس کی وضاحت: اس آیت کے منشا کو بہترین طریقے سے خود رسول اللہ ﷺ نے اُس موقع پر واضح فرمایا تھا جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ''اُس کو حکم دو کہ بیوی سے رجوع کر لے اور اُسے اپنی زوجیت میں روکے رکھے یہاں تک کہ وہ طاہر ہو، پھر اُسے حیض آئے اور اُس سے بھی فارغ ہو کر وہ پاک ہو جائے، اس کے بعد اگر وہ اسے طلاق دینا چاہے تو طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دے''۔ یہی وہ عدت ہے جس کے لیے طلاق دینے کا اللہ عزّ و جل نے حکم دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''یا تو طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر طلاق دے، یا پھر ایسی حالت میں دے جب کہ اُس کا حمل ظاہر ہو چکا ہو''۔

اس آیت کے منشا پر مزید روشنی چند اور احادیث بھی ڈالتی ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ سے منقول ہیں۔

نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ حضور ﷺ یہ سن کر غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اَیُلعَبُ بِکِتٰبِ اللّٰہِ عزَّوَجلَّ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُم، کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمھارے درمیان موجود ہوں۔ اس حرکت پر حضور ﷺ کے غصے کی کیفیت دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟

عبدالرزاق نے حضرت عُبادہ بن الصامت کے متعلق روایت نقل کی ہے کہ اِن کے والد نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے ڈالیں۔ اُنھوں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: بَانَتْ مِنْہُ بِثَلَاثٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَ بَقِیَ تِسْعٌ مِئَۃٍ وَ سَبْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ ظُلْمًا وَ عُدْوَانًا، اِنْ شَآءَ اللّٰہُ عَذَّبَہٗ وَ اِنْ شَآءَ غَفَرَلَہٗ، تین طلاقوں کے ذریعے سے تو اللہ کی نافرمانی کے ساتھ وہ عورت اس سے جُدا ہو گئی اور ۹۹۷ ظلم اور عدوان کے طور پر باقی رہ گئیں جن پر اللہ چاہے تو اُسے عذاب دے اور چاہے تو معاف کر دے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قصے کی جو تفصیل دار قطنی اور ابن ابی شیبہ میں روایت ہوئی ہے اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو بیوی سے رجوع کرنے کا حکم دیا تو اُنھوں نے پوچھا اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا پھر بھی میں رجوع کر سکتا تھا؟ حضور ﷺ نے جواب دیا: لَا، کَانَتْ تَبِیْنُ مِنْکَ وَ کَانَتْ مَعْصِیَۃً، نہیں، وہ تجھ سے جُدا ہو جاتی اور یہ فعل معصیت ہوتا۔ ایک روایت میں آپؐ کے الفاظ یہ ہیں: اِذًا قَدْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عصیت ربک و بانت منک، اگر تم ایسا کرتے تو اپنے رب کی نافرمانی کرتے اور تمھاری بیوی تم سے جدا ہو جاتی[1]۔

اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس بارے میں جو فتاویٰ منقول ہیں وہ بھی حضور ﷺ کے انھی ارشادات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مؤطا میں ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دے ڈالی ہیں''۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''پھر اس پر تمھیں کیا فتویٰ دیا گیا''؟ اُس نے عرض کیا: ''مجھ سے کہا گیا ہے کہ عورت مجھ سے جدا ہو گئی''۔ آپ نے فرمایا: صدقوا، ھو مثل ما یقولون، لوگوں نے سچ کہا مسئلہ یہی ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔

عبدالرزاق نے علقمہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا میں نے اپنی بیوی کو ۹۹ طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا: ثلاث بینھا و سائرھن عدوان، تین طلاقیں اُسے جدا کرتی ہیں، باقی سب زیادتیاں ہیں۔

وکیع بن الجراح نے اپنی سُنن میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا یہی مسلک نقل کیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ میں اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے بیٹھا ہوں۔ اُنھوں نے فرمایا: بانت منک بثلاث و اقسم سائر ھن علی نسآئک، تین طلاقوں سے تو وہ تجھ سے جدا ہو گئی، باقی طلاقوں کو اپنی دُوسری عورتوں پر تقسیم کرتا پھر۔

ابوداؤد اور ابن جریر نے تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ مجاہد کی روایت نقل کی ہے کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اُس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے بیٹھا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سُن کر خاموش رہے حتیٰ میں نے خیال کیا شاید یہ اس کی بیوی کو اس کی طرف پلٹا دینے والے ہیں۔ پھر اُنھوں نے فرمایا: تم میں سے ایک شخص پہلے طلاق دینے میں حماقت کا ارتکاب کر گزرتا ہے، اس کے بعد آ کر کہتا ہے یا ابن عباس، یا ابن عباس۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔ اور تو نے اللہ سے تقویٰ نہیں کیا۔ اب میں تیرے لیے کوئی راستہ نہیں پاتا۔ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی۔

ایک اور روایت جسے مؤطا اور تفسیر ابن جریر میں کچھ لفظی فرق کے ساتھ مجاہد ہی سے نقل کیا گیا ہے، اس میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں، پھر ابن عباس سے مسئلہ پوچھا۔ اُنھوں نے جواب دیا: تین طلاقوں سے تو وہ تجھ سے جدا ہو گئی، باقی ۹۷ طلاقوں سے تو نے اللہ کی آیات کو کھیل بنایا۔ یہ مؤطا کے الفاظ ہیں۔ ابن جریر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جواب کے الفاظ یہ ہیں: تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی اور تو نے اللہ کا خوف نہیں کیا کہ وہ تیرے لیے اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کرتا۔

امام طحاوی نے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اُس نے کہا: میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا: ان عمک عصی اللہ فاثم و اطاع الشیطان فلم یجعل لہ

۱۔ مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۴۳، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مَخرَجًا، تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ کا ارتکاب کیا اور شیطان کی پیروی کی۔ اللہ نے اُس کے لیے اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

ابوداؤد اور مؤطا میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دے دیں، پھر اُس سے دوبارہ نکاح کرنا چاہا اور فتویٰ پوچھنے نکلا۔ حدیث کے راوی محمد بن ایاس بن بُکیر کہتے ہیں کہ میں اُس کے ساتھ ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کے پاس گیا۔ دونوں کا جواب یہ تھا کہ: اِنَّکَ اَرسَلتَ مِن یَدِکَ مَا کَانَ مِن فَضلٍ، تیرے لیے جو گنجایش تھی تو نے اُسے اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

زمخشری نے کشاف میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جو شخص بھی ایسا آتا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں اُسے وہ مارتے تھے اور اُس کی طلاقوں کو نافذ کر دیتے تھے۔ سعید بن منصور نے یہی بات صحیح سند کے ساتھ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے۔ اِس معاملے میں صحابہ کرام کی عام رائے، جسے ابن ابی شَیبَہ اور امام محمد نے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، یہ تھی کہ: اِنَّ الصَّحَابَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنھُم کَانُوا یَستَحِبُّونَ اَن یُّطَلِّقَھَا وَاحِدَۃً ثُمَّ یَترُکُھَا حَتّٰی تَحِیضَ ثَلَاثَۃَ حِیَضٍ، صحابہ رضی اللہ عنہم اِس بات کو پسند کرتے تھے کہ آدمی بیوی کو صرف ایک طلاق دے دے اور اُسے چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اُسے تین حیض آ جائیں۔ یہ ابن ابی شَیبَہ کے الفاظ ہیں اور امام محمد کے الفاظ یہ ہیں: وَکَانُوا یَستَحِبُّونَ اَن لَّا یَزِیدُوا فِی الطَّلَاقِ عَلٰی وَاحِدَۃٍ حَتّٰی تَنقَضِیَ العِدَّۃُ، اِن کو پسند یہ طریقہ تھا کہ طلاق کے معاملے میں ایک سے زیادہ نہ بڑھیں یہاں تک کہ عدّت پوری ہو جائے۔

فقہائے اِسلام کا مرتب کردہ قانونِ طلاق

اِن احادیث و آثار کی مدد سے قرآنِ مجید کی مذکورہ بالا آیت کا منشا سمجھ کر فقہائے اِسلام نے جو مفصل قانون مرتب کیا ہے اُسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

مسلکِ حنفی: حنفیہ طلاق کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں۔ احسن، حَسَن اور بِدعی۔ احسن طلاق یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو ایسے طہر میں جس کے اندر اُس نے مجامعت نہ کی ہو، صرف ایک طلاق دے کر عدّت گزر جانے دے۔ حَسَن یہ ہے کہ ہر طُہر میں ایک ایک طلاق دے۔ اِس صورت میں تین طہروں میں تین طلاق دینا بھی سنّت کے خلاف نہیں، اگرچہ بہتر یہی ہے کہ ایک ہی طلاق دے کر عدّت گزر جانے دی جائے۔ اور طلاقِ بدعت یہ ہے کہ آدمی بیک وقت تین طلاق دے دے، یا ایک طہر کے اندر الگ الگ اوقات میں تین طلاق دے یا حیض کی حالت میں طلاق دے، یا ایسے طُہر میں طلاق دے جس میں وہ مباشرت کر چکا ہو۔ اِن میں سے جو فعل بھی وہ کرے گا گنہگار ہوگا۔ یہ تو ہے حُکم ایسی مدخولہ عورت کا جسے حیض آتا ہو۔ رہی غیر مدخولہ عورت تو اُسے سنّت کے مطابق طُہر اور حیض دونوں حالتوں میں طلاق دی جا سکتی ہے۔ اور اگر عورت ایسی مدخولہ ہو جسے حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا ابھی آنا شروع ہی نہ ہوا ہو تو اُسے مباشرت کے بعد بھی طلاق دی جا سکتی ہے، کیونکہ اِس کے حاملہ ہونے کا امکان نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اور عورت حاملہ ہو تو مباشرت کے بعد اُسے بھی طلاق دی جا سکتی ہے، کیونکہ اس کا حاملہ ہونا پہلے ہی معلوم ہے۔ لیکن ان تینوں قسم کی عورتوں کو سنت کے مطابق طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک مہینہ بعد طلاق دی جائے اور اَحسن یہ ہے کہ صرف ایک طلاق دے کر عدت گزر جانے دی جائے (هدایه فتح القدیر۔ احکام القرآن للجصاص۔ عمدة القاری)۔

مسلکِ مالکی: امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ سُنّی، بدعی مکروہ اور بدعی حرام۔ سُنّت کے مطابق طلاق یہ ہے کہ مدخولہ عورت کو جسے حیض آتا ہو، طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر صرف ایک طلاق دے کر عدت گزر جانے دی جائے۔ بدعی مکروہ یہ ہے کہ ایسے طُہر کی حالت میں طلاق دی جائے جس میں آدمی مباشرت کر چکا ہو۔ یا مباشرت کیے بغیر ایک طُہر میں ایک سے زیادہ طلاقیں دی جائیں، یا عدت کے اندر الگ الگ طُہروں میں تین طلاقیں دی جائیں یا بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں اور بدعی حرام یہ ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دی جائے (حاشیه الدسوقی علی الشرح الکبیر۔ احکام القرآن لابن العربی)۔

مسلکِ حنبلی: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا معتبر مذہب یہ ہے جس پر جمہور حنابلہ کا اتفاق ہے: مدخولہ عورت جس کو حیض آتا ہو اُسے سُنّت کے مطابق طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ طُہر کی حالت میں مباشرت کیے بغیر اُسے طلاق دی جائے۔ پھر اُسے چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔ لیکن اگر اُسے تین طُہروں میں تین الگ الگ طلاقیں دی جائیں، یا ایک ہی طُہر میں تین طلاقیں دے دی جائیں، یا بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں، یا حیض کی حالت میں طلاق دی جائے، یا ایسے طُہر میں طلاق دی جائے جس میں مباشرت کی گئی ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہو، تو یہ سب طلاقِ بدعت اور حرام ہیں۔ لیکن اگر عورت غیر مدخولہ ہو، یا ایسی مدخولہ ہو جسے حیض آنا بند ہو گیا ہو یا ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو، یا حاملہ ہو، تو اُس کے معاملے میں نہ وقت کے لحاظ سے سُنّت وبدعت کا کوئی فرق ہے نہ تعداد کے لحاظ سے (الانصاف فی معرفة الراجح من الخِلاف علی مذهب احمد بن حنبل)۔

مسلکِ شافعی: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک طلاق کے معاملے میں سُنّت اور بدعت کا فرق صرف وقت کے لحاظ سے ہے نہ کہ تعداد کے لحاظ سے۔ یعنی مدخولہ عورت جس کو حیض آتا ہو، اُسے حیض کی حالت میں طلاق دینا، یا جو حاملہ ہو سکتی ہو اُسے ایسے طُہر میں طلاق دینا جس میں مباشرت کی جا چکی ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا ہو، بدعت اور حرام ہے۔ رہی طلاقوں کی تعداد، تو خواہ بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں یا ایک ہی طُہر میں دی جائیں، یا الگ الگ طُہروں میں دی جائیں بہر حال یہ سُنّت کے خلاف نہیں ہے اور غیر مدخولہ عورت یا ایسی عورت جسے حیض آنا بند ہو گیا ہو یا حیض آیا ہی نہ ہو، یا جس کا حاملہ ہونا ظاہر ہو چکا ہو، اُس کے معاملے میں سُنّت اور بدعت کا کوئی فرق نہیں (مُغنی المحتاج)۔

کسی طلاق کے حرام یا گناہ ہونے کا مطلب

کسی طلاق کے بدعت، مکروہ، حرام یا گناہ ہونے کا مطلب ائمۂ اربعہ کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ وہ واقع ہی نہ ہو۔ چاروں مذاہب میں طلاق، خواہ حیض کی حالت میں دی گئی ہو، یا بیک وقت تین طلاقیں دے دی گئی ہوں، یا ایسے طُہر میں طلاق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دی گئی ہو جس میں مباشرت کی جا چکی ہو اور عورت کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا ہو یا کسی ایسے طریقے سے دی گئی ہو جسے کسی امام نے بدعت قرار دیا ہے، بہرحال واقع ہو جاتی ہے، اگرچہ آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔ لیکن بعض دُوسرے مجتہدین نے اس مسئلے میں ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا ہے۔

خلافِ سُنّت طلاق کا حکم: سعید بن المسیبؒ اور بعض دُوسرے تابعین کہتے ہیں کہ جو شخص سُنّت کے خلاف حیض کی حالت میں طلاق دے، یا بیک وقت تین طلاق دے دے اُس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی۔ یہی رائے امامیہ کی ہے اور اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ ممنوع اور بدعت مُحرّمہ ہے اس لیے یہ غیر مؤثر ہے، حالانکہ اُوپر جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں اُن میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جب بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی تو حضور ﷺ نے اُنھیں رُجوع کا حکم دیا۔ اگر یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوئی تھی تو رُجوع کا حکم دینے کے کیا معنی؟ اور یہ بھی بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے اور اکابر صحابہ نے ایک سے زیادہ طلاق دینے والے کو اگرچہ گناہ گار قرار دیا ہے، مگر اُس کی طلاق کو غیر مؤثر قرار نہیں دیا۔

طلاقِ ثلاثہ کا وُقوع: طاؤس اور عکرمہ کہتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور اسی رائے کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔ اُن کی اس رائے کا ماخذ یہ روایت ہے کہ ابو الصّہباء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دَور میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں (بخاری و مسلم)۔ اور مسلم، ابوداؤد اور مُسندِ احمد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق کو ایک قرار دیا جاتا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگ ایک معاملے میں جلد بازی کرنے لگے ہیں جس میں اُن کے لیے سوچ سمجھ کر کام کرنے کی گنجایش رکھی گئی تھی۔ اب کیوں نہ ہم اُن کے اس فعل کو نافذ کر دیں؟ چنانچہ اُنھوں نے اسے نافذ کر دیا۔

طلاقِ بدعت کے واقع ہونے کے دلائل: لیکن یہ رائے کئی وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اوّل تو متعدد روایات کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا فتویٰ اس کے خلاف تھا جیسا کہ ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں۔ دُوسرے یہ بات اُن احادیث کے بھی خلاف پڑتی ہے جو نبی ﷺ اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہوئی ہیں۔ جن میں بیک وقت تین طلاق دینے والے کے متعلق یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ اُس کی تینوں طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں۔ یہ احادیث بھی ہم نے اُوپر نقل کر دی ہیں۔ تیسرے خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مجمع میں تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا اعلان فرمایا تھا، لیکن نہ اُس وقت، نہ اُس کے بعد کبھی صحابہ میں سے کسی نے اس سے اختلاف کا اظہار کیا۔ اب کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سُنّت کے خلاف کسی کام کا فیصلہ کر سکتے تھے؟ اور سارے صحابہ اس پر سکوت بھی اختیار کر سکتے تھے؟ مزید برآں رُکانہ بن

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

عبد یزید کے قصّے میں ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، امام شافعی، دارمی اور حاکم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رُکانہ نے جب ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کو حلف دے کر پوچھا کہ اُن کی نیت ایک ہی طلاق دینے کی تھی؟ (یعنی باقی دو طلاقیں پہلی طلاق پر زور دینے کے لیے ان کی زبان سے نکلی تھیں، تین طلاق دے کر ہمیشہ کے لیے جُدا کر دینا مقصود نہ تھا) اور جب اُنھوں نے یہ حلفیہ بیان دیا تو آپ نے اُن کو رُجوع کا حق دے دیا۔ اِس سے اِس معاملے کی اصل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ ابتدائی دَور میں کس قِسم کی طلاق کو ایک کے حُکم میں رکھا جاتا تھا۔ اِس بنا پر شارحینِ حدیث نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ابتدائی دَور میں چونکہ لوگوں کے اندر دینی معاملات میں خیانت قریب قریب مفقود تھی، اس لیے تین طلاق دینے والے کے اِس بیان کو تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ اُس کی اصل نیت ایک طلاق دینے کی تھی اور باقی دو طلاقیں محض پہلی طلاق پر زور دینے کے لیے اُس کی زبان سے نکلی تھیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ لوگ پہلے جلد بازی کر کے تین تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں اور پھر تاکید کا بہانہ کرتے ہیں تو اُنھوں نے اِس بہانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ امام نَوَوِی اور امام سُبکی نے اسے ابن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت کی بہترین تاویل قرار دیا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ خود ابوالصّہباء کی اُن روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے بارے میں اُن سے مروی ہیں۔ مسلم اور ابوداؤد اور نسائی نے اِنھی ابوالصّہباء سے ایک دُوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ان کے دریافت کرنے پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ایک شخص جب خلوَت سے پہلے اپنی بیوی کو طلاقیں دیتا تھا تو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دَور میں اِس کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا۔ اِس طرح ایک ہی راوی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دو مختلف مضمونوں کی روایتیں نقل کی ہیں اور یہ اختلاف دونوں روایتوں کو کمزور کر دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۵۳-۵۶۰، الطلاق حاشیہ ۱)

سورۂ طلاق کی پہلی آیت میں ارشاد ہے:

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (الطلاق ۶۵:۱) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اُوپر خود ظلم کرے گا۔ تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ (موافقت کی) کوئی صورت پیدا کر دے۔

یہ دونوں فقرے اُن لوگوں کے خیال کی بھی تردید کرتے ہیں جو اِس بات کے قائل ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے یا بیک وقت تین طلاق دے دینے سے کوئی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی اور اُن لوگوں کی رائے کو بھی غلط ثابت کر دیتے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاق ایک ہی طلاق کے حُکم میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بدعی طلاق واقع ہی نہیں ہوتی یا تین طلاق ایک ہی طلاق رجعی کے حُکم میں ہیں تو یہ کہنے کی آخر ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ جو اللہ کی حدود، یعنی سُنّت کے بتائے ہوئے طریقے کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا اور تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ یہ دونوں باتیں تو اُسی صورت میں بامعنی ہو سکتی ہیں جب کہ سُنّت کے خلاف طلاق دینے سے واقع کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نقصان ہوتا ہو جس پر آدمی کو پچھتانا پڑے، اور تین طلاق بیک وقت دے بیٹھنے سے رُجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو طلاق واقع ہی نہ ہو اُس سے حدود اللہ پر کوئی تعدّی نہیں ہوتی جو اپنے نفس پر ظلم قرار پائے، اور جو طلاق بہر حال رجعی ہی ہو اُس کے بعد تو لازماً موافقت کی صورت باقی رہتی ہے، پھر یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔

اس مقام پر ایک مرتبہ پھر سورۂ بقرہ کی آیات ۲۲۸ تا ۲۳۰ اور سورۂ طلاق کی زیرِ بحث آیات کے باہمی تعلق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ سورۂ بقرہ میں طلاق کا نصاب تین بتایا گیا ہے، جن میں سے دو کے بعد رُجوع کا حق اور عدت گزر جانے کے بعد بلاتحلیل دوبارہ نکاح کر لینے کا حق باقی رہتا ہے اور تیسری طلاق دے دینے سے یہ دونوں حق ساقط ہو جاتے ہیں۔ سورۂ طلاق کی یہ آیات اس حکم میں کسی ترمیم و تنسیخ کے لیے نازل نہیں ہوئی ہیں، بلکہ یہ بتانے کے لیے نازل ہوئی ہیں کہ بیویوں کو طلاق دینے کے جو اختیارات مردوں کو دیے گئے ہیں اُن کو استعمال کرنے کی دانشمندانہ صورت کیا ہے جس کی پیروی اگر کی جائے تو گھر بگڑنے سے بچ سکتے ہیں، طلاق دے کر پچھتانے کی نوبت پیش نہیں آسکتی، موافقت پیدا ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع باقی رہتے ہیں اور اگر بالآخر علیحدگی ہو بھی جائے تو یہ آخری چارۂ کار کھلا رہتا ہے کہ پھر مل جانا چاہیں تو دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن اگر کوئی شخص نادانی کے ساتھ اپنے ان اختیارات کو غلط طریقے سے استعمال کر بیٹھے تو وہ اپنے اُوپر خود ظلم کرے گا اور تلافی کے تمام مواقع کھو بیٹھے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو تین سو روپے دے اور کہے کہ یہ تمھاری ملکیت ہیں، ان کو تم اپنی مرضی سے خرچ کرنے کے مختار ہو۔ پھر وہ اُسے نصیحت کرے کہ اپنے اس مال کو جو میں نے تمھیں دے دیا ہے، اِس طرح احتیاط کے ساتھ برمحل اور بتدریج استعمال کرنا تاکہ تم اِس سے صحیح فائدہ اُٹھا سکو، ورنہ میری نصیحت کے خلاف تم بے احتیاطی کے ساتھ اسے بے موقع خرچ کرو گے یا ساری رقم بیک وقت خرچ کر بیٹھو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے اور پھر مزید کوئی رقم میں تمھیں برباد کرنے کے لیے نہیں دوں گا۔ یہ ساری نصیحت ایسی صورت میں بے معنی ہو جاتی ہے جب کہ باپ نے پوری رقم سرے سے اس کے ہاتھ میں چھوڑی ہی نہ ہو، وہ بے موقع خرچ کرنا چاہے تو رقم اس کی جیب سے نکلے ہی نہیں، یا پورے تین سو خرچ کر ڈالنے پر بھی ایک سو ہی اُس کے ہاتھ سے نکلیں اور دو سو بہر حال اُس کی جیب میں پڑے رہیں۔ صورتِ معاملہ اگر یہی ہو تو اس نصیحت کی آخر حاجت کیا ہے؟

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۵-۵۶۶، الطلاق حاشیہ ۵)

ایک اور دلیل: ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۬ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ (الطلاق ۶۵: ۲-۳) یہ باتیں ہیں جن کی تم لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے، ہر اُس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اُس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔

یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ اُوپر جو ہدایات دی گئی ہیں وہ نصیحت کی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ قانون کی۔ آدمی سُنّت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خلاف طلاق دے بیٹھے، عدّت کا شمار محفوظ نہ رکھے، بیوی کو بلا عذر معقول گھر سے نکال دے، عدّت کے خاتمے پر رُجوع کرے تو عورت کو ستانے کے لیے کرے اور رخصت کرے تو لڑائی جھگڑے کے ساتھ کرے اور طلاق رجوع، مفارقت، کسی چیز پر بھی گواہ نہ بنائے تو اس سے طلاق اور رُجوع اور مفارقت کے قانونی نتائج میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ البتہ اللہ کی نصیحت کے خلاف عمل کرنا اس بات کی دلیل ہوگا کہ اُس کے دِل میں اللہ اور روزِ آخر پر صحیح ایمان موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اُس نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک سچے مومن کو اختیار نہ کرنا چاہیے۔

سیاقِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا مطلب سُنّت کے مطابق طلاق دینا، عدّت کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھنا، بیوی کو گھر سے نہ نکالنا، عدّت کے اختتام پر عورت کو روکنا ہو تو نباہ کرنے کی نیت سے رُجوع کرنا اور علیحدگی ہی کرنی ہو تو بھلے آدمیوں کی طرح اُس کو رُخصت کر دینا اور طلاق، رُجوع یا مفارقت جو بھی ہو اُس پر دو عادل آدمیوں کو گواہ بنالینا ہے۔ اِس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو اس طرح تقویٰ سے کام لے گا اُس کے لیے ہم کوئی مَخرَج (یعنی مشکلات سے نکلنے کا راستہ) نکال دیں گے۔ اِس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جو شخص اِن امُور میں تقویٰ سے کام نہ لے گا وہ اپنے لیے خود ایسی اُلجھنیں اور مشکلات پیدا کرلے گا جن سے نکلنے کا کوئی راستہ اُسے نہ مِل سکے گا۔

اِن الفاظ پر غور کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک طلاقِ بدعی سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی اور جو لوگ بیک وقت یا ایک ہی طُہر میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق قرار دیتے ہیں، اُن کی رائے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر طلاقِ بدعی واقع ہی نہ ہو تو سرے سے کوئی اُلجھن پیش نہیں آتی جس سے نکلنے کے لیے کسی مَخرَج کی ضرورت ہو اور اگر تین طلاق اکٹھے دے بیٹھنے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہو تب بھی مَخرَج کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اِس صورت میں آخر وہ پیچیدگی کیا ہے جس سے نکلنے کے لیے کسی راستے کی حاجت پیش آئے؟

عدّت کے دوران میں مطلقہ کو گھر میں رکھنا، اُس کا خرچ برداشت کرنا، اور رُخصت کرتے ہوئے اُس کو مَہر یا مُتعۂ طلاق دے کر رخصت کرنا بلاشبہ آدمی پر مالی بار ڈالتا ہے۔ جس عورت سے آدمی دِل برداشتہ ہو کر تعلّقات منقطع کرلینے پر آمادہ ہو چکا ہو، اُس پر مال خرچ کرنا تو اُسے ضرور نا گوار ہوگا۔ اور اگر آدمی تنگ دست بھی ہو تو یہ خرچ اُسے اور زیادہ کھلے گا، لیکن اللہ سے ڈرنے والے آدمی کو یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہیے۔ تمھارا دِل تنگ ہو تو ہو، اللہ کا ہاتھ رِزق دینے کے لیے تنگ نہیں ہے۔ اِس کی ہدایت پر چل کر مال خرچ کرو گے تو وہ ایسے راستوں سے تمھیں رِزق دے گا جدھر سے رِزق ملنے کا تم گمان بھی نہیں کرسکتے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۷-۵۶۹، الطلاق حواشی ۸-۱۰)

حیض میں طلاق دینے والے کو رُجوع کا حُکم کس معنی میں ہے

حیض کی حالت میں طلاق دینے والے کو چونکہ رسول اللہ ﷺ نے رُجوع کا حُکم دیا تھا، اِس لیے فقہا کے درمیان یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ یہ حُکم کس معنی میں ہے؟ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ، اسحاق بن راہویہ اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابوثور رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو رُجوع کا حکم تو دیا جائے گا مگر رُجوع پر مجبور نہ کیا جائے گا (عمدۃ القاری)۔ ہدایہ میں حنفیہ کا مذہب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِس صورت میں رُجوع کرنا نہ صِرف مستحب بلکہ واجب ہے۔ مُغنی المحتاج میں شافعیہ کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ جس نے حیض میں طلاق دی ہو اور تین طلاقیں نہ دے ڈالی ہوں اُس کے لیے مسنون یہ ہے کہ وہ رُجوع کرے اور اِس کے بعد والے طُہر میں طلاق نہ دے بلکہ اِس کے گزرنے کے بعد جب دُوسری مرتبہ عورت حیض سے فارغ ہو تب طلاق دینا چاہے تو دے، تاکہ حیض میں دِی ہوئی طلاق سے رُجوع محض کھیل کے طور پر نہ ہو۔ الانصاف میں حنابلہ کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ اِس حالت میں طلاق دینے والے کے لیے رُجوع کرنا مستحب ہے، لیکن امام مالک اور اُن کے اصحاب کہتے ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا جُرم قابلِ دَست اندازیِ پولیس ہے۔ عورت خواہ مطالبہ کرے یا نہ کرے، بہر حال حاکم کا یہ فرض ہے کہ جب کسی شخص کا یہ فعل اُس کے علم میں آئے تو وہ اُسے رُجوع پر مجبور کرے اور عدّت کے آخری وقت تک اُس پر دباؤ ڈالتا رہے۔ اگر وہ انکار کرے تو اُسے قید کر دے۔ پھر بھی انکار کرے تو اُسے مارے۔ اِس پر بھی نہ مانے تو حاکم خود فیصلہ کر دے کہ "میں نے تیری بیوی تجھ پر واپس کر دی" اور حاکم کا یہ فیصلہ رُجوع ہوگا۔ جس کے بعد مَرد کے لیے اُس عورت سے مباشرت کرنا جائز ہوگا خواہ اُس کی نیت رُجوع کی ہو یا نہ ہو، کیونکہ حاکم کی نیت اُس کی نیت کی قائم مقام ہے (حاشیہ، الدّسوقی)۔ مالکیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس شخص نے طوعاً وکرہاً حیض میں دی ہوئی طلاق سے رُجوع کر لیا ہو وہ اگر طلاق ہی دینا چاہے تو اُس کے لیے مستحب طریقہ یہ ہے کہ جس حیض میں اُس نے طلاق دی ہے اُس کے بعد والے طُہر میں طلاق نہ دے بلکہ جب دوبارہ حیض آنے کے بعد وہ طاہر ہو اس وقت طلاق دے۔ طلاق سے متصل والے طہر میں طلاق نہ دینے کا حکم دراصل اِس لیے دیا گیا ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے والے کا رُجوع صِرف زبانی کلامی نہ ہو بلکہ اُسے طُہر کے زمانے میں عورت سے مباشرت کرنا چاہیے پھر جس طُہر میں مباشرت کی جا چکی ہو اُس میں طلاق دینا چونکہ ممنوع ہے، لہٰذا طلاق دینے کا صحیح وقت اس کے بعد والا طُہر ہی ہے (حاشیہ الدّسوقی)۔

رُجوع کی مدّت: رجعی طلاق دینے والے کے لیے رُجوع کا موقع کس وقت تک ہے؟ اِس میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، اور یہ اختلاف اِس سوال پر پیدا ہوا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ سے مُراد تین حیض ہیں یا تین طُہر؟ امام شافعی اور امام مالک علیہما السلام کے نزدیک قُروء سے مُراد طُہر ہے اور یہ رائے حضرت عائشہ، ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ قروء سے مُراد حیض ہے اور امام احمد ابن حنبل کا مُعتبر مذہب بھی یہی ہے۔ یہ رائے چاروں خلفائے راشدین، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، اُبَیّ بن کعب، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، عُبادہ بن صامت اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ امام محمد نے مؤطا میں شَعبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۳ صحابیوں سے ملے ہیں اور ان سب کی رائے یہی تھی اور یہی رائے بکثرت تابعین نے بھی اختیار کی ہے۔

اِس اختلاف کی بنا پر شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک تیسرے حیض میں داخل ہوتے ہی عورت کی عدّت ختم ہو جاتی ہے، اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرد کا حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اگر طلاق حیض کی حالت میں دی گئی ہو، تو اس حیض کو شمارِ عدت میں نہ ہو گا، بلکہ چوتھے حیض میں داخل ہونے پر عدت ختم ہو گی (مغنی المحتاج، حاشیۃ الدسوقی)۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر تیسرے حیض میں دس دن گزرنے پر خون بند ہو تو عورت کی عدت ختم ہو جائے گی خواہ عورت غسل کرے یا نہ کرے۔ اور اگر دس دن سے کم میں خون بند ہو جائے تو عدت اُس وقت تک ختم نہ ہو گی جب تک عورت غسل نہ کرے، یا ایک نماز کا پورا وقت نہ گزر جائے۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جب عورت تیمم کر کے نماز پڑھ لے اس وقت مرد کا حقِ رجوع ختم ہو گا، اور امام محمدؒ کے نزدیک تیمم کرتے ہی حقِ رجوع ختم ہو جائے گا (هدایه)۔ امام احمدؒ کا معتبر مذہب جس پر جمہور حنابلہ کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر غسل نہ کر لے مرد کا حقِ رجوع باقی رہے گا (الانصاف)۔

رُجوع کا طریقہ: رُجوع کس طرح ہوتا ہے اور کس طرح نہیں ہوتا؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو رجعی طلاق دی ہو وہ عدت ختم ہونے سے پہلے جب چاہے رُجوع کر سکتا ہے، خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (البقرہ ۲:۲۲۸) اُن کے شوہر اس مدت کے اندر اُنھیں واپس لے لینے کے پوری طرح حقدار ہیں۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے تک اُن کی زَوجیت برقرار رہتی ہے اور وہ اُنھیں قطعی طور پر چھوڑ دینے سے پہلے واپس لے سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر رُجوع کوئی تجدیدِ نکاح نہیں ہے کہ اس کے لیے عورت کی رضا ضروری ہو۔ اس حد تک اتفاق کے بعد آگے رُجوع کے طریقے میں فقہا کی رائے مختلف ہو گئی ہے۔

فقہا کا اختلاف: شافعیہ کے نزدیک رُجوع صرف قول ہی سے ہو سکتا ہے، عمل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر آدمی زبان سے یہ نہ کہے کہ میں نے رُجوع کیا تو مباشرت یا اختلاط کا کوئی فعل خواہ رُجوع کی نیت ہی سے کیا گیا ہو، رُجوع قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ اِس صورت میں عورت سے ہر قسم کا استمتاع حرام ہے چاہے وہ بلا شہوت ہی ہو، لیکن مطلقہ رجعیہ سے مباشرت کرنے پر حد نہیں ہے، کیونکہ علما کا اس کے حرام ہونے پر اتفاق نہیں ہے۔ البتہ جو اس کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو اُسے تعزیر دی جائے گی۔ مزید برآں شافعی مسلک کی رُو سے مطلقہ رجعیہ کے ساتھ مباشرت کرنے پر بہر حال مَہرِ مثل لازم آتا ہے خواہ اس کے بعد آدمی رُجوع بالقول کرے یا نہ کرے (مغنی المحتاج)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ رُجوع قول اور فعل دونوں سے ہو سکتا ہے۔ اگر رُجوع بالقول میں آدمی صریح الفاظ استعمال کرے تو خواہ اُس کی نیت رُجوع کی ہو یا نہ ہو۔ رُجوع ہو جائے گا، بلکہ اگر وہ مذاق کے طور پر بھی رُجوع کے صریح الفاظ کہہ دے تو وہ رُجوع قرار پائیں گے، لیکن اگر الفاظ صریح نہ ہوں تو وہ صرف اُس صورت میں رُجوع قرار دیے جائیں گے جب کہ وہ رُجوع کی نیت سے کہے گئے ہوں۔ رہا رُجوع بالفعل تو کوئی فعل خواہ وہ اختلاط ہو یا مباشرت، اس وقت تک رُجوع قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ وہ رُجوع کی نیت سے نہ کیا گیا ہو (حاشیہ الدسوقی۔ احکام القرآن لابن العربی)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حنفیہ اور حنابلہ کا مسلک رُجوع بالقول کے معاملے میں وہی ہے جو مالکیہ کا ہے۔ رہا رُجوع بالفعل تو مالکیہ کے برعکس ان دونوں مذاہب کا فتویٰ یہ ہے کہ شوہر اگر عدّت کے اندر مطلّقہ رجعیّہ سے مباشرت کر لے تو وہ آپ سے آپ رُجوع ہے، خواہ رُجوع کی نیت ہو یا نہ ہو۔ البتہ دونوں کے مسلک میں فرق یہ ہے کہ حنفیّہ کے نزدیک اختلاط کا ہر فعل رُجوع ہے۔ خواہ وہ مباشرت سے کم کسی درجے کا ہو، حنابلہ محض اختلاط کو رُجوع نہیں مانتے (ھدایہ۔ فتح القدیر۔ عمدۃ القاری۔ الانصاف)۔

طلاقِ سُنّت اور طلاقِ بدعت کا فرق: طلاقِ سُنّت اور طلاقِ بدعت کے نتائج کا فرق یہ ہے کہ ایک طلاق یا دو طلاق دینے کی صورت میں اگر عدّت گزر بھی جائے تو مطلّقہ عورت اور اُس کے سابق شوہر کے درمیان باہمی رضامندی سے پھر نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آدمی تین طلاق دے چکا ہو تو نہ عدّت کے اندر رُجوع ممکن ہے اور نہ عدّت گزر جانے کے بعد دوبارہ نِکاح کیا جا سکتا ہے۔ اِلّا یہ کہ اُس عورت کا نِکاح کسی اور شخص سے ہو، وہ نِکاح صحیح نوعیت کا ہو، دُوسرا شوہر اُس عورت سے مباشرت بھی کر چکا ہو، پھر یا تو وہ اُسے طلاق دے دے یا مر جائے۔ اُس کے بعد اگر عورت اور اُس کا سابق شوہر باہمی رضامندی کے ساتھ ازسرِنو نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ احادیث کی اکثر کتابوں میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، پھر اُس عورت نے دُوسرے شخص سے نِکاح کر لیا اور اُس دُوسرے شوہر کے ساتھ اُس کی خلوت بھی ہوئی مگر مباشرت نہیں ہوئی، پھر اُس نے اُسے طلاق دے دی، اب کیا اس عورت کا اپنے سابق شوہر سے دوبارہ نِکاح ہو سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: لَا حَتّٰی یَذُوْقَ الْآخَرُ مِنْ عُسَیْلَتِھَا مَا ذَاقَ الْاَوَّلُ نہیں، جب تک کہ دُوسرا شوہر اُس سے اُسی طرح لُطف اندوز نہ ہو چکا ہو جس طرح پہلا شوہر ہوا تھا۔

حلالہ یا سازشی نِکاح: رہا سازشی نِکاح جس میں پہلے سے یہ طے شُدہ ہو کہ عورت کے سابق شوہر کے لیے حلال کرنے کی خاطر ایک آدمی اُس سے نِکاح کرے گا اور مباشرت کرنے کے بعد اُسے طلاق دے دے گا، تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نِکاح فاسد ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اِس سے تحلیل تو ہو جائے گی، مگر یہ فعل مکروہ تحریمی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَعَنَ اللّٰہُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَہٗ، اللہ نے تحلیل کرنے والے اور تحلیل کرانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے (ترمذی۔ نسائی)۔ حضرت عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا: اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِالتَّیْسِ الْمُسْتَعَارِ، کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ کرائے کا سانڈ کون ہوتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: ضرور ارشاد فرمائیں۔ فرمایا: ھُوَ الْمُحَلِّلُ، لَعَنَ اللّٰہُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَہٗ وہ تحلیل کرنے والا ہے۔ خدا کی لعنت ہے تحلیل کرنے والے پر بھی اور اُس شخص پر بھی جس کے لیے تحلیل کی جائے (ابن ماجہ۔ دار قطنی)[1]۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۰-۵۶۳، الطلاق حاشیہ ۱)

۱- مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۴۰-۱۴۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (البقرہ ۲:۲۳۰) پھر اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ اُس کا نِکاح کسی دُوسرے شخص سے ہو اور وہ اُسے طلاق دے دے۔ تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے، تو اُن کے لیے ایک دُوسرے کی طرف رُجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جنھیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے، جو (اُس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اُس کا نِکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نِکاح کے بعد اُسے طلاق دے دے گا تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نِکاح، نِکاح نہ ہوگا، بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی اور ایسے سازشی نِکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ حضرت علی، ابن مسعود، ابو ہریرہ اور عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم کی متفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طریقے سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص۱۷۶-۱۷۷، البقرہ حاشیہ ۲۵۳)

طلاق کا صحیح طریقہ قرآن وحدیث کی روشنی میں

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۖ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۗ (البقرہ ۲:۲۲۹) طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اُس کو رُخصت کر دیا جائے۔

اِس مختصر سی آیت میں ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی کی جو عرب جاہلیت میں رائج تھی، اصلاح کی گئی ہے۔ عرب میں قاعدہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حد و حساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔ جس عورت سے اُس کا شوہر بگڑ جاتا اُس کو وہ بار بار طلاق دے کر رُجوع کرتا رہتا تھا تاکہ نہ تو وہ غریب اُس کے ساتھ بس ہی سکے اور نہ اُس سے آزاد ہو کر کسی اور سے نِکاح ہی کر سکے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت اسی ظُلم کا دروازہ بند کرتی ہے۔ اِس آیت کی رُو سے ایک مرد ایک رشتۂ نِکاح میں اپنی بیوی پر حد سے حد دو ہی مرتبہ طلاق رجعی کا حق استعمال کر سکتا ہے۔ جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اُس سے رُجوع کر چکا ہو۔ وہ اپنی عمر میں جب کبھی اِس کو تیسری بار طلاق دے گا عورت اُس سے مستقل طور پر جُدا ہو جائے گی۔

طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طُہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہوا ہو، جب کہ عورت ایامِ ماہواری میں ہو تو اُسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں ہے، بلکہ ایام سے اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پھر ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہے تو دُوسرے طُہر میں دوبارہ ایک طلاق اور دے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دے۔ ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اِس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ عدّت کے گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کر لے، اور اگر ردّت گزر بھی جائے، تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرلیں۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رُجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اِس کا ہی کوئی مواقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں، جیسا کہ آج کل جُہلا کا عام طریقہ ہے تو یہ شریعت کی رُو سے سخت گناہ ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا، آپ اُس کو دُرّے لگاتے تھے۔ تاہم گناہ ہونے کے باوجود ائمہ اربعہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور طلاق مغلّظہ ہو جاتی ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۴-۱۷۵، البقرہ حاشیہ ۲۵۰)

دو صاحب عدل آدمیوں کو گواہ بنانے کا حکم: وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق ۶۵:۲) اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحبِ عدل ہوں۔ اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد طلاق پر بھی گواہ بنانا ہے اور رُجوع پر بھی (ابن جریر)۔ حضرت عمران بن حُصین سے پُوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور پھر اُس سے رُجوع کر لیا، مگر نہ طلاق پر کسی کو گواہ بنایا نہ رُجوع پر۔ اُنھوں نے جواب دیا "تم نے طلاق بھی سُنّت کے خلاف دی اور رُجوع بھی سُنّت کے خلاف کیا۔ طلاق اور رُجوع دونوں پر گواہ بناؤ اور آئندہ ایسا نہ کرنا" (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)۔ لیکن فقہائے اربعہ کا اِس پر اتفاق ہے کہ طلاق اور رجعت اور فُرقت پر گواہ بنانا، اِن افعال کی صحت کے لیے شرط نہیں ہے کہ اگر گواہ نہ بنایا جائے تو نہ طلاق واقع ہوگی، نہ رُجوع صحیح ہو اور نہ فُرقت، بلکہ یہ حُکم اِس احتیاط کے لیے دِیا گیا ہے کہ فریقین میں سے کوئی بعد میں کسی واقعے کا انکار نہ کر سکے۔ اور نزاع پیدا ہونے کی صورت میں بآسانی فیصلہ ہو سکے اور شکوک و شُبہات کا دروازہ بھی بند ہو جائے۔ یہ حُکم بالکل ایسا ہی ہے جیسے فرمایا: وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ (البقرہ ۲۸۲:۲) جب تم آپس میں بیع کا کوئی سا معاملہ کرو تو گواہ بنالو۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیع پر گواہ بنانا فرض ہے اور اگر گواہ نہ بنایا جائے تو بیع صحیح نہ ہوگی، بلکہ یہ ایک حکیمانہ ہدایت ہے جو نزاعات کا سدِّ باب کرنے کے لیے دی گئی ہے اور اس پر عمل کرنے ہی میں بہتری ہے۔ اسی طرح طلاق اور رُجوع کے معاملے میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ اُن میں سے ہر فعل گواہیوں کے بغیر بھی قانوناً درست ہو جاتا ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جو فعل بھی کیا جائے، اُسی وقت یا اُس کے بعد دو صاحبِ عدل آدمیوں کو اُس پر گواہ بنالیا جائے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵٦۷، الطلاق حاشیہ ۷)

قرآن کے بیان کردہ قواعد: اِس سورہ کے احکام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن ہدایات کو پھر سے ذہن میں تازہ کر لیا جائے جو طلاق اور عدّت کے متعلق اِس سے پہلے قرآنِ مجید میں بیان ہو چکی ہیں:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ ۲۲۹:۲) طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اُس کو رخصت کر دیا جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ...... وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (البقرہ ۲:۲۲۸) مطلقہ عورتیں (طلاق کے بعد) تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور ان کے شوہر اس مدت میں اُن کو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لینے کے حق دار ہیں اگر وہ اصلاح پر آمادہ ہوں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ ۲:۲۳۰) پھر اگر وہ [اُس کو تیسری بار] طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ ایک دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے۔

اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب ۳۳:۴۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھارے لیے اُن پر کوئی عدت لازم نہیں ہے، جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ ۲:۲۳۴) اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں چار مہینے دس دن تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

اِن آیات میں جو قواعد مقرر کیے گئے تھے وہ یہ تھے:

۱- ایک مرد زیادہ سے زیادہ اپنی بیوی کو تین طلاق دے سکتا ہے۔

۲- ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق رہتا ہے اور عدت گزر جانے کے بعد وہی مرد و عورت پھر نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اس کے لیے تحلیل کی کوئی شرط نہیں ہے۔ لیکن اگر مرد تین طلاق دے دے تو عدت کے اندر رجوع کا حق ساقط ہو جاتا ہے اور دوبارہ نکاح بھی اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عورت کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو جائے اور وہ بھی اپنی مرضی سے اُس کو طلاق نہ دے دے۔

۳- مدخولہ عورت، جس کو حیض آتا ہو، اُس کی عدت یہ ہے کہ اُسے طلاق کے بعد تین مرتبہ حیض آ جائے۔ ایک طلاق یا دو طلاق کی صورت میں اِس عدت کے معنی یہ ہیں کہ عورت ابھی تک اُس شخص کی زوجیت میں ہے اور وہ عدت کے اندر اُس سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مرد تین طلاق دے چکا ہو تو یہ عدت رجوع کی گنجایش کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اِس لیے ہے کہ اِس کے ختم ہونے سے پہلے عورت کسی اور شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔

۴- غیر مدخولہ عورت، جسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے، اُس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔ وہ چاہے تو طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔

۵- جس عورت کا شوہر مر جائے، اُس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔

سورۂ طلاق کے نزول کا مقصد: اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ سورۂ طلاق اِن قواعد میں سے کسی قاعدے کو منسوخ کرنے یا اُس میں ترمیم کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ دو مقاصد کے لیے نازل ہوئی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک یہ کہ مرد کو طلاق کا جو اختیار دیا گیا ہے اُسے استعمال کرنے کے ایسے حکیمانہ طریقے بتائے جائیں جن سے حتی الامکان علیحدگی کی نوبت نہ آنے پائے اور علیحدگی ہو تو بدرجۂ آخر ایسی حالت میں ہو جب کہ باہمی موافقت کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہوں۔ کیونکہ خدا کی شریعت میں طلاق کی گنجائش صرف ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر رکھی گئی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اس بات کو سخت ناپسند فرماتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان جو ازدواجی تعلق قائم ہو چکا ہو وہ پھر کبھی ٹوٹ جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ: مَا اَحَلَّ اللّٰهُ شَيْئًا اَبْغَضَ اِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ، اللہ نے کسی ایسی چیز کو حلال نہیں کیا ہے جو طلاق سے بڑھ کر اُسے ناپسند ہو (ابوداؤد)۔ اور اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الطَّلَاقُ، تمام حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے (ابوداؤد)[1]۔

دُوسرا مقصد یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے احکام کے بعد جو مزید مسائل جواب طلب باقی رہ گئے تھے اُن کا جواب دے کر اسلام کے عائلی قانون کے اس شعبے کی تکمیل کر دی جائے۔ اس سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن مدخولہ عورتوں کو حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا جنھیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو، طلاق کی صورت میں اُن کی عدت کیا ہوگی۔ اور جو عورت حاملہ ہو اُسے اگر طلاق دے دی جائے یا اُس کا شوہر مر جائے تو اُس کی عدت کیا ہے۔ اور مختلف قسم کی مطلقہ عورتوں کے نفقہ اور سکونت کا انتظام کس طرح ہوگا اور جس بچے کے والدین طلاق کے ذریعہ سے الگ ہو چکے ہوں اُس کی رضاعت کا انتظام کس طرح کیا جائے۔

(تفہیم القرآن، پنجم ص ۵۵۰-۵۵۲، الطلاق موضوع اور مضمون)

جماع سے پہلے طلاق اور متعۂ طلاق

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (البقرہ ۲: ۲۳۶-۲۳۷) تم پر کچھ گناہ نہیں، اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں اُنھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے۔ خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقے سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو، لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اُس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد جس کے اختیار میں عقدِ نکاح ہے، نرمی سے کام لے (اور پورا مہر دے دے) اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمھارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اِس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہر حال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مقدرت اس کی تلافی کرو۔

---

[1] مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۱۰۵، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انسانی تعلقات کی بہتری و خوشگواری کے لیے لوگوں کا باہم فیاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اڑا رہے تو اجتماعی زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص۱۸۱-۱۸۲، البقرہ حواشی ۲۶۰-۲۶۱)

اس مسئلے پر مزید روشنی اس آیت سے پڑتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب ۳۳:۴۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر اُنھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھاری طرف سے اُن پر کوئی عدت لازم نہیں ہے، جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو، لہٰذا اُنھیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔

یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً اسی زمانے میں طلاق کا کوئی مسئلہ پیدا ہو جانے پر نازل ہوئی تھی، اس لیے پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کے سلسلۂ بیان کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ اس ترتیب سے یہ بات خود مترشح ہوتی ہے کہ یہ تقریر ما سبق کے بعد اور تقریر مابعد سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس آیت سے جو قانونی احکام نکلتے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:

۱- مطلقہ کتابیہ کا حکم: آیت میں اگرچہ ''مومن عورتوں'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ کتابی عورتوں کے معاملہ میں قانون وہ نہیں ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ لیکن تمام علماءِ اُمّت کا اس پر اتفاق ہے کہ معنًی یہی حُکم کتابیات کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی کتابی عورت سے بھی کسی مسلمان نے نکاح کیا ہو تو اُس کی طلاق اُس کے مَہر، اُس کی عدّت اور اُس کو متعۂ طلاق دینے کے جملہ احکام وہی ہیں جو مومن عورت سے نکاح کی صورت میں ہیں۔ علما کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مخصوص طور پر صرف مومن عورتوں کا ذِکر جو کیا ہے اِس سے مقصود دراصل اِس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے مومن عورتیں ہی موزوں ہیں۔ یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ضرور ہے۔ مگر مناسب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے اس اندازِ بیان سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ ایمان سے متوقع یہی ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں گے۔

۲- مَس کرنے سے مُراد: 'ہاتھ لگانے' یا 'مَس' کرنے سے مُراد لُغت کے اعتبار سے تو محض چھونا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ کنایۃً مباشرت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اِس لحاظ سے ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر شوہر نے مباشرت نہ کی ہو تو خواہ وہ عورت کے پاس تنہائی میں رہا ہو، بلکہ اُسے ہاتھ بھی لگا چکا ہو تب بھی طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم نہ آئے۔ لیکن فقہا نے برسبیلِ احتیاط یہ حُکم لگایا ہے کہ اگر خلوتِ صحیحہ ہو جائے (یعنی جس میں مباشرت ممکن ہو) تو اُس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدّت لازم آئے گی اور سقوطِ عدّت صِرف اُس حالت میں ہو گا جب کہ خَلوَت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۳- خلوت سے پہلے طلاق کی عدت نہیں: طلاق قبلِ خلوت کی صورت میں عدّت ساقط ہو جانے کے معنی یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں کہ اس صورت میں مَرد کا حق رُجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نِکاح کر لے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حُکم صِرف طلاق قبلِ خلوت کا ہے۔ اگر خلوت سے پہلے عورت کا شوہر مر جائے تو اس میں عدّتِ وفات ساقط نہیں ہوتی بلکہ عورت کو وہی چار مہینے دَس دِن کی عدّت گزارنی ہوتی ہے جو منکوحۂ مدخولہ کے لیے واجب ہے۔ (عدّت سے مُراد وہ عدّت ہے جس کے گزرنے سے پہلے عورت کے لیے دُوسرا نِکاح جائز نہ ہو)

۴۔ عدّت، عورت پر اولاد اور شرع کا حق: فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ (تمھارے لیے اُن پر کوئی عدّت لازم نہیں ہے) کے الفاظ اس اَمر پر دلالت کرتے ہیں کہ عدّت عورت پر مَرد کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں۔ ایک حق اولاد، دوسرے اللہ یا حق الشرع۔ مَرد کا حق وہ اس بنا پر ہے کہ اس دوران میں اُس کو رُجوع کر لینے کا حق ہے، نیز اس بنا پر کہ اِس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدّت کے زمانے میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اِس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچّے کے نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حقوق قائم ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس کے اخلاقی مرتبے کا انحصار بھی اِس اَمر پر ہے کہ اس کا نسب مُشتبہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لیے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پروانہ بھی ہو تو خدا کی شریعت اِن حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مَرد کسی عورت کو یہ پروانہ بھی لکھ کر دے دے کہ میرے مَرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لے لینے کے بعد تیرے اُوپر میری طرف سے کوئی عدّت نہ ہو گی تب بھی شریعت کسی حال میں اس کو ساقط نہ کرے گی۔

۵۔ متعۂ طلاق[1] کی نوعیت: فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (ان کو کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رُخصت کر دو) اس حُکم کا منشا دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر پورا کرنا ہوگا۔ اگر نِکاح کے وقت مَہر مقرّر کیا گیا تھا اور پھر خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں نصف مَہر دینا واجب ہوگا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۷ میں ارشاد ہوا ہے۔ اس واجب سے زائد کچھ دینا لازم نہیں ہے مگر مستحب ہے۔ مثلاً یہ بات پسندیدہ ہے کہ نصف مَہر دینے کے ساتھ مَرد وہ جوڑا بھی عورت کے پاس ہی رہنے دے جو دُلہن بننے کے لیے اُسے بھیجا گیا تھا، یا اور کچھ سامان اگر شادی کے موقع پر اُسے دیا گیا تھا تو وہ نہ لے۔ لیکن اگر نِکاح کے وقت مَہر مقرّر نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کرنا واجب ہے اور یہ "کچھ نہ کچھ" آدمی کی حیثیت اور مقدرت کے مطابق ہونا چاہیے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں فرمایا گیا ہے۔ علما کا ایک گروہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ متعۂ طلاق دینا بہر حال واجب ہے خواہ مَہر مقرّر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا۔

۶۔ بھلے طریقے سے رُخصت کرنے کا مطلب: بھلے طریقے سے رُخصت کرنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کیا جائے، بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی قسم کا فضیحتا کیے بغیر شریفانہ طریقے

---

[1] اسلامی فقہ کی اصطلاح میں متعۂ طلاق اُس مال کو کہتے ہیں جو طلاق دے کر رُخصت کرتے وقت عورت کو دیا جاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ ایک آدمی کو اگر عورت پسند نہیں آئی ہے یا کوئی اور وجہ شکایت پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت کو نہیں رکھنا چاہتا تو بھلے آدمیوں کی طرح اُسے طلاق دے اور رُخصت کر دے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے عیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اپنی شکایتوں کے دفتر کھولے تا کہ کوئی دُوسرا بھی اس عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں 'بھلے طریقے سے رُخصت کرنے' کا کوئی امکان نہیں رہتا، بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو تھُکا فضیحتی اور بدنامی ورُسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجایش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیارِ طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔ آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اُسی پر یہ ذِمہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مہر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اِس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذِمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تا کہ وہ خود ہی اپنے اختیارِ طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرُونی معاملے میں کسی بیرُونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے، بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔

نِکاح سے پہلے طلاق

فقہا کے ایک گروہ کی رائے: ابن عباس رضی اللہ عنہ، سعید بن المُسَیَّب، حَسن بَصرِی، علی بن الحسین (زین العابدین) امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے آیت کے الفاظ ''جب تم نِکاح کرو پھر طلاق دے دو'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق اُسی صورت میں واقع ہوتی ہے جب کہ اِس سے پہلے نِکاح ہو چکا ہو نِکاح سے پہلے طلاق بے اَثر ہے۔ اِس لیے اگر کوئی شخص یوں کہے کہ ''اگر فلاں عورت سے، یا فلاں قبیلے یا قوم کی عورت سے یا کسی عورت سے نِکاح کروں تو اس پر طلاق ہے''۔ تو یہ قول لغو و بے معنی ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوسکتی۔ اس خیال کی تائید میں یہ احادیث پیش کی جاتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا طَلَاقَ لِابْنِ آدَمَ فِي مَالَا يَمْلِكُ (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجه) ابن آدم جس چیز کا مالک نہیں ہوسکتا اُس کے بارے میں طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔ اور لَا طَلَاقَ قَبْلَ النِّكَاحِ (ابن ماجه) نِکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں۔

دُوسرے گروہ کی رائے: مگر فقہا کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اس آیت اور ان احادیث کا اطلاق صرف اِس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک غیر عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو یوں کہے کہ ''تجھ پر طلاق ہے'' یا ''میں نے تجھے طلاق دی''۔ یہ قول بلاشُبہ لغو ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ یوں کہے کہ ''اگر میں تجھ سے نِکاح کروں تو تجھ پر طلاق ہے'' تو یہ نِکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے، بلکہ دراصل وہ شخص اِس اَمر کا فیصلہ اور اعلان کرتا ہے کہ جب وہ عورت اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے نِکاح میں آئے گی تو اُس پر طلاق وارد ہوگی۔ یہ قول لغو وبے اثر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ جب بھی وہ عورت اس کے نِکاح میں آئے گی اُسی وقت اِس پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ مسلک جن فقہا کا ہے اُن کے درمیان پھر اِس اُمر میں اختلاف ہوا ہے کہ اِس نوعیت کے ایقاعِ طلاق کی وُسعت کس حد تک ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام زُفر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شخص عورت یا قوم یا قبیلے کی تخصیص کرے یا مثال کے طور پر عام بات اِس طرح کہے کہ "جس عورت سے بھی میں نِکاح کروں اُس پر طلاق ہے" دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ ابوبکر جصاص نے یہی رائے حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ابراہیم نخعی، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی نقل کی ہے۔

سُفیان ثوری اور عثمان البتی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ طلاق صِرف اِسی صورت میں پڑے گی جب کہنے والا یوں کہے "اگر میں فلاں عورت سے نِکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"۔

حسن بن صالح، لیث بن سعد اور عامر الشعبی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اِس طرح کی طلاق عمومیت کے ساتھ بھی پڑ سکتی ہے بشرطیکہ اِس میں کسی نوع کی تخصیص ہو، مثلاً آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں فلاں خاندان یا فلاں قبیلے یا فلاں شہر یا فلاں ملک یا قوم کی عورت سے نِکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"۔

ابن ابی لیلیٰ اور امام مالک اُوپر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مزید یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس میں مدّت کا بھی تعیّن ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں اِس سال یا آیندہ دَس سال کے اندر فلاں عورت یا فلاں گروہ کی عورت سے نِکاح کروں تو اِس پر طلاق ہے" تب یہ طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس پر اِتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر یہ مدّت اِتنی طویل ہو جس سے اِس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر رہے گا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۰۹-۱۱۲، الاحزاب حاشیہ ۸۵-۸۶)

ایک استفسار اور اُس کا جواب

(س) میرے ایک غیر شادی شدہ دوست نے کسی وقتی جذبے کے تحت ایک مرتبہ یہ کہہ دیا تھا کہ "اگر میں کسی عورت سے بھی شادی کروں تو اُس پر تین طلاق ہے"۔ اب وہ اپنے اِس قول پر سخت نادم ہے اور چاہتا ہے کہ شادی کرے۔ علما یہ کہتے ہیں کہ جوں ہی وہ شادی کرے گا عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اِس لیے عمر بھر اب شادی کی کوشش کرنا اِس کے لیے ایک بے کار اور عبث فعل ہے۔ براہِ کرم بتائیں کہ اِس مصیبت نیز اُلجھن سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟

(ج) بلاشبہ فقہائے حنفیہ کی رائے یہی ہے کہ ایسی صورت میں جس عورت سے بھی اس کا نِکاح ہوگا اُس پر طلاق وارد ہو جائے گی۔ لیکن تمام ائمہ وفقہا کا اِس بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ طلاق کا حق نِکاح کے بعد پیدا ہوتا ہے نہ کہ نِکاح سے پہلے۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا ہو کہ وہ آیندہ جس عورت سے بھی نِکاح کرے، اُس کو طلاق ہے تو یہ ایک لغو اور غیر مؤثر بات ہے۔ اِس سے کوئی قانونی حُکم ثابت نہیں ہوتا۔ یہی رائے حضرت علی، حضرت معاذ بن جبل،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ اور اس رائے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: لَا طَلَاقَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ نِكَاحٍ[1] (طلاق واقع نہیں مگر نکاح کے بعد) امام مالک کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی عورت یا خاص قبیلے یا خاص خاندان کی عورتوں کے بارے میں کوئی شخص ایسی بات کہے تب تو طلاق لازم آ جائے گی، لیکن مطلقاً تمام عورتوں کے بارے میں یہ بات کہی جائے تو طلاق واقع نہ ہو گی۔ کیونکہ پہلی صورت میں تو یہ امکان باقی رہتا ہے کہ مرد اس عورت یا اس قبیلے کی عورت کے سوا دُوسری عورتوں سے نکاح کر سکے، لیکن دُوسری صورت میں ترک سُنّت کی قباحت لازم آتی ہے۔ اور یہ ایک حلال چیز کو اپنے اُوپر مطلقاً حرام کر لینے کا ہم معنی ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۷۶ء، ص ۲۶۰-۲۵۲، بحوالہ ترجمان القرآن جنوری ۵۶ء)

تفویض طلاق

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۲۸-۲۹)

اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دُنیا اور اُس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رُخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے اُن کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

اِس آیت کے نزول کے وقت حضور ﷺ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں۔ حضرت سَودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت اُمِ سَلمہ رضی اللہ عنہن۔ ابھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کا نکاح نہیں ہوا تھا (احکام القرآن لابن العربی طبع مصر ۱۹۵۸ء جلد سوم، ص ۱۲-۱۳، ۱۵)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کی اور فرمایا'' میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین کی رائے لے لو پھر فیصلہ کرو''۔ پھر حضور ﷺ نے اُن کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حُکم آیا ہے اور یہ آیت اُن کو سُنا دی۔ اُنھوں نے عرض کیا: ''کیا اس معاملے کو میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں تو اللہ اور اُس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں''۔ اِس کے بعد حضور ﷺ باقی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ایک ایک کے ہاں گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیا تھا (مُسند احمد۔ مسلم۔ نسائی)۔

اصطلاح میں اِس کو تخییر کہتے ہیں، یعنی بیوی کو اس اَمر کا اختیار دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جُدا ہو جانے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کرے۔ یہ تخییر نبی ﷺ پر واجب تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حضور ﷺ کو حُکم دیا تھا۔ اگر ازواجِ مطہرات میں سے کوئی خاتون علیحدگی کا پہلو اختیار کرتیں تو آپ سے جُدا نہ ہو جاتیں بلکہ حضور ﷺ کے جُدا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث ج ۵، ص ۱۰۹، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرنے سے ہوتیں، جیسا کہ آیت کے الفاظ ’’آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رُخصت کردوں‘‘ سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن حضور ﷺ پر یہ واجب تھا کہ اِس صورت میں اُن کو جُدا کر دیتے۔ کیونکہ نبی کی حیثیت سے آپ کا یہ منصب نہ تھا کہ اپنا وعدہ پورا نہ فرماتے۔ جُدا ہو جانے کے بعد بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ وہ امہات المؤمنین کے زمرے سے خارج ہو جاتیں اور ان سے کسی دوسرے مسلمان کا نِکاح حرام نہ ہوتا، کیونکہ وہ دُنیا اور اِس کی زینت ہی کے لیے تو رسول پاک ﷺ سے علیحدگی اختیار کرتیں جس کا حق اُنھیں دیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ اِن کا یہ مقصدِ نِکاح سے محروم ہو جانے کی صورت میں پورا نہ ہو سکتا تھا۔ دُوسری طرف آیت کا منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن ازواج نے اللہ اور اُس کے رسول اور دارِ آخرت کو پسند کر لیا اُنھیں طلاق دینے کا اختیار حضور ﷺ کے لیے باقی نہ رہا، کیونکہ تخییر کے دو ہی پہلو تھے۔ ایک یہ کہ دُنیا کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جُدا کر دیا جائے۔ دُوسرے یہ کہ اللہ اور اُس کے رسول اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہو تو تمھیں جُدا نہ کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ اِن میں سے جو پہلو بھی کوئی خاتون اختیار کرتیں اُن کے حق میں دُوسرا پہلو آپ سے آپ ممنوع ہو جاتا تھا۔

اسلامی فِقہ میں تخییر دراصل تفویضِ طلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی شوہر اِس ذریعے سے بیوی کو اختیار دے دیتا ہے کہ چاہے تو اُس کے نِکاح میں رہے ورنہ الگ ہو جائے۔

فقہا کے مستنبط کردہ احکام: اِس مسئلے میں قرآن وسُنّت سے استنباط کر کے فقہا نے جو احکام بیان کیے ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے:

۱- یہ اختیار ایک دَفعہ عورت کو دے دینے کے بعد شوہر نہ تو اُسے واپس لے سکتا ہے اور نہ عورت کو اس کے استعمال سے روک سکتا ہے۔ البتہ عورت کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس اختیار کو استعمال ہی کرے۔ وہ چاہے تو شوہر کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دے، چاہے علیحدگی کا اعلان کر دے، اور چاہے تو کسی چیز کا اظہار نہ کری اور اِس اختیار کو یوں ہی ضائع ہو جانے دے۔

۲- اس اختیار کے عورت کی طرف منتقل ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ اوّل یہ کہ شوہر نے یا تو اُسے صریح الفاظ میں طلاق کا اختیار دیا ہو، یا اگر طلاق کی تصریح نہ کی ہو تو پھر اُس کی نیت یہ اختیار دینے کی ہو۔ مثلاً اگر وہ کہے: ’’تجھے اختیار ہے‘‘ یا ’’تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے‘‘ تو اِس طرح کے کنایات میں شوہر کی نیت کے بغیر طلاق کا اختیار عورت کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ اگر عورت اس کا دعویٰ کرے اور شوہر بحلف یہ بیان دے کہ اِس کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی نہ تھی تو شوہر کا بیان قبول کیا جائے گا۔ اِلّا یہ کہ عورت اِس اَمر کی شہادت پیش کر دے کہ یہ الفاظ ناچاقی اور جھگڑے کی حالت میں یا طلاق کی باتیں کرتے ہوئے کہے گئے تھے، کیونکہ اِس سیاق وسباق میں اختیار دینے کے معنی یہی سمجھے جائیں گے کہ شوہر کی نیت طلاق کا اختیار دینے کی تھی۔ دوم یہ کہ عورت کو معلوم ہو کہ یہ اختیار اُسے دیا گیا ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو اُسے اس کی اطلاع ملنی چاہیے۔ اور اگر وہ موجود ہو تو اُسے یہ الفاظ سننے چاہییں۔ جب تک وہ سنے نہیں، یا اُسے اس کی خبر نہ پہنچے اختیار اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی طرف منتقل نہ ہوگا۔

۳- اگر شوہر کسی وقت کی تعیین کے بغیر مطلقاً اس کو اختیار دے تو عورت اِس اختیار کو کب تک استعمال کر سکتی ہے؟ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس نشست میں شوہر اُس سے یہ بات کہے اُسی نشست میں عورت اپنا اختیار استعمال کر سکتی ہے۔ اگر وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے اُٹھ جائے، یا کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتی تو اس کا اختیار باطل ہو جائے گا۔ یہ رائے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود، حضرت جابر بن عبداللہ، جابر بن زید رضی اللہ عنہم، عطا، مجاہد، شعبی، نخعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام اوزاعی، سُفیان ثوری اور ابوثور رحمہم اللہ کی ہے۔ دُوسری رائے یہ ہے کہ اس کا اختیار اس نشست تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کے بعد بھی اُسے استعمال کر سکتی ہے۔ یہ رائے حَسن بَصری، قتادہ اور زُہری کی ہے۔

۴- اگر شوہر وقت کی تعیین کر دے، مثلاً کہے کہ ایک مہینے یا ایک سال تک تجھے اختیار ہے یا اتنی مدت تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو یہ اختیار اُسی مدت تک اِس کو حاصل رہے گا۔ البتہ اگر وہ کہے: ''تو جب چاہے اس اختیار کو استعمال کر سکتی ہے'' تو اِس صورت میں اِس کا اختیار غیر محدود ہوگا۔

۵- عورت اگر علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اُسے واضح اور قطعی الفاظ میں اِس کا اظہار کرنا چاہیے۔ مبہم الفاظ جن سے مدّعا واضح نہ ہوتا ہو، مؤثر نہیں ہو سکتے۔

۶- قانوناً شوہر کی طرف سے عورت کو اختیار دینے کے تین صیغے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کہے: ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے''۔ دوسرے یہ کہ وہ کہے: ''تجھے اختیار ہے''۔ تیسرے یہ کہ وہ کہے: ''تجھے طلاق ہے اگر تو چاہے''۔ اِن میں سے ہر ایک کے قانونی نتائج الگ الگ ہیں۔

ل:- ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' کے الفاظ اگر شوہر نے کہے ہوں اور عورت اس کے جواب میں کوئی صریح بات ایسی کہے جس سے ظاہر ہو کہ وہ علیحدگی اختیار کرتی ہے تو حنفیہ کے نزدیک ایک طلاق بائن پڑ جائے گی (یعنی اس کے بعد شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا، لیکن عدت گزر جانے پر یہ دونوں پھر چاہیں تو باہم نکاح کر سکتے ہیں) اور اگر شوہر نے کہا ہو کہ ''ایک طلاق کی حد تک تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' تو اِس صورت میں ایک طلاقِ رجعی پڑے گی (یعنی عدت کے اندر شوہر رُجوع کر سکتا ہے)۔ لیکن اگر شوہر نے معاملہ عورت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تین طلاق کی نیت کی ہو، یا اس کی تصریح کی ہو تو اِس صورت میں عورت کا اختیار طلاق ہی کا ہم معنی ہوگا خواہ وہ بصراحت اپنے اُوپر تین طلاق وارد کرے یا صِرف ایک بار کہے کہ میں نے علیحدگی اختیار کی یا اپنے آپ کو طلاق دی۔

ب:- ''تجھے اختیار ہے'' کے الفاظ کے ساتھ اگر شوہر نے عورت کو علیحدگی کا اختیار دیا ہو اور عورت علیحدگی اختیار کرنے کی تصریح کر دے تو حنفیہ کے نزدیک ایک ہی طلاق بائن پڑے گی خواہ شوہر کی نیت تین طلاق کا اختیار دینے کی ہو۔ البتہ اگر شوہر کی طرف سے تین طلاق کا اختیار دینے کی تصریح ہو تب عورت کے اختیارِ طلاق سے تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ امام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر شوہر نے اختیار دیتے ہوئے طلاق کی نیت کی ہو اور عورت علیحدگی اختیار کرے تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مدخولہ بیوی پر تین طلاقیں پڑ جائیں گی، لیکن اگر غیر مدخولہ کے معاملے میں شوہر ایک طلاق کی نیت کا دعویٰ کرے تو اُسے قبول کر لیا جائے گا۔

ج:۔ ”تجھے طلاق ہے اگر تو چاہے“ کہنے کی صورت میں اگر عورت طلاق کا اختیار استعمال کرے تو طلاقِ رجعی ہوگی نہ کہ بائن۔

۷۔ اگر مرد کی طرف سے علیحدگی کا اختیار دیے جانے کے بعد عورت اُسی کی بیوی بن کر رہنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ یہی رائے حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت ابوالدرداء، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کی ہے۔ اور اِسی رائے کو جمہور فقہا نے اختیار کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مسروق نے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: خَیَّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ نِسَآئَہٗ فَاخْتَرْنَہٗ أَکَانَ ذٰلِکَ طَلَاقًا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو اختیار دیا تھا اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا پسند کر لیا تھا۔ پھر کیا اُسے طلاق شمار کیا گیا؟ اس معاملے میں صرف حضرت علی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کی یہ رائے منقول ہوئی ہے کہ ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی۔ لیکن دوسری روایت اِن دونوں بزرگوں سے بھی یہی ہے کہ کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۷۵-۸۸، الاحزاب حاشیہ ۴۲)

طلاق کے بعد بیوی کے لیے آزادی

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ○ (البقرہ ۲: ۲۳۲) جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔ تمھیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمھارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اگر کسی عورت کو اُس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو اور زمانۂ عدت کے اندر اُس سے رُجوع نہ کیا ہو پھر عدت گزر جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو عورت کے رشتے داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت عدت کے بعد اُس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو تو اس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے، اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۸، البقرہ حاشیہ ۲۵۶)

بیوی کو آزار دینے میں سختی ممنوع ہے: وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۙ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ (البقرہ ۲: ۲۳۱) اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور اُن کی عدت پوری ہونے کو آ جائے، تو یا بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا بھلے طریقے سے رُخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ در حقیقت آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے اُس کا احترام ملحوظ رکھو۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق ۶۵: ۲) پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمے پر پہنچیں تو یا انھیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو، یا بھلے طریقے پر اُن سے جُدا ہو جاؤ۔

ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے فیصلہ کر لو کہ آیا عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا ہے یا نہیں۔ رکھنا ہو تو نباہنے کی غرض سے رکھو، اس غرض سے نہ رکھو کہ اُس کو ستانے کے لیے رُجوع کر لو اور پھر طلاق دے کر اُس کی عدت لمبی کرتے رہو۔ اور اگر رُخصت کرنا ہو تو شریف آدمیوں کی طرح کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر رُخصت کرو، مہر یا اس کا کوئی حصہ باقی ہو تو ادا کر دو اور حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ مُتعہ طلاق کے طور پر دو جیسا کہ سورۂ بقرہ آیت ۲۴۱ میں ارشاد ہوا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۶، الطلاق حاشیہ ۶)

ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت گزرنے سے پہلے محض اس لیے رُجوع کر لے کہ اُسے پھر ستانے اور دق کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رُجوع کرتے ہو تو اس نیت سے کرو کہ اب حُسنِ سلوک سے رہنا ہے۔ ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقے سے رُخصت کر دو۔

اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے کر دُنیا کی رہنمائی کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم 'اُمتِ وسط' بنائے گئے ہو۔ تمھیں نیکی اور راستی کا گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمھارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے رُوحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اُٹھاؤ اور دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۷، البقرہ حاشیہ ۲۵۴-۲۵۵)

طلاق کے بعد عورت سے چیزیں واپس لینا: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ (البقرہ ۲: ۲۲۹) اور رُخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لے لو۔ البتہ یہ صورت مُستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔

مہر اور وہ زیور اور کپڑے وغیرہ، جو شوہر اپنی بیوی کو دے چکا ہو، اُن میں سے کوئی چیز بھی واپس مانگنے کا اُسے حق نہیں ہے۔ یہ بات ویسے بھی اسلام کے اخلاقی اُصولوں کی ضد ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو، جسے وہ دُوسرے شخص کو ہبہ یا ہدیہ و تحفہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے طور پر دے چکا ہو، واپس مانگے۔ اِس ذلیل حرکت کو حدیث میں اُس کتّے کے فعل سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی ہی قے کو خود چاٹ لے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ ایک شوہر کے لیے تو یہ بہت ہی شرمناک ہے کہ وہ طلاق دے کر رُخصت کرتے وقت اپنی بیوی سے وہ سب کچھ رکھوا لینا چاہے جو اُس نے کبھی اُسے خود دیا تھا۔ اِس کے برعکس اِسلام نے یہ اخلاق سکھائے ہیں کہ آدمی جس عورت کو طلاق دے اُسے رُخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کرے۔ جیسا آیت ۲۴۱ میں ارشاد ہے وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَي الْمُتَّقِيْنَ۔ اِسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، اُنھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔

(تفہیم القرآن، اوّل،ص ۱۷۵، البقرہ حاشیہ ۲۵۱)

طلاق کے بعد مہر واپس نہیں لیا جاسکتا: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُھْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (النسآء ۴: ۲۰-۲۱) اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کرلو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اُسے بُہتان لگا کر اور صریح ظلم کرکے واپس لوگے؟ اور آخر تم اُسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دُوسرے سے لُطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔

پختہ عہد سے مُراد نِکاح ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمانِ وفا ہے جس کے استحکام پر بھروسہ کرکے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مَرد کے حوالے کرتی ہے۔ اب اگر وہ اپنی خواہش سے اِس کو توڑتا ہے تو اُسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔

ایقاعِ طلاق کے بارے میں غیر مسلم عدالتوں کا فیصلہ

س اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ مسلمان مَرد و عورت کے نِکاح کو اِسلامی احکام کے مطابق فسخ کردے، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ عورت پر مَرد کا ظُلم ثابت ہو جانے کی صورت میں مَرد کی طرف سے عورت کو طلاق دے دے، جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان قاضی کو یہ حق حاصل ہے تو کیا نِکاح فسخ ہو جائے گا اور عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی، اور عورت کو شرعاً یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نِکاح اور ایقاعِ طلاق کو شرعاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو، دوسرے مسلمان مَرد سے نِکاح کرلے؟

ج اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صرف غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کرلیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں، اُس کو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟ اِس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف فسخ و تفریق کے معاملات سے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اُصولی حیثیت سے اِن معاملات کی نوعیت دُوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

غیر اِسلامی عدالت کے فیصلے کی حیثیت: صرف نِکاح و طلاق کے معاملات میں نہیں، بلکہ جملہ معاملات میں غیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رُو سے غیر مسلّم ہے۔ اسلام نہ اُس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ خود مختارانہ قائم ہوئی ہو۔ نہ اُس قانون کو تسلیم کرتا ہے جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطورِ خود بنالیا ہو۔ نہ اُس عدالت کے حقِ سماعت وفصلِ خصومات کو تسلیم کرتا ہے۔ جو اصل مالک وفرماں روا کے ملک میں اس کی اجازت (sanction) کے بغیر اِس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اِسلامی نقطۂ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رُو سے اُن عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں 'تاج' کی اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔ اُن عدالتوں کے جج، اُن کے کارندے اور وکیل، اور اُن سے فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی ومجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اُسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ وباغیانہ ہے جو بادشاہِ ارض وسما کی مملکت میں اِس کے 'سلطان' (چارٹر) کے بغیر قائم کیا گیا ہو۔ اور جس میں اُس کے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دُوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو۔ ایسا نظامِ عدالت جُرمِ مجسّم ہے۔ اِس کے جج مجرم ہیں، اس کے کارکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اِس کے سامنے اپنے معاملات لے جانے والے مجرم ہیں اور اُس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔ اگر اُن کا فیصلہ کسی خاص معاملے میں شریعتِ اِسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے، کیونکہ بغاوت اس کی جڑ میں موجود ہے، بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں، تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور اور زانی اور شرابی اپنے جرم سے اِس سزا کی بنا پر پاک نہ ہوں گے اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پر کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہوں گی، کیونکہ اُنھوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کیے جو خدا کے قانون کی رُو سے اُن کو حاصل نہ تھے[1]۔

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے جب کہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان اُن کی کُرسی پر بیٹھا ہو خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لے کر جو شخص مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسان کے بنائے ہوئے قانون کی رُو سے احکام جاری کرتا ہے وہ کم از کم جج کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھلا اِس کے احکام کالعدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔

یہی قانونی پوزیشن اُس صورت میں بھی قائم رہتی ہے جب کہ حکومت جمہوری ہو اور اُس میں مسلمان شریک ہوں، خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں قلیل التعداد ہوں یا کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری لادینی اُصول پر

۱۔ اِس سلسلے میں اُن مقدمات کی کارروائی مزید بصیرت کی موجب ہوگی جو ۱۹۴۵ء کے آخر اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں حکومتِ ہند نے اُن فوجی افسروں پر چلائے، جنھوں نے برما و ملایا پر جاپانی قبضے کے دوران میں ''آزاد ہند ریاست'' اور ''آزاد ہند فوج'' بنالی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ شاہنواز سہگل اور ڈھلوں کے مقدمہ میں ہندوستان کے ایڈووکیٹ جنرل نے استغاثہ کی جو تقریر کی تھی وہ بغور پڑھنے کے لائق ہے، کیونکہ اس میں اُن نام نہاد 'باغیوں'' کے مقابلہ میں حکومتِ ہند کی جو قانونی پوزیشن بیان کی گئی تھی درحقیقت وہی تمام اصلی وحقیقی باغیوں کے مقابلہ میں سلطنت رب العالمین کی قانونی پوزیشن ہے۔ (یہ حاشیہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نظامِ حکومت قائم کیا ہو۔ بہر حال جس حکومت کی بنیاد اِس نظریہ پر ہو کہ اہلِ ملک خود مالک الملک (sovereign) ہیں اور ان کو قانونِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے، اُس کی حیثیت اِسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی رعیت اُس کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرے اور اُس کے بالمقابل اپنی خود مختارانہ حکومت قائم کر لے۔ جس طرح ایسی حکومت کو اُس بادشاہ کا قانون کبھی جائز تسلیم نہیں کر سکتا، اُسی طرح اِس نوعیت کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہوں گی، خواہ اُن کے جج قومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اُن کے فیصلے بھی اِسی طرح کالعدم ہوں گے، جس طرح کہ صورتِ اوّل و دوم میں بیان کیے گئے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا اُس کی صحت پر پورا قرآن دلیل ہے۔ تاہم چونکہ سائل نے کتاب وسُنّت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے محض چند آیاتِ قرآنی یہاں پیش کی جاتی ہیں[1]۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النسآء ۴:۶۵) پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے نبی تجھ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝ (النسآء ۴:۶۱) اور جب کہا گیا کہ آؤ اُس حُکم کی طرف جو اللہ نے اُتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے جھجک رہے ہیں۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (النسآء ۴:۱۴۱) اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے باغیوں) کے لیے اہلِ ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ اِن میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے۔ اِسلام کے نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر مشتبہ رہ جاتا تو قرآن کا نزول ہی معاذ اللہ بے کار ہوتا۔ اِس لیے قرآن نے اس کو اتنے صاف اور قطعی طریقے سے بیان کر دیا ہے کہ اِس میں دو رائیں ہونے کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رُجوع کریں۔

پھر جب کہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ نے جس چیز کے لیے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے اور اللہ کے سلطان سے بے نیاز ہو کر جو چیز بھی قائم کی گئی ہو اُس کی قانونی حیثیت سراسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملے کے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اس معاملے میں بھی کسی غیر الٰہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچے کا نُطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اُس کے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بال بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ جب کہ پورا کا پورا حرام ہے تو اُس کی کسی بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں؟ پس یہ سوال کرنا کہ فسخِ نکاح اور تفریق بین الزوجین اور ایقاعِ طلاق کے بارے میں غیر الٰہی عدالتوں کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم ججوں کے بارے میں کیا

۱۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حقوق الزوجین ص ۱۶۰-۱۶۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائے۔ گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الٰہی نظامِ عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں اُن کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا، حالانکہ خنزیر کے جسم کی بوٹی کا نام 'بکرے کی بوٹی' رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اِس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الٰہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے، لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لیے اسلام کے اوّلین بنیادی اُصول میں ترمیم تو نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان اگر غیر الٰہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو اُنھیں اصولِ اسلام میں ترمیم کرنے یا بالفاظِ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں اِس سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام کو چھوڑ کر کسی آسان طریقِ زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الٰہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ایسے حیلے ڈھونڈتے پھریں جو اِسلام کے بنیادی اُصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ اُن کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریے کو بدلنے اور اُصولِ حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری قوّت صرف کریں۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۶-۱۷۰)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

خُلع

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲۲۹:۲) ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حُدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو اُن دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ حُدودِ الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں۔

شرعی اصطلاح میں خُلع کا معنیٰ

شریعت کی اصطلاح میں اسے 'خُلع' کہتے ہیں، یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اُس سے طلاق حاصل کرنا۔ اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے گھر کے درمیان گھر ہی میں کوئی معاملہ طے ہو جائے تو جو کچھ طے ہوا ہو وہی نافذ ہو گا۔ لیکن اگر عدالت میں معاملہ جائے تو عدالت صرف اِس اَمر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اُس مرد سے اِس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے پر عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے جو فدیہ چاہے، تجویز کرے اور اِس فِدیے کو قبول کر کے شوہر کو اُسے طلاق دینا ہو گا۔ بالعموم فقہا نے اِس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ جو مال شوہر نے اُس عورت کو دیا ہو، اُس کی واپسی سے بڑھ کر کوئی فدیہ اُسے دلوایا جائے۔

خُلع کی صورت میں واقعہ طلاق کی نوعیّت

خُلع کی صورت میں جو طلاق دی جاتی ہے، وہ رجعی نہیں ہے، بلکہ بائنہ ہے۔ چونکہ عورت نے معاوضہ دے کر اس طلاق کو گویا خریدا ہے، اس لیے شوہر کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ اِس طلاق سے رُجوع کر سکے۔ البتہ اگر یہی مرد وعورت پھر ایک دُوسرے سے راضی ہو جائیں اور دوبارہ نِکاح کرنا چاہیں تو ایسا کرنا اُن کے لیے بالکل جائز ہے۔

عدّتِ خُلع

جمہور کے نزدیک خُلع کی عدّت وہی ہے جو طلاق کی ہے۔ مگر ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں متعدّد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اس کی عدت ایک ہی حیض قرار دی تھی اور اس کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کیا (ابن کثیر، جلد اوّل ص ۲۷۶)۔

(تفہیم القرآن، اوّل ص ۱۷۵-۱۷۶، البقرہ حاشیہ ۲۵۳)

ایک سوال کا جواب

س آپ کی تصنیف تفہیم القرآن جلد اوّل، سورۂ بقرہ ص ۱۷۶ میں لکھا ہوا ہے کہ خُلع کی صورت میں عدت صرف ایک حیض ہے۔ دراصل یہ عدت ہے ہی نہیں بلکہ یہ حُکم محض استبراءِ رحم کے لیے دیا گیا ہے۔

اب قابلِ دریافت یہ امر ہے کہ آپ نے اس مسئلے کی سند وغیرہ نہیں لکھی۔ حالانکہ یہ قول مفہوم الآیۃ اور اقوالِ محققین اور قول النبی ﷺ کے بھی خلاف ہے۔

(۱) فی الفتح روی عبدالرزاق مرفوعاً الخلع تطلیقۃ۔ (۲) و روی الدار قطنی و ابن عدی انه جعل النبی صلی اللہ علیه و سلم الخلع تطلیقۃ۔ (۳) و روی مالک عن ابن عمر رضی اللہ عنه عدۃ المختلعۃ عدۃ المطلقۃ۔

ایک ابوداؤد کی روایت ہے کہ عدتها حیضۃ۔ لیکن یہ قول تصرّف من الرواۃ پر محمول کیا گیا ہے اور نص کے بھی خلاف ہے کہ نص میں ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔

مہربانی فرما کر احادیث نبویہ میں تطبیق دیتے ہوئے نص کو اپنے اطلاق پر رکھتے ہوئے اور محدثین کے اقوال کو دیکھتے ہوئے مسئلے کی پوری تحقیق مدلّل بحوالہ کتبِ معتبرہ تحریر فرمائیں تا کہ باعث اطمینان ہو سکے۔

ج مختلِعه کی عدت کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ فقہا کی ایک کثیر جماعت اُسے مطلقہ کی عدت کے مانند قرار دیتی ہے۔ اور ایک معتد بہ جماعت اُسے ایک حیض تک محدود رکھتی ہے۔ اس دُوسرے مسلک کی تائید میں متعدد احادیث ہیں۔ نسائی اور طبرانی نے ربیع بنت معوذ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی کے مقدمۂ خُلع میں حضور ﷺ نے حُکم دیا کہ: تتربص حیضۃ واحدۃ و تلحق باهلها۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انھی زوجہ ثابت بن قیسؓ کو حضور ﷺ نے حُکم دیا کہ: تعتد بحیضۃ۔ نیز ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ربیع بنت معوذؓ کی ایک اور روایت بھی اسی مضمون کی نقل کی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی ایک فیصلہ اسی مضمون پر مشتمل نقل کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہم مختلعه کی عدت کے معاملے میں تین حیض کے قائل تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کے بعد انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور ایک حیض کا فتویٰ دینے لگے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ عدتها حیضۃ۔ ابن ماجہ نے ربیع بنت معوذ بن عفرا کے حوالے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا فیصلہ کی جو روایت نقل کی ہے اُس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی موجود ہے کہ انما اتبع فی ذالک قضاء رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم۔ اُمید ہے کہ ان حوالوں سے آپ کا اطمینان ہو جائے گا۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۸-۲۷۰، بحوالہ ترجمان القرآن، اکتوبر ۵۶ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

احکامِ خُلع کی تفصیل

شرعِ اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں کرسکتا اُسے طلاق دے دے، اِسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کرسکتی ہو اُس سے خُلع کرلے۔

اس باب میں احکامِ شریعت کے دو پہلو ہیں۔ایک پہلو اخلاقی ہے اور دُوسرا قانونی۔

اخلاقی پہلو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو طلاق یا خُلع کا اختیار صِرف ایک آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے، نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لیے طلاق اور خُلع کو کھیل بنا لیا جائے۔چنانچہ احادیث میں نبی ﷺ کے ارشادات منقول ہیں کہ

> اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ وَ الذَّوَّاقَاتِ، اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔
>
> لَعَنَ اللّٰهُ كُلَّ ذَوَّاقٍ مِطْلَاقٍ، ہر طالبِ لذّت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت کی ہے۔
>
> اَيُّمَا امْرَأَةٍ اخْتَلَعَتْ مِنْ زَوْجِهَا بِغَيْرِ نُشُوْزٍ فَعَلَيْهَا لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ الْمُخْتَلِعَاتُ هُنَّ الْمُنَافِقَاتُ، جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے اِس کی کسی زیادتی کے بغیر خُلع لیا اُس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی۔خُلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں[1]۔

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعیّن کرنا ہے، اس پہلو سے بحث نہیں کرتا۔وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خُلع کا حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لیے بوقتِ ضرورت عقدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مُبتلا نہ کردیا جائے کہ دِل میں نفرت ہو، مقاصدِ نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتۂ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دُوسرے کے ساتھ محض اس لیے بندھے ہوئے ہیں کہ اِس گرفت سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حقوق کو بے جا طور پر استعمال کرے گا تو اِس بارے میں قانون جہاں تک ممکن اور معقول ہے پابندیاں عائد کردیتا ہے۔مگر حق کے بجا یا بے جا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیارِ تمیزی اور اُس کی دیانت اور خداترسی پر ہے۔اُس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ وہ محض طالبِ لذّت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائز حاجت رکھتا ہے۔قانون اِس کا فطری حق اُسے دینے کے بعد اُس کو بے جا استعمال سے روکنے کے لیے صِرف ضروری پابندیاں اِس پر عائد کرسکتا ہے۔چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیحدگی کا حق دینے کے ساتھ اُس پر متعدد قیُود لگادی گئی ہیں۔مثلاً یہ کہ جو مہر اُس نے عورت کو دیا تھا، اُس کا نقصان گوارا کرے، زمانۂ حیض میں طلاق نہ دے، تین طُہروں میں ایک

۱- مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵ ص ۱۱۶-۱۲۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک طلاق دے، عورت کو زمانہ عدّت میں اپنے ساتھ رکھے اور جب تین طلاق دے چکے تو پھر وہ عورت تحلیل کے بغیر دوبارہ اُس کے نکاح میں نہ آسکے۔ اِسی طرح عورت کو بھی خُلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں، جن کو قرآنِ مجید اس مختصری آیت میں بتمام وکمال بیان کر دیتا ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ (البقرہ ۲:۲۲۹) تمھارے لیے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ بھی واپس لو۔ الا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقدِ نکاح سے آزاد ہو جائے۔

اس آیت سے حسبِ ذیل احکام مُستنبط ہوتے ہیں۔

۱- خُلع ایسی حالت میں ہونا چاہیے، جب کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خُلع ایک بُری چیز ہے، جس طرح کہ طلاق بُری چیز ہے، لیکن جب یہ خوف ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خُلع لینے میں کوئی بُرائی نہیں۔

۲- جب عورت عقدِ نکاح سے آزاد ہونا چاہے تو وہ بھی اِسی طرح مال کی قربانی گوارا کرے جس طرح مَرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مَرد اگر خود طلاق دے تو وہ اِس مال میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو اُس نے عورت کو دیا تھا اور اگر عورت جُدائی کی خواہش کرے تو وہ اِس مال کا ایک حِصّہ یا پورا مال واپس کر کے جُدا ہو سکتی ہے، جو اُس نے شوہر سے لیا تھا۔

۳- افتداء (یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لیے محض فدیہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں ہے، بلکہ اِس معاملہ کا اِتمام اُس وقت ہوتا ہے جب کہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک مِقدار مال پیش کر کے آپ سے آپ علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ علیحدگی کے لیے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے اُس کو شوہر قبول کر کے طلاق دے دے۔

۴- خُلع کے لیے صرف اِس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اُس کا ایک حِصّہ پیش کر کے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور مَرد اِس کو قبول کر کے طلاق دے دے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ کے الفاظ اِس پر دلالت کرتے ہیں کہ خُلع کا فعل طرفین کی رضامندی سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اِس سے اِن لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خُلع کے لیے عدالتی فیصلے کو شرط قرار دیتے ہیں، جو معاملہ گھر کے اندر طے ہو سکتا ہے اِسلام اُسے عدالت میں لے جانا ہرگز پسند نہیں کرتا۔

۵- اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مَرد قبول نہ کرے تو اُس صورت میں عورت کو عدالت سے رُجوع کرنے کا حق ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اِس آیت میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اُولی الامر ہی کی طرف ہے، چونکہ اُولی الامر کا اوّلین فرض تو حُدود اللہ کی حفاظت ہے، اِس لیے اِن پر لازم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوگا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوا دیں جو اُنھی حدود کے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے۔

یہ مجمل احکام ہیں جن میں اس اَمر کی تصریح نہیں ہے کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف کن صورتوں میں متحقق ہوگا؟ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف کیا ہے؟ اور اگر عورت افتداء پر آمادہ ہو، لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں قاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خُلع کے ان مقدمات کی رُودادوں میں ملتی ہیں۔ جو نبی ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش ہوئے تھے۔

صدرِ اوّل کے نظائر

خُلع کا سب سے مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے اُن کی بیویوں نے خُلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمے کی تفصیلات کے مختلف ٹکڑے مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں، جن کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے اُن کی دو بیویوں نے خُلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت اُبَی بن سَلُول (عبداللہ بن ابیّ کی بہن[1]) کا قصہ یہ ہے کہ اُنھیں ثابت کی صورت ناپسند تھی۔ اُنھوں نے نبی ﷺ کے پاس خُلع کے لیے مرافعہ کیا اور ان الفاظ میں اپنی شکایت پیش کی:

يا رسولَ اللّٰهِ لا يَجمَعُ رَأسِي وَ رَأسَهٗ شَيءٌ اَبَدًا اِنِّي رَفَعتُ جانِبَ الْخِبَآءِ فَرَأَيْتُهٗ اَقبَلَ فِي عِدَّةٍ فَإِذَا هُوَ اَشَدُّهُم سَوادًا وَ اَقصَرُهُم قَامَةً وَ اَقبَحُهُم وَجهًا (ابن جرير) یا رسول اللہ! میرے اور اُس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا گھونگھٹ جو اُٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اُن سب سے زیادہ کالا اور سب سے زیادہ پستہ قد اور سب سے زیادہ بدشکل تھا۔

وَاللّٰهِ مَا كَرِهتُ مِنهُ دِينًا وَّلَا خُلُقًا اِلَّا اَنِّي كَرِهتُ دَمَامَتَهٗ (ابن جرير) خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی کے سبب سے اُس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ مجھے اُس کی بدصورتی ناپسند ہے۔

وَاللّٰهِ لَولَا مَخَافَةُ اللّٰهِ اِذَا دَخَلَ عَلَيَّ لَبَصَقتُ فِي وَجهِهٖ (ابن جرير) خدا کی قسم اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا تھا اس وقت میں اُس کے منہ پر تھوک دیتی۔

يا رَسُولَ اللّٰهِ بِي مِنَ الْجَمَالِ مَا تَرَى وَ ثَابِتٌ رَجُلٌ دَمِيمٌ (عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری) یا رسول اللہ میں جیسی خوب صورت ہوں آپ دیکھتے ہیں اور ثابت ایک بدصورت شخص ہے۔

وَمَا اَعتِبُ عَلَيهِ فِي خُلُقٍ وَّلَا دِينٍ وَ لٰكِنِّي اَكرَهُ الكُفرَ فِي الاِسلَامِ[2] (بخاری و نسائی) میں اُس کے دین اور اخلاق پر کوئی حرف نہیں رکھتی۔ مگر مجھے اِسلام میں کفر کا خوف ہے[3]۔

۱۔ بعض نے زینب بنت عبداللہ بن ابی کہا۔ مگر مشہور یہی ہے کہ اُن کا نام جمیلہ تھا۔ اور عبداللہ ابن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

۲۔ مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفهيم الاحاديث، ج ۵ ص ۱۱۴ تا ۱۱۶، اشاعت سوم

۳۔ اسلام میں کفر کے خوف سے مُراد ہے کہ کراہت و نفرت کے باوجود اگر میں اُس کے ساتھ رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس انداز میں کی پابندی نہ کر سکوں، جو شوہر کی اطاعت اور اُس کی وفاداری اور عصمت و عفت کے تحفظ کے لیے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی ﷺ نے یہ شکایت سُنی اور فرمایا: اَتَرُدِّیْنَ عَلَیْهِ حَدِیْقَتَهُ الَّتِیْ اَعْطَاکِ، جو باغ تجھ کو اُس نے دیا تھا وہ تو واپس کر دے گی؟ اُنھوں نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ، بلکہ وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اَمَّاالزِّیَادَةُ فَلَا وَلٰکِنْ حَدِیْقَتَهٗ زیادہ تو نہیں مگر تو اُس کا باغ واپس کر دے۔ پھر ثابت کو حُکم دیا کہ اَقْبِلِ الْحَدِیْقَةَ وَ طَلِّقْهَا تَطْلِیْقَةً، باغ قبول کر لے اور اُس کو ایک طلاق دے دے (بخاری و نسائی)

ثابت کی ایک اور بیوی حَبِیبہ بنت سَہل الانصاریہ تھیں جن کا واقعہ امام مالک اور ابوداؤد رحمھما اللہ نے اِس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضور ﷺ اپنے مکان سے باہر نکلے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔ دریافت فرمایا: کیا معاملہ ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا: لَا اَنَا وَلَا ثَابِتُ بْنُ قَیْسٍ، میری اور ثابت کی نِبھ نہیں سکتی۔ جب ثابت حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے۔ اس نے بیان کیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو کچھ ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے۔ حضور ﷺ نے ثابت کو حُکم دیا کہ وہ لے لے اور اُس کو چھوڑ دے۔ بعض روایتوں میں خَلِّ سَبِیْلَهَا کے الفاظ ہیں اور بعض میں فَارِقْهَا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابوداؤد اور ابن جریر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس واقعے کو اِس طرح روایت کیا ہے کہ ثابتؓ نے حبیبہؓ کو اِتنا مارا تھا کہ اُن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حبیبہؓ نے آ کر حضور ﷺ سے شکایت کی آپؐ نے ثابتؓ کو حُکم دیا کہ خُذْ بَعْضَ مَالِهَا وَ فَارِقْهَا، اِس کے مال کا ایک حصّہ لے لے اور جُدا ہو جا۔

مگر ابن ماجہ نے حبیبہ کے جو الفاظ نقل کیے ہیں اُن سے معلُوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو بھی ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ مار پیٹ کی نہیں، بلکہ بدصورتی کی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے وہی الفاظ کہے جو دُوسری احادیث میں جمیلہ سے منقول ہیں، یعنی اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مَرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اِس پر آپؓ نے اُسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دِن قید رکھنے کے بعد آپؓ نے اُسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا؟ اُس نے کہا: خدا کی قسم مجھ کو اِنھی راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِس کے شوہر کو حُکم دیا کہ اِخْلَعْهَا وَ یْحَکَ وَلَوْ مِنْ قُرْطِهَا اِس کو خُلع دے دے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں کے عوض ہی میں ہو (کشف الغمہ، ج ۲)۔

رُبَیِّع بنت مُعَوِّذ بن عَفرا نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضے میں خُلع حاصل کرنا چاہا۔ شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُس کو حُکم دیا کہ اِس کی چوٹی کا موباف تک لے لے اور اُس کو خُلع دے دے۔ فاجازہ و امرہ باخذ عقاص رأسھا فمادونہ (عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیے ہیں۔ یہ ایک مومنہ کا تصوّر ہے کہ حدود اللہ کے توڑنے کو وہ کفر سمجھتی ہے اور آج کل کے مولویوں کا تصوّر یہ ہے کہ اگر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ بھی ادا نہ کیا جائے اور کھلّم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کیا جائے تب بھی وہ اس حالت کو ایک ایمانی حالت کہنے پر اصرار کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جنّت کی بشارتیں دیتے ہیں اور جو اِسے غیر ایمانی حالت کہے اُسے خارجی ٹھیراتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

احکامِ خُلع کا خلاصہ

ان روایات سے حسب ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ کی تفسیر وہ شکایات ہیں جو ثابت بن قیس کی بیویوں سے منقول ہیں۔ نبی ﷺ نے ان عورتوں کی اس شکایت کو خُلع کے لیے کافی سمجھا کہ اُن کا شوہر بدصورت ہے، اور وہ اُن کو پسند نہیں ہے۔ آپؐ نے اُن کو خوب صورتی کے فلسفے پر کوئی لکچر نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ اُن عورتوں کے دِل میں شوہر کی طرف سے نفرت و کراہت بیٹھ چکی ہے تو آپؐ نے اُن کی درخواست کو قبول فرمالیا۔ کیونکہ نفرت و کراہت کے ساتھ ایک عورت اور مَرد کو جبراً ایک دُوسرے سے باندھ رکھنے کے نتائج دِین اور اخلاق اور تمدن کے لیے طلاق و خُلع سے زیادہ خراب ہیں۔ اُن سے تو مقاصدِ شریعت ہی کے فوت ہو جانے کا خوف ہے۔ پس نبی ﷺ کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خُلع کا حُکم نافذ کرنے کے لیے محض اس بات کا تحقیق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو قطعی ناپسند کرتی ہے اور اُس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کی تحقیق کے لیے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے تا کہ کسی شُبہ کی گنجایش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس جوڑے میں اب نباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں ہے اور یہ ایک معقول بات ہے۔ عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سُننے والا نفرت کے لیے کافی نہ سمجھے گا۔ لیکن جس کو ان اسباب سے رات دِن سابقہ پیش آتا ہے اُس کے دِل میں نفرت پیدا کرنے کے لیے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قاضی کا کام صرف اس واقعے کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دِل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اُس کا کام نہیں ہے کہ جو وجوہ عورت بیان کر رہی ہے وہ نفرت کے لیے کافی ہیں یا نہیں؟

۴۔ قاضی عورت کو وعظ و پند کر کے شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اُسے مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خُلع اُس کا حق ہے جو خدا نے اُس کو دیا ہے۔ اور اگر وہ اس اَمر کا اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑ دے مگر اس خاص مَرد کے ساتھ بہر حال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

۵۔ خُلع کے مسئلے میں دراصل یہ سوال قاضی کے لیے تنقیح طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالبِ خُلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لیے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدماتِ خُلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اوّل تو اس سوال کی کما حقہ تحقیق کر

www.KitaboSunnat.com

کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دُوسرے خُلع کا حق عورت کے لیے اُس حق کے مقابلے میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذوّاقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حقِ طلاق کو قانون میں اِس قید کے ساتھ مقیّد نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوّاقیت کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلّق ہے عورت کے حقِ خُلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقیّد نہ ہونا چاہیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالبِ خُلع عورت دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ یا وہ فی الحقیقت خُلع کی جائز ضرورت رکھتی ہوگی۔ یا محض ذوّاقہ ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اُس کے مطالبے کو ردّ کرنا ظلم ہوگا اور اگر دُوسری صورت ہے تو اُس کو خُلع نہ دلوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اِس لیے کہ جو عورت طبعاً ذوّاقہ ہوگی وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے رہے گی۔ اگر آپ اِس کو جائز طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں سے اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ بُرا ہوگا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلنا اِس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے نِکاح میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

۶- اگر عورت خُلع مانگے اور شوہر اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اِس کو حُکم دے گا کہ اِسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حُکم دیا ہے۔ اور قاضی کا حُکم بہرحال یہی معنی رکھتا ہے کہ محکوم علیہ اِس کے بجالانے کا پابند ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ بجا نہ لائے تو قاضی اِس کو قید کر سکتا ہے۔ شریعت میں قاضی کی حیثیت صِرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اِس کا حُکم مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا ماننے کا اختیار ہو۔ قاضی کی اگر یہ حیثیت ہو تو لوگوں کے لیے اِس کی عدالت کا دروازہ کھُلا ہونا محض بے معنی ہے۔

۷- خُلع کا حُکم نبی ﷺ کی تصریح کے مطابق ایک طلاقِ بائن کا ہے، یعنی اس کے بعد زمانہ عدّت میں شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا۔ کیونکہ حقِ رُجوع باقی رہنے سے خُلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ عورت نے جو مال اُس کو دیا ہے، وہ عقدِ نِکاح سے اپنی رہائی کے معاوضے میں دیا ہے، اس لیے اگر شوہر معاوضہ لے لے اور اُس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہوگی جس کو شریعت جائز نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اُس کے ساتھ نِکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طلاق مُغلّظ نہیں ہے، جس کے بعد دوبارہ نِکاح کرنے کے لیے تحلیل شرط ہو۔

۸- خُلع کے معاوضے کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جیسے معاوضے پر بھی زوجین راضی ہو جائیں اُس پر خُلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا ہے کہ شوہر خُلع کے معاوضے میں اپنے دیے ہوئے مَہر سے زیادہ مال لے۔ آپ کا ارشاد ہے: لَا يَأْخُذُ الرَّجُلُ مِنَ الْمُخْتَلِعَةِ اَكْثَرَ مِمَّا اَعْطَاهَا[1]، [خلع کی جانے والی عورت سے اس کا شوہر دیے ہوئے مال سے زیادہ نہ لے] حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے بھی بالفاظِ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی اِس پر اتفاق ہے۔ بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خُلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کو مَہر سے مال

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۲۰، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہی لینا مکروہ ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے: و إن کان النشوز من قبله یکره له ان یاخذ منها عوضا۔ ان تصریحات کو دیکھتے ہوئے اس باب میں اصولِ شرع کے تحت یہ ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ اگر خُلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوز ثابت کر دے، یا خُلع کے لیے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں تو اس کو مہر کے ایک قلیل جز یا نصف کی واپسی پر خُلع دلایا جائے اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوز ثابت کرے نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اُس کے لیے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصّہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے رویے میں قاضی کو ذواقیت کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اُس کو مہر سے زیادہ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

ایک بنیادی غلطی

خُلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانونِ اسلامی میں عورت اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خُلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا اور اُصولِ شرع کے خلاف، خُلع دینے یا نہ دینے کو بالکل مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں اُن کی ذِمّہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا اِستقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گُتھیاں سُلجھ جائیں جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں، بلکہ گُتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے۔

عورت سے خُلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے، وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خُلع کا معاملہ کلیتاً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدودِ اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خُلع دینا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو گیا ہے۔ اگر عورت خُلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شرارت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ معاملۂ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دُوسرے فریق کے ہاتھ میں دے دے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدّنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کیے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلامی شریعت میں قانون ازدواج کی بنا ہی اس اصل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکیزگی اخلاق اور مودّت و رحمت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اُس کا استحکام مستحسن اور ضروری ہے اور اس کو توڑنا یا تڑوانے کی کوشش کرنا سخت نامحمود ہے اور جب یہ تعلق دونوں کے لیے یا دونوں میں سے کسی ایک کے لیے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے، یا اُس میں مودّت و رحمت کی جگہ نفرت و کراہت داخل ہو جائے، تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے اور اس کا باقی رہنا اغراضِ شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے ماتحت شریعت نے معاملۂ نکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقدِ نکاح کے ناقابلِ برداشت ہو جانے کی صورت میں حَل و عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلے کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اُسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آلے کا نام خُلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جب وہ عقدۂ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اِس کا مطالبہ کرے اور اگر مرد اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دے تو پھر قاضی سے مدد لے۔

زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا ہے اور خدا اور رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا، مگر قاضی کے اختیارِ سماعت کو درمیان سے خارج کر کے یہ توازن بگاڑ دیا گیا، کیونکہ اِس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا۔ اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ اگر مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ اُسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو اُس کے پاس اِس تعلق کو قطع کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاوقتیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کر دے، وہ مجبور ہے کہ بہرحال اِس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لیے محال ہی کیوں نہ ہو جائے اور مناکحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں۔ کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوئی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟ یہ جسارت اگر کوئی کرے تو اُسے اقوالِ فقہا سے نہیں، بلکہ کتاب و سُنت سے اِس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول نے خُلع کے معاملے میں قاضی کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔

مسئلۂ خُلع میں قاضی کے اختیارات

www.kitabosunnat.com

قرآنِ مجید کی جس آیت میں خُلع کا قانون بیان کیا گیا ہے، اُس کو پھر پڑھیے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (البقرہ ۲:۲۲۹) اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ان دونوں (یعنی زوجین) پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ (یعنی عورت) کچھ فدیہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔

اِس آیت میں خود زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں میں کیا گیا ہے لہٰذا الفاظ اِن خِفْتُمْ (اگر تم کو خوف ہو) کے مخاطب وہ نہیں ہو سکتے۔ اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اِس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکمِ الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خُلع پر زوجین میں باہمی رضامندی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رُجوع کیا جائے۔

اس کی تائید اُن احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے پاس خُلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا اُن کی سماعت کرنا خود اِس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں خُلع پر راضی نامہ نہ ہو سکے تو عورت کو قاضی کی طرف رُجوع کرنا چاہیے۔ اب اگر فی الواقع قاضی اِس معاملے میں صرف سماعت کا اختیار رکھتا ہو، مگر مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں اُس سے اپنا فیصلہ منوانے کا اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہو گا۔ کیونکہ اِس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اِس معاملے میں بے اختیار ہے؟ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے جتنے فیصلے اُوپر منقول ہوئے ہیں اُن سب میں یا تو صیغۂ امر آیا ہے جیسے طَلِّقْهَا (اُسے طلاق دے)، فَارِقْهَا (اس سے جدا ہو جا) اور خَلِّ سَبِيلَهَا (اس کو چھوڑ دے) یا یہ بیان کیا گیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ اور ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا، پھر آپ نے اُن کو جدا کر دیا۔ اور یہی الفاظ اِس روایت میں بھی ہیں جو خود جمیلہ بنتِ اُبَیّ بن سلُول سے منقول ہے۔ اِس کے بعد یہ شُبہ کرنے کی کوئی گنجایش نہیں رہتی کہ قاضی خُلع کے معاملے میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اگر شوہر اِس حُکم کو محض مشورہ سمجھ کر ماننے سے انکار کر دے تو کیا قاضی اِس سے جبراً اپنا حُکم منوا سکتا ہے؟ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں تو ایسی کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے سرتابی کی جرأت کی ہو۔ لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اِس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں، جس میں آپ نے ایک جھگڑالو شوہر سے فرمایا تھا: لَسْتَ بِبَارِحٍ حَتّٰى تَرْضٰى بِمِثْلِ مَا رَضِيَتْ بِهٖ، یعنی تجھے نہ چھوڑا جائے گا جب تک کہ تو بھی اِسی طرح حکمین کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔ اگر قاضی ایک شوہر کو حکمین کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار پر حراست میں رکھ سکتا ہے تو وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لیے تو بدرجۂ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دُنیا کے تمام معاملات میں سے صرف ایک خُلع ہی کا مسئلہ ایسا ہو جسے قاضی کے اِس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں میں متعدد جزئیات ایسے ملتے ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر اس کے حُکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کرادے۔ پھر کیوں نہ خُلع کے مسئلے میں بھی قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

آگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے، اِن سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے گی کہ عِنّین (نامرد) اور مجبوب (مقطوع الذکر) اور خصی اور جذامی اور مبروص (کوڑھی) اور مجنون شوہروں کے مسئلے میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کیے ہیں اور اسی طرح خیار بلوغ اور بعض دُوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کیے گئے ہیں اُن کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو خُلع دلانے کے پورے اختیارات قاضی کو حاصل ہوں۔ ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں، اِن کے لیے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں رہتی کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں یا خودکشی کر لیں، یا اپنے داعیاتِ نفس سے مجبور ہو کر فواحش میں مُبتلا ہو جائیں یا مجبوراً مُرتد ہو کر قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ توضیح مُدعا کے لیے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عِنّین کے معاملے میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہم بستری پر قادر ہو گیا، حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اُس نے ادھوری مباشرت بھی کر لی[1] تو عورت کو فسخِ نکاح کا حق نہیں ہے۔ بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لیے باطل ہو گیا۔ اگر عورت کو نکاح کے وقت معلوم تھا کہ وہ نامرد ہے اور پھر وہ نکاح پر راضی ہوئی تو اُس کو سرے سے قاضی کے پاس دعویٰ ہی لے جانے کا حق نہیں ہے[2]۔ اگر اُس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر نامرد

۱- فی ردالمحتار عن المعراج، اذا اولج الحشفة فقط فليس بعنين و ان كان مقطوعا فلا بد من ايلاج بقية الذكر

۲- فی العالمكيرية، ان علمت المرأة وقت النكاح انه عنين لا يصل الى النساء لا يكون لها الخصومة.

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہو گیا تب بھی عورت کو دعویٰ کا حق نہیں[1]۔ اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم حاصل ہو اور وہ اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے تب بھی وہ ہمیشہ کے لیے خیارِ فسخ سے محروم ہو گئی[2]۔ ان صورتوں میں عورت کا خیار فسخ تو یوں باطل ہو گیا۔ اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خُلع کر لے۔ مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا۔ کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا مَہر بلکہ مَہر سے کچھ زائد لے کر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اور عدالت سے رُجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کر کے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس غریب عورت کا حشر کیا ہو گا؟ بس یہی نا کہ یا تو وہ خودکُشی کر لے یا عیسائی راہبات کی طرح نفس کُشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر رُوح فرسا تکلیفیں برداشت کرے، یا قیدِ نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مُبتلا ہو، یا پھر سرے سے دینِ اسلام ہی کو خیرباد کہہ دے۔ مگر کیا اسلامی قانون کا منشا بھی یہی ہے کہ عورت اِن حالات میں سے کسی حالت میں مُبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لیے قانونِ ازدواج بنایا گیا تھا؟ کیا ایسے زَوجَین میں مودّت و رحمت ہو گی؟ کیا وہ باہم مِل کر تمدن کی کوئی مُفید خدمت کر سکیں گے؟ کیا اِن کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہو سکیں گے؟ کیا یہ قیدِ نکاح کسی حیثیت سے بھی احصان کی تعریف میں آ سکے گی اور اِس سے دین اور اخلاق اور عفت کا تحفظ ہو گا؟ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا مجبوراً اُس کو فواحش میں مُبتلا ہو جانے یا دائرۂ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے سَر ہو گا؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذّمہ ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنے قانون میں ایسا کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۵۸-۶۷)

............OOO............

۱- فی الدر المختار فلوجب بعد وصوله اليهامرة او صار عنينا بعده ای الوصول لا يطرق لحصول حقها بالوطی مرة۔

۲- قال الشامی قوله لم يبطل ای مالم نقل رضيت بالمقام معه

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

خیارِ فسخ[1]

عیُوب میں خیارِ فسخ

عیُوبِ زوجین کے مسئلے میں فقہا کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ایک گروہ اِس طرف گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بنا پر دُوسرے فریق کو خیارِ فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے: ولا یتخیر احد الزوجین بعیب الاٰخر ولو فاحشا کجنون و جذام و برص ورتق و قرن، میاں بیوی میں سے کسی کو بھی دُوسرے کے کسی عیب پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں، خواہ وہ عیب کیسا ہی سخت ہو۔ مثلاً جنون، جذام، برص، رتق، قرن۔ صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں سے عطا، نخعی، عمر بن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی، ثوری، ابوحنیفہ اور ابو یوسف رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔

دُوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیُوب جو مانع تعلقات زن وشوہر ہوں، ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ اور شرم گاہ کے ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

چنانچہ ابن جزی نے القوانین میں عیوب مذکورہ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ: اذا کان فی اَحد الزَوجین احدُ العُیوب کان الاٰخر بالخیار فی البقاء معَه والفراق، اگر ان عیُوب میں سے کوئی عیب عورت یا مرد میں ہو تو فریق ثانی کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ رہنا قبول کرے یا الگ ہوجائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جنون اور جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مگر قروح سیالہ فرج[2] مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارش میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت اندامِ نہانی کے ایسے امراض میں مُبتلا ہو جو مانعِ مباشرت ہوں یا مرد عنین یا مقطوع الذکر ہو تو ایسی صورت میں فریقِ ثانی کو خیارِ فسخ ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ نہیں ہے مگر اُس کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیارِ فسخ ہے۔

۱۔ خیارِ فسخ یعنی نکاح ہوجانے کے بعد یہ کہنے کا اختیار کہ مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔

۲۔ وہ زخم جن کی وجہ سے فرج سے رطوبتیں بہتی رہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان تمام مذاہب میں سے دُوسرا مذہب قرآنِ مجید کی منشا سے اقرب ہے۔ قرآن کی رُو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظِ اخلاق، دُوسرے زوجین کی باہمی مودّت ورحمت۔ یہ دونوں مقصد ایسے عیُوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعًا ایک دُوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں۔ یا ایک دُوسرے کی طبعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔ پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ بات اسلامی قانونِ ازدواج کے اُصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لیے مضرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیُوب میں خیارِ فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے وہ تمام امراض جن کا اُوپر ذِکر کیا گیا ہے۔ ضرر پہنچانے والے ہیں اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تمام عیُوب میں زوجین کے لیے خیارِ فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ نِکاح سے پہلے زوجین کو ایک دُوسرے کے حال کی خبر نہ ہو اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر نارضامندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دُوسرے کا حال معلُوم تھا اور اُنھوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا۔ یا ان کو معلُوم تو نہ تھا مگر بعد میں علم ہونے پر اُنھوں نے خیارِ فسخ استعمال نہ کیا، یا نِکاح کے بعد عیب پیدا ہوا تو ان تمام صورتوں میں مَرد کے پاس تو ایک چارۂ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے یعنی طلاق اور اس کے علاوہ دُوسرا چارۂ کار بھی اُس کے پاس موجود ہے، یعنی دُوسری شادی کر لینا، مگر عورت کے لیے بعض صورتوں میں فقہا نے کوئی چارۂ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاوی ہیں، اُن کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے اُن پر بحث کریں گے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۸-۱۳۰)

عِنّین[1] و مجبُوب[2] وغیرہ

اگر شوہر مجبوب ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کا دعویٰ کرنے کا حق ہے اور تحقیقِ حال کے بعد فی الفور تفریق کرائی جائے گی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی بنا پر اُسے ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر وہ قادر نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ فقہا نے حسبِ ذیل شرطیں لگائی ہیں:

۱- یہ حکم صرف اس صورت میں ہے جب کہ عورت کو پہلے سے اُس کے عِنّین ہونے کا علم نہ ہو۔ لیکن اگر اُس کو علم تھا اور اُس نے برضا ورغبت اس سے نِکاح کیا، تو اُسے تفریق کے مطالبے کا حق نہیں۔

۱- نامرد

۲- مقطوع الذکر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱- اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا مگر بعد میں علم ہو نے کے بعد اس نے اُس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کر دی تو اس کو مطالبہ تفریق کا حق باقی نہیں رہا۔

۲- تفریق صرف اس صورت میں کرائی جائے گی جب کہ شوہر ایک مرتبہ بھی مباشرت نہ کر سکا ہو۔ ورنہ اگر اُس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ان شرطوں میں سے کسی کے لیے بھی قرآن و حدیث میں کوئی سند موجود نہیں ہے اور ہم ان تینوں شرطوں کو درست نہیں سمجھتے۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اُس سے نکاح کر لیا تو اُس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر بیّن ہیں کہ بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ ایسی نادان عورت کے لیے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اُس کو مہر سے محروم کرا کے تفریق کرا دی جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا اور اس نے ابتداً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کر دی تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں جس کی بنا پر اس کو تمام عمر مصیبت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ ابتدا میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے۔ میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی مگر بعد میں اُس کو ناقابلِ برداشت تکلیفیں پیش آئیں، جن کا اُسے پہلے احساس نہ تھا اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف سے پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دے کر اُس کی زبان پکڑ لی جائے اور اُس سے کہا جائے کہ تو نے ابتدا میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو سڑ سڑ کر مر جا یا آبرو باختہ بن کر زندگی گزار۔ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلوں میں منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے بہتر ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے۔ درآں حالیکہ حقیقتاً تفریق میں اس کا بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اس عورت کو دی جا سکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اُسے کُل یا جزو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بھی میرے نزدیک زیادتی ہے۔ کیونکہ سزا کا مستحق تو وہ شخص ہے جس نے نامرد ہونے کے باوجود نکاح کیا۔

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اسلام کا قانون کسی آسمانی مخلوق کے لیے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لیے ہے اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لیے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت درجہ دشوار ضرور ہے کہ بس ایک یا دو چار مرتبہ شوہر کی صحبت سے متمتع ہو جانا ان کے لیے کافی ہو اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گزار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر پچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں تو ان بقیہ پچاس فی صدی عورتوں کا حشر کیا ہوگا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جن کے ضبط وتحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لیے حلال کے دروازے بند کر کے انھیں حرام کے راستوں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں نامردی کی ہر شکایت پر خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیے اور اگر کافی علاج کے بعد جس کے لیے ایک سال کی مدت مناسب ہے یہ شکایت دُور نہ ہو تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہائے کرام نے یہ لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لیے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بے جا شدت پائی جاتی ہے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملے میں ماہرینِ طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے لیے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہا نے خصی کے لیے بھی وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لیے رکھا گیا ہے۔ یعنی اُس کو بھی علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے۔ اِس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور مجبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں، مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانثیین، دونوں صورتوں میں وظیفۂ زوجیت کے لیے وہ یکساں نااہل ہوتا ہے اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہٰذا خصی اور مجبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہیے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۱-۱۳۴)

جنون: مجنون کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اُس کے علاج کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے۔ اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اُس کی عورت اُس سے جُدا کر دی جائے۔ فقہا نے اِسی کو لیا ہے اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس مجنون کے لیے ہے جو نکاح سے قبل مجنون تھا اور نکاح کے بعد ہم بستری پر قادر نہ ہوا۔ اس لحاظ سے گویا وہ عنین ہے اور اسی لیے اس کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں جنون اگر حادث[1] ہو تو اُس کو علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے گی اور اگر مُطبق[2] ہو تو وہ مجبوب کے حکم میں ہے۔ بلا تاجیل[3] تفریق کرا دی جائے گی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حادث اور مُطبق دونوں میں ایک سال کی مہلت بغرض علاج دی جائے گی اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسب ذیل شرطیں لگاتے ہیں:

۱- یعنی جس کے دورے کبھی کبھی پڑتے ہوں۔ ۲- یعنی دائماً حالتِ جنون طاری ہو۔ ۳- مہلت دیے بغیر۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱- اگر نکاح سے پہلے جنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا ہو تو تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

۲- اگر نکاح کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ مجنون ہے اور اس نے صراحتاً اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا۔

۳- اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہوا تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گزر چکا ہے۔ ان کا کوئی ماخذ کتاب و سنت میں نہیں ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ شریعت، تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا ہو تو اس کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگر نکاح کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا، لیکن بعد میں اس کے لیے روحانی و جسمانی تکلیفیں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو درحقیقت اس نے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ رنج، تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریفانہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس کی خبر گیری کی اور سابق کا سا تعلق زن و شوہر اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا تو اس سے یہ کیوں لازم آ جائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بے چاری کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں آثار جنون ہویدا ہوں، وہ فوراً اس کی تمام پچھلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کر لے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابلِ برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت یہ وفاداری و رفاقت بلائے جان ثابت ہو گی اور اس کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں مرد کے حقوق کا بہت مبالغہ آمیز تصور اختیار کیا گیا ہے اور دوسری طرف عورتوں کے ساتھ بڑی سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بے کار ہو جائے یا جنون میں مبتلا ہو، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو تو مرد اسے طلاق دے سکتا ہے یا دوسری شادی کر کے اپنی زندگی خوش گوار طریقے سے بسر کر سکتا ہے، لیکن مرد ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت نہ تو اسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کر سکتی ہے۔ اس کے لیے بجز تفریق کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارۂ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لیے رہائی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اس عدل اور توازن کے خلاف ہو گا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے۔ ایسے تمام معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لیے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیے۔ عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرار اور تعدی نہ ہو اور حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف نہ ہو۔ لیکن اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدے پر عمل ہونا چاہیے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل یا آتشک زدہ، یا جذامی، یا مردمی شرم سے ساتھ بجبر واکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لیے ضرار اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت زبردستی اس حالت میں رکھی گئی ہو، اُس کے لیے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع سے زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجے کی عورت کے لیے کس قدر دشوار ہے؟

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۵-۱۳۸)

..........○○○..........

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

مسائلِ جزئیّہ

پچھلے باب میں اُصولِ احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اب اُسی ترتیب کے ساتھ ہم اُن جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان میں سے ایک اُصل کے تحت آتے ہیں۔ یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن میں ضروریات وحالاتِ زمانہ کے لحاظ سے ازسرِنو احکامِ فقہی کی تصریح وتوضیح ضروری ہے۔

اِرتداد احدالزوجین

موجودہ زمانے میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے اُس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہوگئی ہے۔ بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لیے مُرتد ہوگئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ اُنھیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا اُنھیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلے میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، یعنی: اِذَا ارْتَدَّ اَحَدُ الزَّوْجَیْنِ وَقَعَتِ الْفُرْقَةُ بِغَیْرِ طَلَاقٍ، جب زوجین میں سے کوئی مُرتد ہو جائے تو فُرقت بغیر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔[1] لیکن علمائے ہند اس قسم کے ارتداد کی روک تھام کے لیے مشائخِ بلخ وسمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتوے کی بنا اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مُرتد بن جاتی ہے اس لیے اِن حیلے کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اُس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں، جن پر شاید ان علمائے کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی۔

اولاً: اسلام اور کفر کے معاملے میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرارِ لسانی کا اعتبار کرتے ہیں، اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ایک عورت دِل سے مُرتد نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس نیت سے مُرتد ہوتی ہے کہ اپنے شوہر سے جُدا ہو جائے۔

۱- مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر تو حرام ہو جاتی ہے مگر اس فرقت سے اُس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کر سکے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثانیاً: جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اُس کے حق میں تو بدرجۂ آخر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ سے فائدہ اُٹھا کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔ مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے اُس کا مسلمان مرد کے نکاح میں رہنا تو قرآنِ مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً: جو عورت اِسلام کے دائرے سے نکل کر دُوسرے مذہب میں چلی گئی ہے، اُس پر اِسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے۔ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے تحت ہیں اور حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو، سکھ یکساں ہیں۔ ہم اُس سے کس طرح یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہو چکی ہے۔ اِس کی مرضی کے خلاف اُسی نکاح پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرے گی جو اُس سے بحالتِ اِسلام اِسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلے میں مشائخ بلخ وسمرقند کے فتوے سے مسلمان علما کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مُرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فی صدی ایسی ہوں گی جن کے عقیدے میں فی الواقع تغیّر ہوتا ہے، درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صِرف یہ ہے کہ ظُلم وضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لیے دادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے، مگر بیوی اُس سے خُلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا بے ہودہ عادات میں مُبتلا ہے، بیوی اُس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں، مگر بندِ نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود الخبر ہے، سالہا سال سے اُس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اِسلام کے دامن سے نکل کر کُفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اِس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ اِدھر اُدھر سے فقہی جزئیات نکال نکال کر لائے جائیں تاکہ اِن قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لیے کُفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے اور اُن کو ارتداد کے بجائے خود کُشی پر مجبور کیا جائے، بلکہ اِس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور اِن اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم واصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اِسلام کے آغوش سے نکل کر کُفر کی گود میں جا پڑنا پڑتا ہے جہاں تک اللہ اور رسول کے منصوص احکام تک کا تعلق ہے، ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لیے موجب ضرر رہی ہو یا کہ موجب ارتداد ہو۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی ہے اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کیا جا سکتا ہے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۷-۱۱۰)

مفقود الخبر کے احکام

مفقود الخبر کے متعلق قرآنِ مجید میں کوئی صریح حُکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حُکم نہیں۔ دار قطنی نے اپنی سُنن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: اِمرأۃ المفقود انّ امرأتہ حتی یاتیھا البیان حضور ﷺ نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اُسی کی بیوی ہے، جب تک کہ اس کا حال معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مُصعب اور محمد بن شرحبیل ہمدانی کے واسطے سے پہنچی ہے جو مجروح ہیں ابن شرحبیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انہ یروی عن المغیرۃ مناکیر اباطیل[2] اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین میں ابن شرحبیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلے میں حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا اور نہ اُن کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اُسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن شرحبیل اس حدیث کو مُغیرہ بن شُعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیسے ممکن تھا کہ اُن کو نبی ﷺ کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمر و عثمان غنی رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حُکم منصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق کلیتاً اہلِ علم کے اجتہاد سے ہے۔

صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کی آرا اس مسئلے میں مختلف ہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حُکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیب، زُہری، نخعی، عطاء، مکحول اور شعبی رحمہم اللہ کی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا میلان بھی اس کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔ سُفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لیے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس بستی یا اس کے ملک میں زندہ ہوں اُس وقت تک اُس کی بیوی انتظار کرے۔ پھر مختلف بزرگوں نے اپنے اپنے اندازے کے مطابق انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے، کہ ایک انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہے اُس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۳۰ سال کی عمر میں مفقود ہو تو اُس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال اور بقول بعض ۷۰ سال اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول بعض ۵۰ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال کی تھی اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۷۰

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۵۷، اشاعت سوم۔

۲۔ وہ مغیرہ سے ایسی باتیں روایت کرتا ہے جو منکر اور جھوٹی ہوتی ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرار دیتے ہیں۔ اب اگر اس وقت عورت ۲۰ سال کی تھی تو سب سے زیادہ جن بزرگوں نے اُس کے ساتھ رعایت فرمائی ہے اُن کے فتوے کے مطابق وہ ۶۰ برس کی عمر کو پہنچنے تک اُس کا انتظار کرے پھر اُسے نِکاح کی اجازت ہے۔

اِس مسئلے میں جب ہم قرآنِ مجید کے اُصولی احکام کی طرف رُجوع کرتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اُن کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہی اِسلامی قانون کی رُوح اور اُس کے عدل اور اُس کے توازن اور اُس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حُکم دیا گیا ہے کہ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ، ایک بیوی کی طرف بالکل اِس طرح نہ جھک جاؤ کہ دُوسری بیوی کو معلّق چھوڑ دو۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلّق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اِس کو ناپسند کرتا ہے تو اُس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیوں کر پسند کر سکتا ہے؟ دوسری جگہ شوہروں کو حُکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلا کرو تو زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک ایسا کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہوگا۔ یہاں پھر اِسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اُس کے لیے موجبِ ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب بن جائے۔ پھر وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا فرمایا گیا، جس کا منشا صاف طور پر یہ ہے کہ رِشتۂ ازدواج میں ضرار نہ ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حُکم دینے میں انتہا درجے کا ضرار ہے۔ اِس کے ساتھ وہ آیت بھی قابلِ غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خُلع میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رِشتۂ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے اور اِس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس عورت کا شوہر برسوں سے مفقود ہو اُس کے لیے حدود اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے؟ ان تمام احکام کے اُصول اور اُن کے مصالح اور اُن کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حُکم دینا اور اُس کو معلّق چھوڑ نا درست نہیں ہے۔

مذہب مالکی: علمائے احناف نے اِنھی وجوہ سے مفقود الخبر کے مسئلے میں مذہب مالکی کے حُکم کے مطابق فتویٰ دینا پسند کیا ہے۔ لہٰذا اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اِس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں؟

مذہبِ مالکی کے لحاظ سے فُقدانِ زوج کی تین صورتیں ہیں اور ہر ایک کے احکام جُدا جُدا ہیں۔

۱۔ مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گزر بسر کر سکے۔ اِس صورت میں حاکم اِس کو انتظار کا حُکم نہیں دے گا، بلکہ تحقیقِ حال کے بعد بلا انتظار اُس کو باختیار خود طلاق دے دے گا، یا اُسے اجازت دے گا کہ اپنے اُوپر آپ طلاق وارد کر لے[۱]۔ شافعی اور حنبلی مذاہب بھی اِس مسئلے میں مالکی مذہب کی تائید کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک عدمِ نفقہ بجائے خود تفریق کے لیے کافی ہے۔

۱۔ تفریق کے لیے حاکم کے بطورِ خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اُوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے فرمایا تھا کہ اَنْتِ اَمْلَكُ بِنَفْسِكِ اِنْ شِئْتِ اَقَمْتِ مَعَ زَوْجِكِ وَ اِنْ شِئْتِ فَارِقِيْهِ، یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے، خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اُس سے جدا ہو جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۲- مفقود نے مال تو چھوڑا ہے مگر عورت جوان ہے اور اس کو کسی طویل مدت کے لیے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جتنی مدت مناسب سمجھے انتظار کرنے کا حکم دے گا۔ اس بارے میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے بلکہ بعض شدید صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو جائز رکھا ہے۔ نیز خوفِ معصیت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مدعیہ خود منہ پھوڑ کر کہہ دے کہ مجھے اس شوہر کی قیدِ نکاح سے آزاد کرو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت فقدانِ زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اس کی عمر کیا ہے؟ کس ماحول میں رہتی ہے اور دعویٰ کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گزار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے اسے مدتِ انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہیے۔

۳- مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے۔ اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں:

(ل- اگر مفقود بلادِ اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

ب:- اگر وہ میدانِ جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

ج:- اگر وہ کسی مقامی فساد کے سلسلے میں کھویا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اس کی تلاش کے لیے امکانی کوشش کی جائے گی، پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدتِ وفات گزارنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

د:- اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھو گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان بھی نہیں ہے تو اس کی بیوی کو مدتِ تعمیر[1] گزارنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدتِ تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض ۷۰ سال کہتے ہیں، بعض ۸۰ سال اور بعض ۷۵ سال، لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہو گا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علمائے احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرائط کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور فقدانِ زوج کی تمام صورتوں میں چار سال تک انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں جب کہ اخلاقی حالات کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ہر فاقد الزوج عورت کے لیے چار سال کی مدتِ انتظار پر اصرار کرنا مصالحِ شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا۔ غیر اسلامی طریقوں کے رواج نے ان تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہواتِ نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے اسلام نے قائم کی تھیں۔ عریاں تصاویر ہیں، عشقیہ ناول اور قصے ہیں، ریڈیو کے جنون خیز گانے ہیں، جن سے کوئی شخص شہروں اور قصبوں میں

[1] - یعنی ایک اوسط درجہ کے انسان کا جتنی عمر پانا متوقع ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رہتے ہوئے بچ ہی نہیں سکتا۔ اور اِن سب پر مزید یہ کہ قانون ملکی نے زنا کو جائز کر رکھا ہے، پردے کے شرعی حدود عملاً باقی نہ رہنے کی وجہ سے غیر محرم مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیے ہیں کہ کسی شخص کے لیے ضبطِ نفس اور پرہیز گاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود الخبر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت میں رُجوع کرے تو عدالت اُس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے۔ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرف عورتوں ہی کے لیے ضرر نہیں ہے، بلکہ اِس کے مُضر نتائج ساری قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود الخبر کے متعلق مذہب مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجرائے احکام میں فاقد الزوج عورت کی عمر، اُس کے ماحول اور اُس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے جس کو حالتِ انتظار میں گزارنے کے بعد اُس نے عدالت کی طرف رُجوع کیا ہو۔

حکم بصورتِ واپسی مفقود: اِس سلسلے میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر مفقود عدالت کی دی ہوئی مدتِ انتظار ختم ہو جانے کے بعد واپس آ جائے تو اُس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نِکاحِ ثانی سے پہلے اُس کا شوہر واپس آ گیا تو وہ اُسی کو ملے گی، لیکن اگر عورت نِکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو دونوں صورتوں میں شوہرِ اوّل کا اُس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اِس قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب مالکی کا مفتیٰ بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خواہ دُوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید برآں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دُوسرے شوہر سے اُس عورت کو مَہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اِس فیصلے کی طرف رُجوع کر لیا تھا، لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رُجوع ثابت نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نِکاحِ ثانی کر چکی ہو، پھر شوہرِ اوّل واپس آ جائے تو اُس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہیے یا مَہر؟ اگر اُس نے مَہر واپس لینے یا معاف کرا لینے کو پسند کیا تو عورت شوہرِ ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے شوہر سے جُدا ہو کر عدتِ طلاق گزارنی ہوگی۔ پھر وہ پہلے شوہر کے حوالے کر دی جائے گی اور دُوسرے شوہر سے اُس کو مَہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ سب سے بہتر ہے جس سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے استناد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورت کا نِکاحِ ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہرِ اوّل کا حق اس پر قائم رہے تو کون ایسی عورت سے نِکاح کرنا پسند کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آ جائے اور نہ صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عورت اس سے چھن جائے، بلکہ اس کو مہر بھی دینا پڑے اور بچے ہو جانے کی صورت میں اُس کی اولاد الگ برباد ہو۔ اس قسم کی شرائط عائد کرنے میں عورت کے لیے غایت درجے کا ضرر ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکا دینے والی مدت انتظار گزار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو۔ عدالت سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد بھی اُس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی رہے اور اُس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گزارنی پڑے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۸-۱۴۷)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

عدّت کے احکام

عدّت ٹھیک ٹھیک شمار کرنے کا حکم

وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ (الطلاق ۶۵:۱) اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے۔

اِس حُکم کا خطاب مَردوں سے بھی ہے اور عورتوں سے بھی اور اُن کے خاندان والوں سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ طلاق کو کھیل نہ سمجھ بیٹھو کہ طلاق کا اہم معاملہ پیش آنے کے بعد یہ بھی یاد نہ رکھا جائے کہ کب طلاق دی گئی ہے، کب عدّت شروع ہوئی اور کب اِس کو ختم ہونا ہے۔ طلاق ایک نہایت نازک معاملہ ہے، جس سے عورت اور مَرد اور اُن کی اولاد اور اُن کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں، اِس لیے جب طلاق دی جائے تو اُس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے، اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ کس حالت میں عورت کو طلاق دی گئی ہے اور حساب لگا کر دیکھا جائے کہ عدّت کا آغاز کب ہوا ہے، کب تک وہ باقی ہے اور کب وہ ختم ہوگئی۔ اِسی حساب پر اِن اُمور کا فیصلہ موقوف ہے کہ شَوہر کو کب تک رُجوع کا حق ہے، کب تک اُسے عورت کو گھر رکھنا ہے، کب تک اِس کا نفقہ دینا ہے، کب تک وہ عورت کا وارث ہوگا اور عورت اُس کی وارث ہوگی، کب عورت اُس سے جُدا ہو جائے گی اور اُسے دُوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر یہ معاملہ کسی مقدمے کی صورت اختیار کر جائے تو عدالت کو بھی صحیح فیصلہ کرنے کے لیے طلاق کی صحیح تاریخ اور وقت اور عورت کی حالت معلوم ہونے کی ضرورت ہوگی، کیونکہ اِس کے بغیر وہ مدخولہ اور غیر مدخولہ، حاملہ اور غیر حاملہ، بے حیض اور باحیض، رجعیّہ اور غیر رجعیّہ عورتوں کے معاملے میں طلاق سے پیدا شدہ مسائل کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۳-۵۶۴، الطلاق حاشیہ ۲)

مطلّقہ عورت عدّت کہاں گزارے؟

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ (الطلاق ۶۵:۱) [زمانۂ عدت میں] نہ تم انھیں اُن کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، اِلّا یہ کہ وہ کسی صریح بُرائی[1] کی

---

[1] اس کے متعدد مطلب مختلف فقہا نے بیان کیے ہیں۔ حضرت حسن بصری، عامر شعبی، زید بن اسلم، ضحاک، مجاہد، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

مرتکب ہوں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا۔

نہ مرد غصے میں آ کر عورت کو گھر سے نکال دے، اور نہ عورت خود ہی بگڑ کر گھر چھوڑ دے۔ عدت تک گھر اُس کا ہے۔ اُسی گھر میں دونوں کو رہنا چاہیے، تاکہ باہم موافقت کی کوئی صورت اگر نکل سکتی ہو تو اُس سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ طلاق اگر رجعی ہو تو کسی وقت بھی شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف مائل ہو سکتی ہے اور بیوی بھی اختلاف کے اسباب کو دُور کر کے شوہر کو راضی کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ دونوں ایک گھر میں موجود رہیں گے تو تین مہینے تک یا تین حیض آنے تک یا حمل کی صورت میں وضع حمل تک اس کے مواقع بارہا پیش آ سکتے ہیں۔ لیکن اگر مرد جلد بازی کر کے اُسے نکال دے، یا عورت ناسمجھی سے کام لے کر میکے جا بیٹھے تو اُس صورت میں رُجوع کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں اور بالعموم طلاق کا انجام آخر کار مستقل علیحدگی ہو کر رہتا ہے۔ اسی لیے فقہا نے یہاں تک کہا ہے کہ طلاقِ رجعی کی صورت میں جو عورت عدت گزار رہی ہو اُسے بناؤ سنگھار کرنا چاہیے تاکہ شوہر اُس کی طرف مائل ہو (ھدایہ۔ الانصاف)۔

فقہا کے درمیان اِس اَمر میں اتفاق ہے کہ مطلقہ رجعیہ کو عدت کے زمانے میں سکونت اور نفقہ کا حق ہے اور عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے جائے اور مرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اُسے گھر سے نکالے۔ اگر مرد اُسے نکالے گا تو گناہ گار ہوگا اور عورت اگر خود نکلے گی تو گناہ گار ہوگی اور نفقہ و سکونت کے حق سے محروم ہو جائے گی۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۴، الطلاق حاشیہ ۳)

دورانِ عدت رجوع کا حق

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (البقرہ ۲:۲۲۸) جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عکرمہ، ابن زید، حماد اور لیث رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اِس سے مُراد بدکاری ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد بدزبانی ہے۔ یعنی یہ کہ طلاق کے بعد بھی عورت کا مزاج درستی پر نہ آئے، بلکہ وہ عدت کے زمانے میں شوہر اور اُس کے خاندان والوں سے جھگڑتی اور بدزبانی کرتی رہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد نشوز ہے، یعنی عورت کو نشوز کی بنا پر طلاق دی گئی ہو اور عدت کے زمانے میں بھی وہ شوہر کے مقابلے پر سرکشی کرنے سے باز نہ آئے۔ عبداللہ بن عمرؓ، سُدی، ابن السائب اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد عورت کا گھر سے نکل جانا ہے، یعنی اُن کی رائے میں طلاق کے بعد عدت کے زمانے میں عورت کا گھر چھوڑ کر نکل جانا بجائے خود فاحشة مبينة (صریح بُرائی کا ارتکاب) ہے اور یہ ارشاد کہ "وہ نہ خود نکلیں، اِلّا یہ کہ صریح بُرائی کی مرتکب ہوں" کچھ اس طرح کا کلام ہے جیسے کوئی کہے کہ "تم کسی کو گالی نہ دو، اِلّا یہ کہ بدتمیز بنو"۔ ان چار اقوال میں سے پہلے تین قولوں کے مطابق، "اِلّا یہ" کا تعلق "اِن کو گھروں سے نہ نکالو" کے ساتھ ہے اور اِس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ بد چلنی یا بدزبانی یا نشوز کی مرتکب ہوں تو انھیں نکال دینا جائز ہوگا۔ اور چوتھے قول کی رُو سے اس کا تعلق "اور نہ خود نکلیں" کے ساتھ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نکلیں گی تو صریح بُرائی کی مرتکب ہوں گی۔ (تفہیم القرآن، پنجم ص ۵۶۴-۵۶۵، الطلاق حاشیہ ۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو، اُسے چھپائیں۔ انھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے، اگر وہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران میں اُنھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا، اِس آیت کے حکم میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے، اُس وقت تک طلاق بائن نہ ہوگی اور شوہر کو رُجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرات ابوبکر، عمر، ابن عباس، ابوموسیٰ اشعری، ابن مسعود اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی یہی رائے ہے اور فقہائے حنفیہ نے اِسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اِس کے دُوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حق رُجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہ، ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی ہے اور فقہائے شافعیہ اور مالکیہ نے اِسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اُس صورت سے متعلق ہے، جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صورت میں شوہر کو حقِ رُجوع نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۳-۱۷۴، البقرہ حاشیہ ۲۴۹)

حیض سے مایوس عورتوں کی عدت

وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق ۶۵: ۴) اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اُن کے معاملے میں اگر تم کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمھیں معلوم ہو کہ) اُن کی عدت تین مہینے ہے۔

یہ اُن عورتوں کا حکم ہے جن کو حیض آنا قطعی بند ہو چکا ہو اور کبرسنی کی وجہ سے وہ سن ایاس میں داخل ہو چکی ہوں۔ اُن کی عدت اُس روز سے شُمار ہوگی جس روز اُنھیں طلاق دی گئی ہو اور تین مہینوں سے مُراد تین قمری مہینے ہیں۔ اگر قمری مہینے کے آغاز میں طلاق دی گئی ہو تو بالاتفاق رویتِ ہلال کے لحاظ سے عدت شُمار ہوگی اور اگر مہینے کے بیچ میں کسی وقت طلاق دی گئی ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ۳۰ دِن کا مہینہ قرار دے کر تین مہینے پورے کرنے ہوں گے (بدائع الصنائع)۔

جن عورتوں کے حیض میں کسی طرح کی بے قاعدگی ہو

رہیں وہ عورتیں جن کے حیض میں کسی نوع کی بے قاعدگی ہو، اُن کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلافات ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس عورت کو طلاق دی گئی ہو، پھر ایک دو مرتبہ حیض آنے کے بعد اُس کا حیض بند ہو گیا ہو وہ ۹ مہینے انتظار کرے۔ اگر حمل ظاہر ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ ۹ مہینے گزرنے کے بعد وہ مزید تین مہینے عدت گزارے، پھر وہ کسی دُوسرے شخص سے نکاح کے لیے حلال ہوگی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابن عباس، قتادہ اور عکرمہ کہتے ہیں کہ جس عورت کو سال بھر حیض نہ آیا ہو، اُس کی عدت تین مہینے ہے۔

طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جس عورت کو سال میں ایک مرتبہ حیض آئے اُس کی عدت تین حیض ہے۔ یہی رائے حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ایک صاحب حبان نامی تھے، جنھوں نے اپنی بیوی کو ایسے زمانے میں طلاق دی جبکہ وہ بچے کو دودھ پلا رہی تھیں اور اس پر ایک سال گزر گیا مگر اُنھیں حیض نہ آیا۔ پھر وہ صاحب انتقال کر گئے۔ مطلقہ بیوی نے وراثت کا دعویٰ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اُنھوں نے حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں بزرگوں کے مشورے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ عورت وارث ہے۔ دلیل یہ تھی کہ نہ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اور نہ اُن لڑکیوں میں سے ہے جن کو ابھی حیض نہیں آیا، لہٰذا وہ شوہر کے مرنے تک اپنے اُس حیض پر تھی جو اُسے پہلے آیا تھا اور اُس کی عدت باقی تھی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ جس عورت کا حیض بند ہو گیا ہو مگر اُس کا بند ہونا سنِ ایاس کی وجہ سے نہ ہو کہ آئندہ اُس کے جاری ہونے کی اُمید نہ رہے، اس کی عدت یا تو حیض ہی سے ہوگی، اگر وہ آئندہ جاری ہو، یا پھر عمر کے لحاظ سے ہوگی، جس میں عورتوں کو حیض آنا بند ہو جاتا ہے اور اِس عمر کو پہنچنے کے بعد وہ تین مہینے عدت گزار کر نکاح سے آزاد ہوگی۔ یہی قول امام شافعی، امام ثوری اور امام لیث رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور یہی مذہب حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت پہلے ۹ مہینے گزارے گی۔ اگر اس دوران میں حیض جاری نہ ہو تو پھر وہ تین مہینے اُس عورت کی سی عدت گزارے گی جو حیض سے مایوس ہو چکی ہو۔ ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی توضیح یہ کی ہے کہ ۹ مہینے اُس روز سے شُمار ہوں گے جب آخری مرتبہ اُس کا حیض ختم ہوا تھا، نہ کہ اُس روز سے جب اُسے طلاق دی گئی۔[1]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی عورت جس کی عدت حیض کے اعتبار سے شروع ہوئی تھی، عدت کے دوران میں آئسہ ہو جائے تو اُسے حیض والی عورتوں کے بجائے آئسہ عورتوں والی عدت گزارنی ہوگی اور اگر اُس کو حیض آنا بند ہو جائے اور معلوم نہ ہو سکے کہ وہ کیوں بند ہو گیا ہے تو پہلے وہ حمل کے شُبہ میں ۹ مہینے گزارے گی اور پھر اُسے تین مہینے عدت کے پورے کرنے ہوں گے۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ حیض کیوں بند ہوا ہے، مثلاً کوئی بیماری ہو یا دودھ پلا رہی ہو یا ایسا ہی کوئی اور سبب ہو، تو وہ اُس وقت تک عدت میں رہے گی جب تک یا تو حیض آنا شروع نہ ہو جائے اور عدت حیضوں کے لحاظ سے شُمار ہو سکے، یا پھر وہ آئسہ ہو جائے اور آئسہ عورتوں کی عدت گزار سکے (الانصاف)۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۶۹-۵۷۰، الطلاق حاشیہ ۱۲)

۱۔ (یہ تمام تفصیلات احکام القرآن للجصاص اور بدائع الصنائع للکاسانی سے ماخوذ ہیں)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جن عورتوں کو حیض نہ آتا ہو ان کا اور حاملہ کا حکم

وَّالّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنۡ یَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ؕ (الطلاق ۶۵: ۴) اور یہی حکم اُن کا ہے جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ اُن کا وضعِ حمل ہو جائے۔

حیض خواہ کم سنی کی وجہ سے نہ آیا ہو، یا اِس وجہ سے کہ بعض عورتوں کو بہت دیر میں حیض آنا شروع ہوتا ہے اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر نہیں آتا۔ بہرحال تمام صورتوں میں ایسی عورت کی عدت وہی ہے جو آئسہ عورت کی عدت ہے، یعنی طلاق کے وقت سے تین مہینے۔

اِس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اُس عورت کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کر چکا ہو، کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں (الاحزاب ۳۳: ۴۹)۔ اِس لیے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنھیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، صریحاً اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کرنا جائز ہے، بلکہ شوہر کا اِس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو اُسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا۔

جس لڑکی کو ایسی حالت میں طلاق دی گئی ہو کہ اُسے ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، اور پھر عدت کے دوران میں اُس کو حیض آ جائے تو وہ پھر اُسی حیض سے عدت شروع کرے گی اور اُس کی عدت حائضہ عورتوں جیسی ہو گی۔

اِس اَمر پر تمام اہلِ علم کا اجماع ہے کہ مطلقہ حاملہ کی عدت وضعِ حمل تک ہے۔ لیکن اِس اَمر میں اختلاف واقع ہو گیا ہے کہ آیا یہی حکم اُس عورت کا بھی ہے، جس کا شوہر زمانۂ حمل میں وفات پا گیا ہو۔ یہ اختلاف اِس وجہ سے ہوا ہے کہ سورۂ بقرہ آیت ۲۳۴ میں اُس عورت کی عدت ۴ مہینے دَس دِن بیان کی گئی ہے جس کا شوہر وفات پا جائے اور وہاں اِس اَمر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ حکم آیا تمام بیوہ عورتوں کے لیے عام ہے یا اُن عورتوں کے لیے خاص ہے جو حاملہ نہ ہوں۔

حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اِن دونوں آیتوں کو ملا کر یہ استنباط کرتے ہیں کہ حاملہ مطلقہ کی عدت تو وضعِ حمل تک ہی ہے، مگر بیوہ حاملہ کی عدت آخر الاجلین ہے، یعنی مطلقہ کی عدت اور حاملہ کی عدت میں سے جو زیادہ طویل ہو وہی اُس کی عدت ہے۔ مثلاً اگر اُس کا بچہ ۴ مہینے دَس سے پہلے پیدا ہو جائے تو اُسے چار مہینے دَس دِن پورے ہونے تک عدت گزارنی ہو گی۔ اور اگر اُس کا وضعِ حمل اِس وقت تک نہ ہو تو پھر اُس کی عدت اِس وقت پوری ہو گی جب وضعِ حمل ہو جائے۔ یہی مذہب امامیہ کا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سورۂ طلاق کی یہ آیت سورۂ بقرہ کی آیت کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اِس لیے بعد کے حکم نے پہلی آیت کے حکم کو غیر حاملہ کے لیے خاص کر دیا ہے اور ہر حاملہ کی عدت وضعِ حمل تک مقرر کر دی ہے خواہ وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مطلقہ ہو یا بیوہ۔ اس مسلک کی رُو سے عورت کا وضعِ حمل چاہے شوہر کی وفات کے فوراً بعد ہو جائے یا ۴ مہینے دس دن سے زیادہ طول کھینچے، بہرحال بچہ پیدا ہوتے ہی وہ عدت سے باہر ہو جائے گی۔ اس مسلک کی تائید حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں جب سورۂ طلاق کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا یہ مطلقہ اور بیوہ دونوں کے لیے ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ہاں۔ دُوسری روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید تصریح فرمائی: اجل کل حامل ان تضع ما فی بطنھا " ہر حاملہ عورت کی عدت کی مدت اس کے وضعِ حمل تک ہے"۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ اس کی سند میں کلام کی گنجایش ہے، لیکن چونکہ یہ متعدد سندوں سے نقل ہوئی ہے، اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر اِس کی مضبوط تائید سُبیعۃ اَسلَمِیّہ کے واقعہ سے ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں پیش آیا تھا۔ وہ بحالتِ حمل بیوہ ہوئی تھیں اور شوہر کی وفات کے چند روز بعد (بعض روایات میں، ۲۰ دِن، بعض میں ۲۳ دِن اور بعض میں ۲۵ دِن، بعض میں ۴۰ دِن اور بعض میں ۳۵ دِن بیان ہوئے ہیں) اُن کا وضعِ حمل ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کے معاملے میں فتویٰ پوچھا گیا تو آپؐ نے اُن کو نکاح کی اجازت دے دی۔ اس واقعہ کو بخاری و مسلم نے کئی طریقوں سے حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ اِس واقعہ کو بخاری، مسلم، امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف سندوں کے ساتھ حضرت مِسوَر بن مَخرمہ سے بھی روایت کیا ہے۔ مسلم نے خود سُبیعہؓ اسلمیہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت سعد بن خولہ کی بیوی تھی۔ حجۃ الوداع کے زمانے میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا، جب کہ میں حاملہ تھی۔ وفات کے چند روز بعد میرے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ تم چار مہینے دس دِن سے پہلے نکاح نہیں کر سکتیں۔ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے فتویٰ دیا کہ تم وضعِ حمل ہوتے ہی حلال ہو چکی ہو، اب چاہو تو دُوسرا نکاح کر سکتی ہو۔ اس روایت کو بخاری نے بھی مختصراً نقل کیا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی کثیر تعداد سے یہی مسلک منقول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے حاملہ بیوہ کا مسئلہ پوچھا گیا تو اُنھوں نے کہا: اس کی عدت وضعِ حمل تک ہے۔ اس پر انصار میں سے ایک صاحب بولے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر شوہر ابھی دفن بھی نہ ہوا ہو بلکہ اس کی لاش اس کے بستر پر ہی ہو اور اُس کی بیوی کے ہاں بچہ ہو جائے تو وہ دُوسرے نکاح کے لیے حلال ہو جائے گی۔ یہی رائے حضرت ابوہریرہ، حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے اور اِسی کو ائمہ اربعہ اور دُوسرے اکابر فقہا نے اختیار کیا ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر حاملہ کے پیٹ میں ایک سے زیادہ بچے ہوں تو آخری بچے کی ولادت پر عدت ختم ہوگی۔ بچہ خواہ مُردہ ہی پیدا ہو، اُس کی ولادت سے عدت ختم ہو جائے گی۔ اسقاطِ حمل کی صورت میں اگر دائیاں اپنے فن کی رُو سے یہ کہیں کہ یہ محض خون کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ اُس میں آدمی کی صورت پائی جاتی تھی، یا یہ رسولی نہ تھی بلکہ آدمی کی اصل تھی تو اُن کا قول قبول کیا جائے گا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور عدّت ختم ہو جائے گی (مغنی المحتاج)۔ حنابلہ اور حنفیہ کا مسلک بھی اِس کے قریب قریب ہے۔ مگر اسقاط کے معاملے میں اُن کا مذہب یہ ہے کہ جب تک انسانی بناوٹ ظاہر نہ پائی جائے، محض دائیوں کے اِس بیان پر کہ یہ آدمی ہی کی اصل ہے، اعتماد نہیں کیا جائے گا اور اُس سے عدّت ختم نہ ہوگی (بدائع الصنائع۔ الانصاف)۔ لیکن موجودہ زمانے میں طبّی تحقیقات کے ذریعے سے یہ معلوم کرنے میں کوئی مُشکل پیش نہیں آ سکتی کہ جو چیز ساقط ہوئی ہے وہ واقعی انسانی حمل کی نوعیت رکھتی تھی یا کسی رسولی یا جمے ہوئے خون کی قسم سے تھی۔ اِس لیے اب جہاں ڈاکٹروں سے رائے حاصل کرنا ممکن ہو وہاں یہ فیصلہ بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو اسقاطِ حمل کہا جاتا ہے وہ واقعی اسقاطِ حمل تھا یا نہیں اور اِس سے عدت ختم ہوئی یا نہیں۔ البتہ جہاں ایسی طبّی تحقیق ممکن نہ ہو وہاں حنابلہ اور حنفیہ کا مسلک ہی زیادہ مبنی بر احتیاط ہے اور جاہل دائیوں پر اعتماد کرنا مناسب نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۷۰-۵۷۳، الطلاق حاشیہ ۱۳)

اِن احکام پر عمل کرنے کا ثمرہ

وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلْ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ يُسۡرًا ○ ذٰلِكَ اَمۡرُ اللّٰهِ اَنۡزَلَهٗۤ اِلَيۡكُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرۡ عَنۡهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعۡظِمۡ لَهٗۤ اَجۡرًا ○ (الطلاق ۶۵: ۴-۵) جو شخص اللہ سے ڈرے اُس کے معاملے میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اُس کی برائیوں کو اس سے دُور کر دے گا اور اُس کو بڑا اجر دے گا۔

یہ اگرچہ ایک عمومی نصیحت ہے جس کا اطلاق انسانی زندگی کے تمام حالات پر ہوتا ہے، لیکن اِس خاص سیاق وسباق میں اسے ارشاد فرمانے کا مقصد مسلمانوں کو خبردار کرنا ہے کہ اُوپر جو احکام بیان کیے گئے ہیں، اُن سے خواہ تمھارے اُوپر کتنی ہی ذِمہ داریوں کا بوجھ پڑتا ہو، بہرحال خدا سے ڈرتے ہوئے اُن کی پیروی کرو، اللہ تمھارے کام آسان کرے گا، تمھارے گناہ معاف کرے گا اور تمھیں بڑا اجر دے گا۔ ظاہر ہے کہ جن مطلّقہ عورتوں کی عدت تین مہینے مقرّر کی گئی ہے اُن کا زمانۂ عدت اُن عورتوں کی بہ نسبت طویل تر ہوگا جن کی عدت تین حیض مقرّر کی گئی ہے اور حاملہ عورت کا زمانۂ عدت تو اُس سے بھی کئی مہینے زیادہ ہو سکتا ہے۔ اِس پورے زمانے میں عورت کی سکونت اور اُس کے نفقے کی ذِمہ داری اُٹھانا، جب کہ آدمی اُسے چھوڑ دینے کا ارادہ کر چکا ہو، لوگوں کو ناقابلِ برداشت بار محسوس ہوگا، لیکن جو بار اللہ سے ڈرتے ہوئے اللہ کے احکام کی پیروی میں اُٹھایا جائے، اللہ کا وعدہ ہے کہ اپنے فضل سے وہ اُس کو ہلکا کر دے گا اور اُس کو اتنی بھاری جزا دے گا جو دُنیا میں اُٹھاتے ہوئے اِس تھوڑے سے بار کی بہ نسبت بہت زیادہ گراں قدر ہوگی۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۷۳، الطلاق حاشیہ ۱۵)

شوہر کے وفات پانے کی صورت میں احکام

وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ○ (البقرہ ۲: ۲۳۴) تم میں سے جو لوگ مر جائیں، اُن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے، دس دن روکے رکھیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں، تم پر اس کی کوئی ذمّے داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔

"اپنے آپ کو روکے رکھیں" سے مُراد یہی نہیں ہے کہ وہ اِس مدّت میں نِکاح نہ کریں، بلکہ اِس سے مُراد اپنے آپ کو زینت سے بھی روکے رکھنا ہے۔ چنانچہ احادیث میں واضح طور پر احکام ملتے ہیں کہ زمانۂ عدّت میں عورت کو رنگین کپڑے اور زیور پہننے سے، مہندی اور سُرمہ اور خوشبو اور خضاب لگانے سے اور بالوں کی آرائش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ آیا اِس زمانے میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں؟ حضرت عمر، عثمان، ابن عمر، زید بن ثابت، ابن مسعود، اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین، سعید بن مُسیّب، ابراہیم نَخعی، محمد بن سیرین اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ اِس بات کے قائل ہیں کہ زمانۂ عدّت میں عورت کو اِسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اُس کے شوہر نے وفات پائی ہو۔ دِن کے وقت کسی ضرورت سے وہ باہر جاسکتی ہے، مگر قیام اُس کا اِسی گھر میں ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس حضرت عائشہ، ابن عباس، حضرت علی، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین، عطاء، طاؤس، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز اور تمام اہل الظاہر رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ عورت اپنی عدّت کا زمانہ جہاں چاہے گزار سکتی ہے اور اس زمانے میں سفر بھی کر سکتی ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۹-۱۸۰، البقرہ حاشیہ ۲۵۹)

دورانِ عدّت بیوہ کے ساتھ نِکاح کرنے کا وعدہ نہ کریں

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○ (البقرہ ۲:۲۳۵) زمانۂ عدّت میں خواہ تم اُن بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کرو، خواہ دِل میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دِل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو، خُفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معرُوف طریقے سے کرو۔ اور عقدِ نِکاح باندھنے کا فیصلہ اُس وقت تک نہ کرو، جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دِلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بُردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔

نان ونفقہ

مطلّقہ مبتوتہ کے لیے سکونت اور نفقہ: أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ (الطلاق ۶۵:۶) اُن کو (زمانۂ عدت میں) اُسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمھیں میسّر ہو۔ اور اُنھیں تنگ کرنے کے لیے اُن کو نہ ستاؤ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِس اَمر میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ مطلّقہ کو اگر رجعی طلاق دی گئی ہو تو شوہر پر اُس کی سکونت اور اُس کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اِس اَمر پر بھی اتفاق ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو خواہ اُسے رجعی طلاق دی گئی ہو یا قطعی طور پر الگ کر دینے والی، بہرحال اِس کے وضعِ حمل تک اُس کی سکونت اور اُس کے نفقے کا ذمہ دار شوہر ہوگا۔ اِس کے بعد اختلاف اِس اَمر میں ہوا ہے کہ آیا غیر حاملہ مطلّقہ مَبْتُوتہ (یعنی جسے قطعی طور پر الگ کر دینے والی طلاق دی گئی ہو) سکونت اور نفقہ دونوں کی حق دار ہے؟ یا صِرف سکونت کا حق رکھتی ہے؟ یا دونوں میں سے کسی کی بھی حق دار نہیں؟

اثبات کے حامیوں کے دلائل: ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ سکونت اور نفقہ دونوں کی حق دار ہے۔ یہ رائے حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی بن حسین، امام زین العابدین، قاضی شُریح اور ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم اجمعین کی ہے۔ اسی کو حنفیہ نے اختیار کیا ہے اور امام سُفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اِس کی تائید دار قُطنی کی اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المطلقة ثلاثا لها السكنى والنفقة[1]، جس عورت کو تین طلاق دی جا چکی ہوں، اُس کے لیے زمانۂ عدت میں سکونت اور نفقہ کا حق ہے۔ اِس کی مزید تائید اُن روایات سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ ہم ایک عورت کے قول پر اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سُنّت کو ترک نہیں کر سکتے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں لازماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سُنّت ہوگی کہ ایسی عورت کے لیے نفقہ اور سکونت کا حق ہے۔ بلکہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں تو یہ تصریح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث کو رد کرتے ہوئے فرمایا تھا: سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول: لها السكنى والنفقة، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایسی عورت کے لیے سکونت کا حق بھی ہے اور نفقہ کا بھی۔ امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں اِس مسئلے پر مفصّل بحث کرتے ہوئے اِس مسلک کے حق میں پہلی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا ہے کہ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ، اُن کو عدّت کے لیے طلاق دو۔ اِس فرمانِ الٰہی کا اطلاق اُس شخص پر بھی ہوتا ہے جو دو طلاق پہلے دے کر رُجوع کر چکا ہو اور اب اُسے صِرف ایک ہی طلاق دینے کا حق باقی ہو۔ دُوسری دلیل اُن کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دینے کا جب یہ طریقہ بتایا کہ ''آدمی یا تو ایسے طُہر میں طلاق دے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو یا ایسی حالت میں طلاق دے جب کہ عورت کا حاملہ ہونا ظاہر ہو چکا ہو۔ تو اس میں آپ نے پہلی، دوسری، یا آخری طلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''اُن کو اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو'' ہر قسم کی طلاق سے متعلّق مانا جائے گا۔ تیسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ حاملہ، مطلّقہ خواہ رجعیہ ہو یا مَبْتُوتہ، اس کی سکونت اور اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے اور غیر حاملہ رجعیہ کے لیے بھی یہ دونوں حقوق واجب ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ سکونت اور نفقہ کا وجوب دراصل حمل کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اِس بنا پر ہے کہ یہ دونوں قسم کی عورتیں شرعاً شوہر کے گھر میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اب اگر یہی حکم مَبْتُوتہ غیر حاملہ کے بارے میں بھی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سکونت اور اس کا نفقہ مَرد کے ذِمّے نہ ہو۔

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۵۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دُوسرا گروہ کہتا ہے کہ مطلّقۂ مبتوتہ کے لیے سکونت کا حق تو ہے مگر نفقہ کا حق نہیں ہے۔ یہ مسلک سعید بن المسیّب، سلیمان بن یسار، عطاء، شعبی، اوزاعی، لَیث اور ابوعُبید رحمہم اللہ کا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اِس کو اختیار کیا ہے۔ لیکن مغنی المحتاج میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اِس سے مختلف بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

نفی کے حامیوں کے دلائل: تیسرا گروہ کہتا ہے کہ مطلّقۂ مبتوتہ کے لیے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقہ کا۔ یہ مسلک حسن بصری، حماد، ابن ابی لیلیٰ، عمرو بن دینار، طاؤس، اسحاق بن راہویہ اور ابوثور رحمہم اللہ کا ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امامیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور مغنی المحتاج میں شافعیہ کا بھی یہی مسلک بیان کیا گیا ہے کہ تَجِبُ سُکْنٰی لِمُعْتَدَّةٍ طَلَاقٍ حَائِلٍ اَوْ حَامِلٍ وَلَا بَائِنٍ ...... وَالْحَائِلُ الْبَائِنُ لَا نَفَقَةَ لَهَا وَلَا كِسْوَةَ ''طلاق کی بنا پر جو عورت عدت گزار رہی ہو اُس کے لیے سکونت کا حق واجب ہے، خواہ وہ حاملہ ہو یا نہ ہو، مگر بائنہ کے لیے واجب نہیں ہے...... اور غیر حاملہ بائنہ کے لیے نہ نفقہ ہے اور نہ کپڑا''۔ اِس مسلک کا استدلال ایک تو قرآنِ مجید کی اس آیت سے ہے کہ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ''تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے''۔ اِس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ بات مطلّقہ رجعیہ کے حق ہی میں درست ہوسکتی ہے نہ کہ مبتوتہ کے حق میں۔ اس لیے مطلّقہ کو گھر میں رکھنے کا حُکم بھی رجعیہ ہی کے لیے خاص ہے۔ دُوسرا استدلال فاطمہ بنتِ قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہے جسے کتبِ حدیث میں بکثرت صحیح سندوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

یہ فاطمہ بنت قیس الفہریہ رضی اللہ عنہا اولین مہاجرات میں سے تھیں۔ بڑی عاقلہ سمجھی جاتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر اصحابِ شوریٰ کا اجتماع انھی کے ہاں ہوا تھا۔ یہ پہلے ابوعمرو بن حفص بن المغیرہ المخزومی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، پھر ان کے شوہر نے اُن کو تین طلاقیں دے کر الگ کر دیا اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے کیا۔ اِن کا قصہ یہ ہے کہ ان کے شوہر ابوعَمرو رضی اللہ عنہ پہلے اِن کو دو طلاق دے چکے تھے، پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ یمن بھیجے گئے تو اُنھوں نے وہاں سے باقی ماندہ تیسری طلاق بھی ان کو بھیج دی۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ ابوعَمرو رضی اللہ عنہ ہی نے اپنے رشتہ داروں کو پیغام بھیجا تھا کہ عدت کے زمانے میں ان کو گھر میں رکھیں اور اِن کا خرچ برداشت کریں۔ اور بعض میں یہ ہے کہ انھوں نے خود نفقہ وسکونت کے حق کا مطالبہ کیا تھا۔ بہر حال جو صورت بھی ہو، شوہر کے رشتہ داروں نے اِن کا حق ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ دعویٰ لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ نہ تمھارے لیے نفقہ ہے نہ سکونت۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اِنَّمَا النَّفَقَةُ وَالسُّکْنٰی للمراة علی زوجها ماکانت له علیها رجعة فاذا لم یکن له علیها رجعة فلا نفقة ولا سکنی[1] (مُسند احمد) عورت کا نفقہ اور اُس کی سکونت تو شوہر پر اِس صورت میں واجب ہے جب کہ شوہر کو اس پر رُجوع کا حق ہو۔ مگر جب رُجوع کا حق نہ ہو تو نہ نفقہ ہے نہ سکونت۔ طبرانی اور نسائی نے بھی قریب قریب یہی روایت نقل کی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں فَاِذَا کانت لا تحِل له حتی تنکح

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۱۵۸ - ۱۶۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زوجاً غیرہ فلا نفقة ولا سُکنی'' لیکن جب اُس کے لیے وہ اُس وقت تک حلال نہ ہو جب تک اُس کے سوا کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے تو پھر اُس کے لیے نہ نفقہ ہے، نہ سکونت''۔ یہ حُکم بیان کرنے کے بعد حضور ﷺ نے اُن کو اُم شریک رضی اللہ عنہا کے گھر میں عدت گزارنے کا حُکم دیا اور بعد میں فرمایا کہ تم ابنِ اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ہاں رہو۔

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث ناقابلِ قبول ہے: لیکن اِس حدیث کو جن لوگوں نے قبول نہیں کیا ہے اُن کے دلائل یہ ہیں۔

اوّلاً، اُن کو شوہر کے رشتہ داروں کا گھر چھوڑنے کا حُکم اِس لیے دِیا گیا تھا کہ وہ بہت تیز زُبان تھیں اور شوہر کے رشتہ دار اُن کی بدمزاجی سے تنگ تھے۔ سعید بن المُسیّب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''اِن خاتون نے اپنی حدیث بیان کر کے لوگوں کو فتنہ میں ڈال دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ زبان دراز تھیں، اِس لیے اُن کو ابن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ہاں رکھا گیا (ابوداؤد)۔ دُوسری روایت میں سعید بن المُسیّب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول منقول ہوا ہے کہ اُنھوں نے اپنے شوہر کے رشتہ داروں سے زبان درازی کی تھی اِس لیے اُنھیں اِس گھر سے منتقل ہونے کا حُکم دیا گیا تھا (جصاص)۔ سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ''اِن کا گھر سے نکلنا دراصل بدمزاجی کی وجہ سے تھا (ابوداؤد)۔

ثانیاً، ان کی روایت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُس زمانے میں ردّ کر دیا تھا جب بکثرت صحابہ موجود تھے اور اس معاملے کی پوری تحقیقات ہوسکتی تھیں۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث پہنچی تو اُنھوں نے فرمایا: لسنا بتارکی آیة فی کتاب الله و قول رسول الله صلی الله علیه و سلم لقول امرأة لعلها اوھمت، سمعت رسول الله صلی الله علیه و سلم یقول: لھا السکنیٰ والنفقة، ہم کتاب اللہ کی ایک آیت اور رسول اللہ ﷺ کے قول کو ایک عورت کے قول کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے جسے شاید کچھ وہم ہوا ہے۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے کہ مبتوتہ کے لیے سکونت کا حق بھی ہے اور نفقہ کا بھی (جصاص)۔ ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں اسود بن یزید کے پاس کوفہ کی مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہاں شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث کا ذِکر کیا۔ اس پر حضرت اسود نے شعبی کو کنکریاں کھینچ ماریں اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب فاطمہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت پیش کی گئی تھی تو اُنھوں نے کہا تھا: ''ہم اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی ﷺ کی سنّت کو ایک عورت کے قول کی وجہ سے ردّ نہیں کر سکتے۔ معلوم نہیں اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔ اِس کے لیے نفقہ اور سکونت ہے، اللہ کا حُکم ہے لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ''۔ یہ روایت باختلاف الفاظ مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں منقول ہوئی ہے۔

ثالثاً، مروان کے زمانۂ حکومت میں جب مطلّقہ مبتوتہ کے متعلق ایک نزاع چل پڑی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت پر سخت اعتراضات کیے تھے۔ قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پُوچھا: کیا آپ کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قِصہ معلوم نہیں ہے؟ اُنھوں نے جواب فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا ذِکر نہ کرو تو اچھا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے (بخاری)۔ بخاری نے دُوسری روایت جو نقل کی ہے اُس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ یہ ہیں "فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کیا ہو گیا ہے، وہ خدا سے ڈرتی نہیں"۔ تیسری روایت میں حضرت عُروہ بن زُبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "فاطمہ کے لیے یہ حدیث بیان کرنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے"۔ حضرت عُروہ رضی اللہ عنہ ایک اور روایت میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فاطمہ رضی اللہ عنہا پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہا: "وہ دراصل ایک خالی مکان میں تھیں جہاں کوئی مونس نہ تھا اس لیے ان کی سلامتی کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کو گھر بدل دینے کی ہدایت فرمائی تھی"۔

رابعاً، اِن خاتون کا نِکاح بعد میں اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا اور محمد بن اُسامہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب کبھی فاطمہ رضی اللہ عنہا اس حدیث کا ذِکر کرتیں میرے والد، جو چیز بھی اِن کے ہاتھ لگتی اُٹھا کر ان پر دے مارتے تھے (جصّاص)۔ ظاہر ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے علم میں سُنّت اس کے خلاف نہ ہوتی تو وہ اس حدیث کی روایت پر اِتنی ناراضی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۷۳-۵۷۷، الطلاق حاشیہ ۱۶)

حاملہ عورت کا نفقہ اور سکونت: وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ (الطلاق ۶۵:۶) اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اُس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضعِ حمل نہ ہو جائے۔

یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ مطلّقہ خواہ رجعیّہ ہو یا مبتُوتہ اگر حاملہ ہو تو وضعِ حمل تک اِس کی سکونت اور اس کے نفقہ کا ذِمّہ دار شوہر ہے۔ البتہ اختلاف اُس صورت میں ہے جب کہ حاملہ کا شوہر مر گیا ہو۔ قطعِ نظر اس سے کہ وہ طلاق دینے کے بعد مرا ہے، یا اِس نے کوئی طلاق نہ دی ہو اور عورت زمانۂ حمل میں بیوہ ہوگئی ہو۔ اِس معاملے میں فقہا کے مسالک یہ ہیں:

۱- حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ شوہر کے مجموعی ترکہ میں اُس کا نفقہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، قاضی شُریح، ابوالعالیہ، شعبی اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی یہی قول منقول ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی ایک قول اِسی کی تائید میں ہے (آلوسی۔ جصّاص)۔

۲- ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا دُوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ اُس پر اُس کے پیٹ کے بچہ کے حصّے میں سے خرچ کیا جائے اگر میت نے کوئی میراث چھوڑی ہو اور اگر میراث نہ چھوڑی ہو تو میّت کے وارثوں کو اُس پر خرچ کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ (البقرہ ۲:۲۳۳)۔

۳- حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن المُسیَّب اور حضرت عطا بن ابی رَباح رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ متوفی شوہر کے مال میں اِس کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک تیسرا قول یہی منقول ہوا ہے (جصّاص)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کے ترکہ میں سے اس کو جو میراث کا حِصّہ ملا ہو اس سے وہ اپنا خرچ پورا کر سکتی ہے، لیکن شوہر کے مجموعی ترکے پر اس کا نفقہ عائد نہیں ہوتا جس کا بار تمام وارثوں پر پڑے۔

۴- ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اُس کا نفقہ متوفی شوہر کے مال میں اُسی طرح واجب ہے جس طرح اُس کے مال میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کسی کا قرض واجب ہوتا ہے (جصاص)۔ یعنی مجموعی ترکہ میں سے جس طرح قرض ادا کیا جاتا ہے اسی طرح اس کا نفقہ بھی ادا کیا جائے۔

۵- امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ میّت کے مال میں اس کے لیے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقہ کا۔ کیونکہ موت کے بعد میّت کی کوئی ملکیت ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد تو وہ وارثوں کا مال ہے۔ اُن کے مال میں حاملہ بیوہ کا نفقہ کیسے واجب ہوسکتا ہے (ھدایہ، جصاص)۔ یہ مسلک امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے (الانصاف)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے، البتہ اِسے سکونت کا حق ہے (مُغنی المحتاج)۔ اِن کا استدلال حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ کی بہن فُریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کے اِس واقعے سے ہے کہ اُن کے شوہر جب قتل کر دیے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کو حکم دیا کہ شوہر کے گھر ہی میں عدّت گزاریں (ابوداؤد، نسائی، ترمذی)۔ مزید برآں ان کا استدلال دارقطنی کی اِس روایت سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس للحامل المتوفیٰ عنها زوجها نفقة، بیوہ حاملہ کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ یہی مسلک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے (حاشیہ الدُسوقی)۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۷۷-۵۷۹، الطلاق حاشیہ ۱۷)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

حضانت

زوجین کی علیحدگی کی صورت میں مدتِ رضاعت

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (البقرہ ۲:۲۳۳) جو باپ چاہتے ہوں کہ اُن کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیے، تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دُودھ پلائیں۔ اِس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے اُنھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا، مگر کسی پر اس کی وُسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اِس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے.....دُودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچے کے باپ پر ہے، ویسا ہی اُس کے وارث پر بھی ہے.....لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمھارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دُودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

یہ اُس صورت کا حکم ہے، جب کہ زوجین ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہوں، خواہ طلاق کے ذریعے سے یا خُلع یا فسخ اور تفریق کے ذریعے سے اور عورت کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ اگر باپ مرجائے تو جو اُس کی جگہ بچے کا ولی ہو، اُسے یہ حق ادا کرنا ہوگا۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۷۸-۱۷۹، البقرہ حواشی ۲۵۷-۲۵۸)

طلاق کی صورت میں بچے کی پرورش

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ۝ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝ (الطلاق ۶۵:۶-۷) پھر اگر وہ تمھارے لیے (بچے کو) دُودھ پلائیں تو اُن کی اُجرت اُنھیں دو، اور بھلے طریقے سے (اجرت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا معاملہ) باہمی گفت وشنید سے طے کرلو۔لیکن اگر تم نے (اُجرت طے کرنے میں) ایک دُوسرے کو تنگ کیا تو بچّے کو کوئی اور عورت دُودھ پلا لے گی۔خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے،اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اُسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اُسے دیا ہے۔اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اُس سے زیادہ کا وہ مکلّف نہیں کرتا۔بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرمادے۔

اس ارشاد سے کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ایک یہ کہ عورت اپنے دودھ کی مالک ہے،ورنہ ظاہر ہے کہ وہ اس کی اُجرت لینے کی مجاز نہیں ہوسکتی تھی۔دُوسرے یہ کہ جب وہ وضعِ حمل ہوتے ہی اپنے سابق شوہر کے نِکاح سے باہر ہوگئی تو بچّے کو،دودھ پلانے پر وہ قانوناً مجبور نہیں ہے بلکہ باپ اگر اِس سے دُودھ پلوانا چاہے اور وہ بھی راضی ہو تو وہ اِسے دُودھ پلائے گی اور اس پر اُجرت لینے کی حقدار ہوگی۔تیسرے یہ کہ باپ بھی قانوناً مجبور نہیں ہے کہ بچّے کی ماں ہی سے اُس کو دُودھ پلوائے۔چوتھے یہ کہ بچّے کا نفقہ باپ پر عائد ہوتا ہے۔پانچویں یہ کہ بچّے کو دُودھ پلانے کی اوّلین حقدار ماں ہے اور دُوسری عورت سے رضاعت کا کام اُسی صورت میں لیا جاسکتا ہے جب کہ ماں خود اِس پر راضی نہ ہو،یا اِس کی ایسی اُجرت مانگے جس کا ادا کرنا باپ کی مقدرت میں نہ ہو۔اِسی سے چھٹا قاعدہ یہ نکلتا ہے کہ اگر دُوسری عورت کو بھی وہی اُجرت دینی پڑے جو بچّے کی ماں مانگتی ہو تو ماں کا حق اولیٰ ہے۔

فقہا کی آرا اِس مسئلے میں یہ ہیں:

ضحّاک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بچّے کی ماں اِسے دُودھ پلانے کی زیادہ حق دار ہے۔مگر اُسے اختیار ہے کہ چاہے دُودھ پلائے یا نہ پلائے۔البتہ اگر بچہ دُوسری عورت کی چھاتی قبول نہ کرے تو ماں کو اُسے دُودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا۔اِسی سے مِلتی جُلتی رائے قتادہ اور ابراہیم نخعی اور سُفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اگر دُوسری عورت رضاعت کے لیے نہ مِل رہی ہو تب بھی ماں کو اُسے دُودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا'' (ابن جریر)۔

ھدایہ میں ہے: ''اگر ماں باپ کی علیحدگی کے وقت چھوٹا بچہ دُودھ پیتا ہو تو ماں پر یہ فرض نہیں ہے کہ وہی اُسے دُودھ پلائے۔البتہ اگر دُوسری عورت نہ ملتی ہو تو وہ رضاعت پر مجبور کی جائے گی۔اور اگر باپ یہ کہے کہ میں بچّے کی ماں کو اُجرت دے کر اُس سے دُودھ پلوانے کی بجائے دُوسری عورت سے اُجرت پر یہ کام لوں گا اور ماں دُوسری عورت ہی کے برابر اُجرت مانگ رہی ہو،یا بلا اُجرت ہی اِس خدمت کے لیے راضی ہو تو اِس صورت میں ماں کا حق مقدّم رکھا جائے گا۔اور اگر بچّے کی ماں زیادہ اُجرت مانگ رہی ہو تو باپ کو اِس پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اِس میں ماں اور باپ دونوں کے لیے عتاب کا ایک پہلو ہے۔اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی تلخیوں کی بنا پر،جن کے باعث بالآخر طلاق تک نوبت پہنچی تھی دونوں بھلے طریقے سے آپس میں بچّے کی رضاعت کا معاملہ طے نہ کریں تو یہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔عورت کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تو زیادہ اُجرت مانگ کر مَرد کو تنگ کرنے کی کوشش کرے گی تو بچّے کی پرورش کچھ تیرے ہی اُوپر موقوف نہیں ہے،کوئی دُوسری عورت اُسے دُودھ پلا لے گی اور مَرد کو بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تو ماں کی مامتا سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُسے تنگ کرنا چاہے گا تو یہ بھلے آدمیوں کا سا کام نہ ہوگا۔قریب قریب یہی مضمون سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زیادہ تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم،ص۵۷۷-۵۷۹، الطلاق حاشیہ ۱۸-۱۹)

اسلام کا قانونِ معاشرت ایک لاثانی قانون ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ (الطلاق ۶۵:۱۰-۱۱) پس اللہ سے ڈرو، اے صاحبِ عقل لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمھاری طرف ایک نصیحت نازل کردی ہے ایک ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سُناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔

جہالت کی تاریکیوں سے علم کی روشنی میں نکال لائے۔ اِس ارشاد کی پوری اہمیت اُس وقت سمجھ میں آتی ہے جب انسان طلاق، عدّت اور نفقات کے متعلق دُنیا کے دُوسرے قدیم اور جدید عائلی قوانین کا مطالعہ کرتا ہے۔ اِس تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بار بار کی تبدیلیوں اور نت نئی قانون سازیوں کے باوجود آج تک کسی قوم کو ایسا معقول اور فطری اور معاشرے کے لیے مفید قانون میسر نہیں آسکا ہے جو اس کتاب اور اس کے لانے والے رسول ﷺ نے ڈیڑھ ہزار برس پہلے ہم کو دیا تھا اور جس پر کسی نظرِ ثانی کی ضرورت نہ کبھی پیش آئی نہ پیش آسکتی ہے[1]۔

(تفہیم القرآن، پنجم،ص۵۸۰، الطلاق حاشیہ ۲۲)

............OOO............

۱- یہاں اِس تقابلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ اس کا محض ایک مختصر سا نمونہ ہم نے اپنی کتاب حقوق الزوجین کے آخری حصّہ میں درج کیا ہے۔ لیکن جو اصحابِ علم چاہیں وہ دُنیا کے مذہبی اور لادینی قوانین سے قرآن وسُنّت کے اِس قانون کا مقابلہ کرکے خود دیکھ لیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

عائلی قوانین کے کمیشن کا سوال نامہ اور اُس کا جواب

ذیل میں وہ سوال نامہ مع جواب نقل کیا جا رہا ہے جو حکومت کے مقرّر کردہ کمیشن برائے قوانین عائلہ کی طرف سے ۱۹۵۵ء کے اواخر میں جاری کیا گیا تھا۔

نِکاح سے متعلق سوالات

س کیا نِکاح خوانی کا کام صرف حکومت کے مقرّر کردہ نِکاح خوانوں کے ذریعے ہونا چاہیے؟

ج جی نہیں۔ اسلامی معاشرے میں کسی قسم کی کہانت (priesthood) کے لیے جگہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان جس طرح نماز پڑھا سکتا ہے اُسی طرح نِکاح بھی پڑھا سکتا ہے۔ بلکہ زَوجین خود بھی دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کر سکتے ہیں۔ نِکاح خواں کا ایک نیا عہدہ از رُوئے قانون اگر مقرّر کر دیا جائے تو لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ یا تو ہر اس نِکاح کو باطل قرار دیا جائے جو سرکاری 'پادری' کے بغیر کر لیا گیا ہو۔ یا پھر اُسے جائز تسلیم کیا جائے۔ پہلی صورت میں شریعت اور قانون کے درمیان تضاد واقع ہو جائے گا، کیونکہ شرعاً وہ نِکاح صحیح ہوگا اور دُوسری صورت میں یہ قاعدہ مقرّر کرنا فضول ہوگا۔

س کیا نِکاح کا رجسٹری کرانا لازمی ہونا چاہیے؟ اگر ایسا ہو تو اس کے لیے کیا طریق کار ہونا چاہیے اور اِس کی خلاف ورزی کے لیے کیا اور کسے سزا ہونی چاہیے؟

ج نِکاحوں کا ایک پبلک رجسٹر میں درج کرانے کا انتظام مُفید تو ضرور ہے مگر اسے لازم نہ ہونا چاہیے۔ شریعت نے نِکاح کے لیے جو قواعد مقرّر کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نِکاح کم از کم دو گواہوں کے سامنے ہو اور اس کو علی الاعلان کیا جائے تاکہ زَوجین کے رِشتہ داروں اور قریب قریب کے حلقۂ تعارف میں اِن کا رِشتہ معلوم ومعروف ہو جائے۔ نزاعات کی صورت میں اِس طریقے سے نِکاح کی شہادتیں بہم پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ تاہم قیامِ شہادت میں مزید سہولتیں دو طریقوں سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک معیاری نِکاح نامہ مرتب کر کے عام طور پر شائع کر دیا جائے تاکہ لوگ نِکاح سے متعلق تمام ضروری امور اِس میں درج کر کے شہادتیں ثبت کرا لیا کریں۔ دُوسرے یہ کہ ہر محلّے اور بستی میں نِکاحوں کا ایک رجسٹر رکھ دیا جائے تاکہ جو بھی اس میں نِکاح کا اندراج کرانا چاہے کرا دے۔ لوگ بالعموم خود ہی اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے اِن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دونوں سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اِسے لازم کرنے میں دو قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خلاف ورزی کرنے والوں کو کوئی نہ کوئی سزا دینی ہوگی اور اِس طرح خواہ مخواہ ایک نئے جرم کا اضافہ ہوگا، حالانکہ جو نِکاح گواہوں کے سامنے کیا جائے وہ شرعاً منعقد ہو جاتا ہے اور عدالت اِس کے وجود سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ آیا آپ غیر رجسٹری شدہ نِکاحوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو ناجائز اولاد قرار دیں گے اور اِنھیں پدری جائیداد کی وراثت سے بھی محروم کریں گے؟ اگر یہاں تک آپ نہیں جانا چاہتے تو رجسٹری کو قانوناً لازم کرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔

س یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زَوجَین میں سے ہر ایک نے کسی دباؤ کے بغیر اپنی رضامندی سے ایجاب وقبول کیا ہے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

ج قانونی اغراض کے لیے ایجابی طور پر یہ معلوم ہونا ضروری نہیں ہے کہ نِکاح کے فریقَین نے اپنی رضامندی سے نِکاح کیا ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ کسی فریق نے دباؤ کے تحت بلا رضا و رغبت مجبوراً ایجاب وقبول کیا ہے اُس وقت تک ہر نِکاح کے متعلق یہی فرض کیا جائے گا کہ وہ برضا و رغبت ہوا ہے۔ اِسلام میں ایجاب وقبول لازماً دو گواہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ بالغ لڑکے کا نِکاح اُس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک وہ گواہوں کے سامنے بالفاظِ صریح اِسے قبول نہ کرے۔ لڑکی کے لیے (اگر وہ باکرہ ہو) زبانی اقرار ضروری نہیں ہے، لیکن اگر وہ بآوازِ بلند روئے تو یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ اِسے نِکاح منظور نہیں۔ اِس طرح شریعت نے خود رضامندی متحقق کرنے کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے اور یہ بالکل کافی ہے۔ پس پردہ اگر لڑکے یا لڑکی پر کوئی دباؤ ڈالا گیا ہو تو اِس کا ثبوت مدعی کو لانا چاہیے۔ قانون ایسے کسی دباؤ کے عدم کے لیے ثبوت کا طالب نہیں ہے، بلکہ اِس کے وجود کا ثبوت مانگتا ہے، اگر کوئی اِس کا دعویٰ کرے۔ دباؤ کے عدم کا ثبوت لازم کر دینے سے نہ صِرف یہ کہ قانون کا منشا اُلٹ جائے گا بلکہ اِس سے عملاً سخت مشکلات رُونما ہوں گی۔

س کیا آپ کے نزدیک کم سنی کی شادیوں کو روکنے کے لیے یہ قانون بنانا ضروری ہے کہ شادی کے وقت مَرد کی عمر ۱۸ سال سے اور عورت کی ۱۵ سال سے کم نہ ہو۔

ج کم سنی کی شادیاں روکنے کے لیے کسی قانون کی حاجت نہیں۔ اور اِس کے لیے ۱۸ سال اور ۱۵ سال کی عمر مقرّر کر دینا بالکل غلط ہے۔ ہمارے ملک میں ۱۸ سال کی عمر سے بہت پہلے ایک لڑکا جسمانی طور پر بالغ ہو جاتا ہے اور لڑکیاں بھی ۱۵ سال سے پہلے جسمانی بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں۔ اِن عمروں کو ازرُوئے قانون نِکاح کی کم سے کم عمر قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اِس سے کم عمر والے لڑکوں اور لڑکیوں کی صِرف شادی پر اعتراض ہے، کسی دُوسرے طریقے سے جنسی تعلقات پیدا کر لینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ شریعتِ اِسلام نے اِس طرح کی مصنوعی حد بندیوں سے اِسی لیے احتراز کیا ہے کہ یہ درحقیقت بالکل غیر معقول ہیں۔ اِس کے بجائے یہ بات لوگوں کے اپنے ہی اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ کب نِکاح کریں اور کب نہ کریں۔ لوگوں میں تعلیم اور عقلی نشو ونما کے ذریعے سے جتنا زیادہ شعور پیدا ہوگا اِسی قدر زیادہ صحیح طریقے سے وہ اپنے اِس اختیارِ تمیزی کو استعمال کریں گے اور کم سنی کے نامناسب نِکاحوں کا وقوع، جو اَب بھی ہمارے معاشرے میں کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، روز بروز کم تر ہوتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چلا جائے گا۔ شرعاً ایسے نکاحوں کو جائز صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ بسا اوقات کسی خاندان کی حقیقی مصلحتیں اس کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اس ضرورت کی خاطر قانوناً اسے جائز ہی رہنا چاہیے اور اس کے نامناسب رواج کی روک تھام کے لیے قانون کے بجائے تعلیم اور عام بیداری کے وسائل پر اعتماد کرنا چاہیے۔ معاشرے کی ہر خرابی کا علاج قانون کا لٹھ ہی نہیں ہے۔

(س) کیا آپ کے نزدیک نکاح کے لیے عمروں کا یہ تعین از روئے قرآنِ کریم یا از روئے حدیثِ صحیح ممنوع ہے؟

(ج) نکاح کے لیے عمروں کے تعین کی کوئی صریح ممانعت تو قرآن و حدیث میں نہیں ہے، مگر کم سنی کے نکاح کا جواز سُنّت سے ثابت ہے اور احادیثِ صحیحہ میں اس کے عملی نظائر موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو چیز شرعاً جائز ہے اس کو آپ قانوناً حرام کس دلیل سے کرتے ہیں؟ آپ کا ایک عمر از رُوئے قانون مقرر کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس عمر سے کم میں اگر کوئی نکاح کیا جائے تو آپ اُسے باطل قرار دیں گے اور ملکی عدالتیں اس کو تسلیم نہ کریں گی۔ کیا اِسے ناجائز اور باطل ٹھیرانے کے لیے کوئی اجازت قرآن و حدیثِ صحیح میں موجود ہے؟ دراصل یہ طرزِ سوال بہت ہی مغالطہ آمیز ہے۔ تعیینِ عمر صرف ایک ایجابی پہلو ہی نہیں رکھتی بلکہ ساتھ ساتھ ایک سلبی پہلو بھی رکھتی ہے۔ اِس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ نکاح کے لیے محض ایک عمر مقرر کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس عمر سے پہلے نکاح کرنے کو آپ حرام بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اِس منفی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف یہ پوچھنا کہ کیا اس کا مثبت پہلو ممنوع ہے، سوال کو ادھوری شکل میں پیش کرنا ہے۔ سوال کی تکمیل اِس وقت ہو گی جب آپ ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھیں کہ کیا ایک عمرِ خاص سے پہلے نکاح کرنا جائز ٹھیرانے کے حق میں کوئی دلیل قرآن یا کسی حدیثِ صحیح میں ملتی ہے؟

(س) کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ معاہدۂ ازدواج میں ہر ایسی شرط درج ہو سکتی ہے جو اسلام اور اخلاق کے بنیادی اُصولوں کے خلاف نہ ہو اور عدالت اِس کے ایفا پر مجبور کرے؟

(ج) اِس سوال کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ کیا ایسی شرطیں معاہدۂ ازدواج میں درج ہو سکتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتی ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسی کچھ شرائط از روئے قانون معاہدۂ نکاح کا لازمی جُزو بنا دی جائیں اور حکومت کی طرف سے شائع کردہ معیاری نکاح نامے میں ان کو شامل کر دیا جائے۔ شریعت نے اِس معاملے کو ہر انفرادی نکاح کے فریقین پر چھوڑا ہے اور اُنھیں اختیار دیا ہے کہ جو مُباح شرطیں بھی وہ چاہیں آپس میں طے کر لیں۔ اِس حد سے تجاوز کر کے بعض شرطوں کو قانون یا رواج کی حیثیت دے دینا اُصول کے بھی خلاف ہے اور عملاً بھی اِس سے بہت سی خرابیاں رُونما ہو سکتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جو بات تجربے سے ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بالعموم کامیاب ازدواجی رِشتے وہی ہوتے ہیں جن میں فریقین نے باہمی اعتماد پر معاملہ کیا ہو اور طرح طرح کی شرطوں سے ایک دُوسرے کو باندھنے کی کوشش نہ کی ہو۔ شرطوں کی بندشیں عام طور پر اُلٹی خرابی پیدا کرتی ہیں۔ کیونکہ اِن کی بدولت رِشتے کا آغاز ہی بے اعتمادی سے ہوتا ہے۔ مصنوعی شرطوں کو رائج کرنے کے لیے صرف یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ اِسلام اور اُصولِ اخلاق کے خلاف نہیں ہیں۔ کسی چیز کے خلافِ اِسلام اور خلافِ اخلاق نہ ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اُسے ضرور کرنا چاہیے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا عدالتیں ایسی شرطوں کے ایفا پر حُکماً مجبور کر سکتی ہیں جو معاہدۂ ازدواج میں درج ہوں اور خلافِ اسلام واخلاق نہ ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی مقرر کردہ شرطوں کے سوا جتنی شرطیں بھی معاہدۂ ازدواج میں درج کی گئی ہوں، انھیں نافذ کرتے وقت عدالت کو صرف یہی نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ خلافِ اسلام واخلاق نہیں ہیں، بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ طرفین کے انفرادی حالات میں وہ معقول اور منصفانہ بھی ہیں۔

(س) کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ ازرُوئے قانون یہ تسلیم کیا جائے کہ معاہدۂ ازدواج میں یہ شرط ہو سکتی ہے کہ عورت کو بھی اعلانِ طلاق کا وہی حق حاصل ہوگا جو مَرد کو حاصل ہے؟

(ج) اگر ایجاب وقبول کے وقت عورت یہ کہے کہ میں اپنے آپ کو تیرے نکاح میں اس شرط کے ساتھ دیتی ہوں کہ میں جب چاہوں اپنے اُوپر طلاق وارد کرنے کی مختار ہوں گی اور مَرد اُسے قبول کر لے تو قانوناً اس شرط کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت تفویضِ طلاق کی ہے اور فقہا نے اِسے جائز رکھا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تفویضِ طلاق کا قانوناً جائز ہونا اور چیز ہے اور اسلامی معاشرے میں اِسے رواج دینے کی کوشش کرنا اور چیز۔ اس کا قانونی جواز تو صرف اس بنا پر ہے کہ مَرد کو شریعت نے طلاق کا جو اختیار دیا ہے اُسے وہ اپنی طرف سے نیابتاً یا وکالتاً جسے چاہے سونپ سکتا ہے اور عورت کو بھی وہ تفویض کر سکتا ہے، لیکن اس کی ترویج اور ہر معاہدۂ نکاح میں اس شرط کو شامل کرنے کی کوشش قطعاً اسلام کے منشا کے خلاف ہے۔ اسلام نے عورت اور مَرد کے درمیان حقوق واختیارات کا جو تناسب قائم کیا ہے اُس کا یہ فطری اور منطقی تقاضا ہے کہ زوجین میں سے صرف مَرد ہی طلاق کا مختار ہو۔ اُس نے مَہر اور زمانۂ عدت کا نفقہ اور چھوٹے بچوں کے زمانۂ رضاعت وحضانت کا خرچ کلیتاً مَرد پر ڈالا ہے۔ اس لیے مَرد مجبور ہے کہ طلاق کا اختیار استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لے، کیونکہ اِس کا پورا مالی نُقصان اسی کو برداشت کرنا ہوگا۔ بخلاف اس کے عورت پر کوئی مالی ذِمہ داری اِس نے عائد نہیں کی ہے، بلکہ طلاق کے نتیجے میں اِسے کچھ لینا ہی ہوتا ہے، دَینا کچھ نہیں ہوتا۔ اِس لیے وہ اختیارِ طلاق کے استعمال میں سخت بے احتیاطی کر سکتی ہے، بلکہ ذَرا سے اشتعال پر بھی بے تکلف طلاق دے سکتی ہے۔ اِن وجوہ سے عورت کی طرف اس اختیار کو منتقل کر دینا اُس اسکیم کے بالکل خلاف ہے جو اِسلام نے اپنے ازدواجی قانون میں پیشِ نظر رکھی ہے۔ اس غلط طریقے کو اگر رائج کیا گیا تو معاشرے میں اس کے بہت بُرے نتائج رُونما ہوں گے اور ہم کثرتِ طلاق کی ایک ایسی وَبا سے دوچار ہو جائیں گے جس سے اب تک ہمارا معاشرہ محفوظ رہا ہے۔

(س) ہمارے معاشرے کے بعض طبقوں میں دُختر فروشی کا مکروہ رواج پایا جاتا ہے۔ اس کے انسداد کے لیے آپ کے نزدیک کِس قِسم کا اقدام مناسب ہوگا تاکہ والدین یا ولی لڑکی کو نکاح میں دیتے ہوئے رَقمیں وصول نہ کر سکیں؟

(ج) یہ ایک نہایت مکروہ رسم ہے۔ اِسے قانوناً جُرم ٹھیرا دینا چاہیے اور اُن لوگوں کے لیے قید وجرمانے کی سزا تجویز کرنی چاہیے جو لڑکیوں کو اس طرح فروخت کرتے ہیں۔

(س) کیا آپ کے نزدیک مناسب ہوگا کہ ایک معیاری نِکاح نامہ مرتب کیا جائے اور نِکاح کے تمام اندراجات اس کے مطابق ہوں؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: یہ بین مناسب ہے۔ ماہرین فقہ کے مشورے سے اس طرح کا ایک نکاح نامہ ضرور مرتب ہونا چاہیے، بلکہ اس کے ساتھ ازدواجی قانون کے ضروری احکام بھی منسلک ہونے چاہییں جن کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگ بالعموم غلطیاں کرتے ہیں۔

طلاق سے متعلق

س: اگر کوئی شوہر بیک وقت تین طلاقیں دے تو کیا آپ کے نزدیک اسے قطعی طلاق مغلّظہ شُمار کیا جائے یا تین طُہروں میں تین طلاقوں کے اعلان کے بغیر جیسا کہ قرآن میں ہدایت کی گئی ہے یہ مغلّظہ شُمار نہ ہوگی۔

ج: ائمہ اربعہ اور جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاق اگر بیک وقت دیے جائیں تو وہ تین ہی طلاق شُمار ہوں گے اور میرے نزدیک یہی صحیح تر بات ہے، اس لیے میں یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ اس قاعدے میں کوئی تغیر کیا جائے۔ لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے کیونکہ یہ اُس صحیح طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے طلاق دینے کے لیے سکھایا ہے۔ اس لیے اس غلط طریقے کی روک تھام ضرور ہونی چاہیے۔ میری رائے میں اس غرض کے لیے حسبِ ذیل تدابیر مناسب ہوں گی:

ا: مسلمانوں کو عام طور پر طلاق کے صحیح طریقے سے واقف کرایا جائے، اس کی حکمتیں اور اس کے فوائد سمجھائے جائیں اور اس کے مقابلے میں طلاقِ بدعی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے، نیز یہ بھی بتایا جائے کہ اس غلط طریقے سے طلاق دینے والا گناہ گار ہوتا ہے۔ یہ چیز تعلیم کے نصاب میں بھی شامل ہونی چاہیے۔ ریڈیو اور پریس کے ذریعے سے بھی نشر ہونی چاہیے اور نکاح ناموں کے ساتھ جو احکام منسلک ہوں اُن میں بھی اسے درج ہونا چاہیے۔

ب: دستاویز نویسوں کو حکماً تین طلاق کی دستاویز لکھنے سے منع کر دیا جائے اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جرمانہ مقرر کیا جائے۔

ج: بیک وقت تین طلاق دینے والوں کے لیے بھی سزائے جرمانہ مقرر کر دی جائے۔ اس کے لیے ہمارے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کی نظیر موجود ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے کا مقدمہ اُن کے سامنے پیش ہوتا وہ طلاق کو نافذ کرنے کے ساتھ طلاق دینے والوں کو سزا بھی دیتے تھے۔

س: کیا طلاقوں کا رجسٹری کرانا لازمی قرار دیا جائے؟

ج: طلاق کی رجسٹری کا انتظام تو ضرور ہونا چاہیے، مگر وہ صرف اختیاری ہونی چاہیے، لازم قرار دینے میں متعدد قباحتیں ہیں۔ عدالتوں میں ہر اُس طلاق کو تسلیم کیا جانا چاہیے جس کی شہادت بہم پہنچے، یا طلاق دینے والا جس کا اقرار کرے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ رجسٹری شدہ ہو یا نہیں۔

س: اگر طلاق کی رجسٹری نہ ہو تو آپ کے نزدیک اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟

ج: رجسٹری نہ کرانے کے لیے کسی سزا کی حاجت نہیں۔

س: کیا مختلف علاقوں کے لیے مصالحتی مجالس مقرر کی جائیں اور کسی طلاق کو اس وقت تک صحیح تسلیم نہ کیا جائے جب تک کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فریقین اُن مجالس کی طرف رُجوع نہ کر چکے ہوں جن میں زوجین کے خاندانوں کی طرف سے بھی ایک ایک حَکم شامل ہو؟

ج اِس طرح کی مصالحتی مجالس تو ضرور قائم ہونی چاہییں اور عدالتوں کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کرنا چاہیے کہ وہ ازدواجی نزاعات کا فیصلہ کرنے سے پہلے قرآنِ مجید کے مقرر کردہ طریقۂ تحکیم پر عمل کریں، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جس طلاق کا معاملہ مصالحتی مجالس یا خاندانی حَکموں کے سامنے نہ گیا ہو اُس کو سرے سے تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ شریعت کی رُو سے ہر وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے جس میں طلاق کے ارکان وشروط پائے جائیں۔ اِس کے وقوع کی شرائط میں شرعاً یہ چیز شامل نہیں ہے کہ آدمی کسی حَکم یا مصالحتی مجلس سے رُجوع کرے۔ اب اگر ایسی طلاق کو جو شرعاً واقع ہو چکی ہو عدالتیں تسلیم نہ کریں تو لوگ سخت پیچیدگی میں پڑ جائیں گے اور یہ قاعدہ اِسلامی شریعت سے متناقض ہو جائے گا[1]۔

س کیا 'ازدواجی وعائلی عدالت' کو مطلّقہ کے مطالبے پر یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ مطلّقہ کو تاحینِ حیات یا تاعقدِ ثانی نفقہ دلوائے؟

ج یہ بات شریعت کے خلاف بھی ہوگی اور انصاف کے خلاف بھی۔ قرآن اور حدیث میں وہ صورتیں معیّن کر دی گئی ہیں جن میں ایک مطلقہ عورت طلاق دینے والے شوہر سے نفقہ پانے کی حق دار ہوتی ہے اور یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ اِن مختلف صورتوں میں وہ کتنی مدت کے لیے حق دار رہتی ہے۔ تاحینِ حیات یا تاعقدِ ثانی نفقہ پانے کا استحقاق اِس شرعی ضابطے کے خلاف ہوگا اور عقل بھی یہ نہیں مانتی کہ ایک شخص جو ایک عورت کو طلاق دے چکا ہے اور جو اس سے اب کسی قسم کا فائدہ اُٹھانے کا حق دار نہیں ہے، مدت العمر یا تاعقدِ ثانی اِس کے مصارف کا بار اُٹھانے پر مجبور کیا جائے۔ یہ چیز خود عورتوں کی اخلاقی پوزیشن کو بھی گرا دینے والی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی خوددار اور شریف عورت یہ بات کبھی گوارا کر سکتی ہے کہ وہ ایک غیر شخص سے جس کی بیوی وہ نہیں رہی ہے اپنے مصارف کی کفالت کرائے۔ ایسا ضابطہ اپنے قوانین میں درج کر کے ہم اپنے معاشرے کے طبقۂ اناث کی عزّت پر بُری طرح حرف لائیں گے اور اس کا فائدہ صِرف وہ چند عورتیں ہی اُٹھائیں گی جو اپنے اخلاقی وقار کی بہ نسبت مال کو زیادہ اہمیت دینے والی ہوں۔

عورت کی طرف سے مطالبۂ طلاق

س کیا آپ کے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ خُلع کے متعلق مجلس آئین ساز واضح اور غیر مبہم قانون وضع کرے؟

ج مناسب یہ ہوگا کہ صِرف خُلع ہی کے متعلق نہیں، بلکہ تمام ازدواجی معاملات کے متعلق اِسلامی احکام ایک کتابچے کی صورت میں مدوّن (codify) کر دیے جائیں اور اِس غرض کے لیے علما اور تجربہ کار قانون دانوں کی ایک کمیٹی بنا دی جائے۔

۱۔ س کیا عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد کوئی شخص اگر شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی؟ متذکرۂ صدر قوانین کی رُو سے تو طلاق کے نافذ ہونے کے لیے کچھ خاص شرائط عائد کر دی گئی ہیں۔

ج کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ اِسی لیے جو طلاق شرعی قواعد کی رُو سے دے دی گئی ہو وہ عنداللہ اور عندالمسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ اِن قوانین کی رُو سے وہ نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہوگی خواہ یہ قوانین اِس کو نافذ کر دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنے نکاح وطلاق کے معاملات خدا اور رسول ﷺ کی شریعت کے مطابق طے کرنا چاہتے ہیں یا اِن عائلی قوانین کے مطابق۔ (رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۱۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

س: کیا آپ ڈیسولیوشن آف میرج ایکٹ ۱۹۳۹ء (انفساخ نکاح مسلمین ۱۹۳۹ء) کی تمام وضاحت کو جامع اور تشفی بخش سمجھتے ہیں؟ یا آپ کے نزدیک اس میں اضافہ وترمیم ہونی چاہیے؟

ج: مذکورہ ایکٹ میرے سامنے نہیں ہے۔ اس لیے میں اس پر کوئی اظہارِ رائے نہیں کرسکتا۔ اچھا ہوتا کہ اس سوال نامے کے ساتھ اس ایکٹ کی نقل بھی شامل ہوتی۔

(تفہیمات، سوم، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۱-۲۰۱)

اختلافِ مزاج کی وجہ سے فسخِ نکاح

س: کیا زوجین کا ایسا اختلاف مزاج جس کی وجہ سے ازدواجی زندگی ناخوش گوار ہو جائے، جائز طور پر وجہِ فسخِ نکاح ہوسکتا ہے؟

ج: اختلافِ مزاج کی صورت میں عدالت کو پہلے تحکیم کے قرآنی قاعدے پر عمل کرنا چاہیے تاکہ زوجین کے خاندان ہی کے دو معتبر آدمی اس اختلاف کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ پھر اگر وہ ناکام ہونے کی رپورٹ عدالت کو دیں تو عدالت کا کام وجوہِ اختلاف کی تحقیق کرنا تو نہیں ہے، مگر یہ تحقیق اس کو ضرور کرنی چاہیے کہ آیا ان زوجین کے درمیان نباہ ممکن نہیں رہا ہے۔ اس کے بعد عدالت دو شکلوں میں سے کوئی ایک شکل اختیار کرسکتی ہے۔ یا تو عورت کے حق میں خُلع کا فیصلہ کرے اگر وہ اس کی طالب ہو یا شوہر کو مجبور کرے کہ وہ اسے معلق رکھنے کے بجائے طلاق دے دے۔

(تفہیمات، سوم، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۲۱۲)

عدالت سے طلاق لینے کی حیثیت:

س: کیا خواتین اسلامی عدلیہ سے خود طلاق لینے کی مجاز ہوں گی؟

ج: مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعے خُلع حاصل کرسکتی ہے۔ فسخِ نکاح (nullification) اور تفریق (judicial separation) کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کرسکتی ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری عدالت میں حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق (divorce) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مَرد کو دیے ہیں اور کوئی قانون مَردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کرسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہدِ رسالت سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے ناآشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مَرد سے سلب کرلیا جائے اور کوئی عدالت یا پنچایت اس میں دخل دے۔ یہ تخیّل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانونِ طلاق کا پس منظر (back ground) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے بُرے نتائج رُونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟

(رسائل و مسائل، چہارم، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۶۳-۲۶۴، بحوالہ ترجمان القرآن، جنوری ۶۲ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعدّدِ ازواج

س قرآنِ کریم میں تعدّدازدواج کی بابت ایک ہی آیت (۴:۴) ہے جو حقوقِ یتامیٰ کی حفاظت کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا آپ کے نزدیک جہاں حقوقِ یتامیٰ کا سوال نہ ہو وہاں تعدّدِ ازواج کو ممنوع کیا جاسکتا ہے؟

ج یہ خیال غلط ہے کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت کا حُکم حقوقِ یتامیٰ کی حفاظت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ رائے بھی غلط ہے کہ جہاں حقوقِ یتامیٰ کا سوال نہ ہو وہاں تعدّدِ ازواج کو ممنوع کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بکثرت مثالیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حُکم بیان کرنے کے ساتھ اِن حالات کا بھی ذِکر کیا گیا ہے جن میں اس حُکم کے بیان کی حاجت پیش آئی ہے، یا جن میں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے، یا جن سے وہ حُکم متعلق ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا اور کسی قانون داں آدمی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ ایسا ہر حُکم صرف اُنھی حالات کے ساتھ وابستہ رہے جن کا ذِکر کر دیا گیا ہے اور دُوسرے تمام حالات میں اس حُکم پر عمل کرنا یا اس اجازت سے فائدہ اُٹھانا ممنوع ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۳ میں فرمایا گیا ہے کہ ''اگر تم سفر پر ہو اور (قرض کی دستاویز لکھنے کے لیے) تم کو کاتب نہ ملے تو پھر رہن با قبضہ ہونا چاہیے''۔ کیا قانون کی سمجھ رکھنے والا کوئی آدمی اس کا یہ مطلب لے سکتا ہے کہ اسلامی شریعت میں رہن بالقبض کا جواز صرف سفر اور کاتب نہ ملنے کی حالت کے ساتھ وابستہ ہے؟ اسی طرح سورۂ نساء کی آیت ۲۳ میں جن عورتوں کے ساتھ نِکاح حرام کیا گیا ہے ان میں سوتیلی بیٹی کی حُرمت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے ''اور تمھاری وہ پروردہ لڑکیاں جو تمھاری گودوں میں ہیں تمھاری اُن بیویوں سے جن کے ساتھ تم ہم بستر ہو چکے ہو''۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ سوتیلی بیٹی کی حُرمت صِرف اِس حالت کے ساتھ وابستہ ہے جب کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو؟ ان مثالوں سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ تعدّدِ ازواج کی اجازت جس آیت میں بیان ہوئی ہے اِس کے ساتھ حقوقِ یتامیٰ کی حفاظت کا ذِکر کرنے کا مقصد اس اجازت کو صرف اسی حالت کے ساتھ وابستہ کر دینا نہیں ہے جب کہ یتامیٰ کا کوئی معاملہ درپیش ہو۔ بلکہ اگر اِس موقع ومحل کو دیکھا جائے جس میں یہ آیت آئی ہے تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔ تعدّدِ ازواج اِس آیت کے نزول سے پہلے عرب میں رائج تھا، نبی ﷺ خود متعدد بیویاں رکھتے تھے، اور بکثرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے گھروں میں ایک سے زائد بیویاں موجود تھیں۔ قرآن میں اس کی کوئی ممانعت نہ آنا بجائے خود اِس رواج کے جواز کے لیے کافی دلیل تھا۔ اس لیے یہ آیت دراصل تعدّدِ ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہی نہیں ہوئی تھی، بلکہ جنگِ اُحد کے بعد اس کے نزول کا مقصد مسلمانوں کو یہ رہنمائی دینا تھا کہ جنگِ اُحد کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی شہادت سے یتامیٰ کی پرورش کا جو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اُس پر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس مسئلے کو تم لوگ تعدّدِ ازواج کے طریقے سے حل کر سکتے ہو جو پہلے ہی سے تمھارے لیے جائز ہے۔ اِس طرح اِس آیت نے کوئی نئی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ پہلے سے جو اجازت عملاً چلی آرہی تھی اُس سے ایک خاص اجتماعی مسئلے کو حل کرنے میں مدد لینے کی تلقین کی ہے۔ البتہ نئی بات اس میں صرف یہ تھی کہ پہلے تعدّدِ ازواج غیر مقید تھا اور اب

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

اس کو زیادہ سے زیادہ چار کی حد کے ساتھ مقید کر دیا گیا۔ اس پس منظر سے جو شخص واقف ہو وہ کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ اس آیت میں تعدّدِ ازواج کی پہلی مرتبہ اجازت دی گئی تھی اور اس اجازت کو صرف اُس حالت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا جب کہ یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت پیش آئے۔

س: کیا آپ کے نزدیک یہ لازمی ہونا چاہیے کہ عقدِ ثانی کا ارادہ رکھنے والا شخص عدالت سے اجازت حاصل کرے؟

ج: شریعت نے عقدِ اوّل اور عقدِ ثانی و ثالث و رابع میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ ان سب کی کھلی اجازت ہے۔ اگر عقدِ اوّل کسی عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط نہیں ہو سکتا تو ثانی کیا، ثالث و رابع بھی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کی تجویزیں صرف اُسی صورت میں قابلِ غور ہو سکتی ہیں جب کہ پہلے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک سے زائد نکاح کرنا ایک بُرائی ہے جس کو اگر روکا نہ جا سکے تو کم از کم اس پر پابندیاں ہی عائد ہونی چاہییں۔ یہ نقطۂ نظر رومن لا کے فلسفۂ قانون کا ہے نہ کہ اسلام کے فلسفۂ قانون کا۔ اس لیے اسلامی قانون کی بحث میں ایسی تجویزیں لانا جن کا بنیادی تصور ہی اسلام کے تصور سے مختلف ہو اُصولاً بالکل غلط ہے۔

س: کیا آپ کے نزدیک یہ قانون ہونا چاہیے کہ عدالت یہ اجازت اس وقت تک نہیں دے سکتی جب تک اُسے یہ اطمینان نہ ہو کہ درخواست دہندہ دونوں بیویوں اور اُن کی اولاد کی اُس معیارِ زندگی کے مطابق کفالت کر سکتا ہے جس کے وہ عادی ہیں؟

ج: اُوپر کے جواب کے بعد یہ سوال آپ سے آپ خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز کی بعض کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ عدالت عقدِ ثانی کی اجازت صرف اُس صورت میں دے جب کہ ایک شخص دو بیویوں اور اُن کی اولاد کی کفالت کر سکتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص ایک بیوی اور اُس کی اولاد کی بھی کفالت نہ کر سکتا ہو اُسے نکاح کی کھلی چھٹی کیوں ملی رہے؟ کیوں نہ ہر شخص کے عقدِ اوّل کا معاملہ بھی عدالت کی اجازت سے مشروط ہو اور اُس کے لیے بھی یہ قید نہ لگا دی جائے کہ جب تک نکاح کا ہر خواہش مند عدالت کو اپنی مالی پوزیشن کے متعلق اطمینان نہ دلا دے اُس وقت تک کسی کو نکاح کی اجازت نہ دی جائے؟ پھر یہ عجیب بات ہے کہ محبت اور سنجوگ اور خاندانی زندگی کے لُطف و اطمینان کا ہر سوال نظر انداز کر کے صرف اس ایک سوال کو نکاحِ ثانی کے معاملے میں اہمیت دی گئی ہے کہ یہ کام کرنے والا دو بیویوں اور اُن کی اولاد کے مالی بار کا متحمل ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عقدِ ثانی غریب اور متوسط طبقے کے لیے تو ممنوع ہو، مگر اونچے طبقے کے لیے یہ حق پوری طرح محفوظ رہے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ کمزوری اس میں یہ ہے کہ عدالت صرف یہ دیکھ کر ایک شخص کو نکاحِ ثانی کی اجازت دے دے گی کہ وہ دو بیویوں اور اُن کی اولاد کا متکفل ہو سکتا ہے، حالانکہ محض متکفل ہو سکنا عملاً متکفل ہونے کے لیے کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ہمارے سامنے بکثرت مثالیں ایسی لوگوں کی موجود ہیں جو بڑی بڑی آمدنیاں رکھتے ہیں اور ایک بیوی کو نذرِ تغافل کیے رکھتے ہیں۔ عدالتوں کی اجازت کی قید ان خرابیوں کا آخر کیا سدِ باب کرتی ہے؟ ایسی خام تجویزوں کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم شریعت کے اِس قاعدے ہی پر اکتفا کریں کہ ایک شخص ایک سے زائد نکاح کرنے کے معاملے میں اپنی مرضی کا مختار ہو اور جس بیوی کو بھی اُس سے کسی نوع کی بے انصافی کا شکوہ ہو اُس کی دادرسی کے لیے عدالت کا دروازہ کھلا رہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

س کیا یہ قانون ہونا چاہیے کہ دوسری شادی کرنے والے کی کم از کم نصف تنخواہ پہلی بیوی اور اُس کی اولاد کو عدالت دلوائے؟ اور جو لوگ تنخواہ دار نہیں بلکہ دُوسرے ذرائع آمدنی رکھتے ہیں اُن سے عدالت ضمانت لے کہ وہ اپنی آمدنی کا کم از کم نصف پہلی بیوی اور اُس کی اولاد کو دیتے رہیں گے؟

ج یہ تجویز بالکل غلط ہے۔ ایک آدمی لازماً صرف اپنے ہی بال بچوں کا کفیل نہیں ہوتا، بلکہ والدین، چھوٹے بہن بھائی اور دُوسرے مستحق اعزّہ بھی بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جن کی اُنھیں خدمت اور کفالت کرنی ہوتی ہے۔ اِس صورت میں یہ ضابطہ بنا دینا کہ دُوسری شادی کرنے والے کی کم از کم نِصف آمدنی ضرور پہلی بیوی کو دلوائی جائے سراسر بے انصافی ہے۔ پھر اگر پہلی بیوی بے اولاد ہو اور دُوسری صاحبِ اولاد تو یہ کس اُصولِ انصاف کا تقاضا ہے کہ شوہر کی آدھی آمدنی بے اولاد بیوی کے لیے مخصوص کر دی جائے اور دُوسری بیوی اولاد سمیت نِصف میں گزارا کرے؟ شریعت ایسے اندھے ضابطے بنانے کے بجائے یہ قاعدہ مقرّر کرتی ہے کہ بیویوں کے درمیان شوہر خود عدل کرے اور اگر کسی بیوی کی طرف سے بے انصافی کی شکایت عدالت میں آئے تو قاضی اِس خاندان کے حالات کو دیکھ کر انصاف کی مناسب صورت تجویز کر دے۔

مَہر

س کیا آپ کے نزدیک یہ قانون بن جانا چاہیے کہ معاہدۂ ازدواج میں جو مَہر مقرّر کیا گیا ہے خواہ اُس کی مقدار کتنی ہی کثیر کیوں نہ ہو وہ شوہر کے لیے واجب الادا ہے؟

ج مَہر تو شرعاً ہے ہی واجب الادا چیز۔ اِس کے لیے الگ قانون بنانے کی کیا حاجت ہے؟ البتہ اگر اِس کا مطلب ایسا قانون بنانا ہے کہ ہر مقدارِ مَہر لازماً ہر حال میں واجب الادا ہو، تو یہ قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل وانصاف کے بھی خلاف۔ قرآن عورت کو مَہر معاف کرنے کا حق بھی دیتا ہے اور مَہر میں کمی قبول کرنے کا حق بھی۔ نیز اگر مَہر شوہر کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو، یا بعد میں کسی وقت شوہر کے مالی حالات ایسے ہو جائیں کہ وہ کسی طرح ایک گراں قدر مَہر ادا کرنے کے قابل نہ رہے، یا کسی عقدِ نِکاح میں ایسا مَہر بندھوا لیا گیا ہو جسے کوئی شخص بھی معقول نہ تسلیم کر سکتا ہو تو ایسی صورتوں میں عدالت یا پنچوں کے لیے مناسب رقم پر راضی نامہ کرا دینے کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے۔

س کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ مطالبۂ مَہر کے لیے ازرُوئے قانون کسی مدّت کی تحدید نہ ہو؟

ج مَہر کی وصولی کے لیے مدّت کا تعیّن اور عدمِ تعیّن فریقین کی باہمی قرارداد پر منحصر ہے۔ اِس معاملے میں قانون کو کسی مداخلت کی ضرورت نہیں۔

س اِس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر نِکاح نامے میں ادائے مَہر کی صُورت کا کوئی تعیّن نہ ہو تو نِصف مَہر معجّل (عند الطلب) اور نصف [دیگر[1]] مؤجّل (بعد انفساخِ نِکاح یا وفاتِ شوہر یا بصورتِ طلاق) شُمار ہو؟

1- تفہیمات میں یہاں لفظ 'غیر' لکھا ہے، مگر درست 'دیگر' ہے۔ دیکھیے: ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۵ء [مرتب]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج ایسی صورت میں سارا مہر عند المطالبہ واجب الادا ہونا چاہیے۔ البتہ اگر عدالت یہ دیکھے کہ مقدارِ مہر فی الواقع شوہر کی حیثیت سے بہت زیادہ رکھی گئی ہے تو وہ انصاف کو ملحوظ رکھ کر ادائیگی مہر کے لیے کوئی مناسب صورت تجویز کر سکتی ہے۔ اِس معاملے میں قانون بنا کر عدالتوں کے ہاتھ باندھ دینا ٹھیک نہیں۔

حضانت

س موجودہ قانون کی رُو سے بچوں کی حضانت کا حق ماں کو خاص عمروں تک حاصل ہے۔ یعنی لڑکا ہو تو سات سال اور لڑکی ہو تو بلوغ تک۔ حضانت کے لیے عمروں کا یہ تعین نہ قرآن میں ہے اور نہ کسی حدیث میں، بلکہ یہ بعض فقہا کا اجتہاد ہے۔ کیا آپ کے نزدیک اس میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے؟

ج اس معاملے میں صحیح بات یہ ہے کہ بچوں کا مفاد ہر دُوسری چیز پر مقدم ہے۔ ہر انفرادی مقدمے میں حالت کو دیکھتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ماں اور باپ میں سے جس کی حضانت بھی زیادہ موزوں نظر آئے اُسے ترجیح دی جائے۔ کسی ایک کے حق میں قانون بنا دینا مناسب نہیں ہے۔ البتہ قانوناً یہ لازم ہونا چاہیے کہ جس فریق کی حضانت میں بھی بچے دیے جائیں وہ دُوسری فریق سے اُن کے ملنے میں مزاحم نہ ہو۔ مشہور فقہا میں سے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی وہی ہے جو میں نے اُوپر عرض کی ہے۔

بیوی بچوں کا گزارا

س کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ کوئی شوہر کسی معقول وجہ کے بغیر بیوی کو گزارا نہ دے تو بیوی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ خاص 'ازدواجی و عائلی عدالت' میں اِس پر دعویٰ دائر کر سکے؟

ج جی ہاں!

(تفہیمات، سوم، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۶-۲۰۷)

نفقہ

اِس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی تو استطاعت رکھتا ہو، مگر نہ دے اور دُوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ اَمر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقے سے مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اِس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطورِ خود اپنے نفقہ کا اہتمام کرے۔ خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے، خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر بخلاف اِس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطورِ خود طلاق واقع کر دینے کا حق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ بعض علمائے احناف نے مالکیہ کے اس فتوے کو اختیار کرنا پسند کیا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی ہو۔ یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مُبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآنِ مجید کی رُو سے نفقہ عورت کا حق ہے، جس کے معاوضے ہی میں اُس پر شوہر کو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے ہیں، جب کوئی شخص قصداً اِس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقدِ نکاح میں بند ھے رہنے پر مجبور کیا جائے۔ چیز لے کر اُس کا بدل اور مال لے کر اُس کی قیمت ادا کرنے سے جو شخص انکار کر دے وہ آخر اس چیز اور اُس مال کا مستحق کیسے رہ سکتا ہے؟ جب تک عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے اُس کی پرورش کا ذمہ دار اُس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت میں اُس کو خود روزی کمانے یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصولِ قرض کی غیر ممکن الحصول کوشش کرنے کی تکلیف آخر کس اُصولِ انصاف کی بنا پر دی جائے؟

دوسری صورت میں [یعنی جب شوہر نفقہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو] حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی اور اُس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گزر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اُس شخص پر واجب ہے جس پر اُس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرادی جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدّت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ صرف تین دِن کی مہلت دیتے ہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرادی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآنِ مجید کا وہ قاعدہ جو وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ میں بیان کیا گیا ہے ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دارقطنی اور بیہقی میں نبی ﷺ کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدمِ نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے۔ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین رحمہم اللہ میں سے سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی فتویٰ ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔

بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اِس آیت میں سے ہے کہ وَمَنۡ قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ فَلۡيُنۡفِقۡ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ‌ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰٮهَا ؕ (الطلاق ۶۵:۷) جس کو نپا تلا رزق دیا گیا ہو اُس کو اپنی اسی استطاعت کے مطابق نفقہ دینا چاہیے جو اللہ نے اُسے دی ہے۔ اللہ کسی متنفس کو اس سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا جس کی قدرت اُس نے اُسے عطا کی ہو۔ لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لیے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گزر کرنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے اور ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ بہ رضا ورغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کو ناپسند کرے تو نہایت قابلِ تعریف ہے، لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانونِ اسلام کے عدل وانصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے بلند مقام پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلے میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب امام مالک کا ہے، جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

(حقوق الزوجین، جنوری ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۳-۱۲۵)

(س) موجودہ کریمنل پروسیجر کوڈ (ضابطہ فوجداری) کی دفعہ ۴۸۸ کے مطابق بیوی عدالت فوجداری میں نفقے کا دعویٰ کرسکتی ہے لیکن عدالت فوجداری زیادہ سے زیادہ سو روپے ماہانہ دلوا سکتی ہے، کیا آپ اس مقدار کے اضافے کے حق میں ہیں؟

(ج) جی ہاں۔ عدالت کو یہ حق ہونا چاہیے کہ زوجین کی حیثیت کے مطابق نفقہ دلوائے۔ کسی خاص مقدار کا تعین از روئے قانون کردینا مناسب نہیں۔

(س) کیا آپ اس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایک بیوی گذشتہ تین سال تک کے نفقے کا مطالبہ کرسکے؟

(ج) تین سال کی قید صحیح نہیں ہے۔ جب سے شوہر نے بیوی کو نفقہ سے محروم کر رکھا ہو اسی وقت سے اس کا نفقہ دلوانا چاہیے۔

(تفہیمات، سوم، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۷-۲۰۸)

مقدمہ عدالت میں آنے سے پہلے کا نفقہ

قرآنِ مجید اور حدیثِ رسول ﷺ میں (میرے علم کے مطابق) اس مسئلے کے متعلق کوئی حکم نفی یا اثبات کی شکل میں نہیں دیا گیا ہے کہ عورت کو مقدمہ عدالت میں لانے سے پہلے کا نفقہ دلوایا جائے گا یا نہیں۔ اس لیے لامحالہ اس مسئلے کا فیصلہ اسلام کے عام اصولوں اور عقلِ عام کی بنا پر اجتہاد کے طریقے سے ہی کیا جائے گا۔ نفقہ کے متعلق شریعت میں ایک اصولی بات تو طے کردی گئی ہے کہ عورت کا نفقہ اس کے شوہر کے ذمے ہے، لیکن کوئی خاص مقدار نفقہ مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ قاعدہ بیان کردیا گیا ہے کہ ہر شخص اپنی وسعت واستطاعت کے مطابق نفقہ دے۔ اب یہ بات کہ مقدمہ دائر ہونے کے بعد عدالت عورت کو کتنا نفقہ دلوائے، اس کو طے کرنے کے لیے عدالت یہ دیکھے گی کہ اس وقت شوہر کی استطاعت کیا ہے اور عورت کی ضروریات کم سے کم کتنے نفقہ میں پوری ہوسکتی ہیں اور دونوں پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے عدالت حکم دے گی کہ مرد اس قدر نفقہ ادا کرے، لیکن سابقہ نفقہ کو اس کے ذمے واجب قرار دینے کے لیے اس کی مقدار کا تعین آخر کس طرح ہوگا۔ خصوصاً جب کہ کسی طویل مدت تک عورت نے عدالت سے رجوع نہ کیا ہو؟ اگر پہلے کسی ثالثی فیصلے، یا کسی عدالتی فیصلے، یا عورت اور مرد کے درمیان کسی ثابت شدہ معاہدے کے رو سے ایک مقدار نفقہ متعین ہوچکی ہو تو بلاشبہ اس کے مطابق اس پوری مدت کا نفقہ عورت کو دلوایا جائے گا جس میں مرد نے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کوئی نفقہ نہیں دیا ہے۔ یا معینہ مقدار سے کم دیا ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی مقدار پہلے کی طے شُدہ نہ ہو تو سابقہ ادوار کے بارے میں یہ فیصلہ کیسے کیا جائے گا کہ شوہر کی مالی حالت مختلف زمانوں میں کیا رہی ہے اور قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کے لحاظ سے ان مختلف زمانوں میں عورت کی ناگزیر ضروریات کے لیے کتنی رقم کافی ہو سکتی تھی؟ اس صورت میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر شوہر کی زیادتی ثابت ہو تو آیندہ کے لیے اس پر ایک مقدار نفقہ واجب کرنے کے ساتھ سابقہ ادوار کے لیے عدالت کوئی مناسب رقم یک مُشت بطورِ ہرجانہ لازم کر دے۔

(مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دوم، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۱۹۹-۲۰۱)

س کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر بیوی نے نِکاح نامے میں معیادِ نفقہ کے متعلق خاص شرط لکھوالی ہو تو اُسے محض مدتِ عدّت تک ہی نہیں، بلکہ مدتِ مشروطہ تک نفقہ ملے؟

ج نِکاح کے وقت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ برادری اور خاندان کے دباؤ سے، یا لحاظ مروّت کی بنا پر غیر معقول شرائط تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ اِس طرح کی شرطوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ نفقہ کا جائز حق ایک عورت کو جس حد تک حاصل ہے اُس سے زیادہ کی کوئی شرط اگر معاہدۂ نِکاح میں لکھوالی گئی ہو تو اُسے ازرُوئے قانون نافذ نہیں ہونا چاہیے۔

تولیتِ املاک

س کیا آپ اِس سے متفق ہیں کہ باپ کی عدمِ موجودگی میں عدالت ماں کو بچوں کی املاک کی متولیہ قرار دے بشرطیکہ عدالت کے نزدیک اِس کا تقرر بچوں کی بہبُود اور املاک کے تحفظ کے منافی نہ ہو؟

ج یہ اُس صورت میں ہونا چاہیے جب کہ بچوں کے مفاد کی حفاظت کے لیے ماں کو متولی بنانا ضروری ہو، مثلاً خاندان میں کوئی ایسا مرد موجود نہ ہو جو متولی بن سکتا ہو، یا موجود تو ہو مگر اُس کے ہاتھ میں تولیت دینے سے بچوں کے مفاد کو خطرہ ہو۔

س کیا آپ یہ قانون بنانے کے حق میں ہیں کہ نابالغوں کی املاک کے متولی کو یہ اختیار حاصل نہ ہو کہ وہ عدالت کی اجازت کے بغیر املاک کو فروخت یا رہن کر سکے؟

ج یہ تجویز بالکل مناسب ہے۔

(تفہیمات سوم، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۸-۲۰۹)

وراثت اور وصیت

س (۱) کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ اگر پاکستان کے کسی حصے میں ابھی تک وراثت اور وصیت کے بارے میں شرعی قوانین پر عمل نہیں ہو رہا تو بلا تاخیر ایسا قانون وضع کیا جائے کہ اِس بارے میں شرعی قوانین ہر حصۂ ملک پر عائد ہوں؟

(۲) موجودہ قانونی ضابطے کی پیچیدگی کے پیشِ نظر عورتوں کی مجبوریوں کو رفع کرنے کے لیے کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ جب کبھی وراثت کے معاملے میں عورت مدعیہ ہو تو معمولی سول کورٹ اِس کا مقدمہ عجلتِ انفصال کے لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ازدواجی وعائلی عدالت میں منتقل کردے؟

(ج) دونوں تجویزیں مناسب ہیں۔

(س) کیا قرآنِ کریم میں کوئی نص صریح موجود ہے یا کسی صحیح حدیث میں یہ تعلیم ملتی ہے کہ یتیم پوتے، پوتی یا نواسے نواسی کو بہرحال محروم الارث کردیا جائے؟

(ج) یہ مسئلہ اُن اُصولی احکام سے خود بخود نکلتا ہے جو قرآن وحدیث میں تقسیمِ میراث کے متعلق دیے گئے ہیں اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں ردّ وبدل کرکے یتیم پوتے پوتی یا نواسے نواسی کو وارث بنانے کی جو صورت بھی تجویز کی جائے اُس سے قانونِ میراث کا وہ سارا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے جو قرآن وسُنّت کے اُصولی احکام پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام شروع سے آج تک اس پر متفق رہے ہیں۔ یہاں چونکہ اس مسئلے کی پوری توضیح ممکن نہیں ہے، اس لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ جماعت اسلامی کے شائع کردہ پمفلٹ پوتے کی وراثت کا مسئلہ ص۹-۴۰ ملاحظہ فرمائیں۔

(س) کیا ایسا قانون بنانا جائز ہوگا کہ ایک مسلمان کسی جائیداد کو کسی کے نام اس شرط پر منتقل کردے کہ جسے منتقل کی گئی ہے اُس کی وفات کے بعد وہ جائداد منتقل کرنے والے یا اُس کے ورثا کی طرف عود کرآئے گی؟

(ج) اسلامی فقہ میں اس کے لیے عُمریٰ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور اس کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جو جائداد اس طرح منتقل کی گئی ہو وہ پھر منتقل کرنے والے یا اس کے ورثا کی طرف عود نہیں کرسکتی خواہ انتقال کی دستاویز میں صریح طور پر یہ شرط درج ہی کیوں نہ کردی گئی ہو کہ وہ مُعمَر کی وفات کے بعد مُعمِر یا اُس کے ورثا کو واپس مل جائے گی۔ بخلاف اس کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جو جائداد مُعمَر کو صرف حینِ حیات کے لیے دی گئی ہو وہ آپ سے آپ اس کی وفات کے بعد مُعمِر یا اُس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوجائے گی۔ اِلّا یہ کہ مُعمِر نے تصریح کردی ہو کہ وہ اسے اور اس کے وارثوں کو دی گئی ہے۔ اس بارے میں احادیث زیادہ تر پہلے ہی قول کے حق میں ہیں اور غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔ جس جائداد کے ساتھ ایک شخص کا مفاد صرف حینِ حیات تک وابستہ ہو وہ آخر عمر میں آکر اس سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتا ہے اور اس کی اولاد بھی جانے والی چیز سے غفلت برتنے لگتی ہے۔ اس طرح حینِ حیات کا ہبہ ضیاعِ مال کا موجب ہوتا ہے۔ اور جب اصل مالک یا اس کی اولاد کو جائداد تباہ شدہ حالت میں ملتی ہے تو اسے بھی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے شریعت کا منشا یہ ہے کہ ہبہ کیا جائے تو مستقل طور پر کیا جائے ورنہ حینِ حیات کے ہبہ سے نہ کرنا بہتر ہے۔ اس منشا کی توضیح اس حدیث سے ہوتی ہے کہ أَمْسِكُوا عَلَيْكُمْ أَمْوَالَكُمْ وَلَا تُفْسِدُوهَا فَإِنَّهُ مَنْ أَعْمَرَ عُمْرَى فَهِيَ لِلَّذِيْ أُعْمِرَهَا حَيًّا وَّمَيِّتًا وَ عَقِبِهِ (احمد۔ مسلم) ''اپنے اموال اپنے ہی پاس رکھو اور اُن کو برباد نہ کرو۔ جو شخص کسی کو حینِ حیات کے لیے کچھ دے تو وہ چیز اُسی کی ہے جس کو وہ دی گئی، اس کی زندگی میں بھی اور اُس کے مرنے کے بعد بھی۔ اور وہ اُس کے بعد اُس کے پس ماندوں کے پاس رہے گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انفساخِ نکاح بذریعہ عدالت

س: کیا ایسا قانون وضع ہونا چاہیے کہ اگر عورت انفساخِ نکاح کا مطالبہ کرے اور عدالت کی رائے میں قصور وار شوہر ہو تو طلاق حاصل کرتے ہوئے عورت سے نہ مہر واپس دلوایا جائے اور نہ دُوسری چیزیں جو خاوند اِسے دے چکا ہو؟

ج: خُلع کے شرعی قواعد میں اِس کی گنجایش موجود ہے۔ اِس لیے میں اِس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ شوہر کے قصور کا جدید تصورِ مغرب سے برآمد نہ کیا جائے، بلکہ اِسی تصور پر قناعت کی جائے جو اِسلام میں پایا جاتا ہے۔

س: قانون انفساخِ نکاح کے کلاز (۳) سیکشن (۳) میں سات سال کی قید کی بنا پر نِکاح فسخ ہوسکتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ اِس مدت میں کمی کر کے چار سال کر دیا جائے؟

ج: طویل قید کی صورت میں فسخِ نِکاح کا قانون کچھ صحیح نہیں ہے۔ نیز عورت کو یہ حق دینے سے اصل مسئلہ حل بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا مزاج یہ نہیں ہے کہ شوہر اگر لمبی مدت کے لیے قید ہو گیا ہو تو بیوی فسخِ نِکاح کا مطالبہ لے کر عدالت میں پہنچ جائے۔ خصوصاً صاحبِ اولاد عورت تو مشکل ہی سے اِس کا خیال کر سکتی ہے۔ اس لیے کثیر التعداد عورتیں اِس قانون کے ہوتے ہوئے بھی اِس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائیں گی اور ان کے مصائب جوں کے توں رہیں گے۔ میرے نزدیک اِس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ جیل کے قواعد میں حسبِ ذیل تین اصلاحات کی جائیں۔

ا: چار سال یا اِس سے کم مدت کے قیدیوں کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کم از کم پندرہ دِن کے لیے پیرول پر گھر جانے کی اجازت دی جایا کرے۔

ب: چار سال سے زیادہ مدت کے قیدیوں کو جیل میں رکھنے کی بجائے اُن بستیوں میں رکھا جائے جو طویل المیعاد قیدیوں کے لیے مخصوص ہوں اور وہاں اُنھیں اپنے بال بچوں کی ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے۔

ج: قیدیوں سے جیل میں جو کام لیا جائے اُس کی اُجرت بازار کی شرحوں کے مطابق اُن کے حساب میں جمع کی جائے اور وہ یا اُس کا ایک مناسب حصّہ اُن کی بیویوں اور بچوں کے نفقہ میں ادا کیا جاتا رہے۔

ازدواجی اور عائلی عدالت

س: (۱) کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ ہر کمشنری میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے مرتبے کا جج ایسی عدالتوں میں مقرر کیا جائے جہاں ازدواجی و عائلی مقدمات دائر ہوں؟

(۲) کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسے مقدمات جو ازدواجی و عائلی قوانین کے تحت آئے ہوں اور جہاں عورت مدعیہ ہو فقط ایسی مخصوص عدالتوں میں دائر ہوسکیں؟

(۳) کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالتوں کے ضوابط موجودہ دیوانی اور فوجداری ضوابط سے الگ ہوں اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانون وضع کر دیا جائے کہ ایسی عدالت ہر مقدمے کا فیصلہ تین ماہ کے اندر اندر کر دے؟

(۴) کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالتوں میں کورٹ فیس یا دُوسرے عدالتی اخراجات نہ ہوں؟

(۵) کیا آپ اِس کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالتوں میں فریقین اپنے کسی نمایندے یا اقارب کے ذریعے پیروی کر سکیں اور کسی باقاعدہ سند یافتہ وکیل کا ہونا لازمی نہ ہو؟

(۶) کیا آپ اِس تجویز کے حق میں ہیں کہ کم از کم ایک مَرد اور ایک عورت بطورِ مشیر جج کے ساتھ ہوں؟

(۷) کیا آپ اِس کے حق میں ہیں کہ ایسی عدالت مختلف اضلاع میں باری باری سے اپنا اجلاس طلب کرے؟

(۸) کیا آپ اِس کے حق میں ہیں کہ فریقین کو ایک سے زیادہ اپیل کی اجازت نہ ہو؟

(۹) کیا آپ اس کے حق میں ہیں کہ اپیل براہِ راست ہائی کورٹ میں ہونی چاہیے اور اپیل کا فیصلہ بھی تین ماہ کے اندر ہو جانا چاہیے؟

ج: نمبر ۱ تا ۹ کا جواب یہ ہے کہ یہ سب تجاویز بالکل درست ہیں۔

س: ایسی عدالت کے فیصلے سے واجب الادا رقوم کی وصولی اور دیگر احکام کی بجا آوری کے لیے آپ کیا مناسب تجاویز پیش کرتے ہیں؟

ج: اس کے لیے وہی طریقہ ہونا چاہیے جو عام عدالتی فیصلوں کے نفاذ اور سرکاری مطالبات کی وصولی میں استعمال ہوتا ہے۔

س: ایسے مقدمات میں اخراجاتِ متفرقہ کو پورا کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: جو فریق زیادتی کرنے والا ثابت ہو، یا جس نے بے جا مقدمہ بازی کر کے عدالت اور فریقِ ثانی کا وقت ضائع کیا ہو اُس پر مناسب خرچہ ڈالا جائے جس کا ایک حِصّہ فریقِ ثانی کو ملے اور ایک حِصّہ عدالت کے مصارف میں وضع کیا جائے۔ علاوہ بریں حدِ اعتدال سے زیادہ مقدار کے مَہر کا دعویٰ اسٹامپ ڈیوٹی کے بغیر قبول نہ کیا جائے اور مَہر جتنا حَد سے متجاوز ہو اُسی تناسب سے اسٹامپ ڈیوٹی زیادہ بھاری لگائی جائے۔ یہ تدبیریں معاشرے کی اصلاح میں بھی مددگار ہوں گی اور ان سے عدالت کا پورا خرچ نہیں تو اِس کا ایک معتدبہ حِصّہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ کچھ کمی اگر رِہ جائے تو اُسے سرکاری خزانے سے ادا ہونا چاہیے۔

(تفہیمات، سوم، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۸-۲۵۱)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہشتم

اِسلامی قانونِ ازدواج اور مزعومہ ترقی یافتہ قوانین کا تقابل

تعرف الاشیآء باضدادھا، چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اسلامی قانونِ ازدواج کی جو تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں اُن کو دیکھ کر پوری طرح اس قانون کی شانِ کمال کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے مقابلے میں دُنیا کے اُن قوانین کا مطالعہ نہ کیا جائے جن کے متعلق ترقی یافتہ قوانین ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اِس مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسان جب خود اپنا قانون ساز بنتا ہے تو کس قدر ٹھوکریں کھاتا ہے۔

اسلامی قانون میں اعتدال اور توازن

اِسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اِس کے اُصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کا ایک بلند ترین نصب العین پیشِ نظر رکھتا ہے تو دُوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دُوسری طرف افراد کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دُوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اُوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالمِ واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا کوئی قاعدہ اور کوئی حُکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان سب کا اسلام میں، فطری حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے اور اُن کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دُوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو برس سے یہ قانون مختلف زمانوں میں مختلف تمدنی حالات اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے اور کہیں کسی شخص یا اجتماعی تجربے نے اِس کے کسی اساسی حُکم کو غلط یا قابلِ ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجودِ سعیِ بلیغ، اِس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اِس کے لگ بھگ بھی پہنچتا ہو۔

الٰہی اور انسانی قانون کا فرق

یہ کیفیت جو اِسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صِرف الٰہی حِکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے لازمی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تقیدات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے۔ حال و مستقبل پر یکساں نظر رکھے، بالفعل اور بالقوّۃ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے۔ خود اپنی اور اپنے تمام ابنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے اور اپنے جذبات اور طبعی رُجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل و مناسبت کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں اُن میں صحیح توازن نہیں ہوتا، کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے، کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے، کہیں اشخاص کے حقوق اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا، کہیں فرد اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے، غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر متغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو اُن میں ترمیم کردے یا اعتقاداً اُن کا متبع رہ کر عملاً اُن کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الٰہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج تک اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں اور شپرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اِسلامی قانون کے جن احکام اور اُصولوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کیے جاتے تھے اور اُن کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج اُن کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی ناقابل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے اور ہوتی جارہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا، وہی صحیح تھا۔ اُس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کیے تھے وہ سب غلط اور ناقابلِ اتباع نکلے۔ اگرچہ عالمِ تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے اور زبانیں اب بھی اُن کی ناکامی کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ مگر عملاً دُنیا اُن قوانین کو توڑ رہی ہے جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابلِ ترمیم سمجھتی تھی اور آہستہ آہستہ ان اُصول و قواعد کی طرف رُجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کیے تھے، لیکن بعد از خرابی بسیار۔

عیسائیت میں مسئلہ طلاق

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلے کو لے لیجیے جس پر ابھی چند سال پہلے تک مسیحی دُنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جواب بن نہ آتا تھا، مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازدواج کے مقدس رِشتے کو ناقابلِ انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق وخُلع و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظامِ تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مُضمر تھے۔

مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ ''جسے خدا نے جوڑا اُسے آدمی جُدا نہ کرے'' (متی ۱۹:۶)

مگر مسیحیوں نے نبی علیہ السلام کے اس قول کا منشا نہ سمجھا اور اُسے اخلاقی ہدایت کے بجائے قانون ازدواج کی اساس بنا لیا۔ انجام کیا ہوا؟ مسیحی دُنیا صدیوں تک اِس ناقابلِ عمل قانون کے خلاف حیلوں اور مکر و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی۔ پھر خلاف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ورزی قانون کی عادت بدنے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی حدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں اُن کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا۔ آخر کار انسانوں نے مجبور ہو کر اس قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں جسے غلطی سے وہ خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ اصلاحی قدم اس وقت اُٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پیروانِ مسیح علیہ السلام کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی کسی چیز کا بھی احترام باقی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں کی بدولت مسیحی دُنیا میں طلاق اور فسخ وتفریق کا ایک طوفان اُمڈ آیا، جس کی شدت سے خاندانی نظام کی مقدس دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جارہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۷۱ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں وہاں ۱۹۳۳ء میں چار ہزار سے اُوپر تفریقیں ہوئیں۔ یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۹ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا۔ امریکہ جہاں ۱۸۸۶ء میں ۲۵ ہزار تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۱ ہزار مقدس رشتے قطع کر لیے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ۱۵ شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم وبیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح علیہ السلام نے جو تعلیم دی تھی، اسی سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۲۷) جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یقیناً وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی سخت دلی اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لیے کہا تھا کہ

جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسرا بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔ (متی ۱۹:۹)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی غرض کے لیے اس سے زیادہ جچے تُلے الفاظ میں طلاق کو اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھیرایا ہے۔[۱]

مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اخلاق کی تعلیم کے لیے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انھی کو ہمیشہ لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلّم اخلاق ہی نہ تھے، بلکہ صاحبِ شریعت بھی تھے۔ اس لیے آپ نے اُصولِ اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اُصولوں کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اُصولِ اخلاق ومقتضیات فطرت انسانی کے درمیان کس طرح توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مسیح علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے، بلکہ اجرائے شریعت کی نوبت آنے سے پہلے ہی دُنیا میں اُن کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کے ارشادات میں اخلاق کے ابتدائی اُصولوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زندگی کے عملی مسائل پر اُن اُصولوں کا صحیح انطباق اگر ہو سکتا تھا تو موسوی شریعت کی روشنی ہی میں ہو سکتا تھا۔ مگر مسیحی یہ سمجھے اور سینٹ پال نے اُن کو یہ سمجھایا کہ اُصولوں کو پالینے کے بعد اب ہم الٰہی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہ خدا اور اُس کے رسول کا نہیں بلکہ 'چرچ' کا کام ہے کہ ان اُصولوں کی بنا پر خود

۱- التلخیص الحبیر لابن حجر عسقلانی، ج ۳، ص ۲۰۵، اصل الفاظ ہیں: البغض المباح الی اللہ الطلاق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اُس کے متبعین کو ہمیشہ کے لیے گمراہی میں ڈال دیا۔ مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصولِ دین بنائے تھے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی قومیں ان اُصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مسیح علیہ السلام نے طلاق کی جو بُرائی کی تھی اُس میں 'حرام کاری' کا استثنا کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مُطلقاً بُری چیز نہیں، بلکہ سببِ جائز کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اسے اُوپر والی آیت " جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جُدا نہ کرے" سے متعارض سمجھ کر بعض نے تو یہ رائے قائم کر لی کہ یہ استثنا بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ 'حرام کاری' کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق تو کرا دی جائے مگر رشتۂ نکاح بدستور قائم رہے۔ یعنی دونوں میں سے کسی کو بھی دُوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دُنیا اسی پر عمل کرتی رہی۔ من جملہ دُوسرے قوانین کے یہ قانون بھی مسیحی قوموں کے اندر بداخلاقی کے رواج کا بہت کچھ ذِمہ دار ہے۔

لُطف یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اُصولوں پر قانون سازی کا ادعا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (judicial separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دُوسرے سے جُدا کر دیا جائے مگر دونوں نکاحِ ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔ کلیسائے رُوم کے مذہبی قانون (cannon law) میں مذکورہ بالا اُصول کی بنا پر قواعد بنائے گئے تھے اُن کی رُو سے طلاق (divorce) یعنی رشتۂ نکاح کا کامل انقطاع جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہو، قطعاً ممنوع تھا۔ البتہ تفریق کے لیے چھ صورتیں تجویز کی گئی تھیں۔

(۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری۔ (۲) نامردی۔ (۳) ظالمانہ برتاؤ۔ (۴) کفر۔ (۵) ارتداد۔ (۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارۂ کار تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ زوجین ایک دُوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ تجرّد کی زندگی بسر کریں۔ کون صاحبِ عقل اس چارۂ کار کو مطابقِ عقل کہہ سکتا ہے؟ دراصل یہ کوئی قانونی چارۂ کار نہ تھا، بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے لوگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے اور اگر کسی قضا کے مارے ہوئے جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی تو اُسے راہبوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مُبتلا رہنا پڑتا تھا۔

اس شدید اور ناقابلِ عمل قانون سے بچنے کے لیے مسیحی علما نے بہت سے شرعی حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر 'چرچ' کا قانون ایسے بدنصیب زوجین کا نکاح فسخ کر دیتا تھا۔ من جملہ ان کے ایک حیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین نے مدت العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا وہ بلا ارادہ اُن سے سرزد ہو گیا تھا، ورنہ دراصل ان کا مقصود محض ایک محدود

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مدت کے لیے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا تھا (یعنی متعہ) تو اس صورت میں مذہبی عدالت فسخِ نکاح، یا بالفاظ صحیح تر بطلانِ نکاح کا اعلان کردے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رُو سے 'بطلانِ نکاح' کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا۔ اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور اِن سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دُوسرا قانونی چارۂ کار پہلے سے بھی ذلیل تر تھا۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (orthodox eastern church) نے، جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں، نسبتاً ایک بہتر اور قابلِ عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بندِ نکاح سے زوجین کو حسبِ ذیل وجوہ کی بنا پر آزاد کیا جاسکتا ہے:

(۱) زنا اور اس کے مقدمات۔ (۲) ارتداد۔ (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو قسیس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لیے وقف کرنا۔ (۴) بغاوت۔ (۵) نشوز۔ (۶) نامردی۔ (۷) جنون۔ (۸) برص، جذام۔ (۹) طویل مدت کے لیے قید ہونا۔ (۱۰) نفرت باہمی یا شدید ناموافقت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے، وہ کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لا چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کردیا گیا ہے کہ رشتۂ نکاح بجز موت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لیے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دُوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے۔ ۱۹۱۲ء کے رائیل کمیشن کی سامنے بشپ گور (bishop gore) نے مشرقی کلیسا کی فقہ سے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا مقلد ہے۔ ۱۹۳۰ء کی لیمبتھ کانفرنس (lambeth conference) میں بالفاظِ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح نہیں پڑھ سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (jiont comittee of convocation) متفق ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراضِ خبیثہ میں مبتلا ہو یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اس نے شوہر سے اپنے حمل کو مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آئے تو نہ عورت کے لیے مذہبی حیثیت سے کوئی چارۂ کار ہے نہ مرد کے لیے۔

جدید قوانین ازدواج میں طلاق

یہ تو تھا مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک پے در پے بڑے بڑے علما اور فقہا پیدا ہوئے مگر ابتدا میں اُن کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اُس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہوگئی تھی اُس کا اثر اُن کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ امتدادِ زمانہ، تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقاء، انسانی فطرت کا مطالعہ، سینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے اور دُوسرے بہتر قوانین کے نظائر، غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کرسکیں اور ہزار برس کی طویل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقشے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر اُن روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعینِ قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجیے، جنھوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لیے خود اپنے علم کے بل بوتے پر ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

انقلابِ فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا اور اس نے دُوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور اُن کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دَور میں جب آزاد تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہلِ فرانس نے اُس قانون کے نقائص کو محسوس کیا اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دِین کسی طرح اِس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کیے جا سکتے، سرے سے اِس کا جوا ہی اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا (۱۷۹۲ء)۔ اس کے بعد یہی ہوا دُوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریلیا، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ وغیرہ نے بھی مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جُداگانہ قوانین نِکاح و طلاق وضع کر لیے جن میں قانونی تفریق اور فسخ کے علاوہ طلاق کے لیے بھی گنجایش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک جمِ غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہو جانا براہِ راست نتیجہ ہے اُس تنگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علما ایک ناقابلِ عمل خلافِ فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کی جبراً محض مذہب کی طاقت سے مسلّط رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا، محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا، لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابلِ ترمیم قرار دیا۔ اُنھوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں اور خلافِ عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا، محض اِس لیے کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمہ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے اُن کا ایمان سلب نہ ہو جائے، حتیٰ کہ اُنھوں نے خود اپنے دِین کے ایک دُوسرے فقہی مذہب سے بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی، نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ ''ہم مغربی چرچ کے مقلد ہیں''۔ مذہبی پیشواؤں کے اس طرزِ عمل نے مغربی قوموں کے لیے بجز اس کے کوئی چارۂ کار باقی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابلِ اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانونِ ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے، دراصل یہی پادریانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد و دہریت اور لامذہبی کی طرف دھکیل دھکیل کر لے گئی ہے۔

مذہبی قانون سے آزاد ہو جانے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اَسی سال کے اندر جو ازدواجی قوانین وضع کیے گئے ہیں اُن کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں دماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصّہ لیا ہے، اور تجربات کی روشنی میں پے در پے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اِن کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سکا ہے جو عرب کے ایک اُمّی کے پیش کیے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دِل ودماغ کو اُن تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو اُنھیں رومن چرچ کے ابتدائی بانیوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجیے، ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا، طلاق جس کے بعد زوجین نکاحِ ثانی کے لیے آزاد ہوں، اُس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورہ بالا دو وجوہ کے ساتھ ایلا (یا انقطاعِ تعلق زن وشو)(desertion) کو بھی ایک جائز وجہِ تفریق قرار دیا گیا، بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اِسی قانون میں طلاق (یعنی عُقدۂ نِکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا، مگر اس کے لیے لازم کر دیا گیا کہ مَرد عدالت سے رُجوع کرے، بطورِ خود وہ طلاق نہیں دے سکتا۔ اور اِسی طرح عورت کے لیے بھی لازم کیا گیا کہ اگر وہ طلاق لینا چاہے تو گھر کے گھر ہی میں مَرد سے معاملہ طے نہیں کر سکتی، بلکہ ہر حال میں اُسے بھی عدالت سے ہی رُجوع کرنا ہوگا۔ پھر عدالت کے لیے طلاق کی ڈگری دینے کی صِرف ایک ہی صورت رکھی گئی اور وہ یہ کہ اگر مَرد طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرتکبِ زنا ہونا ثابت کرے اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شَوہر کے ارتکابِ زنا اور اِس کے ساتھ ہی ظالمانہ برتاؤ یا نشوز کا بھی ثبوت دے۔ اِس طرح گویا عورتوں اور مَردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دُوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہرحال اُن کو ایک دُوسرے پر زنا کا الزام ضرور لگانا پڑے گا اور ایک کھلی عدالت میں اِس کا ثبوت دے کر ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو داغ دار بنا دینا ہوگا۔ اِس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا۔ عدالتوں کو سوسائٹی کے تمام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنا دیا اور پھر عدالت ہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت گویا بداخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید برآں اِس قانون نے شَوہروں کو دَیُّوثی کی بھی تعلیم دی، کیونکہ اِس میں شَوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔ ہرجانہ یعنی بیوی کی عِصمت کا معاوضہ!! تمتّعِ ناجائز کی قیمت، جو قُرمساقوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے۔

۱۸۶۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نِکاح توڑنے کے ساتھ ساتھ خطا کار شَوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے۔ ۱۹۰۷ء کے قانون میں شَوہر کے خطا کار ہونے کی شرط اُڑا دی گئی اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلّقہ عورت کے نفقہ کی ذِمّہ داری ڈال دے۔ یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانب داری ہے اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ جب عورت اور مَرد کی درمیان کوئی رِشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مَرد سے نفقہ دلوانا درآنحالیکہ اِس نفقہ کے بالمقابل مَرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اِس کو مبنی برانصاف کہا جا سکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شَوہر کے ظُلم وستم کی وجہ سے اُس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے اور اُس سے الگ رہے تو عدالت شَوہر کو اُس کے پاس جانے سے روک دے گی اور اُسے نفقہ دلوائے گی اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے بُرے برتاؤ یا تغافل کے سبب سے زنا کی مرتکب ہو تو اُس کے خلاف طلاق کے لیے شوہر کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہوگا۔ ذرا اس کے معنی پر غور کیجیے۔ شوہر کا ظلم ثابت کر کے عورت اس سے الگ جا رہی ہے، شوہر کو پاس نہ پھٹکنے دے، خرچ کے لیے روپیہ اُس سے تلے اور زندگی کا لُطف دوستوں سے اُٹھائے، پھر اگر شوہر ایسی عورت سے پیچھا بھی چھڑانا چاہے تو نہ چھڑا سکے۔ یہ ہے وہ قانون ازدواج جو اُنیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کی پے در پے محنتوں سے مرتب کیا تھا۔

۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے تین سال کی محنت کے بعد ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش۔ اِس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

۱- اسبابِ طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے، یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے، اُنھی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اُس سے طلاق لے سکے۔

۲- طلاق کے سابق وجوہ میں حسبِ ذیل اضافہ تجویز کیا گیا:

تین سال تک چھوڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابلِ علاج جنون جب کہ اُس پر پانچ برس گزر چکے ہوں۔ شرابی پن[1] کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی اُمید نہ رہی ہو۔ وہ قید کی سزا جو سزائے موت سے معاف کر کے دی گئی ہو۔

۳- شرابی پن کی بنا پر تین سال کے لیے زوجین میں تفریق کرائی جائے اور اگر اُس مدت میں یہ لت نہ چھوٹے تو ضرر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

۴- نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراضِ خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور وہ دُوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اُس نے حمل مخفی رکھا ہو تو اُس کو فسخِ نکاح کے لیے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

۵- مقدماتِ طلاق کی رپورٹیں، دورانِ مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں عدالت روداد کے جن حصّوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف اُنھی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو جو سب سے زیادہ نامعقول تھی، قبول کر کے ۱۹۲۳ء کے قانونِ معاملاتِ ازدواج (matrimonial cases act) میں شائع کیا گیا۔ باقی جتنی تجویزیں تھیں اُن میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں دی گئی ہے کیونکہ کنٹربری کے اُسقفِ اعظم اور بعض دُوسرے بااثر لوگ اُن سے اختلاف رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تفقّہ کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ وہ عورت اور مرد کے ارتکابِ زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اُن کی اس غلط قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق

۱- شرابی پن کے معنی مغربی اصطلاح میں عادتاً شراب پینے کے نہیں ہیں، بلکہ حد سے زیادہ شراب پی کر غربدہ کرنے اور اُودھم مچانے اور مار پیٹ، گالم گلوچ اور بر سرِ بازار بے ہودگیاں کرنے کے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے دعووں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ انگلستان کی عدالتیں اُن سے پریشان ہوگئیں اور ۱۹۲۸ء میں لارڈ مری ویل (lord merrivalle) کو اُن کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے، وہاں اب تک رشتۂ نکاح ناقابل انقطاع ہے، البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہوسکتی ہے جس کے بعد زوجین نہ مل سکتے ہیں، نہ آزاد ہوکر نکاحِ ثانی کر سکتے ہیں۔ آئرلینڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدے پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کردیا گیا۔ نپولین کے قانون (code napolian) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کردیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۴ء میں اس کے لیے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لیے حسبِ ذیل وجوہ قرار دیے گئے ہیں:

زوجین میں سے کسی کا ارتکابِ زنا، ظالمانہ برتاؤ، اَحدالزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے اُس کے ساتھی کی عزت پر حرف آئے۔ حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجب ذِلّت ہو۔

علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کے لیے تین سو دِن کی عدّت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے[1]۔

یورپ کے دُوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دُوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں، مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں۔

آسٹریلیا، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین صرف باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں، یہ خُلع سے ملتی جُلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔ جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دُوسرے کو چھوڑ دینا اور اُس سے بے تعلق ہوکر رہنا موجب طلاق نہیں تاوقتیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ یہ قانونِ ایلا کا ایک دُھندلا سا عکس ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں اس کے لیے تین سال کی مدت ہے اور ہالینڈ میں پانچ سال کی۔ دُوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔

مفقودالخبر کے لیے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دُوسرے ممالک کے قوانین مفقودالخبر کے باب میں خاموش ہیں۔

۱- عدت کی اصل غرض یہ ہے کہ ایک مرد سے الگ ہونے کے بعد اور دوسرے مرد کی زوجیت میں جانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کرلیا جائے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے بالکل فطری صورت اختیار کی ہے کہ تین مرتبہ حیض آنے سے اس امر کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ یہ وضع حمل طلاق کے دس دن بعد ہو جائے اس کے مقابلے میں ۳۰۰ دن یا ۱۰ مہینے کی عدت کے لیے کوئی فطری بنیاد نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مجنون کے لیے جرمنی، سویڈن اور سوئٹزر لینڈ میں تین سال کی مہلت ہے، باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

بلجیم میں مطلقہ کے لیے دس مہینے کی عدت ہے۔ فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاحِ ثانی کی عدت مقرر نہیں کی گئی۔

آسٹریلیا میں احد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا دعوائے طلاق کے لیے کافی ہے۔ بلجیم میں مجرّد سزایاب ہونا عورت یا مرد کو اپنے رفیق کے خلاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار بنا دیتا ہے۔ سویڈن اور ہالینڈ میں اس کے لیے حبسِ دوام کی شرط ہے۔

یہ اُن قوموں کے قوانین ہیں جو دُنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر اُن پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اِن میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اِن کے مقابلے میں اِسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اُس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرتِ انسانی کی رعایت، فتنوں کے سدِّ باب، اخلاق کی حفاظت، تمدّنی مصالح کی نگہداشت اور ازدواجی زندگی کے تمام مسائل و معاملات پر جامعیت کے ساتھ حاوی ہونے میں اِسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہوا ہے اُس کا عُشرِ عَشیر بھی مغربی قوانین کو نہ صِرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا، حالانکہ یہ قوانین اُنیسویں صدی کے 'روشن' زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علما و عقلا نے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چھان بین اور قانونی تجرّبات کے بعد وضع کیے ہیں اور اُس قانون کو اَب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادیہ نشین ﷺ پیش کر گیا ہے جس نے اِس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی جماعتِ ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اِس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ اِسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا، مگر اُس کی صداقت کا اِس سے زیادہ بیّن ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف صاف کہا کہ میں اپنے دِل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا۔ جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے، وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

پھر اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کے باوجود اگر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایت الٰہی کی ضرورت سے انکار کیے چلا جائے اور اپنا ہادی و شارع خود ہی بننے پر اصرار کرتا رہے تو بجز اِس کے کہ اُس کی اِس ضِد کو حماقت کہا جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اِس شخص سے بڑھ کر احمق کون ہو گا جس کو ایک بے غرض اور خیر خواہ رہنما سیدھا راستہ بتانے کے لیے موجود ہو، مگر وہ کہے کہ میں تو خود ہی راستہ تلاش کروں گا اور اِس تلاش میں خواہ مخواہ مختلف راستوں پر بھٹکتا پھرے۔

(حقوق الزوجین، جولائی ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۴-۱۹۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب ششم

اسلام کا معاشرتی انقلاب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

معاشرتی اُصول

عالم گیر معاشرے کے لیے سُنہری اُصول

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الحجرات ۴۹:۱۰) مومن تو ایک دُوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو۔ اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

یہ آیت دُنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالم گیر برادری قائم کرتی ہے اور یہ اِسی کی برکت ہے کہ کسی دُوسرے دِین یا مسلک کے پیروؤں میں وہ اخوّت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اِس حُکم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا ہے جس سے اِس کی پوری رُوح سمجھ میں آسکتی ہے۔

حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی، ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا۔ دُوسرے یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا۔ تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیرخواہ رہوں گا (بخاری، کتاب الایمان)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُس سے جنگ کرنا کفر'' (بخاری، کتاب الایمان۔ مُسند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر مسلمان پر دُوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزّت حرام ہے'' (مسلم، کتاب البرّ والصِلة - ترمذی، ابواب البرّ والصِلة)۔

حضرت ابوسعید خُدری اور حضرت ابوہُریرۃ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اُس پر ظلم نہیں کرتا، اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اُس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے'' (مُسنَد احمد)۔

حضرت سَہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ آپ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ ''گروہ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سَر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اُس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سَر جسم کے ہر حصّے کا درد محسوس کرتا ہے'' (مُسنَد احمد)۔ اِسی سے ملتا جُلتا مضمون ایک اور حدیث میں ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

"مومنوں کی مثال آپس کی محبت، وابستگی اور ایک دُوسرے پر رحم وشفقت کے معاملے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اِس کے کسی عضو کو بھی تکلیف ہو تو سارا جسم اِس پر بخار اور بے خوابی میں مُبتلا ہو جاتا ہے" (بخاری و مسلم)۔

ایک اور حدیث میں آپ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ "مومن ایک دُوسرے کے لیے ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہوتے ہیں، کہ ہر ایک دُوسرے سے تقویت پاتا ہے" (بخاری، کتاب الادب، ترمذی، ابواب البِرّ والصِلة)۔[1]

(تفہیم القرآن، پنجم ص ۸۳-۸۴، الحجرات حاشیہ ۱۸)

عالمی اصلاح کے لیے پوری نوعِ انسانی کو خطاب

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ (الحجرات۔۴۹:۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مَرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دِیں تاکہ تم ایک دُوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

اِس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دُنیا میں ہمیشہ عالم گیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رَنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اُس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقل اور اخلاقی بُنیاد پر نہیں، بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں اِن کی بِنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے اور کہیں ایک جغرافی خطے میں یا ایک خاص رنگ والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہو جانا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اِس حد تک محدُود نہیں رہی ہے کہ جنھیں اِس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو کہ ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اِس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اِس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں، مذہب ایجاد کیے گئے ہیں، قوانین بنائے گئے ہیں، اخلاقی اُصول وضع کیے ہیں، قوموں اور سلطنتوں نے اِس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اِس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اِسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اِسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اُونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان، نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے اور شُودروں کو انتہائی ذِلّت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے اُن کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج اِس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے اُنھیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ

[1] احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، اشاعت پنجم، ج ۱ ص ۱۵۲، اور ج ۶ ص ۳۸۳-۳۸۵، ص ۳۹۸، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ اُن کے ساتھ کیا اُس کی تہہ میں بھی یہی تصور کار فرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مباح ہے اور اُنھیں حق پہنچتا ہے کہ اُن کو لُوٹیں، غلام بنائیں اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دُوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اُس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصور پچھلی جنگِ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے اُنھیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے، جس کی اصلاح کے لیے قرآنِ مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

تین اہم اُصولی حقیقتیں: اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اُصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ تم سب کی اَصل ایک ہے۔ ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمھاری پوری نوع وجود میں آئی ہے اور آج تمھاری جتنی نسلیں بھی دُنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اُس تفرقے اور اُونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جس کے زعمِ باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمھارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادّۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادّے سے بنے ہوں اور کچھ دُوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادّے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی طریقے سے تم پیدا ہوئے ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کے طریقِ پیدائش الگ الگ ہوں اور ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہوا ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں جن سے دُنیا کے مختلف خطوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دُوسرے یہ کہ اپنی اَصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمھارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری اَمر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری رُوئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا، نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود میں آ جائیں۔ اِسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خدوخال، زبانیں اور طرزِ بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے اور ایک خطّے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دُور دراز خطوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا، مگر اس فطری فرق واختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہیں تھا کہ اُس کی بنیاد پر اُونچ نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں۔ ایک نسل دُوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دُوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل وحقیر جانیں، ایک قوم دُوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دُوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اُن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اِسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے اور ایک قوم کے لوگ مِل کر مشترک معاشرت بنا سکتے تھے اور زندگی کے معاملات میں ایک دُوسرے کے مددگار بن سکتے تھے، مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارُف کا ذریعہ بنایا تھا اُسے تفاخُر اور تنافُر کا ذریعہ بنالیا گیا اور پھر نوبت ظلم و عدوان تک پہنچادی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہوسکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدایش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیونکہ اُن کا پیدا کرنے والا ایک ہے، اُن کا مادّۂ پیدایش اور طریقِ پیدایش ایک ہی ہے اور اُن سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے، علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی اَمر ہے جس میں اُس کے اپنے ارادہ و انتخاب اور اُس کی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اِس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دُوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دُوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، برائیوں سے بچنے والا اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابلِ قدر ہے اور جس کا حال اِس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمزور درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

احادیث میں اِن کی وضاحت: یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اُن کو اپنے مختلف خطابات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ فتح مکّہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد آپؐ نے جو تقریر فرمائی تھی اُس میں فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عَیْبَةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَ تَكَبُّرَهَا. یَا اَیُّهَا النَّاسُ، اَلنَّاسُ رَجُلَانِ، بَرٌّ تَقِیٌّ كَرِیْمٌ عَلَى اللّٰهِ وَ فَاجِرٌ شَقِیٌّ هَیِّنٌ عَلَى اللّٰهِ، اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ (بیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی) شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اُس کا تکبر دُور کردیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصّوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں عزّت والا ہے، دُوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں آپؐ نے تقریر کی اور اُس میں فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ، اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَّلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَّلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ، اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (بیہقی) لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ میں نے تمھیں بات پہنچادی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں یا رسول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ۔فرمایا: اچھا تو جو موجود ہے وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔

ایک اور حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

كُلُّكُمْ بَنُوْا اٰدَمَ وَ اٰدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ وَ لَيَنْتَهِيَنَّ قَوْمٌ يَفْخَرُوْنَ بِاٰبَآئِهِمْ اَوْ لَيَكُوْنُنَّ اَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجِعْلَانِ (بزار) تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔لوگ اپنے آباؤاجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْئَلُكُمْ عَنْ اَحْسَابِكُمْ وَلَا عَنْ اَنْسَابِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (ابن جرير) اللہ قیامت کے روز تمھارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ (مسلم- ابن ماجه) اللہ تمھاری صورتیں اور تمھارے مال نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے[1]۔

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی ہیں، بلکہ اِسلام نے اُن کے مطابق اہلِ ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی ہے جن میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں، جس میں اُونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق وتعصب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل وقوم اور ملک ووطن سے تعلق رکھتے ہوں، بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اُصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اُس کی کوئی نظیر دُنیا کے کسی دِین اور کسی نظام میں بھی نہیں پائی جاتی نہ کبھی پائی گئی ہے۔صرف اسلام ہی وہ دِین ہے جس نے رُوئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک اُمت بنا دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ، یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ کون فی الواقع ایک اعلیٰ درجہ کا انسان ہے اور کون اَوصاف کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کا ہے،لوگوں نے بطورِ خود اعلیٰ اور ادنیٰ کے جو معیار بنا رکھے ہیں یہ اللہ کے ہاں چلنے والے نہیں ہیں۔ہوسکتا ہے کہ جس کو دُنیا میں بہت بلند مرتبے کا آدمی سمجھا گیا ہو وہ اللہ کے آخری فیصلے میں کم ترین خلائق قرار پائے اور ہوسکتا ہے کہ جو یہاں بہت حقیر سمجھا گیا ہو وہ وہاں بڑا اُونچا مرتبہ پائے،اصل اہمیت دُنیا کی عزت وذِلت کی نہیں، بلکہ اُس ذِلت وعزت کی ہے جو خدا کے ہاں کسی کو نصیب ہو،اِس لیے انسان کو ساری فکر اسی اَمر کی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اندر وہ حقیقی اَوصاف پیدا کرے جو اُسے اللہ کی نگاہ میں عزت کے لائق بنا سکتے ہوں۔

(تفہیم القرآن، پنجم،ص ۹۵-۹۹،الحجرات حواشی ۲۸-۲۹)

۱- مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث،ج ۶،ص ۴۲۴-۴۲۵،۴۴۲،۴۴۳،اشاعت سوم)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زمین کے انتظام میں اصل چیز صلاح ہے فساد نہیں

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (الاعراف ۷:۵۶) زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اُس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

''زمین میں فساد برپا نہ کرو'' یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اُصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رُونما ہوتی ہیں اور اِسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اِس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو بلکہ اَصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے جس کو دُور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اِسی فساد کو مٹانے اور نظامِ حیات کو ازسرِ نو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور اُنھوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح[1] پر قائم کیا گیا تھا اُس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۳۸، الحجرات حاشیہ ۴۴)

مسلم معاشرے کے افراد کے مطلوبہ اَوصاف

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ

۱۔ ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر 'مذہب' کی تاریخ مرتب کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دُنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا، اُس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اِس وجہ سے نہیں کہ اُن کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ اِس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہش مند تھے۔ اِسی خرابی کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیا اِس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی اُمت بنا لے، بلکہ اُن کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے اُنھیں پھر سے ایک اُمت بنا دیں (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۶۳، البقرہ حاشیہ ۲۳۰)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (الاحزاب ۳۳:۳۵)

بالیقین جو مَرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مُطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے اُن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

پچھلے پیراگراف کے بعد متصلاً یہ مضمون ارشاد فرما کر ایک لطیف اشارہ اِس اَمر کی طرف کر دیا گیا ہے کہ اُوپر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ اِن کے لیے خاص نہیں ہیں، بلکہ مسلم معاشرے کو بالعموم اپنے کردار کی اصلاح اِنھی ہدایات کے مطابق کرنی چاہیے۔

اِسلام: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ، یعنی جنھوں نے اِسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اب وہ اُسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ دُوسرے الفاظ میں، جن کے اندر اِسلام کے دیے ہوئے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اِس کی اطاعت اور اتباع کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔

ایمان: وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ، یعنی جن کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں ہے، بادلِ نخواستہ نہیں ہے، بلکہ دِل سے وہ اِسلام ہی کی رہنمائی کو حق مانتے ہیں۔ اِن کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے۔ جس چیز کو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط کہہ دیا ہے اُن کی اپنی رائے بھی یہی ہے کہ وہ یقیناً غلط ہے، اور جسے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کہہ دیا ہے اُن کا اپنا دِل و دماغ بھی اُسے برحق ہی یقین کرتا ہے۔ اُن کے نفس اور ذہن کی حالت یہ نہیں ہے کہ قرآن اور سُنّت سے یہ حُکم ثابت ہوا سے وہ نامناسب سمجھتے ہوں اور اِس فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں کہ کسی طرح اُسے بدل کر اپنی رائے کے مطابق، یا دُنیا کے چلتے ہوئے طریقوں کے مطابق ڈھال بھی دیا جائے اور یہ الزام بھی اپنے سر نہ لیا جائے کہ ہم نے حُکمِ خدا اور رسول میں ترمیم کر ڈالی ہے۔ حدیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی صحیح کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا (مسلم) ایمان کا لذّت شناس ہو گیا وہ شخص جو راضی ہوا اِس بات پر کہ اللہ ہی اُس کا رب ہو اور اِسلام ہی اُس کا دِین ہو اور محمدؐ ہی اُس کے رسول ہوں۔

اور ایک دُوسری حدیث میں آپؐ اِس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ (شرح السنه) تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کی خواہشِ نفس اُس چیز کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لایاں ہوں[1]۔

اطاعت: وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ، یعنی وہ محض مان کر رہ جانے والے بھی نہیں ہیں، بلکہ عملاً اطاعت کرنے والے ہیں، اِن کی یہ حالت نہیں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ حق تو اُس چیز کو مانیں جس کا اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حُکم دیا ہے۔ مگر عملاً

۱- احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۲ ص ۳۸-۳۹، اشاعت چہارم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اُس کی خلاف ورزی کریں اور اپنی مخلصانہ رائے میں تو اُن سب کاموں کو بُرا ہی سمجھتے رہیں جنھیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، مگر اپنی عملی زندگی میں ارتکاب اُنھی کا کرتے چلے جائیں۔

سچائی: وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ، یعنی اپنی گفتار میں بھی سچے ہیں اور اپنے معاملات میں بھی کھرے ہیں، جھوٹ، فریب، بدنیتی، دغابازی اور چھل بٹے اُن کی زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ اُن کی زبان وہی بولتی ہے جسے اُن کا ضمیر صحیح جانتا ہے۔ وہ کام وہی کرتے ہیں جو ایمان داری کے ساتھ اُن کے نزدیک راستی و صداقت کے مطابق ہوتا ہے اور جس سے بھی وہ کوئی معاملہ کرتے ہیں، دیانت کے ساتھ کرتے ہیں۔

صبر: وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ یعنی خدا اور رسول ﷺ کے بتائے سیدھے راستہ پر چلنے اور خدا کے دِین کو قائم کرنے میں جو مشکلات بھی پیش آئیں، جو خطرات بھی درپیش ہوں، جو تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں اور جن نُقصانات سے بھی دو چار ہونا پڑے، اُن کا پوری ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ کوئی خوف، کوئی لالچ اور خواہشاتِ نفس کا کوئی تقاضا اُن کو سیدھی راہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

خشوع: وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ یعنی وہ تکبر اور استکبار اور غرورِ نفس سے خالی ہیں۔ وہ اِس حقیقت کا پورا شعور و احساس رکھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور بندگی سے بالاتر ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اِس لیے اُن کے دِل اور جسم دونوں ہی اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ اُن پر خدا کا خوف غالب رہتا ہے، اُن سے کبھی وہ رویہ ظاہر نہیں ہوتا جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مُبتلا اور خدا سے بے خوف لوگوں سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ ترتیبِ کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اِس عام خدا ترسانہ رویے کے ساتھ خاص طور پر 'خشوع' سے مُراد نماز ہے، کیونکہ اِس کے بعد ہی صدقے اور روزے کا ذِکر کیا گیا ہے۔

انفاق: وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ، اِس سے مُراد صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ عام خیرات بھی اِس میں شامل ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کھلے دِل سے اپنے مال صَرف کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی مدد کرنے میں اپنی حدِّ استطاعت تک وہ کوئی دریغ نہیں کرتے۔ کوئی یتیم، کوئی بیمار، کوئی مصیبت زَدہ، کوئی ضعیف و معذور، کوئی غریب و محتاج آدمی اُن کی بستیوں میں دستگیری سے محرُوم نہیں رہتا، اور اللہ کے دِین کو سربلند کرنے کے لیے ضرورت پیش آجائے تو اِس پر اپنے مال لُٹا دینے میں وہ کبھی بُخل سے کام نہیں لیتے۔

روزے: وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ اِس میں فرض اور نفل دونوں قسم کے روزے شامل ہیں۔

حیا: وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ اِس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زنا سے پرہیز کرتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ وہ برہنگی و عریانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ برہنگی و عریانی صرف اِس چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی لباس کے بغیر بالکل ننگا ہو جائے، بلکہ ایسا لباس پہننا بھی برہنگی ہی ہے جو اِتنا رقیق ہو کہ جسم اُس میں سے جھلکتا ہو، یا اِتنا چُست ہو کہ جسم کی ساخت اور اُس کے نشیب و فراز سب اُس میں سے نمایاں نظر آتے ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذِکر: وَ الذّٰکِرِیْنَ اللہَ کَثِیْرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اُس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اُس کے دِل میں خدا کا خیال بَس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اُس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اُتر جاتا ہے تب ہی اُس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اُس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا، فارغ ہوگا تو الحمد للہ کہے گا، سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور اُٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اُس کی زبان سے بسم اللہ، الحمد للہ، ان شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اِسی طرح کے دُوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا، ہر نعمت ملنے پر اُس کا شکر ادا کرے گا، ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا طلبگار ہوگا، ہر مشکل میں اُس سے رُجوع کرے گا، ہر بُرائی کا موقع سامنے آنے پر اُس سے ڈرے گا، ہر قصور سرزد ہو جانے پر اُس سے معافی چاہے گا، ہر حاجت پیش آنے پر اُس سے دعا مانگے گا، غرض اُٹھتے، بیٹھتے اور دُنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اُس کا وظیفہ خدا ہی کا ذِکر ہوگا۔ یہ چیز درحقیقت اِسلامی زندگی کی جان ہے۔ دُوسری جتنی بھی عبادات ہیں اُن کے لیے بہر حال کوئی وقت ہوتا ہے، جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور اُنھیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رِشتہ اللہ اور اُس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اِسی سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دِل محض اِن خاص اعمال کے وقت ہی نہیں، بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اُس کی زبان دائماً اُس کے ذِکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اُس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نشو ونما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب وہوا میں لگا ہوا ہو۔ اِس کے برعکس جو زندگی اِس دائمی ذِکرِ خدا سے خالی ہو اُس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دِینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب وہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اِسی بات کو نبی ﷺ ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عَنْ مُعَاذِبْنِ اَنَسِ الْجُھَنِیِّ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ: اَنَّ رَجُلًا سَأَلَہٗ اَیُّ الْمُجَاھِدِیْنَ اَعْظَمُ اَجْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: اَکْثَرُھُمْ لِلّٰہِ تَعَالٰی ذِکْرًا، قَالَ: اَیُّ الصَّائِمِیْنَ اَکْثَرُ اَجْرًا؟ قَالَ: اَکْثَرُھُمْ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ذِکْرًا۔ ثُمَّ ذَکَرَ الصَّلٰوۃَ وَالزَّکٰوۃَ وَالْحَجَّ وَالصَّدَقَۃَ کُلُّ ذَالِکَ یَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اَکْثَرُھُمْ لِلّٰہِ ذِکْرًا

(مُسنَد احمد) معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: جواُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اُس نے عرض کیا: روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: جو اُن میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اُس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۹۵-۹۷، الاحزاب حواشی ۵۳-۶۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِسلام کی اخلاقی اور تمدّنی اصلاحات پر مخالفین کا طرزِعمل

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۝ (النسآء ۴:۲۶-۲۸) اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور اُنھی طریقوں پر تمھیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صُلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمھاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔ ہاں، اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر دُور نکل جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

سُورہ کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں، اور اِس سُورہ کے نزول سے پہلے سُورۂ بقرہ میں مسائل تمدّن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں، اُن سب کی طرف بحیثیتِ مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدّن کے وہ قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانے سے ہر دَور کے انبیا اور اُن کے صالح پَیرو عمل کرتے چلے آئے ہیں اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقۂ زندگی کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہے۔

منافقین اور قدامت پرست جُہلا اور نواحی مدینہ کے یہُودیوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدّن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات اور رسم و رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حِصّہ، بیوہ عورت کا سُسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدّت کے بعد اُس کا ہر شخص سے نِکاح کے لیے آزاد ہو جانا، سوتیلی ماں سے نِکاح حرام ہونا، دو بہنوں کے ایک ساتھ نِکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا، متبنّٰی کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے متبنّٰی کی بیوہ اور مطلّقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اِس طرح کی دُوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رُسوم کے پرستار چیخ چیخ اُٹھتے تھے۔ مدتوں اِن احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ اِن باتوں کو لے کر نبی ﷺ اور آپؐ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نِکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اِسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اُس کو یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے، آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں اُن کی رُو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ اِس طرح یہ نادان لوگ اُس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اُس وقت احکامِ الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

دُوسری طرف یہُودی تھے جنھوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شُمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو اُنھوں نے شریعت میں بڑھا لی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنھیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اوہام تھے جن کو اُنھوں نے قانونِ خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۴۸۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ بات اُن کے علما اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اِس سیدھی سادی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سُن کر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔ ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو قرآن اُن کے فقہا کے تمام اجتہادات اور اُن کے اسلاف کے سارے اوہام و خرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اُس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے، نہ اُس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اُس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے، بلکہ اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ اِن چند دِنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رِہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اَثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ ؐ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سُورۂ بقرہ رکوع ۲۸[1] کے آغاز میں درج ہے۔ نبی ﷺ نے اِس آیت کی رُو سے حُکم دیا کہ ایامِ ماہواری میں صِرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلقات عورتوں کے ساتھ اِسی طرح رکھے جائیں، جس طرح دُوسرے دِنوں میں ہوتے ہیں۔ اِس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قَسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے اُسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں اُسے پاک قرار دے گا۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۴۳-۳۴۵، النساء حواشی ۴۸-۴۹)

............OOO............

۱- يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ، پوچھتے ہیں: حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو: وہ ایک گندگی کی حالت ہے۔ اِس میں عورتوں سے الگ رہو اور اُن کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

مجلسی آداب

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ٥ (المجادلہ ۵۸:۱۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کر دیا کرو، اللہ تمہیں کشادگی بخشے گا۔ اور جب تم سے کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جایا کرو۔ تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ اُن کو بلند درجے عطا فرمائے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اُس کی خبر ہے۔

آیت میں مسلمانوں کو مجلسی تہذیب کے کچھ آداب سکھائے گئے ہیں اور بعض ایسے معاشرتی عیوب کو دُور کرنے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں جو پہلے بھی لوگوں میں پائے جاتے تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔

مجلس میں جگہ دینا

کسی مجلس میں اگر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہوں اور باہر سے کچھ لوگ آ جائیں تو پہلے سے بیٹھے ہوئے اصحاب اتنی سی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ وہ سمٹ کر بیٹھ جائیں اور دُوسروں کے لیے گنجایش پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد کے آنے والے کھڑے رہ جاتے ہیں، یا دہلیز میں بیٹھنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا واپس چلے جاتے ہیں، یا یہ دیکھ کر کہ مجلس میں ابھی کافی گنجایش موجود ہے، حاضرین کے اُوپر سے پھاندتے ہوئے اندر گھستے ہیں۔ یہ صورتِ حال نبی ﷺ کی مجلسوں میں اکثر پیش آتی رہتی تھی، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ اپنی مجلسوں میں خود غرضی اور تنگ دِلی کا مظاہرہ نہ کیا کریں، بلکہ بعد کے آنے والوں کو کھلے دِل سے جگہ دے دیا کریں۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۷، المجادلہ، موضوع ومباحث)

بعض مفسرین نے اِس حکم کو صرف نبی ﷺ کی مجلس تک محدود سمجھا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی تمام مجلسوں کے لیے یہ ایک عام ہدایت ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول نے اہلِ اِسلام کو جو آداب سکھائے ہیں اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جب کسی مجلس میں پہلے سے کچھ لوگ بیٹھے ہوں اور بعد میں مزید کچھ لوگ آئیں تو یہ تہذیب پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں ہونی چاہیے کہ وہ خود نئے آنے والوں کو جگہ دیں اور حتیٰ الامکان کچھ سکڑ اور سمٹ کر اُن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے کشادگی پیدا کریں اور اتنی شائستگی بعد کے آنے والوں میں ہونی چاہیے کہ وہ زبردستی اُن کے اندر نہ گھسیں اور کوئی شخص کسی کو اُٹھا کر اُس کی جگہ بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا لَا يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَّجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ وَلَكِنْ تَفَسَّحُوا وَتَوَسَّعُوا (مسند احمد۔ بخاری۔ مسلم)، کوئی شخص کسی کو اُٹھا کر اُس کی جگہ نہ بیٹھے بلکہ تم لوگ خود دوسروں کے لیے جگہ کشادہ کرو۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ إِلَّا بِإِذْنِهِمَا، کسی شخص کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر گھس جائے۔ (مُسنَد احمد۔ ابوداؤد۔ ترمِذی)[1]۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۶۱-۳۶۲، المجادلہ حاشیہ ۲۶)

دوسروں کا وقت ضائع نہ کرنے کی ہدایت

اِسی طرح ایک عیب لوگوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں (خصوصاً کسی اہم شخصیت کے ہاں) جاتے ہیں تو جم کر بیٹھ جاتے ہیں اور اِس بات کا کچھ خیال نہیں کرتے کہ ضرورت سے زیادہ اُس کا وقت لینا اُس کے لیے باعثِ زحمت ہوگا۔ اگر وہ کہے کہ حضرت اب تشریف لے جایئے تو بُرا مانتے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر اُٹھ جائے تو بداخلاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ اشارے کنایے سے اُن کو بتائے کہ اب کچھ دُوسرے ضروری کاموں کے لیے اُس کو وقت ملنا چاہیے تو سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں۔ لوگوں کے اِس طرزِ عمل سے خود نبی ﷺ کو بھی سابقہ پیش آتا تھا اور آپؐ کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے کے شوق میں اللہ کے بندے اِس بات کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ وہ بہت زیادہ قیمتی کاموں کا نقصان کر رہے ہیں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ تکلیف دِہ عادت چُھڑانے کے لیے حُکم دیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کے لیے کہا جائے تو اُٹھ جایا کرو۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۴۷، المجادلہ، موضوع اور مباحث)

یہ نہ سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں دُوسروں کو جگہ دینے کی خاطر اگر تم آپؐ سے کچھ دُور جا بیٹھے تو تمھارا درجہ گر گیا، یا اگر مجلس برخاست کر کے تمھیں اُٹھ جانے کے لیے کہا گیا تو تمھاری کچھ ذِلّت ہوگئی۔ رفعِ درجات کا اصل ذریعہ ایمان اور علم ہے نہ یہ کہ کس کو مجلس میں رسول اللہ ﷺ کے قریب بیٹھنے کا موقع ملا اور کون زیادہ دیر تک آپؐ کے پاس بیٹھا، کوئی شخص اگر آپؐ کے قریب بیٹھ گیا ہو تو اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُسے بڑا مرتبہ مل گیا۔ بڑا مرتبہ تو اُس کا رہے گا جس نے ایمان اور علم کی دولت زیادہ پائی ہے۔ اِس طرح کسی شخص نے اگر زیادہ دیر تک بیٹھ کر اللہ کے رسول ﷺ کو تکلیف دی تو اُس نے اُلٹا جہالت کا کام کیا۔ اس کے درجے میں محض یہ بات کوئی اضافہ نہ کر دے گی کہ اُسے دیر تک آپؐ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔ اُس سے بدرجہا زیادہ بلند مرتبہ اللہ کے ہاں اُس کا ہے جس نے آپؐ کی صحبت سے ایمان اور علم کا سرمایہ حاصل کیا اور وہ اخلاق سیکھے جو ایک مومن میں ہونے چاہییں۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۶۲، المجادلہ حاشیہ ۲۸)

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۰۹، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تخلیہ میں گفتگو کرنے والے کے لیے صدقہ کی پابندی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (المجادلۃ ۵۸:۱۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم رسول (ﷺ) سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر اور پاکیزہ چیز ہے۔ البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

ایک اور عیب لوگوں میں یہ بھی تھا کہ ایک ایک آدمی آ کر خواہ مخواہ حضور ﷺ سے تخلیہ میں بات کرنے کی خواہش کرتا تھا یا مجلسِ عام میں یہ چاہتا تھا کہ آپؐ کے قریب جا کر سرگوشی کے انداز میں آپؐ سے بات کرے۔ یہ چیز حضور ﷺ کے لیے بھی تکلیف دہ تھی اور دُوسرے لوگ جو مجلس میں موجود ہوتے، اُن کو بھی ناگوار ہوتی تھی۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی کہ جو شخص بھی آپؐ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہے وہ پہلے صدقہ دے۔ اِس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگوں کو اِس بُری عادت پر متنبہ کیا جائے تاکہ وہ اُسے چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ پابندی بس تھوڑی دیر تک باقی رکھی گئی اور جب لوگوں نے اپنا طرزِ عمل درست کر لیا تو اِسے منسوخ کر دیا گیا۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۳۷-۳۳۸، المجادلہ، موضوع اور مباحث)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اِس حُکم کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ باتیں (یعنی تخلیہ کی درخواست کر کے) پوچھنے لگے تھے حتیٰ کہ اُنھوں نے حضور ﷺ کو تنگ کر دیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے نبی ﷺ پر سے یہ بوجھ ہلکا کر دے (ابن جریر)۔ زید بن اسلم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے جو شخص بھی علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کرتا، آپؐ اُسے رد نہ فرماتے تھے۔ جس کا جی چاہتا آ کر عرض کرتا کہ میں ذرا الگ بات کرنا چاہتا ہوں، اور آپؐ اُسے موقع دے دیتے۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگ ایسے معاملات میں بھی آپؐ کو تکلیف دینے لگے جن میں الگ بات کرنے کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔ زمانہ وہ تھا جس میں سارا عرب مدینہ کے خلاف برسرِ جنگ تھا۔ بعض اوقات کسی شخص کی اِس طرح کی سرگوشی کے بعد شیطان لوگوں کے کان میں یہ پھونک دیتا تھا کہ یہ فلاں قبیلے کے حملہ آور ہونے کی خبر لایا تھا اور اِس سے مدینہ میں افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ دُوسری طرف لوگوں کی اِس حرکت کی وجہ سے منافقین کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا تھا کہ محمد ﷺ تو کانوں کے کچے ہیں، ہر ایک کی سُن لیتے ہیں۔ اِن وجوہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی کہ جو آپؐ سے خلوت میں بات کرنا چاہے وہ پہلے صدقہ دے (احکام القرآن لابن العربی)۔ قتادہ کہتے ہیں کہ دُوسروں پر اپنی بڑائی جتانے کے لیے بھی بعض لوگ حضور ﷺ سے خلوت میں بات کرتے تھے۔

صدقے کی مقدار: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ حُکم آیا تو حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا: کتنا صدقہ مقرر کیا جائے؟ کیا ایک دینار؟ میں نے عرض کیا: یہ لوگوں کی مقدرت سے زیادہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: نصف دینار؟ میں نے عرض کیا: لوگ اِس کی مقدرت بھی نہیں رکھتے۔ فرمایا: پھر کتنا؟ میں نے عرض کیا: بس ایک جو برابر سونا۔ فرمایا: اِنَّکَ لزھید، یعنی تم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے تو بڑی کم مقدار کا مشورہ دیا (ابن جریر۔ ترمذی۔ مُسند ابو یَعلیٰ)۔ ایک دُوسری روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قرآن کی یہ ایک ایسی آیت ہے جس پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا۔ اِس حُکم کے آتے ہی مَیں نے صدقہ پیش کیا اور ایک مسئلہ آپؐ سے پوچھ لیا[۱] (ابن جریر، حاکم، ابن المُنذِر، عَبد بن حُمَید)۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۶۳-۳۶۴، المجادلہ حاشیہ ۲۹)

وُجوبِ صدقہ کی منسوخی: ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المجادلۃ ۵۸: ۱۳) کیا تم ڈر گئے اِس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو اور اللہ نے تم کو اِس سے معاف کر دیا تو نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

یہ دُوسرا حکم اُوپر کے حُکم کے تھوڑی مدّت بعد ہی نازل ہوگیا اور اِس نے صدقہ کے وجوب کو منسوخ کر دیا۔ اِس اَمر میں اختلاف ہے کہ صدقہ کا یہ حُکم کتنی دیر رہا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ایک دِن سے بھی کم مدّت تک باقی رہا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ مُقاتل بن حَیّان کہتے ہیں دَس دِن تک رہا۔ یہ زیادہ سے زیادہ اِس حُکم کے بقا کی مدّت ہے جو کسی روایت میں بیان ہوئی ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۶۳-۳۶۴، المجادلہ حاشیہ ۳۰)

اجتماعی خورد و نوش کے اداب

جن گھروں سے آدمی بلا اجازت کھا پی سکتا ہے: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ (النور ۲۴: ۶۱) تمھارے اُوپر اِس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماں، نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا اُن گھروں سے جن کی کُنجیاں تمھاری سپردگی میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، اِس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔

معذور کے لیے بلا اجازت کھانے پینے کی اجازت: اِس آیت کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ آیت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ بیمار، لنگڑے، اندھے اور اِسی طرح کے دُوسرے معذور لوگوں کے بارے میں ہے، اور دُوسرا عام لوگوں کے بارے میں۔ دوم یہ کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے اہلِ عرب کی ذہنیت میں جو زبردست انقلاب واقع ہوا تھا اُس کی وجہ سے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں اِن کی حِس انتہائی نازک ہوگئی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بقول: اللہ تعالیٰ نے جب اُن کو حُکم دیا کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (ایک دُوسرے کے مال ناجائز

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۱۲-۳۱۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طریقوں سے نہ کھاؤ) تو لوگ ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے پر بھی سخت احتیاط برتنے لگے تھے، حتیٰ کہ بالکل قانونی شرطوں کے مطابق صاحبِ خانہ کی دعوت و اجازت جب تک نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ کسی عزیز یا دوست کے ہاں کھانا بھی ناجائز ہے۔ سوم یہ کہ اِس میں اپنے گھروں سے کھانے کا بھی ذِکر ہے وہ اجازت دینے کے لیے نہیں، بلکہ یہ ذہن نشین کرنے کے لیے ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا، ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے گھر سے کھانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ اِن تین باتوں کو سمجھ لینے کے بعد آیت کا یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک معذور آدمی کا تعلق ہے، وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لیے ہر گھر اور ہر جگہ سے کھا سکتا ہے، اِس کی معذوری بجائے خود سارے معاشرے پر اُس کا حق قائم کر دیتی ہے۔ اس لیے جہاں سے بھی اُس کو کھانے کے لیے ملے وہ اُس کے لیے جائز ہے۔ رہے عام آدمی تو اُن کے لیے اُن کے اپنے گھر اور اُن لوگوں کے گھر جن کا ذِکر کیا گیا ہے، یکساں ہیں۔ اُن میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اِس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحبِ خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں، ورنہ خیانت ہوگی، آدمی اگر ان میں سے کسی کے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اُس کی بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جا سکتا ہے۔

جن رشتہ داروں کے نام یہاں لیے گئے ہیں اُن میں اولاد کا ذِکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آدمی کی اولاد کا گھر اُس کا اپنا ہی گھر ہے۔

بے تکلف دوستوں کے بارے میں حکم: دوستوں کے معاملے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اِن سے مُراد بے تکلف اور جگری دوست ہیں جن کی غیر موجودگی میں اگر یار لوگ اُن کا حلوہ اُڑا جائیں تو ناگوار گزرنا تو درکنار اُنھیں اِس پر اُلٹی خوشی ہو۔

کھانا اکٹھے یا الگ الگ: قدیم زمانے کے اہلِ عرب میں بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ ہر ایک الگ الگ کھانا لے کر بیٹھے اور کھائے۔ وہ مِل کر ایک ہی جگہ کھانا بُرا سمجھتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کے ہاں آج بھی بُرا سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس بعض قبیلے تنہا کھانے کو بُرا جانتے تھے، حتیٰ کہ فاقہ کر جاتے تھے اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہو۔ یہ آیت اِسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۴۲۴-۴۲۵، النور حاشیہ ۹۵-۹۶)

کسی کے ہاں کھانے کے آداب

وَلٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۚ (الاحزاب ۳۳: ۵۳) ہاں اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمھاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَ لٰكِنۡ اِذَا دُعِيۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا یہ اِس سلسلے کا دُوسرا حکم ہے۔ جو غیر مہذب عادات اہلِ عرب میں پھیلی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کسی دوست یا ملاقاتی کے گھر کھانے کا وقت تاک کر پہنچ جاتے۔ یا اُس کے گھر آ کر بیٹھے رہتے یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ اِس حرکت کی وجہ سے صاحبِ خانہ اکثر عجیب مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ منہ پھوڑ کر کہے کہ میرے کھانے کا وقت ہے، آپ تشریف لے جائیے تو بے مروتی ہے، کھلائے تو آخر اچانک آئے ہوئے کتنے آدمیوں کو کھلائے۔ ہر وقت ہر آدمی کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ جب جتنے آدمی بھی اُس کے ہاں آ جائیں اُن کے کھانے کا انتظام فوراً کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ہودہ عادت سے منع فرمایا اور حکم دے دیا کہ کسی شخص کے گھر کھانے کے لیے اُس وقت جانا چاہیے جب کہ گھر والا کھانے کی دعوت دے۔ یہ حکم صرف نبی ﷺ کے گھر کے لیے خاص نہ تھا بلکہ اُس نمونے کے گھر میں یہ قواعد اسی لیے جاری کیے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں عام تہذیب کے ضابطے بن جائیں۔

وَ لَا مُسۡتَاۡنِسِيۡنَ لِحَدِيۡثٍ ؕ یہ ایک اور بے ہودہ عادت کی اصلاح ہے۔ بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بلائے جاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپس میں گفتگو کا ایسا سلسلہ چھیڑ دیتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اُنھیں اِس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ صاحبِ خانہ اور گھر کے لوگوں کو اِس سے کیا زحمت ہوتی ہے۔ ناشائستہ لوگ اپنی اِس عادت سے نبی ﷺ کو بھی تنگ کرتے رہتے تھے اور آپؐ اپنے اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے اِس کو برداشت کرتے تھے۔ آخر کار حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمے کی دعوت تھی، عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رُخصت ہو گئے، مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں لگ گئے۔ تنگ آ کر حضور ﷺ اُٹھے اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپؐ پھر پلٹ گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں جا بیٹھے۔ اچھی خاصی رات گزر جانے پر جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپؐ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مکان میں تشریف لائے۔ اِس کے بعد ناگزیر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خود اِن بُری عادات پر لوگوں کو متنبّہ فرمائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق یہ آیات اِسی موقع پر نازل ہوئی تھیں (مسلم۔ نسائی۔ ابن جریر)۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۲۰-۱۲۱، الاحزاب حاشیہ ۹۷)

گھروں میں داخلے کے وقت سلام کا حکم: فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُيُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ تَحِيَّةً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (النور ۲۴:۶۱) البتہ گھروں میں داخلہ ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے سامنے آیات بیان کرتا ہے تو توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے۔

سلام کا جواب: وَاِذَا حُيِّيۡتُمۡ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡهَاۤ اَوۡ رُدُّوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَسِيۡبًا۝ (النسآء ۴:۸۶) اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمھیں سلام کرے تو اُس کو اِس سے بہتر طریقے کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اُسی طرح، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ جو تمھارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اُس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اُس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے، بلکہ تمھارا منصب یہ ہے کہ دُوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے، جو دُنیا کو راہِ راست پر لانے اور مسلکِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھا ہو، درشت مزاجی، ترش رُوئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے، مگر اُس مقصد کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اُٹھا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل ص ۳۷۸، النساء حاشیہ ۱۱۴)

ہاتھ کے اشارے سے سلام

س: کیا ہاتھ کے اشارے کے ذریعے سلام کرنا جائز ہے؟

ج: جی ہاں، اِس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض اوقات آدمی دُور ہو تو اُسے سلام کی آواز نہیں پہنچتی۔ وہ صرف اشارہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں کا قدیم طریقہ ہے۔ بعض مسلمان ممالک میں آداب کا طریقہ یہ بھی ہے کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا جائے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

(۵۔ اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۷)

ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا: ہاتھ جوڑ کر سلام کرنے کا طریقہ کسی قطعی اور منصوص حُکم کی بنا پر تو اِسلام میں ممنوع نہیں ہے، مگر غیر مسلموں کی نقالی ممنوع ہے۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا ہندوؤں کا شِعار ہے۔ مسلمانوں میں یہ کبھی رائج نہیں رہا ہے۔ اب کسی مسلمان کا یہ طریقہ اختیار کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس نے ہندو غلبے کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

(مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اوّل، جون ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۰)

سلام، مسلمانوں کے لیے شِعار: ابتدائے اِسلام میں 'السلام علیکم' کا لفظ مسلمانوں کے لیے شِعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دُوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمھارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمھارے لیے سلامتی اور عافیت کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا نہ تم مجھ سے دُشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ شِعار (password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دُوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اِسے اِس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوجِ مخالف کے آدمیوں سے ممیّز ہوں، اِسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شِعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔

(تفہیم القرآن، اوّل ص ۳۷۴، النساء حاشیہ ۱۲۶)

مصافحہ اور معانقہ

جہاں تک مُصافحہ کا تعلق ہے، محض خوشی کے مواقع پر ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ہر ملاقات کے موقع پر وہ نہ صرف جائز ہے، بلکہ مُستحب اور مسنون ہے۔ ابوداؤد میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمان

www.KitaboSunnat.com

آپس میں مل کر مُصافحہ کرتے ہیں اور اللہ کی حمد اور اُس سے استغفار کرتے ہیں، اللہ اُن کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ ترمذی میں ارشادِ مبارک کے الفاظ یہ ہیں: جب دو مسلمان آپس میں ملاقات کے وقت مُصافحہ کرتے ہیں اللہ اُن کے جُدا ہونے سے پہلے اُن کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ یعنی اُن کا ایک دُوسرے سے مُصافحہ کرنا چونکہ مسلمان سے مسلمان کی محبت اور باہمی اکرام کا اظہار ہے، اِس لیے یہ اُن کی مغفرت کا موجب ہوتا ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ ملاقات کے وقت آپ لوگوں سے مُصافحہ فرمایا کرتے تھے؟ اُنھوں نے جواب دیا: کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں حضور ﷺ سے ملا ہوں اور آپؐ نے مجھ سے مُصافحہ نہ کیا ہو۔ اِس بنا پر مُصافحہ کے بارے میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مگر مُعانقہ کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض فقہا (جن میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں) اِسے بلا کراہت جائز کہتے ہیں اور بعض صِرف سَفر سے واپسی پر یا ایسے ہی کسی غیر معمولی موقع پر اُس کو جائز اور عام حالات میں مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ مطلقاً مکروہ ہے۔ اِس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ معانقہ کے بارے میں احادیث مختلف ہیں۔ ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے کسی بھائی سے ملے تو کیا اُس کے آگے جُھکے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ اُس نے پوچھا: کیا اُس سے مُعانقہ کرے اور اُس کا بوسہ لے؟ فرمایا: نہیں۔ اُس نے پوچھا: کیا اُس کا ہاتھ پکڑ کر مُصافحہ کرے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ ترمذی میں ایک اور روایت ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب زید بن خالد بن حارثہ رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو اُنھوں نے آ کر ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رسول اللہ ﷺ جلدی سے اُٹھ کر باہر تشریف لے گئے اور اُنھیں گلے سے لگا کر اُن کا منہ چوما۔ ابوداؤد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے مجھے طلب فرمایا تو میں گھر میں موجود نہ تھا۔ بعد میں جب مجھے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے مجھے یاد فرمایا ہے تو میں خدمتِ مبارک میں پہنچا، آپؐ نے مجھے گلے لگا لیا۔

اِن روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عام طور پر صِرف مصافحہ پر اکتفا فرمایا کرتے تھے۔ مُعانقہ آپ کا عام معمول نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی خاص موقع پر آپؐ نے مُعانقہ فرمایا ہے جو اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل ناجائز بھی نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۸-۲۰۰۔ بحوالہ ترجمان القرآن، فروری ۱۹۴۴ء)

بے جا سوالات کی ممانعت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ ۚ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَکُمْ ؕ عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ (المائدہ ۵:۱۰۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں ناگوار ہوں، لیکن اگر تم اُنھیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، وہ درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی ﷺ سے بعض لوگ عجیب عجیب قسم کے فضول سوالات کیا کرتے تھے جن کی نہ دین کے کسی معاملے میں ضرورت ہوتی تھی اور نہ دُنیا ہی کے کسی معاملے میں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک صاحب بھرے مجمع میں آپ سے پوچھ بیٹھے کہ ''میرا اصلی باپ کون ہے؟'' اِسی طرح بعض لوگ احکامِ شرع میں غیر ضروری پوچھ گچھ کیا کرتے تھے اور خواہ مخواہ پوچھ پوچھ کر ایسی چیزوں کا تعین کرانا چاہتے تھے جنھیں شارع نے مصلحتاً غیر معیّن رکھا ہے۔ مثلاً قرآن میں مجملاً یہ حُکم دیا گیا تھا کہ حج تم پر فرض کیا گیا ہے، ایک صاحب نے حُکم سُنتے ہی نبی ﷺ سے دریافت کیا: ''کیا ہر سال فرض کیا گیا ہے''؟ آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُنھوں نے پھر پوچھا۔ آپؐ پھر خاموش ہو گئے۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا: ''تم پر افسوس ہے۔ اگر میری زبان سے ہاں نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار پا جائے۔ پھر تم ہی لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکو گے اور نافرمانی کرنے لگو گے''۔ ایسے ہی لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اِس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

نبی ﷺ خود بھی لوگوں کو کثرتِ سوال سے اور خواہ مخواہ ہر بات کی کھوج لگانے سے منع فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: اِنَّ اَعۡظَمَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ فِی الۡمُسۡلِمِیۡنَ جُرۡمًا مَنۡ سَأَلَ عَنۡ شَیۡءٍ لَمۡ یُحَرَّمۡ عَلَی النَّاسِ فَحُرِّمَ مِنۡ اَجۡلِ مَسۡئَلَتِہٖ، مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا، جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اِس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی۔ ایک دُوسری حدیث میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوۡھَا وَ حَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنۡتَھِکُوۡھَا وَ حَدَّ حُدُوۡدًا فَلَا تَعۡتَدُوۡھَا وَ سَکَتَ عَنۡ اَشۡیَاءٍ مِنۡ غَیۡرِ نِسۡیَانٍ فَلَا تَبۡحَثُوۡھَا، اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں، اُنھیں ضائع نہ کرو، کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے اُن کے پاس نہ پھٹکو، کچھ حدود مقرر کی ہیں، اُن سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اُسے بھول لاحق ہوئی ہو، لہٰذا اُن کی کھوج نہ لگاؤ۔

اِن دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے۔ جن اُمور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور اُن کی تفصیل نہیں بتائی، یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دُوسرے تعیّنات کا ذِکر نہیں کیا ہے، اُن میں اجمال اور عدمِ تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی، تفصیلات بتانی چاہیے تھیں مگر نہ بتائیں، بلکہ اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع اِن اُمور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقیدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، اِستنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصّل، مطلق کو مقیّد، غیر معیّن کو معیّن بنا کر ہی چھوڑتا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ اِس لیے کہ مابعد الطبیعی اُمور میں جتنی تفصیلات زیادہ ہوں گی، ایمان لانے والے کے لیے خلاف ورزیِ حُکم کے امکانات بھی اُسی قدر زیادہ ہوں گے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۵۰۷-۵۰۸، المائدہ حاشیہ ۱۱۶)

بے جا سوالات کرنے میں یہود کی رَوِش: قَدۡ سَاَلَھَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِھَا کٰفِرِیۡنَ (المائدہ ۵:۱۰۲) تم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے پہلے ایک گروہ نے اِسی قسم کے سوالات کیے تھے، پھر وہ لوگ انھی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔

پہلے اُنھوں نے خود ہی عقائد اور احکام میں موشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلق سوال کر کر کے تفصیلات اور قیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کر لیا، پھر خود ہی اُس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے...... اِس گروہ سے مُراد یہُودی ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد ﷺ کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

(تفهيم القرآن، اوّل، ص ۵۰۷، المائدہ حاشیہ ۱۱۷)

یہُودیوں کی رَوِش سے بچنے کا حکم: اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ (البقرۃ ۲: ۱۰۸) پھر تم اپنے رسول سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو، جیسے اُس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے جا چکے ہیں۔

یہُودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور اُنھیں اُکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اِس پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرما رہا ہے کہ اِس معاملے میں یہُودیوں کی رَوِش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی ﷺ خود بھی مسلمانوں کو بار بار متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل وقال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اِس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ اور اُس کے رسول نے نہیں چھیڑا، اُن کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے اُس کی پیروی کرو اور جن اُمور سے منع کیا جاتا ہے، اُن سے رُک جاؤ، دُور اَز کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صَرف کرو۔ www.kitabosunnat.com

(تفهيم القرآن، اوّل، ص ۱۰۲، البقرہ حاشیہ ۱۱۰)

نجویٰ (خُفیہ سرگوشی): لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ (النسآء ۴: ۱۱۴) لوگوں کی خُفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا اُسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۝ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ (المجادلة ۵۸: ۹-۱۰) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں، بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اُس خدا سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمھیں حشر میں پیش ہونا ہے۔ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں، حالانکہ بے اذنِ خدا وہ اُنھیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ نجویٰ (آپس میں راز کی بات کرنا) بجائے خود ممنوع نہیں ہے: بلکہ اِس کے جائز و ناجائز ہونے کا

۱- مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفهيم الاحاديث، ج ۴، ص ۳۶۲-۳۶۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انحصار اُن لوگوں کے کردار پر ہے جو ایسی بات کریں اور اُن حالات پر ہے جن میں ایسی بات کی جائے اور اُن باتوں کی نوعیت پر ہے جو اس طریقے سے کی جائیں۔ جن لوگوں کا اخلاص، جن کی راست بازی، جن کے کردار کی پاکیزگی معاشرے میں معلوم و معروف ہو، انھیں کسی جگہ سر جوڑے بیٹھے دیکھ کر کسی کو یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ وہ آپس میں کسی شرارت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ بخلاف اِس کے جو لوگ شر اور بدکرداری کے لیے معروف ہوں اُن کی سرگوشیاں ہر شخص کے دِل میں کھٹک پیدا کردیتی ہیں کہ ضرور کسی نئے فتنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اسی طرح اتفاقاً کبھی دو چار آدمی باہم کسی معاملے پر سرگوشی کے انداز میں بات کریں تو یہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگوں نے اپنا ایک جتھا بنا رکھا ہو اور اُن کا مستقل وتیرہ یہی ہو کہ ہمیشہ جماعتِ مسلمین سے الگ اُن کے درمیان کھسر پسر ہوتی رہتی ہو تو یہ لازماً خرابی کا پیش خیمہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کا کم از کم نقصان یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں میں پارٹی بازی کی بیماری پھیلتی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر جو چیز نجویٰ کے جائز و ناجائز ہونے کا فیصلہ کرتی ہے وہ ان باتوں کی نوعیت ہے جو نجویٰ میں کی جائیں۔ دو آدمی اگر اس لیے باہم سرگوشی کرتے ہیں کہ کسی جھگڑے کا تصفیہ کرانا ہے، یا کسی کا حق دِلوانا ہے، یا کسی نیک کام میں حصہ لینا ہے، تو یہ کوئی بُرائی نہیں ہے، بلکہ کارِثواب ہے۔ اِس کے برعکس اگر یہی نجویٰ دو آدمیوں کے درمیان اِس غرض کے لیے ہو کہ کوئی فساد ڈلوانا ہے، یا کسی کا حق مارنا ہے، یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ غرض بجائے خود ایک بُرائی ہے اور اس کے لیے نجویٰ بُرائی پر بُرائی۔

نبی ﷺ نے اس سلسلے میں آدابِ مجلس کی جو تعلیم دی ہے وہ یہ ہے کہ اِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةٌ فَلَا يَتَنَاجى اِثْنَانِ دُوْنَ صَاحِبِهَا فَاِنَّ ذَالِكَ يَحْزُنُهٗ (بخاری۔مسلم۔ مسند احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد) جب تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو آدمی آپس میں کھسر پُسر نہ کریں، کیونکہ یہ تیسرے آدمی کے لیے باعث رنج ہوگا۔ دُوسری حدیث میں حضور ﷺ کے الفاظ یہ ہیں فَلَا يَتَنَاجى اِثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَاِنَّ ذَالِكَ يَحْزُنُهٗ (مسلم) دو آدمی باہم سرگوشی نہ کریں مگر تیسرے سے اجازت لے کر، کیونکہ یہ اُس کے لیے باعث رنج ہوگا[1]۔ اِسی ناجائز سرگوشی کی تعریف میں یہ بات بھی آتی ہے کہ دو آدمی تیسرے شخص کی موجودگی میں کسی ایسی زبان میں بات کرنے لگیں جسے وہ نہ سمجھتا ہو۔ اور اِس سے بھی زیادہ ناجائز بات یہ ہے کہ وہ اپنی سرگوشی کے دوران میں کسی کی طرف اِس طرح دیکھیں یا اشارے کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُن کے درمیان موضوعِ بحث وہی ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ یہ بات اس لیے فرمائی گئی ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کچھ لوگوں کی سرگوشیاں دیکھ کر یہ شُبہ بھی ہو جائے کہ وہ اُسی کے خلاف کی جا رہی ہیں، تب بھی اِسے اتنا رنجیدہ نہ ہونا چاہیے کہ محض شُبہ پر کوئی جوابی کارروائی کرنے کی فکر میں پڑ جائے، یا اپنے دِل میں اس پر کوئی غم، یا کینہ، یا غیر معمولی پریشانی پرورش کرنے لگے۔ اُس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ کے اِذن کے بغیر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ اعتماد اس کے قلب میں ایسی قوّت پیدا کر دے گا کہ بہت سے فضول اندیشوں اور خیالی خطروں سے اُس کو نجات مل جائے گی اور وہ اشرار کو اُن کے حال پر چھوڑ کر پورے

۱۔ مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث ج ۷، ص ۳۱۱، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہے گا۔ اللہ پر توکل کرنے والا مومن نہ تھڑدلا ہوتا ہے کہ ہر اندیشہ و گمان اُس کے سکون کو غارت کر دے، نہ کم ظرف ہوتا ہے کہ غلط کار لوگوں کے مقابلے میں آپے سے باہر ہو کر خود بھی خلافِ انصاف حرکتیں کرنے لگے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۶۰-۳۶۱، المجادلہ حاشیہ ۲۴-۲۵)

منافقین کی خُفیہ سرگوشیوں پر گرفت: مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ۖ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (المجادلة ۵۸:۷)

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور اُن کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو، یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور اُن کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو، خُفیہ بات کرنے والے خواہ اِس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی وہ ہوں، اللہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ اِن کو بتادے گا کہ اُنھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اِس ارشاد سے لوگوں کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی محفوظ مقامات پر خُفیہ مشورہ کر رہے ہوں۔ اِن کی بات دُنیا بھر سے چھپ سکتی ہے، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتی اور وہ دُنیا کی ہر طاقت کی گرفت سے بچ سکتے ہیں، مگر اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۵۸-۳۵۹، المجادلہ حاشیہ ۲۰)

............OOO............

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

لباس

انسانیت کے لیے لباس کی ضرورت

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ○ (الاعراف ۷:۲۶) اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اِس سے سبق لیں۔

اہلِ عرب کے سامنے خود اُن کی اپنی زندگی کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اَثر کی نشان دہی فرمائی ہے۔ یہ لوگ لِباس کو صِرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اِس کی سب سے پہلی بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابلِ شرم حِصّوں کی پردہ پوشی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اُنھیں اپنے سَتر دُوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھُل جائے تو سَتر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا، اُن کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اِس معاملے میں اُن کی عورتیں اُن کے مَردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ اُن کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اِس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی، دُنیا کی اکثر قومیں اِسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں، اِس لیے خطاب اہلِ عرب کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ عام ہے اور سارے بنی آدم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمھاری زندگی میں موجود ہے۔ تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اُس کے رسُولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اُس نے تمھیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اُسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمھارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اِس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے کہ رسولوں کی رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چند اہم حقیقتیں

اوّل یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی، بلکہ حیا اور شرم کا مادّہ اُس کی فطرت میں وَدِیعت کر دیا۔ اُس نے انسان کے لیے اُس کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی ہی نہیں بنایا، بلکہ سَوْأۃ بھی بنایا جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اِس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اُس نے کوئی بنا بنایا لباس انسان کو نہیں دے دیا بلکہ اِس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا (قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا) تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اِس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اِس فطری الہام کی رُو سے انسان کے لیے لِباس کی اخلاقی ضرورت مقدّم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سَوْءَۃ کو ڈھانکے اور اُس کی طبعی ضرورت مؤخر ہے، یعنی یہ کہ اُس کا لباس اُس کے لیے رِیش (جسم کی آرایش اور موسمی اثرات سے بدن کی حفاظت کا ذریعہ) ہو۔ اِس باب میں بھی فطرتاً انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ اُن کے لیے پوشش کی اصل غرض صِرف اُس کا 'رِیش' ہونا ہے۔ رہا اِس کا سَتر پوش ہونا تو اُن کے اعضاءِ صنفی سرے سے سَوْأۃ ہی نہیں ہیں کہ اُنھیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جبلّت میں کوئی داعیہ موجود ہوتا اور اُس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اُن کے اجسام پر کوئی لِباس پیدا کیا جاتا۔ لیکن جب انسانوں نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر اُلٹ گیا۔ اُس نے اپنے اِن شاگردوں کو اِس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمھارے لیے لِباس کی ضرورت بعینہٖ وہی ہے جو حیوانات کے لیے رِیش کی ضرورت ہے۔ رہا اِس کا سَوْأۃ کو چھپانے والی چیز ہونا تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضا سَوْءَۃ نہیں ہیں اِسی طرح تمھارے یہ اعضا بھی سَوْءَۃ نہیں، محض اعضائے صنفی ہی ہیں۔

سوم یہ کہ انسان کے لیے لِباس کا صرف ذریعۂ سَتر پوشی اور وسیلۂ زِینت وحفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اِس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اُس کا لباس تقویٰ کا لِباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زِینت میں بھی حَد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر وغرور اور تکبّر وریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو اور پھر اُن ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مَرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مَردانہ پَن کی نمایش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دُوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذِلّت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لِباس کے معاملے میں اِس خیر مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح اُن لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنھوں نے انبیا علیہم السلام پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین اُن کے سرپرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین اُن کو کسی نہ کسی غلطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ لِباس کا معاملہ بھی اللہ کی اُن بے شُمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دُنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں، بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے، اُوپر جن حقائق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اُنھیں اگر تأمل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۸-۲۰، الاعراف حاشیہ ۱۵-۱۶)

ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں اہلِ ایمان کے لیے

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۳۲) اے محمدؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا؟ اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دُنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً اُنھی کے لیے ہوں گی۔ اِس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اللہ نے تو دُنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اِس لیے اللہ کا منشا تو بہر حال یہ نہیں ہو سکتا کہ اُنھیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی نظامِ اخلاق و معاشرت ایسا ہے جو اُنھیں حرام، یا قابلِ نفرت، یا ارتقائے رُوحانی میں سدِ راہ قرار دیتا ہے تو اُس کا یہ فعل خود ہی اِس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ بھی اُن حجتوں میں سے ایک اہم حجت ہے جو قرآن نے مذاہبِ باطلہ کے ردّ میں پیش کی ہیں اور اِس کو سمجھ لینا قرآن کے طرزِ استدلال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں دُنیا کی زندگی میں بھی اہلِ ایمان ہی کے لیے ہیں کیونکہ وہی خدا کی وفادار رِعایا ہیں اور حق نمک صِرف نمک حلالوں ہی کو پہنچتا ہے۔ لیکن دُنیا کا موجودہ انتظام چونکہ آزمایش اور مہلت کے اُصول پر قائم کیا گیا ہے، اِس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں نمک حراموں پر بھی تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور بسا اوقات نمک حلالوں سے بڑھ کر اُنھیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں (جہاں سارا انتظام خالص حق کی بنیاد پر ہوگا) زندگی کی آرایشیں اور رِزق کے طیبات سب کے سب محض نمک حلالوں کے لیے مخصوص ہوں گے اور وہ نمک حرام اِن میں سے کچھ نہ پا سکیں گے، جنھوں نے اپنے رب کے رِزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۳، الاعراف حاشیہ ۲۲-۲۳)

عبادت کے وقت زینتِ لباس کا حکم

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷: ۳۱) اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔

یہاں زینت سے مُراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑے ہونے کے لیے صِرف اِتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی محض اپنا سَتر چھپا لے، بلکہ اِس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حسبِ استطاعت وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں سَتر پوشی بھی ہو اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زینت بھی۔ یہ حکم اُس غلط روپے کی تردید کے لیے ہے جس پر جُہلا اپنی عبادتوں میں عمل کرتے رہے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ برہنہ یا نیم برہنہ ہو کر اور اپنی ہیئتوں کو بگاڑ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اِس کے برعکس خدا کہتا ہے کہ اپنی زینت سے آراستہ ہو کر ایسی وضع میں عبادت کرنی چاہیے جس کے اندر برہنگی تو کیا، ناشائستگی کا بھی شائبہ تک نہ ہو۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۲، حاشیہ ۲۰)

لِباس کا مسئلہ اجتماعی نقطۂ نظر سے

اگر تمدّن کے پیدا کردہ زوائد سے الگ کر کے لِباس کو محض اِس فطری احتیاج کے لحاظ سے دیکھا جائے جس نے اوّل اوّل انسان کو اُس کے اختیار کرنے پر اُکسایا تھا تو وہ صرف ایک ایسی چیز ہے جو شرم و حیا کے فطری جذبات کے تحت جسم کے خاص حِصّوں کو چھپائے اور موسمی اثرات سے اُس کو محفوظ کرے۔ اپنی سادہ صورت میں ایسا لباس جو اِن دو ضرورتوں کو پورا کرتا ہو، قریب قریب ایک ہی وضع کا ہونا چاہیے، کیونکہ سب انسانوں کے جسم ایک سے ہیں اور اُن کو چھپانے کی آسان اور متبادر صورتیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ موسموں کے اختلاف کی بنا پر اُن کی صورتوں میں اِتنا اختلاف ہو سکتا ہے کہ جہاں گرمی ہو وہاں کے لِباس ہلکے اور کم حِصّۂ جسم پر حاوی ہوں اور جہاں سردی ہو وہاں کے لِباس بھاری اور زیادہ حِصّۂ جسم پر چھائے ہوئے ہوں۔

لِباس کے مختلف اوضاع: قدیم ترین انسانوں کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، اُن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لِباس جس زمانے میں محض فطرت کے ابتدائی اقتضا اور مجرّد انسانی ضروریات پر مبنی تھا، اُس وقت اِس کی صورتوں میں کچھ زیادہ تنوّع نہ تھا، اور جو کچھ تھا بھی تو وہ زیادہ تر موسمی اثر کے اختلاف کی بنا پر تھا، لیکن رفتہ رفتہ جب انسان کے شعور نے ترقی کی، تہذیب کی طرف قدم بڑھایا، صنعتیں پیدا ہوئیں، نئے نئے وسائل دریافت کیے گئے اور اُس فطری ملکہ نے انسان کے مزاج میں نشو و نما پایا جسے 'مذاق' کہتے ہیں، تو رفتہ رفتہ فطرت کی ابتدائی ضروریات پر کچھ اور چیزوں کا اضافہ ہونے لگا۔ یہ نئے آنے والے اثرات چونکہ مختلف قوموں میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف تھے، اِس لیے مختلف قوموں نے ابتدائی فطری لِباس پر جو اضافے کیے وہ بھی اپنی صورتوں اور کیفیتوں کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہی ہونے چاہیے تھے اور فی الواقع مختلف ہوئے۔

مختلف وضعوں کے اسباب و عوامل: مختلف قوموں میں لِباس کی مختلف وضعوں کی پیدائش اور پھر اُن کا تغیّر و تبدّل اور نشو و ارتقا جن بے شُمار چھوٹے بڑے اسباب کے زیرِ اثر ہوتا ہے اُن سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ ہزار ہا سال کے دوران میں قوموں کی اجتماعی زندگی اور ہر قوم کے افراد کی شخصی زندگی بے حد و حساب خارجی و داخلی تاثیرات سے متاثر ہوتی ہے جن کا ریکارڈ کہیں محفوظ نہیں رہتا۔ بلکہ بہت سے اثرات تو ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتے، لیکن جزئیات سے قطع نظر کر کے اگر ہم اِن بڑے بڑے عوامل کا استقصا کریں جن کے اثر سے مختلف قوموں میں مختلف طرزوں کے لِباس رواج پاتے ہیں تو وہ حسبِ ذیل آٹھ عنوانات کے تحت تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

۱- جغرافیائی حالات، جو ایک ملک کے باشندوں کو ایک خاص قسم کا لِباس اور طرزِ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۲- اخلاقی و مذہبی تصورات، جن کے اختلاف کی وجہ سے مختلف قوموں میں عورتوں اور مردوں کے لباس مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔

۳- فطری مذاق، جس کا نشو و نما ہر قوم میں مختلف اثرات کے تحت مختلف طور پر ہوتا ہے، اور اِسی اختلافِ مذاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کی پسند دُوسری قوم سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

۴- طرزِ معاشرت، جو ہر قوم کے مخصوص جغرافی، تمدنی، معاشی اور عقلی اور اخلاقی حالات کے تحت ایک مخصوص صورت میں نشو و نما پاتا ہے اور ہر قوم فطرتاً اُسی وضع کا لباس اختیار کرتی ہے جو اس کے عام طرزِ معاشرت سے مناسبت رکھتا ہو۔

۵- معاشی حالت، جس کے تحت ایک قوم کے عام ذرائعِ کسب معیشت، اِس کے پیشے، اُس کی صنعتیں اور اُس کی مالی حالت (افلاس یا خوشحالی) سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ ہر قوم کا لباس لازمی طور پر اُس کے اِن حالات کے مطابق ہوتا ہے اور ان کے تغیر کے ساتھ ساتھ فطرتاً لباس میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے۔

۶- تہذیب و شائستگی، جس میں ہر قوم ایک خاص مرتبے پر ہوتی ہے اور اِس کا قومی لباس لازماً اُس کی تہذیب و شائستگی کے معیار کا ساتھ دیتا ہے۔

۷- قومی روایات، جن کے تحت ایک نسل اپنے بزرگوں سے ایک خاص قسم کا طرزِ زندگی اور طرزِ لباس وراثت میں پاتی ہے اور تھوڑا بہت تغیر و تبدل کر کے اپنے بعد کی نسل کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔ مظاہرِ زندگی کا یہ تسلسل درحقیقت قومی وجود کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے۔ اِس لیے ہر قوم فطرتاً اُس کو عزیز رکھتی ہے۔

۸- بیرونی اثرات، جو ہر قوم کے خیالات اور طرزِ زندگی پر دُوسری قوموں کے میل جول سے پڑتے ہیں، مگر یہ امر کہ ایک قوم کس حد تک اور کس طرح دُوسروں سے اثر پذیر ہوتی ہے، بڑی حد تک اُس کے سیاسی اور ذہنی و اخلاقی حالات پر منحصر ہوتا ہے۔

یہ وہ بڑے بڑے عوامل ہیں جو ایک قوم کے لباس، اور صرف لباس ہی نہیں، بلکہ اِس کی پوری اجتماعی زندگی پر ہمہ گیر اقتدار رکھتے ہیں اور ہر قوم کا لباس انھی کے مشترک عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

دو بنیادی حقیقتیں: اِس تجزیے کی مدد سے جب ہم قومی لباس کے مسئلے پر نظر ڈالتے ہیں تو دو بنیادی حقیقتیں ہمارے ہاتھ آتی ہیں:

ایک یہ کہ لباس محض ایک بیرونی آلۂ ستر پوشی اور اوپری ذریعہ حفاظتِ جسم ہی نہیں ہے، بلکہ قومی نفسیات، قومی تہذیب و تمدن، قومی روایات اور قوم کی اجتماعی حالت کے اندر بہت گہری جڑیں رکھتا ہے۔ وہ دراصل اُس رُوح کا مظہر اور ذریعہ نمود ہے جو جسم قومی میں کارفرما ہوتی ہے۔ ہر قوم کا لباس درحقیقت ایک زبان ہے جس کے ذریعہ سے اِس کی قومیت کلام کرتی ہے اور دُنیا کو اپنی اجتماعی شخصیت سے رُوشناس کراتی ہے۔

دُوسرے یہ کہ لباس کی تہ میں جتنے عوامل کارفرما ہیں جغرافی حالات کے سوا باقی سب کے سب ایسے ہیں جو ہر قوم میں ہر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آن ایک غیر محسوس رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اُن میں کوئی چیز ساکن و جامد نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک فطرتاً تغیر پذیر ہے اور اُن کا تغیّر و ارتقا لازمی طور پر صرف لباس ہی پر نہیں، بلکہ پوری قومی زندگی پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایک ترقی کرنے والی قوم میں جب علوم و فنون پھیلتے ہیں، خیالات میں روشنی آتی ہے، صنعت و حرفت اور تجارت میں فروغ ہوتا ہے، معاشی حیثیت سے خوشحالی بڑھتی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملتا ہے اور اُن کے اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدّن سے اُس کو مختلف قسم کے سبق حاصل ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر خود بخود اُس کی اجتماعی زندگی میں ایک ارتقائی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کے جذبات بدلتے ہیں، فطری مذاق سُدھرتا ہے۔ طرزِ معاشرت میں خوبی و نفاست آجاتی ہے، شائستگی کا معیار بلند ہوتا ہے۔ نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔ قومی روایات کا احترام زیادہ ستھری شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی لباس پر بھی مادۃ و صورت دونوں کے اعتبار سے زیادہ حسین، زیادہ خوش وضع اور زیادہ شایستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اِس ارتقائی عمل کی کسی منزل میں بھی اِس کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ کوئی کانفرنس منعقد کر کے یا پارلیمنٹ میں کوئی ریزولیشن پاس کر کے ساری قوم کے لیے لباس کی کوئی خاص تراش مقرّر کی جائے یا کسی خاص طرزِ لباس کو یک لخت رائج کر دیا جائے، اجتماعی عوامل کی مشترک گردش کے اثر سے خود بخود ہی پُرانے اوضاعِ لباس میں اصلاحیں ہوتی جاتی ہیں، نئی نئی وضعیں چل نکلتی ہیں اور مجموعی حیثیت سے پوری قوم کا مذاق و مزاج اپنی افتادِ پرواز کے مطابق لباس کو بہتر بناتا چلا جاتا ہے۔

غیر فطری تبدیلی کی صورت: قومی لباس کی پیدایش، اِس کے تغیّر و تبدّل اور اِس کے نشو و ارتقا کی فطری صورت یہی ہے اور اِس کے برعکس غیر فطری یا مصنوعی صورت یہ ہے کہ ایک قوم کا لباس بہ تکلّف بدلوایا جائے اور کسی دُوسری قوم سے اُس کا لباس مانگ لیا جائے، جہاں تک نفسِ تغیّر کا تعلّق ہے، وہ فطری ارتقا کی صورت میں بھی ہوتا ہے اور غیر فطری انقلاب کی صورت میں بھی۔ مگر دونوں قسموں کے تغیّر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی قسم کا تغیّر ایسا ہے جیسے ایک درخت کا نشو و نما، کہ وہ جتنا جتنا بڑھتا ہے، اُس کے رنگ رُوپ، جسامت، پھل پھول، پتّیوں اور شاخوں میں تغیّرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اِن تمام تغیّرات کے باوجود درخت کی خودی جوں کی توں رہتی ہے۔ اِملی کا درخت ہے تو آخر وقت تک اِملی کا درخت ہی رہے گا اور آم کا درخت ہے تو ارتقا کے ہر درجے میں اُس کی آمیت بدستور قائم رہے گی۔ زمین، ہوا، پانی، گرمی، دُھوپ، ہر ایک چیز سے وہ بہت کچھ لے گا، مگر جو کچھ بھی لے گا اُسے اپنی خودی کا جز بنا لے گا۔ بخلاف اِس کے دُوسری قسم کا تغیّر ایسا ہے جیسے ایک درخت چلا تو تھا اِملی ہونے کی حیثیت سے مگر یکا یک اُس پر آم کی چھال لا کر چپکا دی گئی اور آم ہی کی شاخیں اور پتّیاں اُس پر جوڑ دی گئیں۔ اَب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ عجوبہ فی الحقیقت ہے کیا؟ آم ہے کہ اِملی؟ اِس طرح کے مصنوعی اور جعلی تغیّرات سے فی الواقع کوئی حقیقی اور نتیجہ خیز تغیّر پیدا نہیں ہوتا، بلکہ فِطری ارتقا کے راستے میں اُلٹا خلل واقع ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ اجتماعی مسائل میں کوئی بصیرت نہیں رکھتے اور محض سطحی نظر سے زندگی کے معاملات کو دیکھتے ہیں، وہ بچوں کی سی سادہ لوحی کے ساتھ یہ خیال کرتے ہیں کہ لباس اور طرزِ معاشرت کی کچھ ظاہری شکلوں کے بدل دینے سے ایک قوم فی الحقیقت بدل جاتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تغیرِ لباس کے حق میں دلائل: عموماً تغیرِ لباس کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس سے ایک پسماندہ قوم کی ذہنیت بدلتی ہے، سکون و جمود کی جگہ حرکت پیدا ہوتی ہے، تنزل و انحطاط کے دَور کا لباس اُتارتے ہی وہ تمام اندرُونی کمزوریاں جو اُس دَور کے ساتھ مختص تھیں اور وہ ساری دِلچسپیاں جو اُس دَور کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھیں، یکا یک کافور کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ نیا لباس پہنتے ہی خصوصاً جب کہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم سے لیا گیا ہو، قوم کے نفسیات اور اُس کی زندگی میں ایک آنی اور دفعی تغیر واقع ہوتا ہے۔ اُس میں خود بخود ترقی یافتہ ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آگے بڑھی ہوئی قوموں کے برابر سمجھنے لگتی ہے۔ دوسری قومیں بھی اُس کو اپنے برابر کا سمجھنے لگتی ہیں۔ اور جب وہ ترقی یافتہ قوموں کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیتی ہے تو اُس میں اُنھی جیسی شائستگی، عملی سرگرمی، اور فعلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مہذب اور کارکُن قوموں میں جو لباس اور طرزِ زندگی پیدا ہوا ہے اِسے اختیار کرنا مہذب اور کارکُن بننے کے لیے ضروری بھی ہے اور مُفید بھی...... یہ اور اسی قسم کے بہت سے دلائل اِس فعل کی تائید میں دیے جاتے ہیں، لیکن یہ سب محض سطحی خیالات ہیں جن کی تہ میں کوئی تفکر اور کوئی بصیرت نہیں ہے۔ پھر اِن خیالات کی سَند میں بعض بڑی بڑی نامور شخصیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے اِن شخصیتوں کے نام سُنتے ہی آدمی پر ہول طاری ہو جائے گا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن کی سَند پیش کی جاتی ہے، فکر و بصیرت کے اعتبار سے اُن کا درجہ بھی اُن لوگوں سے کچھ زیادہ اُونچا نہیں ہے جو اُن کی سَند پیش کرتے ہیں۔ اپنے مُتبعین کی طرح وہ بیچارے خود بھی فِکری حیثیت سے سطحی ہیں اور علمی حیثیت سے کم مایہ ہیں۔ ہنگامی حالات میں کامیاب تدبیریں اختیار کر کے اگر کسی فوجی جنرل نے اپنی قوم کو تباہی سے بچا لیا ہو تو بلاشبہ وہ قدر و عزت کا مستحق ہے، مگر اِس کی قدر اِتنی ہی کی جاسکتی ہے جتنا وہ فی الواقع ہے اور اُسی حیثیت سے کی جاسکتی ہے جس حیثیت سے اُس نے کارِنمایاں انجام دیا ہے۔ اُس کے حقیقی مرتبے سے آگے بڑھا کر اُسے مفکر اور مصلح اور معمارِ تہذیب و تمدن کی حیثیت دینا ایسی ہی بے عقلی ہے جیسے کسی اچھے انجینئر نے اگر سیلاب کے [آگے] بند باندھ کر کسی بستی کو تباہی سے بچا لیا ہو تو اُسے ہر معنیٰ میں مدبر اعظم اور نجات دہندہ سمجھ لیا جائے اور کہا جائے کہ اب محکمۂ حفظانِ صحت کا نگران بھی اِسی کو بنا دو اور تعلیمات کی نگرانی بھی اِسی کے سپرد کر دو۔

تغیرِ لباس کے خلاف دلائل: اُصولی حیثیت سے جو کچھ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، وہ تغیر پسند حضرات کے دلائل کی غلطی واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ لیکن زمانے کی روش کے اثر سے جو غلط فہمیاں عام طور پر دماغوں میں گھر کر چکی ہیں اُن کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں اِس حرکت کے خلاف اپنے دلائل زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کروں۔

۱۔ تبدیلی کے عوامل فطری ہوتے ہیں: پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ لباس کی وضع قطع بجائے خود کوئی مستقل بالذات چیز نہیں ہے، بلکہ بہت سے قدرتی اور اجتماعی عوامل کے مشترک عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت اگر تسلیم کر لی جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان عوامل کے عمل سے کسی قوم میں جو خاص وضعِ لباس پیدا ہوئی ہو وہی اُس کی فطری وضع ہے۔ اُس کو ترک کر کے یکا یک کوئی ایسی نئی وضع اختیار کر لینا جو مناسب طور پر ان عوامل کے مشترک عمل سے نہ پیدا ہوئی ہو بالکل ایک خلافِ وضعِ فطری عمل ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۲۔مصنوعی تبدیلی طرزِ معاشرت کو بگاڑتی ہے: ایک قوم کے لباس کا نہایت قریبی تعلق اُس کے طرزِ معاشرت سے ہوتا ہے، اور اُس کا طرزِ معاشرت اِس کی پوری تمدنی زندگی سے کئی طرح کے روابط اور مناسبتیں رکھتا ہے۔ لباس و طرزِ معاشرت کے فطری تغیرات میں تو یہ مناسبتیں برقرار رہتی ہیں، کیونکہ اِس صورت میں زندگی اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بحیثیت مجموعی حرکت کرتی ہے۔ لیکن اگر غیر فطری طریقے پر تکلّف اور تصنّع کے ساتھ لباس وطرزِ معاشرت کو بدل دیا جائے یا صِرف لباس میں تغیر کر دیا جائے تو ساری اجتماعی زندگی میں ایک برہمی و بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس لیے کہ زندگی کے دُوسرے شعبے اِس تغیّر کا ساتھ نہیں دیتے اور ایک دُوسرے سے بے جوڑ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۳۔اجتماعی زندگی کے ساتھ عدمِ مطابقت: لباس کا شایستہ وخوب صورت ہونا اور ترقی یافتہ حالات کے مناسب ہونا دراصل منحصر ہے اِس بات پر کہ قوم خود اجتماعی حیثیت سے ترقی کرے اور ایک شائستہ، متمدن، خوش مذاق، روشن خیال اور عملی قوم بن جائے۔ اِس راہ میں وہ جتنی جتنی آگے بڑھتی جائے گی، اِسی نسبت سے اِس کے قومی لباس میں خود بخود اصلاح ہوتی جائے گی۔ ترقی پذیر نفسِ اجتماعی آپ سے آپ خالص فطری طریقے سے بلا ارادہ اور بلا تکلّف کچھ اپنی پُرانی چیزوں میں ترمیم واصلاح کرے گا اور کچھ دُوسروں کی مناسب چیزیں لے کر اپنے ہاں اِس طرح سجا لے گا کہ وہ موزونیت کے ساتھ اِس میں کھپ جائیں گی۔ اصلاح وترقی میں پیش قدمی کے اِس فطری طریقے کو چھوڑ کر آنِ واحد میں ایک لباس کی جگہ دوسرا لباس بدل لینا ایسا ہی ہے جیسے چھلانگ مار کر ایک حالت سے دُوسری حالت میں پہنچ جانے کی کوشش کی جائے۔ اجتماعی زندگی میں اِس قِسم کی چھلانگیں مارنے سے کوئی حقیقی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

۴۔وقت سے پہلے بلوغت: کسی قوم کی اجتماعی حالت کے ترقی کرنے سے پہلے اِس کے لباس ومعاشرت کو بلند کرنا اور اُسے کسی ایسے مرتبے پر لے جانے کی کوشش کرنا جو اُس کے حقیقی مرتبے سے اُونچا ہو، بالکل ایسا ہے جیسے کسی نابالغ بچے کو ہیجان خیز ماحول میں رکھ کر، گرم گرم غذائیں اور تیز تیز دوائیں کھلا کر زبردستی حدِ بلوغ کو پہنچایا جائے۔ اِس طرح کی غیر معمولی تبلیغ سے اِس غریب بچے کے نظامِ جسمانی واحوالِ ذہنی میں جو شدید اختلال پیدا ہوگا اِسی پر اُس برہمی وابتری کو قیاس کر لینا چاہیے جو زبردستی، مہذب وشایستہ بنائے جانے سے کسی قوم کے اجتماعی نظام اور اُس کی ذہنی واخلاقی حالت میں برپا ہو گی۔

۵۔معیشت کا نقصان: ایک قوم کی معاشی حالت جس طرزِ لباس ومعاشرت کا بار برداشت کر سکتی ہو اُس سے زیادہ بھاری لباس ومعاشرت کا بوجھ اُس پر لاد دینا اُسے عملاً تباہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ لباس ومعاشرت کے ساتھ وہ خوش حال قوموں کے دُوسرے تمدنی ڈھنگ اختیار کرنے کی بھی کوشش کرے گی، اور اُس کے نتائج اِس کے حق میں تباہ کن ہوں گے۔

۶۔قومی انفرادیت کی نفی: لباس زبان اور رسم الخط وہ اوّلین چیزیں ہیں جن کے سہارے ایک قوم کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی قومیت کے اِن سہاروں کو گرا دیا جائے تو اُس کی انفرادیت آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی ہے اور آخر کار وہ دُوسری

۱۔ واضح رہے کہ یہ مضمون اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب کہ بعض مسلمان ملکوں کے فرمانروا اپنی اپنی قوموں کے لباس زبردستی بدلوا کر اُن کو ترقی یافتہ بنا رہے تھے اور ہمارے ملک میں بھی بعض طبقے ترقی کے اِس نسخے کو آزمانے پر زور دے رہے تھے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قوموں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدیم زمانے کی وہ قومیں جو آج صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہیں اور جنھیں ہم اُممِ بائدہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں سب کی سب اسی وجہ سے فنا ہوئیں۔ ان کے فنا ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اشخاص جن پر وہ قومیں مشتمل تھیں، سب مٹ گئے اور کوئی نسل دُنیا میں چھوڑ کر نہیں گئے۔ بلکہ دراصل ان کی گم شدگی اور فنائیت اس معنی میں ہے کہ اُن کی قومی انفرادیت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اپنی قومیت کے سہاروں کو خود گرا دیا یا گر جانے دیا۔ ان کے افراد دُوسری قوموں کے لباس، زبان، رسم الخط اور آداب معاشرت اختیار کرتے چلے گئے۔ آخر کار اُن کی قومیت مضمحل ہوتے ہوتے ناپید ہو گئی۔ یہی حشر اب بھی اُن قوموں کے لیے مقدر ہے جو اپنے نادان لیڈروں کی احمقانہ تدبیروں کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کر رہی ہیں۔

۷۔احساسِ کمتری کی نشانی: ایک قوم کا دُوسری قوم کے لباس وطرزِ معاشرت کو اختیار کرنا دراصل احساسِ کمتری کا نتیجہ اور اس کا اعلان ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود ذلیل، ادنیٰ اور پست سمجھتی ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس پر وہ فخر کر سکے۔ اس کے اسلاف کوئی ایسی چیز چھوڑ جانے کے قابل ہی نہ تھے جسے وہ شرم کیے بغیر برقرار رکھ سکتی ہو۔ اُس کا قومی مذاق اتنا پست اور اُس کا قومی ذہن اتنا کُند ہے، اور اُس کے اندر تخلیقی قوتوں کا ایسا فقدان ہے کہ وہ خود اپنے لیے کوئی بہتر طرزِ زندگی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے آپ کو مہذّب دکھانے کے لیے سب کچھ دُوسروں سے مانگ لاتی ہے اور بغیر کسی شرم کے دُنیا کے سامنے اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ تہذیب، شائستگی، حضارت اور حسن وجمال جو کچھ بھی ہے دُوسروں کی زندگی میں ہے۔ وہی ہر کمال کا معیار ہیں اور ہم خود سینکڑوں، ہزاروں برس کی زندگی میں گویا بس جانوروں کی طرح جیتے رہے ہیں۔ ہم کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہ کر سکے جو قدر وعزّت کے لائق ہو، یا زندہ رہنے کی مستحق ہو۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں خودداری کا شائبہ بھی باقی ہو وہ اس طرح اپنی ذلت وپستی کا مجسّم اشتہار بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے اور خود موجودہ زمانے کے حالات جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس امر پر شہادت دیتے ہیں کہ اس حقیر وذلیل حیثیت کو ایک قوم دو ہی حالتوں میں گوارا کرتی ہے۔ یا تو اُس وقت جب کہ وہ ہر میدان میں دُوسری قوموں سے پٹ کر اور پیہم شکستیں کھا کر ہار مان لے اور ڈگیں ڈال دے۔ مثلاً ہندوستان، ترکی، مصر، ایران وغیرہ۔ یا پھر اُس صورت میں جب کہ فی الواقع اُس کی پُشت پر کسی قسم کی قابلِ فخر روایات (traditions) نہ ہوں، اُس کی اپنی کوئی تہذیب وثقافت پہلے سے نہ رہی ہو، اُس میں اعلیٰ درجہ کی تخلیقی قوتیں بھی نہ ہوں، اور وہ اقوامِ عالم کے درمیان محض ایک نو دولتے کی حیثیت رکھتی ہو، جیسے جاپان۔

۸۔جعلی ترقی کا دھوکہ: ایک قوم سے دُوسری قوم کو اگر کوئی چیز لینی چاہیے اور کوئی چیز درحقیقت لینے کے قابل ہے تو وہ محض اُس کی علمی تحقیقات کے نتائج، اُس کی تخلیقی واختراعی قوتوں کے ثمرات، اور اُس کے وہ عملی طریقے ہیں جن سے اُس نے دُنیا میں کامیابی حاصل کی ہو۔ اُس کی تاریخ میں، یا اُس کی تنظیمات میں، یا اُس کے اخلاقیات میں اگر کوئی مُفید سبق ہے تو اُسے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ اُس کی ترقی اور کامیابی کے اسباب کا پوری چھان بین کے ساتھ استقصا کرنا چاہیے اور ایک ایک چیز جو مُفید ہو اُسے لے لینا چاہیے۔ یہ چیزیں انسانیت کی مشترک میراث ہیں۔ ان کی قدر نہ کرنا اور ان کے لینے میں قومی عصبیت کی بنا پر بُخل کرنا محض جاہلیت ہے، لیکن ان چیزوں کو چھوڑ کر دُوسری قوم سے اُس کے پہننے کے کپڑے اور اُس کے رہنے سہنے کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طریقے اور اُس کے کھانے کی چیزیں مانگنا، اور اُنھی کو ترقی کا ذریعہ سمجھنا، بجز اِس کے کہ کُند ذہنی کی علامت ہے اور کچھ نہیں۔ کیا کوئی عقلمند ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یورپ نے کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، ہیٹ اور بوٹ کے ذریعے سے ترقی کی ہے؟ یا اُس کی ترقی کے اسباب یہ ہیں کہ وہ چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہے؟ یا اُس کی تزئین و آرائش کے سامان، پاؤڈر اور لپ اسٹک اور کاسمیٹکس وغیرہ اُس کو اُڑا کر ترقی کے آسمان پر لے گئے ہیں؟ یہ بات اگر نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ اصلاح و ترقی کا نام لینے والے سب سے پہلے اُنھی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں؟ کیوں اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یورپ کی زندگی میں یہ چمک دمک جو نظر آتی ہے، یہ دراصل صدیوں کی پیہم جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ اور جو قوم بھی لگاتار محنت اور صبر و عزم کے ساتھ کام کرے اُس کی زندگی اِسی طرح قابلِ رشک ہو سکتی ہے جس طرح آج یورپ کی زندگی پر رشک کیا جاتا ہے۔

اِن دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا کسی دُوسری قوم کے لِباس و معاشرت کو اختیار کرنا ایک غیر طبعی اور غیر معقول حالت ہے اور اُس میں کسی پہلو سے بھی کوئی معقولیت نہیں ہے۔ معمولی حالات میں کوئی شخص یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر سکتا کہ اُس کے گردوپیش جو عام طریقِ زندگی پہلے سے رائج ہے اُسے وہ کیوں چھوڑ دے اور کیوں اُس کی جگہ اجنبی لوگوں کا طریقِ زندگی اختیار کرے۔ اِس قسم کے خیالات ہمیشہ غیر معمولی حالات (abnormal condition) ہی میں پیدا ہوا کرتے ہیں اور اُن کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے زمانۂ حمل میں بعض عورتیں مٹی کھانے لگتی ہیں یا جب آنکھ کی ساخت میں خرابی آجاتی ہے تو آدمی ہر چیز کو ٹیڑھا دیکھنے لگتا ہے۔

شرعی نُقطۂ نظر سے

[تغیرِ لباس کے بارے میں] یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خالص اجتماعی نُقطۂ نظر سے تھا۔ اب ہم شریعتِ اسلام کے نقطۂ نظر سے اِس مسئلے پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔

اِسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ ہر معاملے میں وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو عقلِ عام اور فطرتِ سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ آپ رنگین عینکیں اُتار کر صاف نگاہ سے معاملات کو اُن کی حقیقی و فطری صورت میں دیکھیے۔ اِس طرح کے مشاہدے سے جس نتیجے پر آپ پہنچیں گے وہ بعینہٖ وہی نتیجہ ہو گا جس پر اِسلام پہنچا ہے۔ وہ کوئی خاص لِباس اور کوئی خاص طرزِ زندگی انسان کے لیے مقرّر نہیں کرتا، بلکہ فطری طور پر جس جس طرزِ زندگی اور وضعِ لِباس نے نشوونما پایا ہے اُس کو جوں کا توں تسلیم کر لیتا ہے، البتہ خالص اخلاقی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے وہ چند اُصول مقرّر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے قومی لِباس اور طرزِ معاشرت میں اِن اُصولوں کے مطابق اصلاح کر لے۔

ستر: اِن میں سب سے پہلی چیز ستر کے حدود ہیں۔ اخلاق کے نُقطۂ نظر سے اسلام اِس کو ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مرد، خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں، لازمی طور پر اپنے جسم کے اُن حصّوں کو چھپائیں جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہیں اور تمام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عورتیں، خواہ وہ زمین کے کسی خطے میں رہتی ہوں، چہرے اور ہاتھ پاؤں کے سوا اپنے پورے جسم کو مستور رکھیں۔[1] اگر کسی قوم کی وضع لباس ایسی ہو کہ ستر کی یہ شرطیں اُس میں پوری نہ ہوتی ہوں تو اسلام اس سے مطالبہ کرے گا کہ اپنی وضع میں اِن شرطوں کے مطابق اصلاح کرلے۔ اور جب وہ اصلاح کر لے گی تو اسلام کا منشا پورا ہو جائے گا۔ پھر اُس کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کس تراش خراش کا لباس پہنتی ہے۔

فخر وغرور کی ممانعت: دُوسری ضروری اصلاح جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات پہننا چھوڑ دیں اور مرد اور عورتیں سب ایسے لباس پہننے سے احتراز کریں جن سے فخر وغرور، بے جا نمایش اور عیش پسندی کا اظہار ہوتا ہو۔ وہ تکبر کے لباس جو زمین پر لٹکتے ہوئے چلتے ہیں[2]، اور جنھیں پہن کر ایک انسان دُوسرے انسانوں کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتاتا ہے، اسلام کی نظر میں لعنت کے قابل ہیں۔ وہ فخر وریا کے لباس جنھیں پہن کر ایک طبقے کے لوگ عام انسانوں پر اپنی شان اور ترفع کا رُعب جماتے ہیں یا اپنی خوشحالی کی نمایش کرتے ہیں، اسلام کے نزدیک حرام ہیں۔ وہ بھڑکیلے لباس بھی اسلام کو پسند نہیں جن کے اندر نفس پرستی اور عیاشی کی پرورش ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو اپنی پوشش سے خارج کر دیجیے۔ پھر آپ کے لیے وہی وضع لباس، اسلامی وضع ہے جو آپ کے ملک میں رائج ہو، یا آپ کی سوسائٹی میں مستعمل ہو۔

غیر مسلموں کی مخصوص مذہبی علامتوں سے اجتناب: تیسری چیز جس کا مطالبہ اسلام کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرک اور بُت پرستی کی وہ مخصوص علامتیں جنھیں کسی مذہبی فرقے نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہو، آپ کے لباس سے خارج ہونی چاہییں۔ مثلاً زنار، صلیب، تصویریں، یا ایسی ہی دُوسری چیزیں جو غیر اسلامی شعائر کی تعریف میں آتی ہوں۔

مسلمانوں کے لباس کا امتیاز

اِن اخلاقی وتمدنی اصلاحات کے ساتھ ہی اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے لباس میں کوئی ایسی امتیازی چیز ضرور ہو جس سے وہ غیر مسلموں کے مقابلے میں ممیز ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ غیر مسلموں میں خلط ملط نہ ہو جائیں، ایک دُوسرے کو پہچان سکیں اور اُن کے درمیان جماعتی زندگی مستحکم ہو سکے۔ اِس غرض کے لیے اسلام نے کوئی خاص وضع یا علامت مقرر نہیں کی ہے،

۱- واضح رہے کہ یہ عورت کے لیے ستر کے حدود ہیں، نہ کہ حجاب کے۔ ستر وہ چیز ہے جسے عورت کو اپنے شوہر کے علاوہ ہر ایک سے چھپانا چاہیے۔ خواہ وہ اس کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اور حجاب اس سے زائد ایک چیز کا نام ہے جس میں قریبی رشتہ داروں اور غیر مردوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنی خانگی زندگی کے حدود سے باہر اپنے حسن اور اپنی آرایش کی نمایش کرتی پھریں۔ [مؤلف]

۲- اس کی ایک نمایاں مثال وہ مخصوص لباس ہیں جو بادشاہ، پوپ اور پادری، ہائی کورٹوں کے جج اور اسی طرح کے بعض اُونچے اہلِ مناصب خاص خاص رسموں کے موقع پر پہنتے ہیں اور جو شادی کے موقع پر دُلہنوں کو بھی پہنائے جاتے ہیں۔ یہ لباس اتنا لمبا ہوتا ہے کہ پیچھے کئی کئی آدمی اُس کو تھامے ہوئے چلتے ہیں۔ یہی وہ لباسِ تکبر ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَن جرّ ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة، جو شخص غرور کے ساتھ اپنا کپڑا زمین پر لٹکاتا ہوا چلے گا، خدا قیامت کے روز اُس کی صورت دیکھنا ہرگز پسند نہ کرے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بلکہ اِسے عرفِ عام پر چھوڑ دیا جائے۔ عرب میں جب اِسلامی تحریک کا آغاز ہوا تو خود رسول اللہ ﷺ اور دُوسرے مسلمان وہی لِباس پہنتے تھے جو عرب کا عام قومی لِباس تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو مشرکینِ عرب سے ممتاز کرنے کے لیے یہ علامت تجویز فرمادی تھی کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ باندھیں[1]۔ عام عرب یا تو عمامہ باندھتے تھے یا صرف ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ٹوپی پر عمامہ باندھنا مسلمانوں کے لیے وجہِ امتیاز بن گیا، اور اِتنے امتیاز کو اس غرض کے لیے کافی سمجھا گیا کہ اس نئی تحریک کے پیرو اپنے ملک کے عام باشندوں سے الگ پہچانے جاسکیں۔ بعد میں جب تمام عرب مسلمان ہو گیا تو اِس علامت کی حاجت باقی نہ رہی، کیونکہ اب عربی لِباس ہی اِسلامی لِباس بن گیا تھا اور اِس لِباس کو پہننے والا کوئی شخص کافر و مشرک نہ رہا کہ اُسے مسلمانوں سے ممیز کرنے کے لیے کسی امتیازی نشان کی حاجت ہوتی۔ اِسی طرح جب ایران اور دُوسرے ممالک میں اِسلام پھیلنا شروع ہوا تو اوّل اوّل اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ نومسلم یا تو عربی لِباس پہنیں یا اپنے پُرانے ملکی لِباس میں کسی خاص علامت (مثلاً عمامہ یا خاص طرز کی عبا) کا اضافہ کرلیں۔ کیونکہ اُس وقت اُن کا ملکی لِباس غیر مسلموں کا لِباس تھا، اور بغیر کسی شانِ امتیاز کے اِس کو استعمال کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کسی طرح نہیں بن سکتی تھی۔ مگر جب اِن ممالک کے اکثر باشندے مسلمان ہو گئے اور اُن کے ملکی لِباس میں وہ اخلاقی و تمدّنی اصلاحات نافذ کردی گئیں جن کا اُوپر ذِکر ہوا ہے تو اُن کے مختلف مقامی لِباس بعینہٖ اِسلامی لِباس بن گئے۔ موجودہ زمانے میں بھی جن ممالک کے تمام یا اکثر باشندے مسلمان ہو چکے ہیں اُن کے ملکی لِباس اپنی مختلف وضعوں کے باوجود سب کے سب اِسلامی لِباس ہیں اور جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مخلوط ہے، وہاں ہر وہ لِباس اِسلامی لِباس ہے جسے پہن کر ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم میں تمیز ہو سکے۔ اور جہاں کی ساری آبادی غیر مسلم ہے، وہاں ہر اُس شخص کے لیے جو اِسلام قبول کرے، یہ ضروری ہے کہ عام غیر مسلموں سے ممتاز ہونے کے لیے اپنی وضع میں کسی ایسی علامت کا اضافہ کرلے جو عموماً اِسلامی نشان کی حیثیت سے معروف ہو۔

تشبّہ کا مسئلہ

اس مرحلے پر پہنچ کر ہمارے سامنے تشبُّہ کا مسئلہ آجاتا ہے۔ تشبُّہ کے معنی ہیں کسی کے مشابہ بننا، اور اس معنی کے لحاظ سے تشبّہ کی چار صورتیں ممکن ہیں، جن میں سے ہر ایک کے متعلق اِسلام کے رویے کی توضیح یہاں کی جاتی ہے:

۱۔ صنفی تشبُّہ: یعنی مَرد کا عورت کے مانند بننا یا عورت کا مَرد کے مانند بننا۔ یہ فعل چونکہ فطرت سے انحراف ہے اور ایک

۱۔ ابو داؤد، ترمذی اور مستدرک میں یہ روایت آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس، یعنی ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق کرنے والی چیز ٹوپی پر عمامہ باندھنا ہے، بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے دائمی قانون ہے۔ چنانچہ اب بھی بعض لوگ اس فعل کو مسنون قرار دیتے ہیں، لیکن یہ محض بے سمجھے حدیث پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ دراصل مسنون صرف یہ ہے کہ جب مسلمان کسی ایسی قوم میں ہوں جس کے اکثر افراد غیر مسلم ہوں تو وہ اپنے لباس میں اُن سے الگ کوئی امتیازی نشان پیدا کرلے۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۶۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بگڑی ہوئی ذہنیت کی علامت ہے، اس لیے اسلام اسے ملعون قرار دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اُن مَردوں پر جو زنانہ لباس پہنیں اور اُن عورتوں پر جو مَردانہ لباس پہنیں صاف الفاظ میں لعنت فرمائی ہے[1] اور یقیناً ہر وہ شخص جس کا ذہن صحیح و سلیم ہوگا اِس معاملے میں وہی نقطۂ نظر اختیار کرے گا جو اللہ کے نبی ﷺ کا نقطۂ نظر ہے۔ مَرد میں زنانہ پن اور عورت میں مَردانہ پن، خواہ کسی حیثیت سے بھی ہو، ایک نفرت انگیز چیز ہے جسے دیکھ کر طبیعت بے اختیار بغاوت کرتی ہے۔

۲.....**قومی تشبُّہ:** یعنی ایک قوم کا بحیثیتِ مجموعی کسی دُوسری قوم کی وضع اختیار کرلینا۔ یہ چیز بھی غیر طبعی اور غیر معقول ہے اور ہمیشہ اُن حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کسی قوم میں دناءت کی وبائے عام پھوٹ پڑی ہو۔ لہٰذا اِسلام اِس کو بھی جائز نہیں رکھتا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دَور میں قومی تشبُّہ کی جس طرح روک تھام کی گئی تھی اور مفتوح ممالک کے باشندوں کو عربیت اختیار کرنے سے جس سختی کے ساتھ منع کیا گیا تھا، اس سے صحیح اِسلامی رُوح کا اظہار ہوتا ہے۔

۳۔ **انفرادی تشبُّہ:** یعنی کسی قوم کے بعض افراد کا کسی دُوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنا۔ یہ دراصل انفرادی سیرت کی کمزوری کا نشان ہے، جو افراد اس قسم کی رَوِش اختیار کرتے ہیں وہ دراصل اِس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ اُن کے نفس میں تلوّن کی بیماری موجود ہے۔ اُن کی سیرت میں پختگی اور استحکام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سیّال مادے کی طرح ہے جو ہر سانچے میں ڈھلنے پر آمادہ رہتا ہے، علاوہ اَزیں اِخلاقی حیثیت سے یہ ایک مکروہ فعل ہے۔ اِس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا نسب کسی دُوسرے سے ملائے، جس طرح وہ قابلِ ملامت ہے، اس لیے کہ اپنی اِس حرکت سے دراصل وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنے حقیقی باپ کی اولاد ہونے کو وہ باعثِ ننگ سمجھ رہا ہے، اِسی طرح وہ شخص بھی قابلِ ملامت ہے جو پیدا تو ایک قوم میں ہو، مگر عزّت و افتخار حاصل کرنے کے لیے وضع دُوسری قوم کی اختیار کرے، کیونکہ اِس طرح وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ جس قوم نے اُسے جنم دیا ہے، اُس سے وابستہ ہونا اُس کی نگاہ میں موجبِ عار ہے اور اُس کے نزدیک عزّت کی شکل صِرف یہ ہے کہ اُس کا شمار دُوسری قوم میں ہو۔ تمدّنی حیثیت سے بھی یہ رویّہ سراسر غلط ہے۔ جو لوگ اِسے اختیار کرتے ہیں وہ چمگادڑ بن کر رہ جاتے ہیں، نہ اِس قوم کے رہتے ہیں جس میں پیدا ہوئے ہیں اور نہ اُس قوم کے بن سکتے ہیں جس کے بننا چاہتے ہیں۔ لا الیٰ ھؤلاء ولا الیٰ ھؤلاء۔ اِن ہی وجوہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور خصوصاً حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے عرب کے اُن افراد کو زجر و توبیخ کی تھی جو بیرونی ممالک میں جا کر عرب کے بدوی لِباس چھوڑ بیٹھے تھے اور رُوم و ایران کے شاندار تمدّن سے مرعوب ہو کر اُن کے لِباس اختیار کر لیے تھے۔

۴۔ **تشبُّہ بالکفّار:** یعنی کسی مسلمان کا غیر مسلم کے مشابہ بننا۔ یہ فعل مسلمانوں کی جماعتی وحدت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان اور مسلمان کے درمیان اجنبیت پیدا ہوتی ہے اور اُن کے باہمی تعلقات میں وہ تعاون و تناصُر نہیں ہو سکتا جو اِسلام چاہتا ہے کہ ہو۔ یہ اِس بات کی علامت بھی ہے کہ ایک شخص مسلمان ہونے کے باوجود غیر مسلموں کی طرف میلانِ طبع

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رکھتا ہے۔ اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ حرکت مُضر ہے کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ جو شخص غیر مسلموں کے مانند بنا ہوا ہے، اُس کے ساتھ مسلمان ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلموں کا سا معاملہ کریں گے۔ اِن وجوہ سے نبی ﷺ نے بار بار اس قسم کے تشبّہ کی ممانعت فرمائی ہے۔ خالفوا الیہود والنصاریٰ، خالفوا المجوس۔[1] یہ الفاظ متعدد احادیث میں ہم کو ملتے ہیں جن سے حضور ﷺ کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان، مسلمان کو دیکھ کر پہچان سکے اور اُس کے ساتھ مسلمان کا سا معاملہ کر سکے۔ آپؐ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو مسلمان غیر مسلموں میں مخلوط ہو کر رہے گا میں اُس سے بری الذمہ ہوں، یعنی اگر کسی جنگ میں مسلمان اُسے دُشمن کا آدمی سمجھ کر قتل کر دیں تو اپنے خون کا وہ خود ذِمّہ دار ہوگا۔ من تشبّہ بقوم فھو منھم[2] کا منشا بھی یہی تھا کہ جو شخص کسی قوم کے مشابہ بن کر رہے گا وہ لامحالہ اُسی کا فرد سمجھا جائے گا اور اُس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا جو اُس قوم کے دُوسرے افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔[3]

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۶ - ۳۱۳)

ممانعتِ تشبّہ کی اصل وجہ

[اسلام] جس طرح قومیت کے مبالغے اور اُس کی افراط (یعنی قوم پرستی) کا ساتھ نہیں دیتا، اِسی طرح کسی ایسی چیز کا بھی ساتھ نہیں دیتا، جو قومیت کی جائز فطری حد بندیوں کو توڑنے والی اور قوموں کی انفرادیت (individuality) یا اُن کے امتیازی خصائص کو مٹانے والی اور اُن کے اندر رذائلِ اخلاق پیدا کرنے والی ہو۔

قرآنِ مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اگرچہ سب ایک ہی اصل سے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے درمیان دو قسم کے امتیاز رکھے ہیں۔ ایک عورت اور مرد کا امتیاز۔ دوسرا نسب اور قبیلے اور قومیت کا امتیاز۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ (الحجرات ۴۹: ۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دُوسرے کو پہچان سکو۔

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ (النجم ۵۳: ۴۵) اور اللہ نے مرد اور عورت دو صنفیں پیدا کیں۔

یہ دونوں قسم کے امتیازات انسانی تمدّن اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ہیں اور فطرتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کو صحیح حدود کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ عورت اور مرد کا امتیاز اِس لیے ہے کہ اِن کے درمیان نفسیاتی کشش ہو، لہٰذا ضروری ہوا کہ تمدّن و معاشرت میں دونوں کے اوصافِ امتیازی پوری طرح محفوظ رکھے جائیں اور قوموں کا امتیاز اس لیے ہے کہ تمدّنی اغراض کے لیے انسانوں کے ایسے اجتماعی دائرے اور حصے بن سکیں جن کے درمیان آسانی کے ساتھ باہمی تعاون ہو سکے، لہٰذا ضروری ہوا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۶

۲- ایضاً ج ۷، ص ۳۵۵

۳- اس مسئلے پر مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب مسئلہ قومیت، ص ۹۶-۱۰۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ ہر گروہ یا ہر تمدنی و اجتماعی حلقے کے کچھ امتیازی اوصاف ہوں جن کے ذریعے سے ایک حلقے کے آدمی ایک دوسرے کو پہچان سکیں، باہم مانوس ہوں، ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور دوسرے حلقوں کے آدمیوں میں فرق کر سکیں، اس قسم کے امتیازی اوصاف ظاہر ہے کہ زبان، لباس، طرز زندگی اور شانِ تمدن ہی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ اُن کی حفاظت کی جائے۔

اسی بنا پر اسلام میں تشبّہ کی ممانعت کی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اُس عورت پر جو مرد کا سا لباس پہنے اور اُس مرد پر جو عورت کا سا لباس پہنے (المستدرک، ج ۴، ص ۱۹۴)۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ملعون قرار دیا اُن مردوں کو جو عورتوں کے مشابہ بنیں اور اُن عورتوں کو جو مردوں کے مشابہ بنیں (بخاری، کتاب اللباس)۔ یہ اس لیے کہ عورت اور مرد کے درمیان جو نفسیاتی کشش اللہ نے رکھی ہے، یہ تشبّہ اُس کو دباتا اور گھٹاتا ہے اور اسلام اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح قوموں کے لباس و تمدن اور شعائر کو بھی مٹانا اور اُنھیں خلط ملط کرنا، اجتماعی مفاد و مصالح کے خلاف ہے، لہٰذا اسلام اس کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ قومی امتیاز کو جب فطری حدود سے بڑھا کر قوم پرستی بنایا جائے گا تو اسلام اس کے خلاف جہاد کرے گا، کیونکہ اس مادے سے جاہلانہ حمیت، ظالمانہ تعصب اور قیصریت کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن اسلام کی دُشمنی قوم پرستی سے ہے نہ کہ قومیت سے۔ قوم پرستی کے برعکس قومیت کو وہ برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اسے مٹانے کا بھی وہ ویسا ہی مخالف ہے جیسا کہ اُس کو حد سے بڑھانے کا مخالف ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو متوسط اور متوازن رویہ اسلام نے اختیار کیا ہے، اُس کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل آثار بغور ملاحظہ فرمائیے:

ایک صحابی نے پوچھا کہ عصبیت کیا چیز ہے؟ کیا آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم میں اپنے قوم کا ساتھ دے'' (ابن ماجہ)۔[1]

فرمایا: ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اُسی قوم میں شمار ہوگا'' (ابو داؤد)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آذر بائیجان کے گورنر عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ خبردار، اہلِ شرک (یعنی باشندگانِ آذر بائیجان) کے لباس اختیار نہ کرنا (کتاب اللباس والزینۃ)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام گورنروں کو عام احکام دیے تھے کہ غیر مسلم باشندوں کو اہلِ عرب کے لباس اور وضع و ہیئت اختیار کرنے سے روکیں۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں کے باشندوں سے صلح کرتے وقت باقاعدہ معاہدہ میں ایک مستقل دفعہ اس مضمون کی داخل کر دی گئی تھی کہ تم ہمارے جیسے لباس نہ پہننا (کتاب الخراج، امام ابو یوسف)۔

جو اہلِ عرب فوجی یا ملکی خدمات کے سلسلے میں عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مامور تھے اُن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار یہ تاکید کرتے تھے کہ اپنی زبان اور لہجے کی حفاظت کریں اور عجمی بولیاں نہ بولنے لگیں (بیہقی)۔

ان روایات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام جس بین الاقوامیت کا علم بردار ہے، اُس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ قوموں کی امتیازی خصوصیات کو مٹا کر انھیں خلط ملط کر دیا جائے، بلکہ وہ قوموں کو ان کی قومیت اور خصوصیات کے ساتھ

۱۔ مذکورہ بالا احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۴۔۳۵۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

برقرار رکھ کر اُن کے درمیان تہذیب واخلاق اور عقائد وافکار کا ایک ایسا رشتہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے بین الاقوامی کشیدگیاں، رکاوٹیں، ظلم اور تعصبات دُور ہو جائیں اور اُن کے درمیان تعاون و برادری کے تعلقات قائم ہوں۔

تشبّہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی بنا پر اسلام اس کا سخت مخالف ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے لوگ اپنی قومی خصوصیات کو صرف اسی وقت چھوڑتے ہیں جب اُن کے اندر کوئی نفسی کمزوری اور اخلاقی ڈھیل پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شخص دُوسروں کا اثر قبول کر کے اپنا رنگ چھوڑ دے اور اُن کے رنگ میں رنگ جائے، لامحالہ اُس کے اندر تلوّن، چھچھورپن، سرعتِ انفعال اور خفیف الحرکتی کا مرض ضرور ہوگا۔ اگر اُس کی روک تھام نہ کی جائے گی تو یہ مرض ترقی کرے گا۔ اگر بکثرت لوگوں میں یہ پھیل گیا تو ساری قوم نفسیاتی ضُعف میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس کے اخلاق میں کوئی پختگی باقی نہ رہے گی۔ اس کے ذہن کی چولیں اتنی ڈھیلی ہو جائیں گی کہ اُن پر اخلاق اور خصائص کی مستحکم بنیادیں قائم ہی نہ ہو سکیں گی۔ لہٰذا اسلام کسی قوم کو بھی یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اپنے اندر اس نفسی بیماری کو پرورش کرے۔ مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ جہاں اس کا بس چلتا ہے وہ غیر مسلموں کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ کسی انسان سے بھی اخلاقی کمزوری دیکھنا نہیں چاہتا۔

خصوصیت کے ساتھ مفتوح و مغلوب لوگوں میں یہ مرض زیادہ پھیلتا ہے۔ ان کے اندر محض اخلاقی ضُعف ہی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو جاتے ہیں، اپنے آپ کو خود حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کی نقل اُتار کر عزت اور فخر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ عزت، شرافت، بزرگی، تہذیب، شائستگی، غرض جس چیز کا بھی وہ تصور کرتے ہیں اُس کا مثالی نمونہ اُنھیں اپنے آقاؤں کی صورت ہی میں نظر آتا ہے۔ غلامی اُن کے جوہرِ آدمیت کو اس طرح کھا جاتی ہے کہ وہ علانیہ اپنی ذِلت اور پستی کا مجسّم اشتہار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس میں شرم محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں[1]۔ اسلام جو انسان کو پستیوں سے اُٹھا کر بلندی کی طرف لے جانے آیا ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو جائز نہیں رکھتا کہ کوئی انسانی گروہ ذِلتِ نفس کے اس اسفل السافلین میں گر جائے جس سے نیچے پستی کا کوئی اور درجہ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عجمی قومیں اسلامی حکومت کے زیرنگیں آئیں تو آپؓ نے اُن کو سختی کے ساتھ اہلِ عرب کی نقالی سے روکا۔ اسلامی جہاد کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اگر اُن قوموں میں غلامانہ خصائل پیدا ہونے دیے جاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو اسلام کا پرچم اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ قوموں کے آقا بنیں اور قومیں اُن کے ماتحت غلامی کی مشق بہم پہنچائیں۔

اِن وجوہ سے اسلام اس بات کا مخالف ہے کہ کوئی قوم دُوسری قوم کا ہو بہو چربہ بننے کی کوشش کرے اور اُس کے لباس وطرزِ معاشرت کی نقالی کرنے لگے۔ رہا تہذیب وتمدن کا وہ لین دین جو ایک دُوسرے سے میل جول رکھنے والی قوموں

۱۔ ہمارے اس بیان کی صداقت میں اگر کسی صاحب کو شک ہو تو وہ ہندوستان ہی میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے فرق کو دیکھ لیں۔ مٹھی بھر انگریز منتشر و پراگندہ ڈھائی سو برس سے کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان رہتے ہیں، مگر ایک انگریز بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس نے ہندوستانی لباس اختیار کر لیا ہو۔ بخلاف اس کے اُن ہندوستانیوں کا شمار کرنا بھی اب مشکل ہے جو سر سے پاؤں تک انگریز نما بنے پھرتے ہیں اور لباس ہی میں نہیں، بلکہ اپنی بول چال، انداز و اطوار، حرکات وسکنات ہر چیز میں انگریز کا پورا چربہ اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں فطری طور پر واقع ہوتا ہے تو اسلام اس کو نہ صرف جائز رکھتا ہے بلکہ فروغ دینا چاہتا ہے۔ وہ قوموں کے درمیان تعصبات کی ایسی دیواریں کھڑی کرنا نہیں چاہتا کہ اپنے تمدن میں ایک دُوسرے کی کوئی چیز سرے سے لیں ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے شامی جُبہ پہنا ہے جو یہودیوں کے لباس کا جُز تھا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ فتوضا و علیه جبة شامیة، آپؐ نے تنگ آستینوں والا رومی جُبہ بھی پہنا ہے جسے رومن کیتھولک عیسائی پہنتے تھے۔ نوشیروانی قبا بھی آپؐ کے استعمال میں رہی ہے جسے حدیث میں جبة طیالسة کسروانیة کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے[1]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برنس پہنی ہے جو ایک قسم کی اُونچی ٹوپی ہوتی تھی اور عیسائی درویشوں کے لباس کا جز تھی۔ اس قسم کی متفرق چیزوں کا استعمال تشبہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تشبہ یہ ہے کہ آدمی کی پوری وضع قطع کسی دُوسری قوم کی مانند ہو اور اُس کو دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جائے کہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے جسے ہم 'لین دین' کے لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک قوم دُوسری قوم کی کوئی اچھی یا مناسبِ حال چیز لے کر اُسے اپنی وضع قطع کا جز بنا لے اور اس جز کے شامل ہونے پر بھی اُس کی قومی وضع بحیثیتِ مجموعی قائم رہے۔

(مسئلہ قومیت، نومبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۱-۱۶۹)

لباس اور چہرے کی شرعی وضع

(سوال) مطالبہ کیا جاتا ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لیے آدمی کو لباس اور چہرے کی اسلامی وضع قطع اختیار کرنی چاہیے۔ براہِ کرم بتائیے کہ اس سلسلے میں اسلام نے کیا احکام دیے ہیں۔

(جواب) لباس اور چہرہ کی وضع قطع کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے اُس کا جواب تو میں دیے دیتا ہوں، لیکن اس سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآنی معیار کے مطابق حقیقی مسلمان بنانے کی کوشش کیجیے، پھر ظاہر کی تبدیلی اس حد تک کرتے چلے جائیے جس حد تک باطن میں واقعی تبدیلی ہوتی جائے۔ ورنہ مجرّد ضابطہ و قانون (rules and regulations) کو سامنے رکھ کر اگر آپ نے اپنے ظاہر کو اُس نقشے پر ڈھال لیا جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ایک متقی انسان کے ظاہری نقشے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اندر تقویٰ پیدا نہ ہوا تو آپ کی مثال ایسی ہو گی جیسے تانبے کے سکّہ پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہو۔ اشرفی کا ٹھپہ لگانا کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ بہت آسانی سے جس سستی سے سستی دھات پر چاہیں اُس کو لگا سکتے ہیں، لیکن زرِ خالص بہم پہنچانا ایک مشکل کام ہے اور بہت مدّت کی کیمیا گری سے یہ چیز حاصل ہوا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک مدّت سے ظاہر پر غیر معمولی زور دیا جا رہا ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اَشرفی کے ٹھپّے کے ساتھ تانبے، لوہے، سیسے اور ہر قسم کی گھٹیا دھاتوں کے سکّے چل پڑے ہیں۔ عملی دُنیا کا بازار ایسا بے لاگ صرّاف ہے کہ وہ زیادہ مدت تک اس جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ کچھ مدّت تک تو ہماری دھوکے کی اشرفیاں چل گئیں، لیکن اب بازار میں کوڑی بھر بھی ان کی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ پس ہمیں اسلامی جماعت میں جس قسم کی دین داری

[1] تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۵، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پیدا کرنی ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اشرفی کا ٹھپہ لگانے سے پہلے سونے کا سکہ بننے کی کوشش کریں۔

لباس اور چہرے کی وضع اور ایسے ہی دُوسرے ظواہر کے متعلق نبی ﷺ نے جتنی ہدایات دی ہیں وہ مدینہ طیبہ کے آخری پانچ چھ برسوں کی ہیں۔ اس سے پہلے پندرہ سولہ سال تک آپ اپنے متبعین میں تقویٰ اور احسان کی وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے جن کا مفصل نقشہ قرآنِ مجید اور احادیث نبوی میں بیان ہوا ہے۔ اس ترتیب پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس کو تزکیۂ نفوس کی خدمت پر مقرر فرمایا تھا اُس نے بھی پہلے اپنی پوری توجہ مسِ خام کو کُندن بنانے ہی پر صَرف کی تھی، پھر جب کُندن بنالیا تب اُس پر اشرفی کا نقش مرتسم کیا۔

لیکن اِس تقدیم و تاخیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے احکام شرعی کی تعمیل سے جی چُرانے کا بہانہ بنالیا جائے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی متقیانہ وضع بنانے سے پرہیز کیا جائے جس کی تہہ میں واقعی تقویٰ اور خداترسی موجود نہ ہو، اور جس کے اندر اِسلامی اخلاق کی رُوح مفقود ہو۔

لباس کے متعلق اِسلام نے جس پالیسی کا تعین کردیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایسی وضع میں رہیں جس میں آپ کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کرسکے کہ آپ مسلمان ہیں، بحیثیت مجموعی آپ کی وضع قطع کفار سے مشابہ نہ ہونی چاہیے۔

ڈاڑھی کے متعلق نبی ﷺ نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے۔ صِرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ آپ اگر ڈاڑھی رکھنے میں منافقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور اُتنی ڈاڑھی رکھ لیں جس پر عُرفِ عام میں ڈاڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہو (جسے دیکھ کر کوئی شخص اِس شُبہ میں مبتلا نہ ہو کہ شاید چندروز سے آپ نے ڈاڑھی نہیں مونڈی ہے تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ خواہ اہلِ فقہ کی استنباطی شرائط پر وہ پوری اُترے یا نہ اُترے۔

سَر کے بالوں کے متعلق صِرف یہ ہدایت ہے کہ کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ممنوع ہے۔ موجودہ زمانے میں جس قسم کے بالوں کو پنجاب میں 'بودے' کہتے ہیں اور جنھیں یوپی میں انگریزی بال کہا جاتا ہے، اُن کے ناجائز ہونے کی مجھے کوئی دلیل نہیں ملی۔ لیکن ایک غیر مسلم قوم کی ایجاد کردہ وضع کو سر چڑھانے میں کراہت کا پہلو ضرور ہے اور اِس لیے میں نے اِس وضع کو بدل دیا ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۷۸-۱۸۱)

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت

س: میں نے ڈاڑھی رکھ لی ہے، میرے کچھ ایسے رِشتہ دار جو علمِ دِین سے کافی واقف ہیں، وہ اعتراض کرتے ہیں کہ ڈاڑھی فرض نہیں ہے، قرآن میں اِس کے متعلق حُکم نہیں ملتا، ڈاڑھی نہ رکھی جائے تو کون سا گناہ کبیرہ ہے، یہ رسول ﷺ کی سُنتی محبت ہے۔ آپ فرمایئے کہ میں اُنھیں کیا جواب دوں؟

ج: ڈاڑھی کے متعلق آپ نے جو سوال مجھ سے کیا ہے۔ اِس پر ایک انگریز نومسلم کا واقعہ یاد آگیا، جس نے اِسلام کا اچھا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مطالعہ کرنے کے بعد اُس کو قبول کیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ہی اُس نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی۔ بعض لوگ جو اس طرح کے ''علمِ دین سے کافی واقف تھے'' جیسے آپ کے یہ عزیز ہیں، کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا اسلام میں کچھ ایسا ضروری کام تو نہیں ہے، پھر کیوں خواہ مخواہ آپ نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی؟ اُس نے جواب دیا: ''میں ضروری اور غیر ضروری کی تقسیم کو نہیں جانتا، میں بس یہ جانتا ہوں کہ پیغمبر ﷺ نے اس کا حُکم دیا ہے، جب میں نے پیغمبر ﷺ کی اطاعت قبول کر لی تو حُکم بجالانا میرا فرض ہے، کسی کے ماتحت کا یہ کام نہیں ہے کہ اُفسرِ بالا (higher authority) کے احکام میں سے کسی کو ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دے''۔ بس یہی واقعہ اپنے عزیزوں کو سُنا دیجیے اور اُن سے یہ بھی پوچھیے کہ یہ تو خیر ''رسول ﷺ کی سستی محبت ہے'' جناب نے اگر کسی مہنگی محبت کا ثبوت دیا ہو تو ارشاد فرمایئے۔ اگر ایک نوکر آقا کے آسان احکام کی تعمیل سے بھی گریز کرتا ہے تو وہ اُمورِ مہمہ کو کیسے سرانجام دے سکے گا۔ ہم سستی اور مہنگی محبت کا فرق نہیں جانتے۔ ہمیں تو پوری طرح اس راستے پر چلنا ہے جس پر نبی ﷺ چلے ہیں اور اُن احکام کی تعمیل کرنی ہے جو آپؐ نے دیے ہیں۔

اِس سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لیجیے۔ موجودہ زمانے میں ڈاڑھی رکھنا کسی ایسے شخص کے لیے جو فرنگیت زدہ طبقوں سے تعلّق رکھتا ہو، محض ایک حُکمِ نبوی ﷺ کی تعمیل ہی نہیں ہے، بلکہ ایک طرح کا جہاد بھی ہے اور عجب نہیں کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہجرت کا اجر بھی مل جائے۔ سب سے پہلے تو اُس کو خود اپنے اُس ذوق اور رنگ طبیعت کے خلاف بہت دِنوں تک جدوجہد کرنی پڑتی ہے جو برسوں کی تعلیم وتربیت اور ماحولی اثرات کے تحت اُس کے اندر راسخ ہو چکا تھا۔ پھر جب وہ اس پُرانے ذوق کی بیخ کنی کرنے اور اس کی جگہ اسلامی ذوق اپنے اندر پرورش کرنے میں اِس حد تک کامیاب ہوجاتا ہے کہ اُس کے چہرے پر ڈاڑھی اُگ سکے تو باہر ایک دُوسری کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔ اُس کا ماحول اُس سے لڑنے لگتا ہے کہ یہ کیسا انقلاب تیرے اندر رُونما ہو رہا ہے۔ اُس کے عزیز، اقارب، دوست، آشنا، سب اُسے چھیڑنے لگتے ہیں۔ اُس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ اُس پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں، شادی کی مارکیٹ میں اُس کی قیمت گر جاتی ہے، ہر طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ اس دیوار کو ڈھاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان اُٹھ رہی ہے۔ اِن پے دَر پے حملوں کے مقابلہ میں کوئی ایسا شخص ٹھہر نہیں سکتا جس میں کیرکٹر کی مضبوطی نہ ہو، یا جس میں اندرُونی تغیّر کے مکمل ہونے سے پہلے کسی وقتی جذبے کے اَثر یا کسی خارجی دباؤ سے بیرونی تغیّر شروع ہو گیا ہو۔ ایسا شخص تھوڑا یا بہت مقابلہ کرنے کے بعد آخر کار اپنے ماحول سے شکست کھا جاتا ہے اور بہروپیوں کی طرح پھر وہی وضع اختیار کر لیتا ہے جسے چھوڑنے کی اس نے نمایش کی تھی۔ مگر جو مضبوط کیرکٹر رکھتا ہو اور جس کا باطنی انقلاب پائدار بنیادوں پر اُٹھا ہو، وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے اور اس استقامت کے نتیجے میں دو زبردست فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کے اندر موجودہ کافرانہ ماحول کے خلاف دُوسرے میدانوں میں بھی کامیاب لڑائی لڑنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ دُوسرے یہ کہ جس مضبوط سیرت کا اُس نے ثبوت دیا ہے اُس کا رُعب اُس کے ماحول پر طاری ہو جاتا ہے اور اُس کی تبلیغ وتلقین میں اِتنا وزن پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی سوسائٹی کے دُوسرے اِصلاح پذیر لوگوں پر بھی وہ اثر ڈال سکے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اکثر لوگ اِس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اِس زمانے میں مُنڈی ہوئی ڈاڑھی محض ایک وضع نہیں ہے، بلکہ ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کا نمایاں ترین شِعار ہے۔ اِس شِعار کو چھوڑنا دراصل اُس کلچر اور اُس زندگی کو چھوڑنے کا اعلان ہے جس کا یہ شِعار ہے اور ڈاڑھی رکھنا کم از کم موجودہ حالات میں تو عملاً اسلام کو ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کا ہم معنی ہے۔ یہ ترک واختیار اُس وقت تک حقیقی اور پائدار نہیں ہوسکتا جب تک فی الواقع آدمی کے نفس میں مغربی کلچر اور مذہب زندگی کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہوجائے اور اُس کی جگہ اسلامی کلچر اور مذہب زندگی کی جڑیں اچھی خاصی مضبوط نہ ہوجائیں۔ لہٰذا جو لوگ محض سطحی طور پر اخلاقی دباؤ ڈال کر جدید طرز کے نوجوانوں سے ڈاڑھی رکھوانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اندرُونی انقلاب چاہے ہو یا نہ ہو، مگر بیرُونی انقلاب سے ضابطے کی خانہ پُری فوراً کردی جائے وہ بے چارے حقائق سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مگر جہاں یہ تغیّر فی الحقیقت ایک گہرے اندرُونی انقلاب کا نتیجہ ہو اور اُس کے متوازی متقیانہ سیرت کے دُوسرے مظاہر بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہورہے ہوں اور ماحول کے غیر اسلامی اثرات سے لڑنے میں بھی پامردی کا ثبوت دیا جا رہا ہو ایسی جگہ اِس انقلاب کو محض ایک معمولی چیز قرار دینا اور اُسے رسول ﷺ کی سستی محبت سے تعبیر کرنا صرف اُنھی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو بے چارے رُخسار و ذقن کے بالوں سے زیادہ کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۱-۱۸۵)

ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ

(س) ڈاڑھی کی مقدار کے عدمِ تعیّن پر ترجمان میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس سے مجھے تشویش ہے، کیونکہ بڑے بڑے علما کا متفقہ فتویٰ اِس پر موجود ہے کہ ڈاڑھی ایک مُشت بھر لمبی ہونی چاہیے اور اُس سے کم ڈاڑھی رکھنے والا فاسق ہے، آپ آخر کن دلائل کی بنا پر اِس 'اجماعی فتویٰ' کو رد کرتے ہیں؟

(ج) یہ تو اُنھیں علما سے پوچھنا چاہیے کہ اُن کے پاس مقدار کے تعیّن کے لیے کیا دلیل ہے؟ اور خصوصاً 'فسق' کی وہ آخر کیا تعریف کرتے ہیں جس کی بنا پر اُن کی تعیّن کردہ مقدار سے کم ڈاڑھی رکھنے والے پر فاسق کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ بڑے بڑے علما خود حدودِ شرعیہ کو نہیں سمجھتے اور ایسے فتوے دیتے ہیں جو صریحاً حدودِ شرعیہ سے متجاوز ہیں۔

ڈاڑھی کے متعلق شارع نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ علما نے جو حد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بہرحال ایک استنباطی چیز ہے اور کوئی استنباط کیا ہوا حُکم وہ حیثیت حاصل نہیں کرسکتا جو نص کی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اگر فاسق کہا جاسکتا ہے تو صرف حُکمِ منصوص کی خلاف ورزی پر کہا جاسکتا ہے۔ حُکمِ مستنبط کی خلاف ورزی (چاہے استنباط کیسے ہی بڑے علما کا ہو) فسق کی تعریف میں نہیں آتی، ورنہ اسے فسق قرار دینے کے دُوسرے معنی یہ ہوں گے کہ استنباط کرنے والوں کی بھی شریعت میں وہی حیثیت ہے جو خود شارع کی ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۵)

(س) کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی ایک مُشت سے کم تھی؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج اسماء الرجال اور سِیَر کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مجھے بجز دو تین صحابیوں کے کسی کی ڈاڑھی کی مقدار نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات پر صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں، مگر اُن کے متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ اُن کی ڈاڑھی کتنی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف میں یہ مقدار کا مسئلہ کتنا غیر اہم اور ناقابل توجہ تھا۔ حالانکہ متاخرین میں جس شدت سے اس پر زور دیا جاتا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مومن کی سیرت و کردار میں پہلی چیز جس کی جستجو ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ اُس کی ڈاڑھی کا طول کتنا ہے؟

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۷)

ڈاڑھی رکھنا صرف علما کے لیے ہے؟

س ڈاڑھی کے بارے میں اکثر مسلمانوں کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ ڈاڑھی صرف علما اور مولانا حضرات کو زیب دیتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں عام طور پر ڈاڑھی رکھی جاتی تھی، اس لیے اکثریت ڈاڑھی رکھنے میں عار نہ سمجھتی تھی۔ مگر اب انسان کے لباس و آراستگی میں کافی فرق واقع ہو چکا ہے۔ چہرے بغیر ڈاڑھی کے پُر رونق و بارُعب نظر آتے ہیں۔ کیا ایسے حالات میں ہر مسلمان کے لیے ڈاڑھی رکھنا لازم ہے؟ براہِ کرم اس معاملے میں ذہن کو یکسو اور مطمئن فرمائیں۔

ج ڈاڑھی رکھنا نہ صرف یہ کہ فعلی سُنّت ہے بلکہ نبی ﷺ نے اس کے رکھنے کا حکم دیا ہے اور مونڈنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ ڈاڑھی رکھنا صرف علما اور مولانا حضرات کا کام ہے اور عام مسلمان مختار ہیں کہ چاہیں رکھیں یا نہ رکھیں، بالکل غیر اسلامی اور غلط طرزِ فکر ہے۔ خصوصاً اگر آدمی ڈاڑھی مونڈنے کو پسند اور رکھنے کو ناپسند کرتا ہے تو اُس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر اسلامی ذوق کے بجائے کافرانہ ذوق پرورش پا رہا ہے۔

یہ بڑی عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو اُن کے ہادی و رہبر ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے اُسی طرح سکھوں کو بھی اُن کے پیشوا نے اس کا حکم دیا تھا۔ ہمارے ملک میں انگریزی حکومت کے تحت دونوں رہے اور مغربی تعلیم دونوں نے پائی، لیکن سکھوں نے اپنے پیشوا کے حکم کی وہ بے احترامی نہیں کی جو مسلمانوں نے کی۔ درحقیقت یہ ایک بدترین حالت ہے جس پر مسلمانوں کو شرم آنی چاہیے، کجا کہ وہ بلاتکلف ان خیالات کا اظہار کریں کہ ڈاڑھی کے بغیر چہرے بارونق ہوتے ہیں اور ڈاڑھی رکھنے سے بے رونق ہو جاتے ہیں۔ آج فرنگیت زدہ مسلمان محض ڈاڑھی مونڈنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ڈاڑھی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس کے رکھنے والوں کی تذلیل و تضحیک کرتے ہیں۔ درس گاہوں میں ہر ممکن طریقہ سے ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ سرکاری، ملازمتوں میں اُنھوں نے بجائے خود ڈاڑھی کو نااہلی کا سرٹیفکیٹ قرار دے رکھا ہے اور بعض ملازمتوں میں تو اُس کے رکھنے پر پابندیاں تک عائد ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے سے آدمی چست اور جامہ زیب (smort) نہیں رہتا۔ یہ سب کچھ ایک مسلم سوسائٹی اور مسلم ریاست میں ہو رہا ہے، لیکن سکھوں نے انگریزی حکومت کے زمانے میں اپنا یہ حق تسلیم کرا کے چھوڑا کہ وہ ڈاڑھی رکھ کر ہر شعبۂ حیات میں داخل ہو سکتے ہیں اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بڑے سے بڑے مناصب پر پہنچ سکتے ہیں۔فوج، ایئر فورس اور سول کے کس شُعبے میں وہ نہیں پہنچے اور کون سا بڑے سے بڑا عہدہ رہ گیا جو محض ڈاڑھی رکھنے کی وجہ سے اُن کو نہ ملا ہو۔کس میں یہ جرأت تھی کہ اُن کو نااہل قرار دے سکے، یا اُن پر (smort) نہ ہونے کا فیصلہ صادر کرسکے، یا اُن کو یہ حُکم دے سکے کہ پہلے ڈاڑھی منڈواؤ پھر تمہیں فلاں منصب پر ترقی مل سکے گی۔آج ہمارے کالے صاحب لوگوں میں۔سے نہ معلوم کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے انگریزی دَور میں کسی نہ کسی سکھ اُفسر کی ماتحتی کی ہوگی اور کبھی اُن کو اِس بات پر شرم نہ آئی کہ وہ ایک ڈاڑھی والے کی ماتحتی کر رہے ہیں۔اِن میں سے کوئی شخص کبھی یہ ہمت نہ کرسکا کہ سکھوں کی ڈاڑھی کا مذاق اُڑانا تو در کنار، اِس پر اعتراض تک کر سکے۔

یہ سب کچھ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ سکھ مسلمانوں سے زیادہ کیرکٹر رکھتے ہیں۔اُن سے زیادہ اپنے شعائر کا احترام کرتے ہیں، اُن سے زیادہ اپنے پیشوائے دِین کی اطاعت کرتے ہیں اور ان سے کم ذہنی غلامی میں مُبتلا ہوتے ہیں۔کیا اِس صریح علامتِ کم تری پر مسلمانوں کو کبھی شرم نہ آئے گی؟

(رسائل و مسائل، چہارم، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۸۴-۸۸)

سُنّت اور عادت کا اُصولی فرق اور ڈاڑھی کا مسئلہ

سوال: آپ نے مظاہر تقویٰ پر اپنے خیالات کی توثیق فرماتے ہوئے سُنّت و بدعت کے بارے میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ ”سُنّت و بدعت وغیرہ اصطلاحات کے اُن مفہومات کو میں غلط، بلکہ دِین میں تحریف سمجھتا ہوں، جو آپ کے یہاں رائج ہیں“۔عرض ہے کہ یہ مسئلہ دراصل اُصولی ہے۔اِس پر اگر اطمینان بخش فیصلہ ہو جائے تو بہت سے جزوی مسائل، بلکہ اکثر نزاعات اور ذہنی اُلجھنیں ختم ہو جائیں۔لہٰذا سُنّت اور عادت کی ایسی جامع تعریف فرما دیجیے جو مانع بھی ہو اور اُس کے ساتھ ہی بدعت کے متعلق بھی اپنی تحقیق سے ممنون فرمائیں۔

مزید توضیحِ مقام کے لیے عرض ہے کہ آپ کا یہ ارشاد کہ ”آپ کا یہ خیال کہ نبی پاک ﷺ جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اُتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سُنّتِ رسول یا اُسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسول ﷺ کو بعینہٖ وہ سُنّت سمجھ رہے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی ﷺ اور دُوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے“۔میرے حسبِ حال نہیں ہے، اگرچہ میں مطلق اعفاء لحیہ کو سُنّتِ رسول ﷺ سمجھتا ہوں، مگر اسے غرضِ بعثت و مقصدِ رسالت تو آج سے دس سال قبل بھی نہیں سمجھتا تھا اور نہ اب ہی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ مقصدِ بعثت فقط ایک ہی سُنّت ہے اور وہ ہے اقامتِ دِین، یا قیامِ اطاعت الٰہیہ، باقی اُمور علیٰ حسب المدارج اہمیت رکھتے ہیں۔اِس سُنّت کے ہم پلہ دیگر سُنّتیں تو کیا، فرائضِ شرعیہ مثلاً عمارت مسجد حرام اور سقایۃ الحاج وغیرہ اُمور بھی نہیں ہیں۔اور میرے نزدیک یہی وہ سُنّت ہے جس کے احیا کو مأۃ شہید کے اجر کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے، ہاں حضور (ﷺ) کے ذاتی اسوۂ اعفاء لحیہ وغیرہ کو سُنّت ما بعد الفرائض الشرعیہ تاحال سمجھتا ہوں اور اِسی کی توثیق یا تصحیح کے لیے فوق الصدر استفسار پیشِ خدمت ہے۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

سُنّت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سُنّت ہے۔ لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سُنّت اُس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔ اِس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی ﷺ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کیے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اِس عمل کا کون سا جزو سُنّت ہے اور کون سا جزو عادت، بغیر اِس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دِین کے مزاج کو سمجھ چکا ہے۔

اُصولی طور پر یوں سمجھیے کہ انبیا علیہم السلام انسان کے اخلاقِ صالحہ کی تعلیم دیتے اور زندگی کے ایسے طریقے سکھانے کے لیے آتے رہے ہیں جو فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا کے ٹھیک ٹھیک منشا کے مطابق ہوں۔ ان اخلاقِ صالحہ اور فطری طریقوں میں ایک چیز تو اصل و رُوح کی حیثیت رکھتی ہے اور دُوسری چیز قالب و مظہر کی حیثیت۔ بعض اُمور میں رُوح اور قالب دونوں اِس شکل میں مطلوب ہوتے ہیں جس شکل میں نبی اپنے قول و عمل سے اُن کو واضح کرتا ہے۔ اور بعض اُمور میں رُوح اخلاق و فطرت کے لیے نبی اپنے مخصوص تمدنی حالات اور اپنی مخصوص افتادِ مزاج کے لحاظ سے ایک خاص عملی قالب اختیار کرتا ہے اور شریعت کا مطالبہ ہم سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اُس رُوحِ اخلاق و فطرت کو اختیار کر لیں۔ رہا وہ عملی قالب جو پیغمبر نے اختیار کیا تھا تو اُسے اختیار کرنے یا نہ کرنے کی شرعاً ہم کو آزادی ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے معاملات میں سُنّت رُوح اور قالب دونوں کے مجموعے کا نام ہے اور دُوسری قسم کے معاملات میں سُنّت صِرف وہ رُوحِ اخلاق و فطرت ہے جو شریعت میں مطلوب ہے نہ کہ وہ عملی قالب جو صاحب شریعت نے اُس کے اظہار کے لیے اختیار کیا۔

مثال کے طور پر دِین کا منشا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُس کا ذِکر کریں۔ اِس کے لیے نبی ﷺ نے بعض اعمال تو ایسے اختیار کیے جن کی رُوح اور عملی قالب دونوں سُنّت ہیں اور دونوں کی پیروی ہم پر لازم ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ اور بعض طریقے آپؐ نے ایسے اختیار کیے جن کی رُوح تو ہمارے اعمال میں ضرور پائی جانی چاہیے لیکن قالب کی ہو بہو پیروی کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ ہم کو آزادی دی گئی ہے کہ ہم اِس رُوح کے ظہور کے لیے جو عملی قالب مناسب سمجھیں اختیار کریں، مثلاً دُعائیں اور وہ عام اذکار جو حضور ﷺ وقتاً فوقتاً کرتے تھے۔ ہم پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہم بعینہٖ اُنھی الفاظ میں دُعائیں مانگیں جن الفاظ میں حضور ﷺ مانگتے تھے، البتہ سُنّت کی پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اِن دعاؤں کے طرز اور اُن کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھیں اور جن الفاظ میں بھی دُعائیں مانگیں اُن کے اندر نبی ﷺ کی دُعاؤں کی رُوح موجود ہو۔ اِسی طرح اذکار میں سُنّت صِرف یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے مختلف حالات و اعمال میں خدا کو یاد کرتا رہے۔ اِس سے استعاذہ کرے۔ اِس سے مدد مانگے، اِس کا شکر ادا کرے اور اِس سے طلبِ خیر کرے۔ اِس سُنّت کو حضور ﷺ نے اپنی عملی زندگی میں اُن مختلف اذکار کے ذریعے سے ظاہر اور جاری کیا جو حدیث میں مذکور ہیں، اگر کوئی شخص اِن اذکار کو لفظ لفظ یاد کر کے اِسی طرح اِن کا التزام کرے جس طرح حدیث میں بیان ہوا ہے تو یہ مستحسن یا مستحب تو ہو سکتا ہے لیکن اِسے اتباعِ سُنّت کا لازمی تقاضا نہیں کہا جا سکتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اگر کوئی شخص اِس سُنّت کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے کسی دُوسرے طریقے سے اس پر عمل درآمد کر لے اور اُس کے لیے دُوسرے الفاظ اختیار کر لے تب بھی وہ بدستور متبعِ سُنّت رہے گا اور اس پر خلاف ورزیٔ سُنّت کا الزام عائد نہ ہوگا۔

یہی فرق تمدّنی اور معاشرتی معاملات میں بھی ہے، مثلاً لباس میں جن اخلاقی و فطری حدود کو قائم کرنا نبی ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں تھا وہ یہ ہیں کہ لباس ساتر ہو، اُس میں اسراف نہ ہو، اُس میں تکبّر کی شان نہ ہو، اُس میں تشبّہ بالکفار نہ ہو وغیرہ۔ اِس رُوحِ اخلاق وفطرت کا مظاہرہ نبی ﷺ نے جس لباس سے کیا اُس میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کی پیروی جوں کی توں کرنی چاہیے، جیسے ستر کے حدود اور اِسبالِ ازار سے اجتناب اور ریشم وغیرہ کے استعمال سے پرہیز۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدّن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کو سُنّت بنانا نہ تو مقصود تھا، نہ اُن کی پیروی پر اِس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اِس طرزِ خاص کا لباس نبی ﷺ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اِس غرض کے لیے آیا کرتی ہیں کہ کسی شخص خاص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدّن، یا کسی خاص زمانے کے رسم ورواج کو دُنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سُنّت بنا دیں۔

سُنّت کی اِس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سُنّت نہیں ہیں اُن کو خواہ مخواہ سُنّت قرار دے دینا من جملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دِینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

اب خاص اِس ڈاڑھی کے معاملے کو لے لیجیے جس پر اِس بحث کی ابتدا ہوئی ہے۔ اِس معاملے میں جس روحِ اخلاق وفطرت کو اللہ تعالیٰ ہماری زندگی میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ مونچھیں کم کی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے۔ اِس کی ہدایت نبی ﷺ نے ہم کو دی ہے اور یہی سُنّت ہے۔ اب رہی اس کی عملی صورت تو اِس کا کوئی تعیّن نبی ﷺ نے اپنے ارشاد سے نہیں فرمایا، حالانکہ کوئی اَمر اِس میں مانع نہیں تھا کہ آپ اعفاءِ لحیہ کی مقدار اور قصِ شارب کی حد واضح طور پر مقرر فرما دیتے یا کم از کم یہی فرما دیتے کہ ڈاڑھی اور مونچھ کی ٹھیک ٹھیک وہی وضع رکھو جو میری ہے، جس طرح نماز کے متعلق حضور ﷺ نے فرما دیا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ پس جب کہ آپؐ نے اِس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہیں کی اور صرف ایک عام ہدایت دے کر ہم کو چھوڑ دیا تو اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ جو رُوحِ اخلاق وفطرت اِس معاملے میں مطلوب ہے، اُس کا منشا پورا کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی اور ضروری ہے کہ آدمی ڈاڑھی رکھے اور مونچھ کم کرے۔ اگر مقدار بھی اس کے ساتھ ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا بھی حضور ﷺ کے مشن کا کوئی جزو ہوتا تو آپؐ ہرگز اِس کے تعیّن میں کوئی کوتاہی نہ کرتے۔ مجمل حُکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعیّن سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اِس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اعفاءِ لحیہ اور قصِ شارب کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں اختیار کریں۔

اب اگر ایک شخص مونچھوں کے بال مونڈ ڈالتا ہو اور دُوسرا شخص اُنھیں اِس حد تک کتر ڈالنا چاہتا ہو کہ کھانے اور پینے میں مونچھوں کے بال آلودہ نہ ہوں تو اِن دونوں کو اپنے عمل میں آزادی ہے، اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نزدیک حکم کا منشا اس طریقے سے پورا ہوتا ہے جو میں نے اختیار کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی اس رائے کو تمام دُوسرے انسانوں کے لیے شریعت بنانے کی کوشش کرے اور اس کے خلاف جو شخص عمل کر رہا ہو اُس کو ملامت کرے۔ اگر وہ اسے شریعت بنانے کی کوشش کرے گا اور اس کے خلاف عمل کرنے والوں کو ملامت کرے گا تو یہ بدعت ہوگی۔ کیونکہ جو چیز سُنّت نہیں ہے اُس کو وہ زبردستی سُنّت بنا رہا ہے۔ سُنّت صرف قصِ شارب ہے نہ کہ اس کی کوئی خاص صورت جو کسی شخص نے اپنے استنباط و اجتہاد سے یا اپنے رجحانِ طبع سے اختیار کی ہو۔

اسی طرح ڈاڑھی کے معاملے میں جو شخص حکم کا یہ منشا سمجھتا ہو کہ اِسے بلا نہایت بڑھنے دیا جائے وہ اپنی اس رائے پر عمل کرے اور جو شخص کم سے کم یک مُشت کو حکم کا منشا پورا کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہو وہ اپنی رائے پر عمل کرے اور جو شخص مطلقاً ڈاڑھی رکھنے کو (بلا قیدِ مقدار) حکم کا منشا پورا کرنے کے لیے کافی سمجھتا ہو وہ اپنی رائے پر عمل کرے۔ اِن تینوں گروہوں میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ استنباط و اجتہاد سے جو رائے اُس نے قائم کی ہے وہی شریعت ہے اور اُس کی پیروی سب لوگوں پر لازم ہے۔ ایسا کہنا اس چیز کو سُنّت قرار دیتا ہے جس کے سُنّت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اور یہی وہ بات ہے جس کو میں بدعت کہتا ہوں۔

رہا یہ استدلال کہ نبی ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا اور اس حکم پر خود ایک خاص طرز کی ڈاڑھی رکھ کر اُس کی عملی صورت بتا دی، لہٰذا حدیث میں حضور ﷺ کی جتنی ڈاڑھی مذکور ہے اُتنی ہی اور ویسی ہی ڈاڑھی رکھنا سُنّت ہے تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضور ﷺ نے سترِ عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لیے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کر کے بتا دیا، لہٰذا اس طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سُنّت ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو میرے نزدیک آج متبعینِ سُنّت میں سے کوئی شخص بھی اِس سُنّت کا اتباع نہیں کر رہا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تمدّن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اُصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لیے نبی ﷺ تشریف لائے تھے اور دُوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے اِن اُصولوں کی پیروی کے لیے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور ﷺ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جس میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے، اِن میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لیے سُنّت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۳۰۹-۳۱۷)

قزع اور تشبّہ بالکفار

سوال آپ نے رسائل و مسائل میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ کے نزدیک انگریزی طرز کے بال شرعاً ممنوع نہیں ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ جو چیز ممنوع ہے وہ تو فعلِ قزع ہے یا وضع میں تشبّہ بالکفار ہے۔ اور انگریزی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طرز کے بال ان دونوں کے تحت نہیں آتے۔ مگر آپ کا جواب بہت مختصر تھا۔ اور اُس میں آپ نے اپنے حق میں دلائل کی وضاحت نہیں کی۔ خصوصاً قزع کی جو تعریف آپ نے بتائی ہے اُس کی تائید میں آپ نے کسی متعین حدیث یا اقوالِ صحابہ وائمہ میں سے کسی قول کو نقل نہیں کیا۔ اِسی طرح عہدِ نبوی میں غیر مسلموں کے اجزائے لباس کے اختیار کیے جانے کا آپ نے ذکر تو کیا ہے لیکن وہاں بھی آپ نے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ متعلقہ حوالہ جات کو بھی ترجمان میں نقل کر دیں تا کہ بات زیادہ صاف ہو جائے۔

آپ کی توضیح کے مطابق اس طرز کے بال رکھنا حرام تو نہیں، لیکن آپ کا ذوق اُنھیں پسند بھی نہیں کرتا۔ کیا جو وضع اہلِ دین کے نزدیک ناپسندیدہ ہو مگر حُرمت کے درجے میں نہ ہو، اُس کی روک تھام کے لیے کوئی عملی تدابیر اختیار نہیں کی جاسکتیں؟

ج: کسی چیز کو شرعی حیثیت سے ناجائز کہنے کے لیے دو اُمور میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔ یا تو بعینہٖ اس چیز کے متعلق کوئی حکم کلامِ شارع میں موجود ہو، یا شارع کی دی ہوئی کسی اُصولی ہدایت کے تحت وہ ناجائز قرار پاتی ہو۔ اگر ان دونوں اُمور میں سے کوئی بھی نہ ہو تو ایسی چیز کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ کسی شخص یا گروہ کے مذاق پر کتنی ہی گراں ہو۔ اس قاعدہ کُلیہ کے تحت جب ہم تحقیق کرتے ہیں کہ انگریزی طرز کے بالوں کی شرعی حیثیت کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا وجوہِ تحریم میں سے کوئی بھی یہاں نہیں پائی جاتی۔ سَر کے بالوں کے متعلق نصِ صریح میں جس چیز کی ممانعت وارد ہوئی ہے وہ قزع ہے اور قزع کی جو تعریف ائمہ حدیث وفقہ نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:

اَنْ يُحْلَقَ بَعْضُ رَأْسِ الصَّبِيِّ وَ يُتْرَكَ بَعْضٌ (نافع مولیٰ ابن عمر۔ صحیح مسلم) یہ کہ بچے کے سَر کا کچھ حصہ مونڈا جائے اور کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے۔

اِذَا حُلِقَ رَأْسَ الصَّبِيِّ وَ تُرِكَ هٰهُنَا شَعْرَةٌ وَ هٰهُنَا وَ هٰهُنَا وَ اَشَارَ اِلٰى نَاصِيَتِهٖ وَ جَانِبَىْ رَأْسِهٖ وَلٰكِنِ الْقَزَعُ اَنْ يُتْرَكَ بِنَاصِيَتِهٖ شَعْرٌ وَ لَيْسَ فِىْ رَأْسِهٖ غَيْرُهٗ وَكَذٰلِكَ شَقُّ رَأْسِهٖ هٰذَا وَ هٰذَا (عمر بن نافع۔ صحیح بخاری) جب کہ بچے کا سر اس طرح مونڈا جائے کہ صرف پیشانی پر اور سَر کے دونوں جانب بال چھوڑ دیے جائیں (پھر دوبارہ پوچھنے پر مزید تشریح کی کہ) مگر قزع یہ ہے کہ پیشانی کے بال چھوڑ کر باقی سارا سَر مونڈ دیا جائے اور اسی طرح یہ کہ سر کے اِن ان حصوں کو چھوڑ کر باقی سَر مونڈ ڈالا جائے۔

ابوداؤد کی روایت میں یہ تشریح خود نبی ﷺ کے ارشاد سے مستنبط ہوتی ہے۔ اس میں ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا جس کے سر کا کچھ حصہ مُنڈا ہوا تھا اور کچھ حصے پر بال چھوڑ دیے گئے تھے۔ حضور ﷺ نے اس فعل سے منع کیا اور فرمایا: اِحْلِقُوْ كُلَّهٗ اَوْ اتْرُكُوْ كُلَّهٗ ، یا تو پورا مونڈ دو یا پورے سَر کے بال چھوڑ دو۔

اس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ شریعت میں جو چیز بعینہٖ ممنوع ہے وہ کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اِس کا اطلاق اِن بالوں پر نہیں ہوتا جو آج کل انگریزی بالوں کے نام سے مشہور ہیں۔

اب رہ گیا دُوسرا اَمر کہ شارع کی کسی اُصولی ہدایت کے تحت اِن بالوں کو ناجائز قرار دیا جائے تو وہ اُصولی ہدایت صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہی تشبّہ والی ہدایت ہوسکتی ہے جس کے اس معاملے پر منطبق ہونے کا دعویٰ کرنا ممکن ہے۔ لیکن اس معاملے میں تحقیق طلب امر یہ ہے کہ تشبّہ سے مُراد کیا ہے؟ آیا تشبّہ مجموعی وضع وہیئت ہی ہوتا ہے یا جزئی طور پر بھی ہوسکتا ہے؟ اس سوال کی تحقیق میں جب ہم حدیث پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ جزئی طور پر غیر مسلم قوموں کی کوئی چیز لے کر اپنی وضع و معاشرت میں شامل کر لینے کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر شلوار ایران کی چیز تھی جو عرب پہنچ کر سراویل کے نام سے موسوم ہوئی اور نبی ﷺ نے اُس کے استعمال کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ خود بھی استعمال فرمایا۔

چنانچہ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَجِدْ إِزَارًا فَلْيَلْبَسْ سَرَاوِيلَ[1] جس کو تہمد نہ ملے وہ شلوار پہن لے۔

اور معتبر روایات سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے بھی شلوار خریدی تھی اور آپؐ کے زمانے میں آپؐ کی اجازت سے مسلمان بھی اس کو پہنتے تھے۔ اِسی طرح بُرنُس کے استعمال کو آپؐ نے نہ صرف جائز رکھا تھا بلکہ ایک صحابی کو خود تحفتاً دی تھی، اور قرنِ اوّل کے قُرّا میں اس کا استعمال عام تھا، حالانکہ یہ عیسائی راہبوں کی ٹوپی تھی۔ اسی بنا پر سلف میں سے بعض حضرات نے اِس کے استعمال کو مکروہ بھی سمجھا تھا، لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کے اِس خیال کی صاف صاف تردید فرمائی۔

اِسی طرح حضور ﷺ نے مختلف اَوقات میں ایسے جبّے بھی استعمال فرمائے ہیں جو غیر مسلم قوموں سے درآمد ہوئے تھے، چنانچہ معتبر احادیث سے آپ کا جبۂ شامیہ، جبۂ رُومیہ اور جبۂ کسروانیہ پہننا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ جبۂ شامیہ یہُودیوں کے لِباس کا جزو تھا، جبۂ رُومیہ رُومن کیتھولک عیسائیوں کا لِباس تھا اور جبۂ کسروانیہ ایرانی فیشن کی چیز تھی۔ اِن تمام روایات سے یہ بات ناقابلِ انکار طور پر ثابت ہوتی ہے کہ غیر مسلم قوموں کے تمدّن، معاشرت اور وضع وہیئت میں سے متفرق اجزائے کر (بشرطیکہ اُن میں سے کوئی چیز بذاتِ خود حرام نہ ہو) اپنی معاشرت میں داخل کر لینا تشبّہ نہیں ہے۔ بلکہ تشبّہ کا اطلاق صِرف اِس چیز پر ہوسکتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے آپ کو بحیثیت مجموعی کسی غیر مسلم قوم کی وضع وہیئت میں ڈھال لے، حتیٰ کہ اُسے دیکھ کر ایک ناواقف آدمی یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ مسلمان ہے۔ اب یہ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی مجموعی وضع مسلمانوں کی سی معروف وضع رکھتا ہو اور اُس میں صِرف انگریزی بال اُس کے سر پر ہوں تو اُسے تشبّہ کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔

بلاشُبہ میرے اپنے مذاق پر بھی اب یہ بال گراں ہیں اور اِس لیے میں نے اِن کو چھوڑ دیا ہے، لیکن یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حدودِ حلال وحرام اور چیز ہیں اور وہ مذاق اور چیز ہے جو اِسلامی ذہنیت کے نشو ونما سے اُبھرتا ہے۔ اِن دونوں چیزوں کو خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ایک اِسلامی نظام میں جس چیز کو ضابطہ کے طور پر حُکماً نافذ کر سکتے ہیں وہ صِرف حدودِ حلال وحرام ہیں۔

رہا وہ مذاق جو اِسلامی ذہنیت کے اَرتقا سے ہم میں پیدا ہوتا ہے، تو اوّل تو ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام اہلِ ایمان میں

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۷، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متفق علیہ ہو۔ دُوسرے اگر وہ متفق علیہ بھی ہو تب بھی ہمیں اُس کو 'شریعت' قرار دینے کا حق نہیں ہے۔ شریعت تو صرف اُن احکام کا نام ہے جو کتاب وسُنّت میں منصوص ہوں۔ منصوصات سے ماورا اجتہادی یا ذوقی اُمور ہوں، اُن کو رائج کرنے کے لیے استدلال، تعلیم، تربیت وغیرہ کے ذرائع استعمال کیے جاسکتے ہیں مگر اُن کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۴ء، ص ۲۶۲-۲۶۸)

سَر کے بالوں کا جواز وعدمِ جواز

(س) آپ نے بعض استفسارات کے جواب میں فرمایا ہے کہ انگریزی طرز کے بالوں کو سر چڑھانا، آپ پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ غیر مسلم اقوام کی وضع ہے، تاہم آپ شرعاً اِسے قابلِ اعتراض بھی نہیں سمجھتے، لیکن بعض علما اِس وضع کو ناجائز خیال کرتے ہیں۔ آپ اگر ترجمان میں اپنی تحقیق کی وضاحت کردیں تو دُوسرے لوگ بھی مُستفید ہوسکیں گے۔

(ج) سَر کے بالوں کے متعلق شریعت کا حکم اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حدیث میں 'قزع' کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ قزع کچھ بال مونڈنے اور کچھ رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہی چیز ممنوع بالذات ہے اور اِسی سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ باقی رہیں دُوسری وضعیں تو اُن میں سے کسی کے عدمِ جواز کا ثبوت نہیں ہے، اِس لیے وہ سب جائز ہیں، خواہ کوئی سارا سَر مونڈ دے یا سارے سَر کے بال کتروائے یا کچھ کتروائے اور کچھ رکھے، یا نصف کان تک رکھے، یا کان کی لَو تک رکھے، یا اِس سے بھی نیچے تک، یہ سب اس لیے جائز ہیں کہ اُصولاً جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

بعض لوگ کچھ کترانے اور کچھ رکھنے کو بھی قزع کی تعریف میں لاتے ہیں، مگر یہ نہ اِس لفظ کا صریح مدلول ہے اور نہ شارع نے بعینہٖ اس چیز کو منع کیا تھا۔ اَصل ممنوع کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ہے۔ نہ کہ کچھ کتروانا اور کچھ رکھنا۔ اگر ایک شخص ایک کو دُوسرے پر قیاس کرکے ممنوع سمجھے، تو اپنے قیاس پر اِسے خود ہی عمل کرنا چاہیے یا پھر اُس شخص کو جو اُس کے قیاس کی صحت کا قائل ہو۔ دُوسرے کسی شخص کو جو اِس قیاس سے متفق نہ ہو، وہ نہ مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اُس کا قیاس تسلیم کرے اور نہ اس بنا پر گناہ گار ٹھہرا سکتا ہے کہ اُس نے حکمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس معنی کی پیروی کیوں نہ کی جو میں نے اپنے قیاس واستنباط سے بیان کیے تھے۔

بعض لوگ اِس نوعیت کے بالوں کو تشبّہ کی تعریف میں لاتے ہیں۔ مگر وہ اِس بات کو بھول جاتے ہیں کہ تشبّہ جس سے شارع نے منع فرمایا ہے، صرف اِس صورت میں ہوتا ہے جب کہ ایک شخص بحیثیت مجموعی اپنی وضع قطع کافروں کی مانند بنائے۔ غیر مسلموں کے فیشن، لباس، اوضاع میں سے بعض اجزا کو لے لینا تشبّہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ ورنہ آخر اس بات کی کیا توجیہ کی جائے گی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رُومی جُبّہ پہنا ہے، کسروانی قبا پہنی ہے، شلوار کو پسند کرکے خریدا ہے جو ایران سے عرب میں نئی نئی پہنچی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بُرنُس پہنی ہے جو مسیحی درویش پہنا کرتے تھے۔ لہٰذا جزوی تشبہ کی بنا پر کسی کو گناہ گار ٹھہرانا یا فاسق قرار دینا زیادتی ہے۔ البتہ اگر بالوں کی یہ وضع اُسی طرح ممنوع ہوتی جس طرح بڑی بڑی مونچھوں کو مجوسی کی وضع کہہ کر منع کردیا گیا تھا تو البتہ اس طرح کی بال کتروانے کو گناہ قرار دیا جاسکتا تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہاں میں یہ تصریح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اُصولاً اس بات کا قائل ہوں، اور اِس اُصول پر مجھے شدت کے ساتھ اِصرار ہے کہ آدمی صرف حُکمِ منصوص کی خلاف ورزی سے ہی گناہ گار پا سکتا ہے، قیاس و استنباط سے نکالے ہوئے احکام کی خلاف ورزی کسی کو گناہ گار قرار نہیں بناتی، بجز اُس شخص کے جو اِس قیاس واستنباط کا قائل ہو۔ اِسی طرح مجھے اِس بات پر بھی اصرار ہے کہ حرام صرف وہ ہے جسے خدا نے اور اُس کے رسول (ﷺ) نے بالفاظِ صریح حرام کیا ہو، یا جس سے صاف الفاظ میں منع کیا ہو، یا جس میں مبتلا ہونے والے کو سزا کی وعید سُنائی ہو، یا نصوص کے اشارات واقتضاءات سے جس کی حُرمت مستنبط ہونے پر اجماع ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو قیاس واجتہاد سے حرام ٹھہرائی گئی ہوں اور جن میں دلائل شرعیہ کی بنا پر دو یا دو سے زیادہ اقوال کی گنجایش ہو تو وہ مطلقاً حرام نہیں ہیں، بلکہ صرف اُس شخص کے لیے حرام ہیں جو اُس قیاس واجتہاد کو صحیح تسلیم کرے۔ میرے نزدیک اِس حقیقت سے اغماض برتنا اُن اہم اسباب میں سے ایک ہے جن کی بنا پر اُمت کے مختلف گروہوں نے ایک دُوسرے کی تضلیل وتفسیق کی ہے۔

(رسائل ومسائل، دوم، مارچ ۸۲ء، ص ۲۶۹-۲۷۱)

عورتوں کا بال کٹوانا

س کیا عورتوں کو بال کٹوانے کے سلسلے میں کوئی واضح حُکم موجود ہے؟

ج ایسا کوئی صریح حُکم تو نہیں ہے، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ چیز ہمارے ہاں آئی کہاں سے ہے؟ اور کن لوگوں سے اسے سیکھا جا رہا ہے؟ پھر جن عورتوں کی دیکھا دیکھی اِسے اپنایا جا رہا ہے وہ تو بال کٹوانی کی حد سے بڑھ کر سَر مُنڈوانے کی حد تک جا پہنچی ہیں۔ کیا اب یہ چیز بھی اپنائی جائے گی۔

(۵۔ اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۵۲)

عورتوں کے لیے زیور کا جواز

اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَ هُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ ○ (الزخرف ۴۳: ۱۸) کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث وحجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی۔

اس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے زیور کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے۔ یہی بات احادیث سے بھی ثابت ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور نسائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک ہاتھ میں ریشم اور دُوسرے ہاتھ میں سونا لے کر فرمایا یہ دونوں چیزیں لباس میں استعمال کرنا میری اُمت کے مَردوں کے لیے حرام ہے۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ریشم اور سونا میری اُمت کی عورتوں کے لیے حلال اور مَردوں پر حرام کیا گیا۔ علامہ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں اس مسئلے پر بحث

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہوئے حسب ذیل روایات نقل کی ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو چوٹ لگ گئی اور خون بہنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اپنی اولاد جیسی محبت تھی۔ آپ ان کا خون چوس چوس کر تھوکتے جاتے اور ان کو یہ کہہ کر بہلاتے جاتے کہ اُسامہ اگر بچی ہوتا تو ہم اسے زیور پہناتے، اُسامہ اگر بیٹی ہوتا ہم اس کو اچھے کپڑے پہناتے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَبْسُ الْحَرِيرِ وَالذَّهَبِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُورِ أُمَّتِي وَ حَلَالٌ لِإِنَاثِهَا، ریشمی کپڑے اور سونے کے زیور پہننا میری اُمت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔[1]

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تمھیں ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟ اُنھوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو ان کا حق ادا کرو، یعنی ان کی زکوٰۃ نکالو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ زیور پہننے میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ تمھاری عملداری میں جو مسلمان عورتیں رہتی ہیں اُن کو حُکم دو کہ اپنے زیوروں کی زکوٰۃ نکالیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے عمرو بن دینارؒ کے حوالے سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی بہنوں کو اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹیوں کو سونے کے زیور پہنائے تھے۔

ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد علامہ جصاصؒ لکھتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے جو روایات عورتوں کے لیے سونے اور ریشم کے حلال ہونے کے متعلق وارد ہوئی ہیں وہ عدمِ جواز کی روایات سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں اور آیتِ مذکورہ بالا بھی اس کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ پھر اُمت کا عمل بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے سے ہمارے زمانے (یعنی چوتھی صدی ہجری کے آخری دور) تک یہی رہا ہے۔ بغیر اس کے کہ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہو۔ اس طرح کے مسائل میں اخبارِ احاد کی بنا پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۵۳۱--۵۳۲، الزخرف حاشیہ ۱۷)

............OOO............

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۱۷۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

حقوق العباد

اللہ کی عبادت اور اُس کے بندوں سے حسنِ سلوک

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ (النساء ۴:۳۶) اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ داروں سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمھارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔

[سورۂ بقرہ آیت ۸۳ میں ارشادِ الٰہی ہے:]

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ، اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

[سورۂ انعام آیت ۱۵۱ میں ارشادِ ربانی ہے:]

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ اے نبیؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں بتاؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں، یہ کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

[سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۳ میں ارشادِ ربانی ہے:]

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَـقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو اُنھیں اُف تک نہ کہو، نہ اُنھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو۔

[سورۃ الاحقاف آیت ۱۵ میں ارشاد ہے:]

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حقوق والدین کے جائز حدود

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (العنکبوت ۲۹:۸) ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے، لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے [معبود] کو شریک ٹھیرائے جسے تو [میرے شریک کی حیثیت سے] نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبور کریں تو ان کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں وَ اِنْ جَاهَدٰكَ (اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں) اس سے معلوم ہوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اَولیٰ رد کر دینے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد ان کی خدمت کرے، ان کا ادب و احترام کرے، ان کی جائز باتوں میں ان کی اطاعت کرے، لیکن یہ حق ان کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف ان کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اُسے اس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اس پر کھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے[1]۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۶۸۰، العنکبوت حاشیہ ۱۱، مزید سورۂ لقمان، آیت ۱۵ ملاحظہ ہو)

والدین سے حسنِ سلوک اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری

وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِیْ صَغِيْرًا۝ (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳-۲۴) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے پاس اُن میں سے کوئی ایک، یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک

۱- اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ماں حمنہ بنت سفیان بن اُمیہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی، نہ سایے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے، تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی ہوگی۔ حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار! اُن پر رحم فرما جس طرح اُنھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا ہے"۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع، خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہیے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جو اولاد کو والدین سے بے نیاز بنانے والا نہ ہو، بلکہ اُن کا احسان مند اور اُن کے احترام کا پابند بنائے، اور بڑھاپے میں اُسی طرح اُن کی خدمت کرنا سکھائے جس طرح بچپن میں وہ اس کی پرورش اور ناز برداری کر چکے ہیں۔ یہ آیت بھی صرف ایک اخلاقی سفارش نہیں ہے، بلکہ اسی کی بنیاد پر بعد میں والدین کے وہ شرعی حقوق و اختیارات مقرر کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آدابِ تہذیب میں والدین کے ادب اور اطاعت اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ اُصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام اور تعلیمی پالیسی کے ذریعے سے خاندان کے ادارے کو مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی نہ کہ اِسے کمزور بنانے کی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۱۰، بنی اسرائیل حاشیہ ۲۷)

ماں خدمت کی زیادہ حق دار ہے

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۚ (الاحقاف ۴۶:۱۵) ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اُس کی ماں نے مشقت اُٹھا کر اُسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اُٹھا کر ہی اُس کو جنا اور اُس کے حمل اور دُودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔

اگرچہ اولاد کو ماں اور باپ دونوں ہی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن ماں کا حق اپنی اہمیت میں اِس بنا پر زیادہ ہے کہ وہ اولاد کے لیے زیادہ تکلیف اُٹھاتی ہے۔ یہی بات اِس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ بخاری مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد اور امام بخاری کی الادب المفرد میں وارد ہوئی ہے کہ ایک صاحب نے حضور ﷺ سے پوچھا: کس کا حق خدمت مجھ پر زیادہ ہے؟ فرمایا: تیری ماں کا۔ اُنھوں نے پوچھا: اِس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ اُنھوں نے پوچھا: اِس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ اُنھوں نے پوچھا: اِس کے بعد کون؟ فرمایا: تیرا باپ[1]۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ٹھیک ٹھیک اِس آیت کی ترجمانی ہے، کیونکہ (۱) اِسے مشقت، اٹھا کر پیٹ میں رکھا، (۲) مشقت اُٹھا کر اُس کو جنا۔ (۳) اور اُس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۶۰۹، الاحقاف حاشیہ ۱۹)

ناجائز کام پر والدین کو پٹائی کی دھمکی دینا جائز نہیں: اگر والدین کو کسی خلاف شریعت قول و فعل سے روکنے کے لیے کوئی دُوسری تدبیر کارگر نہ ہو رہی ہو تو آدمی زیادہ سے زیادہ اِس پر قطع تعلق کی دھمکی تو دے سکتا ہے، لیکن ماں باپ پر ہاتھ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۰۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اُٹھانے کی دھمکی دینا جائز نہیں ہے۔ معاملہ بہت ہی سخت نوعیت کا ہو تو عملاً بھی قطع تعلق کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی والدین کی خدمت کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ کفر و شرک سے بڑھ کر گناہ کیا ہو سکتا ہے، لیکن عہدِ رسالت میں جن لوگوں کے والدین مشرک تھے اور مشرکانہ اعمال پر مُصر تھے اُن پر بھی اولاد کو ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ الّا یہ کہ میدانِ جنگ میں باپ اِسلام کے خلاف لڑنے کے لیے آ گیا ہو۔

(مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دوم، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۳)

قادیانی باپ کے لیے دعائے مغفرت:

س: مولانا ہمارے والد صاحب قادیانی تھے۔ بیس سال پہلے اُن کا انتقال ہوا۔ میں اور میرے بھائی قادیانیت سے بالکل تائب ہو گئے۔ اب جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم والد صاحب کی قبر پر جاتے ہیں اور اُن کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں..... معلوم یہ کرنا ہے کہ اِس میں شرعاً کوئی قباحت یا رُکاوٹ تو نہیں؟

ج: آپ اپنے والد کی قبر پر جا سکتے ہیں، لیکن اُن کے لیے دعائے مغفرت نہیں کر سکتے۔

(۵۔ اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۶۵)

اپنے اہل وعیال کو آتشِ جہنّم سے بچانے کی سربراہِ خاندان کی ذِمّہ داری

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (التحریم۔۶۶:۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تُند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حُکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حُکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اُسے بجالاتے ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک شخص کی ذِمّہ داری صرف اپنی ذات ہی کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش تک محدود نہیں ہے، بلکہ اِس کا کام یہ بھی ہے کہ نظامِ فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اُس پر ڈالا ہے اُس کو بھی وہ اپنی حدِ استطاعت تک ایسی تعلیم وتربیّت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں، اور اگر وہ جہنّم کی راہ پر جا رہے ہوں تو جہاں تک بھی اُس کے بس میں ہو، اُن کو اس سے روکنے کی کوشش کرے۔ اُس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے بال بچے دُنیا میں خوشحال ہوں بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر اُسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ وہ آخرت میں جہنّم کا ایندھن نہ بنیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیّت کے معاملے میں جواب دِہ ہے۔ حکمران راعی ہے اور وہ اپنی رعیّت کے معاملے میں جواب دِہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ اُن کے بارے میں جواب دِہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ اُن کے بارے میں جواب دِہ ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۲۹-۳۰، التحریم حاشیہ ۱۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذاتی کمائی میں رشتہ داروں کے حقوق

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶-۲۸)

رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق ..... فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے..... اگر اُن سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمھیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم اُمیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو اُنھیں نرم جواب دے دو۔

ان تین دفعات کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص نہ رکھے، بلکہ اپنی ضروریات اعتدال کے ساتھ پوری کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں اور دُوسرے حاجت مند لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی اور حق شناسی وحق رسانی کی رُوح جاری وساری ہو۔ ہر رشتہ دار دُوسرے رشتہ دار کا معاون اور ہر مستطیع انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے، اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اِتنا وسیع ہو کہ ہر شخص اُن سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہو، اُن کی خدمت کرے تو یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ اُن کا حق ادا کر رہا ہے، نہ یہ کہ احسان کا بوجھ اُن پر لاد رہا ہے۔ اگر کسی کی خدمت سے معذور ہو تو اُس سے معافی مانگے اور خدا سے فضل طلب کرے تاکہ وہ بندگانِ خدا کی خدمت کرنے کے قابل ہو۔

منشورِ اسلامی کی یہ دفعات بھی صرف انفرادی اخلاق کی تعلیم ہی نہ تھیں، بلکہ آگے چل کر مدینۂ طیبہ کے معاشرے اور ریاست میں اِنھی کی بنیاد پر صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ کے احکام دیے گئے، وصیت اور وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے، یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا، ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دِن تک اُس کی ضیافت کی جائے، اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا کہ پورے اجتماعی ماحول میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی رُوح جاری وساری ہوگئی، حتیٰ کہ لوگ آپ ہی آپ قانونی حقوق کے ماسوا اُن اخلاقی حقوق کو بھی سمجھنے اور ادا کرنے لگے جنھیں نہ قانون کے زور سے مانگا جاسکتا ہے نہ دلوایا جاسکتا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۱۰-۶۱۱، بنی اسرائیل حاشیہ ۲۸)

صلہ رحمی کا مفہوم اور اُس کی اہمیت

(س) صلہ رحمی کا مفہوم کیا ہے اور شریعت میں اِس کی اہمیت کس حد تک ہے؟

(ج) صلہ رحمی کا مفہوم رشتہ داری کے تعلق کی بنا پر ہمدردی، معاونت، حُسنِ سلوک اور خیر خواہی اور جائز حدود تک حمایت کرنا ہے۔ اِس کی کوئی حد نہ مقرر ہے، نہ کی جاسکتی ہے۔ دراصل یہ عام معروفات میں سے ہے، جنھیں لوگ خود ہی جانتے

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۶، ص ۴۶۹، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور صلہ رحمی میں کوتاہی کرنا یا قطع رحمی کرنا ان بڑے گناہوں میں سے ہے، جن کی سخت مذمت قرآن وحدیث میں کی گئی ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۶)

صلہ رحمی کی تلقین: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ (محمد ۴۷:۲۲) اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم اُلٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔

پس منظر: اِس ارشاد کا ایک مطلب یہ ہے کہ اگر اِس وقت تم اِسلام کی مدافعت سے جی چُراتے ہو اور اِس عظیم الشان اصلاحی انقلاب کے لیے جان و مال کی بازی لگانے سے منہ موڑتے ہو جس کی کوشش محمد ﷺ اور اہلِ ایمان کر رہے ہیں تو اِس کا نتیجہ آخر اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم پھر اسی جاہلیت کے نظام کی طرف پلٹ جاؤ جس میں تم لوگ صدیوں سے ایک دُوسرے کے گلے کاٹتے رہے ہو، اپنی اولاد تک کو زندہ دفن کرتے رہے ہو اور خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھرتے رہے ہو۔ دُوسرا مطلب یہ ہے کہ جب تمھاری سیرت و کردار کا حال یہ ہے کہ جس دِین پر ایمان لانے کا تم نے اقرار کیا تھا اُس کے لیے تمھارے اندر کوئی اخلاص اور کوئی وفاداری نہیں ہے اور اُس کی خاطر کوئی قربانی دینے کے لیے تم تیار نہیں ہو، تو اِس اخلاقی حالت کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ تمھیں اقتدار عطا کر دے اور دُنیا کے معاملات کی باگیں تمھارے ہاتھ میں آ جائیں تو تم سے ظلم و فساد اور برادر کُشی کے سوا اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔

یہ آیت اِس اَمر کی صراحت کرتی ہے کہ اِسلام میں قطع رحمی حرام ہے۔ دُوسری طرف مُثبت طریقہ سے بھی قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر رِشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کو بڑی نیکیوں میں شُمار کیا گیا ہے اور صلہ رحمی کا حُکم دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: البقرہ: ۸۳، ۱۷۷، النساء: ۸، ۳۶، النحل: ۹۰، بنی اسرائیل: ۲۶، النور: ۲۲۔

عربی زبان میں لفظ رحم کا استعمال: رحم کا لفظ عربی زبان میں قرابت اور رِشتہ داری کے لیے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رِشتہ دار، خواہ وہ دُور کے ہوں یا قریب کے، اِس کے ذوی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رِشتہ ہو اُس کا حق آدمی پر اُتنا ہی زیادہ ہے اور اُس سے قطع رحمی کرنا اِتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلہ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتہ دار کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو اس سے دریغ نہ کرے اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ بُرا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اُس کے لیے ممکن ہو اُس سے قصداً پہلو تہی کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِسی آیت سے استدلال کر کے اُمِ ولد کی بیع کو حرام قرار دیا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اِس سے اتفاق فرمایا تھا۔ حاکم نے مُستدرک میں حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک روز میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ یکایک محلّے میں شور مچ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک لونڈی فروخت کی جا رہی ہے اور اُس کی لڑکی رو رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسی وقت انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ جو دین محمد ﷺ لائے ہیں کیا اس میں آپ حضرات کو قطع رحمی کا بھی کوئی جواز ملتا ہے؟ سب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے کہا: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ کے ہاں ماں کو بیٹی سے جُدا کیا جا رہا ہے؟ اس سے بڑی قطع رحمی اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لوگوں نے کہا: آپ کی رائے میں اِس کو روکنے کے لیے جو صورت مناسب ہو وہی اختیار فرمائیں۔ اِس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام بلادِ اسلامیہ کے لیے یہ فرمانِ عام جاری کر دیا کہ کسی ایسی لونڈی کو فروخت نہ کیا جائے جس سے اُس کے مالک کے ہاں اولاد پیدا ہو چکی ہو، کیونکہ یہ قطع رحمی ہے اور یہ حلال نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۲۶-۲۸، محمد حاشیہ ۳۴)

مسلمانوں کے اپنے کافر رشتہ داروں سے تعلقات: لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (الممتحنہ ۶۰: ۸-۹)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دِین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دِین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دُوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

اس مقام پر ایک شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دُشمنی نہ کرنے والے کافروں کے ساتھ نیک برتاؤ تو خیر ٹھیک ہے، مگر کیا انصاف بھی صرف اُنھی کے لیے مخصوص ہے؟ اور کیا دُشمن کافروں کے ساتھ بے انصافی کرنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سیاق وسباق میں دراصل انصاف ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمھارے ساتھ عداوت نہیں برتتا، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اُس کے ساتھ عداوت نہ برتو۔ دُشمن اور غیر دُشمن کو ایک درجے میں رکھنا اور دونوں سے ایک ہی سا سلُوک کرنا انصاف نہیں ہے۔ تمھیں اِن لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حق ہے، جنھوں نے ایمان لانے کی پاداش میں تم پر ظُلم توڑے اور تم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کیا اور نکالنے کے بعد بھی تمھارا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر جن لوگوں نے اس ظُلم میں کوئی حصہ نہیں لیا، انصاف یہ ہے کہ تم اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور رشتے اور برادری کے لحاظ سے اُن کے جو حقوق تم پر عائد ہوتے ہیں اُنھیں ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۳۳، الممتحنہ حاشیہ ۱۲)

سابقہ آیات میں کفار سے جس ترکِ تعلق کی ہدایت کی گئی تھی اُس کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی تھی کہ یہ اُن کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اِن آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ اُس کی اصل وجہ ان کا کفر نہیں، بلکہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ اُن کی عداوت اور اُن کی ظالمانہ روِش ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دُشمن کافر اور غیر دُشمن کافر میں فرق کرنا چاہیے، اور اُن کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنھوں نے کبھی اُن کے ساتھ کوئی بُرائی نہ کی ہو۔ اس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اَسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اور اُن کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی قُتَیلہ بنت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عبدالعُزّیٰ کافرہ تھیں اور ہجرت کے بعد مکّہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماءؓ اُنھی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صُلح حُدَیبیہ کے بعد جب مدینہ اور مکّہ کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کھل گیا تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفہ تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کی اپنی روایت یہ ہے کہ میں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں اُن سے صلہ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟ حضور ﷺ نے جواب دیا: اِس سے صلہ رحمی کرو[1] (مُسنَد احمد۔ بخاری۔ مسلم)۔ حضرت اسماءؓ کے صاحبزادے عبداللہ بن زُبیرؓ اِس واقعے کی مزید تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت اسماءؓ نے ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں جب اللہ اور اُس کے رسول کی اجازت مل گئی تب وہ اُن سے ملیں (مُسنَد احمد۔ ابن جَریر، ابن ابی حاتم)۔ اِس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں باپ کی خدمت کرنا اور اپنے کافر بھائی بہنوں اور رِشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے، جب کہ وہ دُشمنِ اِسلام نہ ہوں۔ اور اِسی طرح ذِمّی مساکین پر صدقات بھی صَرف کیے جا سکتے ہیں۔[احکام القرآن للجصّاص، روح المعانی]

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۳۳، الممتحنہ حاشیہ ۱۳)

لڑکیوں سے حُسنِ سلُوک

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ٥ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ٥ (التکویر ۸۱:۸-۹) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضب ناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضب ناکی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تو نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ اُن سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟ اور وہ اپنی داستان سُنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اِس کے ساتھ کیا ظُلم کیا اور کس طرح اُسے زندہ دفن کر دیا۔ اِس کے علاوہ اِس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اِس کے فحویٰ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اِس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیّت نے اُن کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی اُنھیں اصرار ہے کہ اپنی اِسی جاہلیّت پر قائم رہیں گے اور اِس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد ﷺ اِن کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ اِس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا، آخر اُس کی کہیں تو دادرسی ہونی چاہیے۔ اور جن ظالموں نے یہ ظُلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب اُن سے اِس بے دردانہ ظُلم کی باز پُرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دُنیا میں تو کوئی سُننے والا نہ تھا۔ جاہلیّت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اِس پر

1- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۱۸-۳۱۹، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کوئی شرم آتی تھی، نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا۔ نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلم عظیم بالکل ہی بے داد رہنا چاہیے؟

بے رحمانہ طرزِ عمل کی وجوہات: عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا۔ ایک، معاشی خستہ حالی، جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا باراُن پر نہ پڑے۔ بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ اُنھیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر اُنھیں بیاہ دینا ہوگا۔ دُوسرے، عام بدامنی، جس کی وجہ سے بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائل لڑائیوں میں اُلٹی اِن کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دِفاع میں وہ کسی کام نہ آ سکتی تھیں۔ تیسرے، عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دُشمن قبیلے جب ایک دُوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی اُن کے ہاتھ لگتی تھیں اُنھیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ اِن وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اُسی گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی، اُس کے خاندان والے اِس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا۔

برکاتِ اِسلام میں سے ایک بڑی برکت: یہ اِسلام کی برکتوں میں سے ایک بڑی برکت ہے کہ اِس نے نہ صرف یہ کہ عرب سے اِس انتہائی سنگ دلانہ رسم کا خاتمہ کیا، بلکہ اِس تخیل کو مٹایا کہ بیٹی کی پیدایش کوئی حادثہ اور مصیبت ہے، جسے بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جائے، اِس کے برعکس اِسلام نے یہ تعلیم دی کہ بیٹیوں کو پرورش کرنا، اُنھیں عمدہ تعلیم و تربیت دینا اور اُنھیں اِس قابل بنانا کہ وہ ایک اچھی گھر والی بن سکیں، بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اِس معاملے میں لڑکیوں کے متعلق لوگوں کے عام تصور کو جس طرح بدلا ہے، اس کا اندازہ آپؐ کے ان بہت سے ارشادات سے ہوسکتا ہے جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثال کے طور پر ہم ذیل میں آپؐ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں:

مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنٰتِ بِشَیْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهٗ سِتْرًا مِنَ النَّارِ (بخاری و مسلم) جو شخص ان لڑکیوں کی پیدایش سے آزمایش میں ڈالا جائے اور پھر وہ اُن سے نیک سلوک کرے تو یہ اُس کے لیے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔

مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهٰكَذَا وَضَمَّ أَصَابِعَهٗ (مسلم) جس نے دو لڑکیوں کو پرورش کیا یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو قیامت کے روز میرے ساتھ وہ اس طرح آئے گا، یہ فرما کر حضور ﷺ نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا۔

مَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنٰتٍ اَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْاَخَوَاتِ فَاَدَّبَهُنَّ وَ رَحِمَهُنَّ حَتّٰى يُغْنِيَهُنَّ اللّٰهُ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ. فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوِاثْنَتَيْنِ؟ قَالَ: اَوِ اثْنَتَيْنِ حَتّٰى لَوْ قَالُوْا اَوْ وَاحِدَةً لَقَالَ وَاحِدَةً (شرح السُّنه) جس شخص

۱- احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۴۴-۳۴۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے تین بیٹیوں یا بہنوں کو پرورش کیا، اُن کو اچھا ادب سکھایا اور اُن سے شفقت کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ وہ اس کی مدد کی محتاج نہ رہیں، تو اللہ اُس کے لیے جنت واجب کر دے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اور دو؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اور دو بھی۔ حدیث کے راوی ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر لوگ اِس وقت ایک کے متعلق پوچھتے تو حضور ﷺ اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔

مَنْ كَانَتْ لَهٗ أُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهٗ عَلَيْهَا قَالَ يَعْنِى الذُّكُوْرَ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (ابوداؤد) جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اُسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے، نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے، اللہ اُسے جنت میں داخل کرے گا۔

مَنْ كَانَ لَهٗ ثَلٰثُ بَنٰتٍ وَصَبَرَعَلَيْهِنَّ وَكَسَاهُنَّ مِنْ جِدَتِهٖ كُنَّ لَهٗ حِجَابًا مِّنَ النَّارِ (بُخاری فی الادب المفرد، ابن ماجه) جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ اُن پر صبر کرے اور اپنی وُسعت کے مطابق اُن کو اچھے کپڑے پہنائے وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔

مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُدْرِكُهٗ ابْنَتَانِ فَيُحْسِنُ صُحْبَتَهُمَآ اِلَّا اَدْخَلَتَاهُ الْجَنَّةَ (بخاری ادب المفرد) جس مسلمان کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور وہ اُن کو اچھی طرح رکھے وہ اُسے جنت میں پہنچائیں گی۔

اِنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لِسُرَاقَةَ ابْنِ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَعْظَمِ الصَّدَقَةِ اَوْ مِنْ اَعْظَمِ الصَّدَقَةِ قَالَ : بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةٌ اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ (ابن ماجه، بخاری فی الادب المفرد) نبی ﷺ نے سراقہ بن مالک بن جُعشم سے فرمایا: میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ (یا فرمایا: بڑے صدقوں میں سے ایک) کیا ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا: ضرور بتائیے یا رسول اللہ! فرمایا: تیری وہ بیٹی جو (طلاق پا کر یا بیوہ ہو کر) تیری طرف پلٹ آئے اور تیرے سوا کوئی اُس کے لیے کمانے والا نہ ہو[1]۔

یہی وہ تعلیم ہے جس نے لڑکیوں کے متعلق لوگوں کا نقطۂ نظر صرف عرب ہی میں نہیں، بلکہ دُنیا کی اُن تمام قوموں میں بدل دیا جو اسلام کی نعمت سے فیض یاب ہوتی چلی گئیں۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۲۶۴-۲۶۸، التکویر حاشیہ ۹)

ہمسایوں کے حقوق

قرآن کی رُو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دُوسرا اجنبی ہمسایہ، تیسرا وہ عارضی ہمسایہ[2] جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رُو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔

۱- احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۶، ص ۱۷۳-۱۷۴

۲- صاحب بالجنب (پہلو کے ساتھ) جس سے مراد ہم نشین دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ چل رہا ہو، یا کسی دوکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسایگی بھی ہر مہذب اور شریف انسان پر ایک حق عاید کرتی ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۵۲، النساء، حاشیہ ۶۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے ہمسایے کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اِسے وراثت میں حصہ دار بنایا جائے گا۔ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اُس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔ایک دُوسری حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اُس کا ہمسایہ اُس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ایک عورت بہت نمازیں پڑھتی ہے۔اکثر روزے رکھتی ہے۔خوب خیرات کرتی ہے۔مگر اُس کی بدزبانی سے اُس کے پڑوسی عاجز ہیں۔آپؐ نے فرمایا: وہ دوزخی ہے۔لوگوں نے عرض کیا کہ ایک دُوسری عورت ہے جس میں یہ خوبیاں تو نہیں ہیں، مگر وہ پڑوسیوں کو تکلیف بھی نہیں دیتی۔فرمایا: وہ جنتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو یہاں تک تاکید فرمائی تھی کہ اپنے بچوں کے لیے اگر پھل لاؤ تو یا تو ہمسایے کے گھر بھی بھیجو ورنہ چھلکے باہر نہ پھینکو تاکہ غریب ہمسایے کا دِل نہ دُکھے۔ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تیرے ہمسایے تجھے اچھا کہتے ہیں تو واقعی تو اچھا ہے، اور اگر ہمسایے کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو تُو ایک بُرا آدمی ہے۔[1]

مختصر یہ کہ اِسلام اِن سب لوگوں کو جو ایک دُوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد، مددگار اور شریک رنج و راحت، دیکھنا چاہتا ہے۔اِن کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دُوسرے پر بھروسہ کریں اور ایک دُوسرے کے پہلو میں اپنی جان، مال اور آبرُو کو محفوظ سمجھیں۔رہی وہ معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ دُور رہنے والے دو آدمی برسوں ایک دُوسرے سے ناآشنا رہیں اور جس میں ایک محلّے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں تو ایسی معاشرت ہرگز اِسلامی معاشرت نہیں ہو سکتی۔

(اسلامی نظامِ زندگی اور اُس کے بنیادی تصوّرات، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۴۴۷-۴۴۸)

یتامیٰ اور مساکین سے شفقت اور محبت کا سلُوک

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ۝

(البلد ۹۰: ۱۲-۱۶) اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دِن کسی غریب یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

[اِن آیات سے پہلے انسان] کی فضول خرچیوں کا ذِکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمائش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اِس لیے اب اِس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون سا خرچ اور مال کا کون سا مصرف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اُس میں نفس کی کوئی لذت نہیں ہے، بلکہ آدمی کو اِس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کر دے، یا اُس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر

۱- احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۹۲-۳۹۴، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اُس سے چھڑائے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دست گیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ اُن کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شان دار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں۔ مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اِسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے بڑے فضائل رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً فَكُّ رَقَبَةٍ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضور ﷺ کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا۔ ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرم گاہ کے بدلے میں شرم گاہ (مسند احمد۔ بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی)۔ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مَرجانہ سے پوچھا: کیا تم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث خود سُنی ہے؟ اُنھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اِسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابو حنیفہ اور امام شعبی نے اس آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔[1]

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضور ﷺ نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: السَّاعِي عَلَى الْأَرْمِلَةِ وَالْمِسْكِينِ كَالسَّاعِي فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَحْسَبُهُ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَكَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ (بخاری و مسلم) بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔ (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے۔

یتامیٰ کے بارے میں تو حضور ﷺ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اس طرح ہوں گے''۔ یہ فرما کر آپ نے شہادت کی اُنگلی اور بیچ کی اُنگلی کو اُٹھا کر دکھایا، دونوں اُنگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا (بخاری)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک

[1] تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۳۶، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سلوک ہورہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بُرا سلوک ہورہا ہو (ابن ماجہ، بخاری فی الادب المفرد)۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا اُس بچے کے ہر بال کے بدلے جس پر اُس شخص کا ہاتھ گزرا اُس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا وہ اور میں جنت میں اِس طرح ہوں گے اور یہ فرما کر حضور ﷺ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتائیں (مُسند احمد، ترمذی)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شامل کیا اللہ نے اُس کے لیے جنت واجب کر دی۔ اِلّا یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھا ہو جو معاف نہیں کیا جا سکتا'' (شرح السنة)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ میرا دِل سخت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا (مسند احمد)[1]۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۳۴۳، البلد حاشیہ ۱۲)

یتامیٰ کے حقوق کا انتظامی اور قانونی تحفظ: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴) مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔

یہ بھی محض ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی، بلکہ آگے چل کر جب اِسلامی حکومت قائم ہوئی تو یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے انتظامی اور قانونی، دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں، جن کی تفصیل ہم کو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اُصول اخذ کیا گیا کہ اِسلامی ریاست اپنے اُن تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی ﷺ کا ارشاد: اَنَا وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهٗ[2] (میں ہر اُس شخص کا سر پرست ہوں جس کا کوئی سر پرست نہ ہو) اسی طرف اشارہ کرتا ہے، اور یہ اِسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۱۵، بنی اسرائیل حاشیہ ۳۸)

یتیم لڑکیوں کے حقوق کی اہمیت:

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا (النسآء ۴: ۱۲۷) لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو: اللہ تمھیں اُن کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اِس کتاب میں سنائے جارہے ہیں یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود اُن سے نکاح کر لینا چاہتے ہو) اور وہ احکام جو اُن بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

۱- احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۲۹-۳۳۰

۲- ایضاً، ج ۶، ص ۴۹۸، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِس کی تصریح نہیں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملے میں لوگ کیا پوچھتے تھے۔ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اِسی سورۃ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچوں کے متعلق بالعموم ارشاد فرمائے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دو رُکوعوں میں اُن کے حقوق کے تحفظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی ہے۔ مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اِس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذِکر بطورِ خود چھیڑ دیا گیا۔

وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''تم اُن سے نِکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو'' اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''تم اُن سے نِکاح کرنا پسند نہیں کرتے'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اِس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی تو وہ اِن لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظُلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مال دار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اِس سے نِکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اِس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اُس سے خود نِکاح کرتے تھے اور نہ کسی دُوسرے سے اُس کا نِکاح ہونے دیتے تھے، تاکہ اُس کا کوئی ایسا سردھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۰۱، النساء حواشی ۱۵۲-۱۵۳، ۱۵۵)

سرپرست کے لیے پرہیزگاری کی تلقین: وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (النسآء ۴: ۶) یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اِس پر گواہ بنالو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

اپنا حق الخدمت اِس حد تک لے کہ ہر غیر جانبدار معقول آدمی اُس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے چوری چھپے نہ لے بلکہ علانیہ متعین کر کے لے اور اُس کا حساب رکھے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۴، النساء حاشیہ ۱۱)

یتیموں کا مال ناحق طریقہ سے کھانے کی ممانعت: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ (النسآء ۴: ۱۰) جو لوگ ظُلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ اُحد کے بعد حضرت سعد بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اُنھوں نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! یہ سعد کی بچیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ اُحد میں شہید ہوئے ہیں۔ اُن

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور اُن کے لیے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا۔ اب بھلا اِن بچیوں سے کون نِکاح کرے گا"؟
اِس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۵، النساء حاشیہ ۱۴)

اموالِ یتامیٰ کو اپنے اموال کے ساتھ ملانے کی ممانعت: وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ○ (النسآء ۴: ۲) تیموں کے مال اُن کو واپس دو۔ اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

یعنی جب تک وہ بچے ہیں، اُن کے مال اُنھی کے مفاد پر خرچ کرو اور جب بڑے ہو جائیں تو جو اُن کا حق ہے وہ اُنھیں واپس کر دو۔

اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو، کا ایک مطلب یہ ہے کہ حلال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو اور دُوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے نہ بدل لو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۰، النساء حاشیہ ۲-۳)

تیموں کا مال کس وقت اُن کے سپرد کیا جائے؟: وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ؕ (النسآء ۴: ۶) اور تیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نِکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِ انصاف سے تجاوز کر کے اِس خوف سے اُن کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔

جب وہ سنِ بلوغ کے قریب پہنچ رہے ہوں تو دیکھتے رہو کہ اُن کا عقلی نشو و نما کیسا ہے اور اُن میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذِمہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہو رہی ہے۔

مال اُن کے حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ، دُوسرے رُشد۔ یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے اُمّت میں اتفاق ہے۔ دُوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سنِ بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو ولی یتیم کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اُس کا مال اُس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اور امام ابویوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالہ کیے جانے کے لیے بہر حال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ غالباً مؤخر الذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہو گی کہ اِس معاملے میں قاضی شرع سے رُجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اِس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اِس کے معاملات کی نگرانی کے لیے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۳، النساء حواشی ۹-۱۰)

نادان یتامیٰ کے اموال کا انتظامی مسئلہ: وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (النسآء ۴: ۵) اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے حوالہ نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔

یہ آیت وسیع معنی کی حامل ہے۔ اس میں اُمت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعہ قیامِ زندگی ہے، بہر حال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرف میں نہ رہنا چاہیے جو اُسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظامِ تمدن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کر دیں۔ حقوقِ ملکیت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور اُن کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے تب بھی اُس کے وہ حقوق سلب نہ کیے جا سکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری ہونی چاہییں، لیکن جہاں تک حقوقِ مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اُس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ استعمال اخلاق و تمدن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحبِ مال کو اس اُمر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانے پر حکومتِ اسلامی کو اِس اَمر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں یا جو لوگ اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، اُن کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے لے اور اُن کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کر دے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۲۲-۳۲۳، النساء حاشیہ ۸)

یتیموں کے ساتھ سلوک کی صحیح نوعیت: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۗ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۗ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ ۲: ۲۲۰) پوچھتے ہیں، یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو جس طرزِ عمل میں اُن کے لیے بھلائی ہو، وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحبِ اختیار ہونے کے ساتھ صاحبِ حکمت بھی ہے۔

اس آیت کے نزول سے پہلے قرآن میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق بار بار سخت احکام آ چکے تھے اور یہاں تک فرما دیا گیا تھا کہ "یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو" اور یہ کہ "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں" ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ، جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے، اِس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے اُن کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا اور اِس احتیاط پر بھی اُنھیں ڈر تھا کہ کہیں، یتیموں کے مال کا کوئی حصہ اُن کے مال میں نہ مل جائے۔ اس لیے اُنھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ اُن بچوں کے ساتھ ہمارے معاملے کی صحیح صورت کیا ہے؟

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۶۸، البقرہ حاشیہ ۲۳۶)

ملازمین کے حقوق

س: یہاں کے ایک ادارے نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ ملازمین کے معاوضہ جات اور دیگر قواعدِ ملازمت کے بارے میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ جہاں تک قرآن و حدیث اور کتبِ فقہ پر میری نظر ہے اس بارے میں کوئی ضابطہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ اس لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں کہ کتاب وسُنّت کی رہنمائی اور عہدِ خلافتِ راشدہ اور بعد کے سلاطینِ صالحین کا تعامل اس بارے میں واضح فرمائیں۔

چند حل طلب سوالات جو اس ضمن میں ہو سکتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) سال بھر میں کتنی رُخصتیں با تنخواہ لینے کا استحقاق ہر ملازم کے لیے ہے؟

(۲) اتفاقی رُخصتیں با تنخواہ کس قدر لینے کا حق ہے؟

(۳) ایامِ بیماری کی تنخواہ ملے گی یا نہیں؟

(۴) ملازمین کی تنخواہ کس اُصول پر مقرر کی جائے؟

(۵) ملازم کے کنبے کے افراد بڑھ جانے پر تنخواہ میں اضافہ ہونا چاہیے یا نہیں؟

(۶) رُخصت حاصل کرنے کے لیے تحریری اجازت ضروری ہے یا نہیں؟

(۷) اعلیٰ وادنیٰ ملازمین حقوق میں برابر ہوں گے یا کچھ تفاوت ہوگا؟

ج: آپ کا سوال کافی غور وخوض اور تفصیلی جواب چاہتا ہے۔ مگر میں مجبوراً مختصر جواب پر اکتفا کر رہا ہوں۔

شریعت میں ملازمین اور مزدوروں کے حقوق کسی مفصل ضابطے کی شکل میں تو مذکور نہیں ہیں، مگر ایسے اُصول ہمیں یقیناً دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں ہم تفصیلی ضوابط مرتب کر سکتے ہیں۔ دورِ خلافتِ راشدہ میں اِن اُصولوں کی بنا پر سرکاری و غیر سرکاری ملازمین سے جو معاملہ ہوتا تھا اُس کی تفصیلات حدیث و تاریخ میں یکجا موجود نہیں ہے، بلکہ مختلف ابواب و فصول میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان تفصیلات میں بھی آپ کے سوالات کا جواب شاید کم ہی ملے گا۔ میں اس وقت عُرفِ عام اور اسلام کے معروف تصوّرِ انصاف پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کے سوالات کا مجمل جواب عرض کر رہا ہوں۔

رُخصتوں کے بارے میں یہ معروف طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سال میں ایک ماہ کی رخصت حسبِ معمول ملنی چاہیے اور ناگہانی رُخصتیں سال میں پندرہ دِن کی بامعاوضہ ملنی چاہییں۔ اِس سے زائد رُخصتیں ایک متعیّن حد تک بلامعاوضہ دی جا سکتی ہیں۔

بیماری کے دِنوں کا معاوضہ ہر ملازم کو پورا ملنا چاہیے، قطع نظر اس کے کہ بیماری کتنی طویل ہو، کسی مستاجر (Employer) کو اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر اُسے بیمار ملازم کے مصارف علاج برداشت کرنے چاہییں یا اُس کے علاج کا مفت انتظام کرنا چاہیے اور بیمار اور اُس کے متعلقین کی ضروریات کا بقدرِ کفاف ذِمہ دار ہونا چاہیے۔

ملازم کا معاوضہ مقرر کرنے میں چند اُمور کا لحاظ کرنا ہوگا۔ مثلاً اُس کے کام کی نوعیت کیا ہے، اُس کی اپنی صلاحیت کیا ہے، اس نوعیت کے کام اور اس قابلیت کے آدمی کے لیے معروف ضروریاتِ زندگی کیا ہیں اور اِس خاص ملازم کی خانگی ذِمہ داریاں کیا ہیں؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عام مستاجر افراد و ادارات کے بس کا تو یہ کام نہیں ہے کہ ملازم کے کنبے کے افراد جس تناسب سے بڑھتے جائیں، اُس کی تنخواہ میں بھی اُسی تناسب سے اضافہ کیا جاتا رہے۔ البتہ حکومت کو اِس کی ذِمّہ داری لینی چاہیے یا پھر بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی ادارو ں کو بھی اِس کا پابند بنایا جاسکتا ہے۔

رُخصت کے لیے اجازت کا معاملہ بھی ایک طرح سے لین دَین کے معاملات سے مشابہ ہے۔ اِس لیے اُصول تو یہی چاہتا ہے کہ تحریری درخواست اور تحریری اجازت کی پابندی ہو۔ البتہ پرائیویٹ ملازمت میں جہاں ایک شخص کا معاملہ ایک شخص سے ہوتا ہے، وہاں زبانی اجازت کے استثنا کی گنجایش نکل سکتی ہے۔

معاوضوں میں تفاوت کے علاوہ دیگر جملہ حقوق میں اُصولاً اعلیٰ و ادنیٰ ملازمین میں یکسانی ہونی چاہیے۔

(رسائل و مسائل، دوم، مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۳۱۵-۳۱۸، بحوالہ ترجمان القرآن، ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ، جنوری ۱۹۵۲ء)

...........OOO...........

www.kitabosunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

ادارۂ معارف اسلامی